



سلسلہ مطبوعات شاہ معنی اکیڈمی نمبر (۴)
جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ



تصوف پر علمی، تحقیقی و دعویٰ مجلہ

کتابی سلسلہ الاحسان الہ آباد

ذیہ سربوستی: داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی محقوی مدظلہ (رحمہ اللہ)

مدیر: حسن سعید صفوی

مترجمین

مجیب الرحمن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمن علیمی، رفعت رضا نوری

معاونین

محمد عمران ثنائی، عارف اقبال مصباحی، کتاب الدین رضوی

مجلس مشاورت

پروفیسر سید محمد امین میاں قادری (مارہہ) مولانا یحیٰ بن اختر مصباحی (دہلی)

مفتی محمد نظام الدین رضوی (میارک پور) پروفیسر اختر العواصم (دہلی)

ڈاکٹر سید عظیم اشرف جاکسی (حیدرآباد) پروفیسر مسعود انور صلی (علی گڑھ)

ڈاکٹر سید شمیم الدین احمد عیسیٰ (پٹنہ) سید ضیاء الدین رحمانی (جدہ)

مولانا اسد الحق محمد عاصم قادری (ہڈاپور) مولانا خوشنورانی (دہلی)

مولانا منظر الاسلام ازہری (امریکا) سید مسیح الدین مسیح رحمانی (پاکستان)

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی (علی گڑھ) ڈاکٹر نوشاد عالم پیشی (فتح پور)

منشر

شاہ معنی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یو پی)

E-mail: alehsaan.yearly@gmail.com

shahsafiacademy@gmail.com

کتابی سلسلہ:

الاحسان (شمارہ نمبر-۳)

مدیر:

حسن سعید صفوی

مترجمین

مجیب الرحمن علیمی، ذیشان احمد مصباحی، ضیاء الرحمن علیمی، رفعت رضا نوری

سال اشاعت:

مارچ ۲۰۱۲ء / ربیع الثانی ۱۴۳۳ھ

قیمت:

۲۲۵ روپے

کمپیوٹنگ:

عبدالرحمن سعیدی، صاحب حسین سعیدی

ناشر:

شاہ معنی اکیڈمی، جامعہ عارفیہ/خانقاہ عارفیہ، سید سراواں، الہ آباد (یو پی)

تقسیم کار:

مکتبہ امام اعظم، ۲/۴۲۵ میاں محل، جامع مسجد، ویلی- 9958423551

Alehsaan (A Journal on Islamic Spirituality)

Published by: Shah Safi Academy, Jamia Arifia

Saiyed Sarawan, Kaushambi, Allahabad U.P.(India)211001

Ph:08081898965,09026981216-Email:alehsaan.yearly@gmail.com

In Association With:

Asiatic Publishing House

Laxmi Nagar, New Delhi

اہل قلم کی رائے سے ادارے کا اتفاق ضروری نہیں!

مشمولات

بادہ و ساغر

07-12

- | | | |
|----|--------------------|---|
| 8 | حضرت آسی غازی پوری | حسن کی کم نہ ہوئی گرمی با تارا بنوڑ |
| 9 | حضرت عزیز صفی پوری | با نگ گیسر بلند است زیرت خانہ ما |
| 10 | حضرت اصغر گوڈ وی | یا دوہ تیری کیا کہ جو گردش خوں یز خانہ دے |
| 11 | شیخ ابو سعید صفوی | اس آستان پہ جیس لوکھ کے پھرا ٹھانہ سکے |
| 12 | علی ظہیر عثمانی | محبت کو ہر ایا حسن پنہانی سمجھتے ہیں |

احوال

13-24

- | | | |
|----|-------------------|----------|
| 14 | حسن سعید صفوی | اہتدائیہ |
| 18 | ڈیشان احمد مصباحی | واروات |

بادہ کھنہ

25-32

- | | | |
|----|-------------------------|---------------------------------|
| 26 | شیخ ابو نصر سراج | فقد اور فقہا - صوفیہ کی نظر میں |
| 28 | شیخ علی بن عثمان ہجویری | شریعت و حقیقت |
| 30 | شیخ احمد سرہندی | علماء عربیہ اور علمائے آخرت |

تذکیر

33-64

- | | | |
|----|---------------------------|--------------------------------------|
| 34 | شیخ ابو سعید صفوی | مقصد حیات انسانی: مقام احسان کا حصول |
| 37 | مولانا عبد الباقی نعمانی | تکبر، تفاخر اور عصییت کی تباہ کاریاں |
| 52 | محمد ساحل سرور دیکھت سنگھ | کفر سے ایمان تک |
| 58 | رابعہ خاتون / رحمنی | رحمنی سے رابعہ: ایک ایمانی سفر |

انتساب

امام ربانی، شیخ لاثانی، مجدد الف ثانی
مصلح دین و امت، قاطع دین اکبری، شارح نظریہ وحدۃ الشہود
حضرت شیخ احمد بن عبد الاحد فاروقی سرہندی رحمہ اللہ
(پیدائش: شوال ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء - وفات: ۱۰۳۳ھ / ۱۶۲۴ء)

کے نام

جن کو ڈاکٹر اقبال نے ان گراں قد و لفظوں میں خراج تحسین پیش کیا:

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار
گردن نہ جھکی جس کی جہاں گیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار

تحقیق و تنقید

65-189

- تصوف اور صوفیہ - علامہ ابن حجر عسقلانی کی نظر میں مولانا طفیل احمد مصباحی 66
 بیعت و اجازت - احادیث کی روشنی میں مولانا کوثر امام قادری 76
 حضرت جنید بغدادی - علمی تحریروں کی روشنی میں مولانا کوثر امام قادری 87
 حضرت سید بہاء الدین بنگلوری ڈاکٹر ساحل شہسرا می 99
 صوفی خواتین - ایک جائزہ ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی 115
 حافظ ابن قیم جوزی اور ان کا ذوق تصوف ضیاء الرحمن علی 127
 الغزالی بین ما وجہ و ناقدیہ - ایک تجزیاتی مطالعہ مولانا ساجد رضا مصباحی 165
 غزالی اور مسئلہ تکفیر - ایک جائزہ مولانا وارث مظہری 179

بحث و نظر

حاضر میں احیائے تصوف کا کام کن اصولوں کے تحت ممکن ہے؟

191-199

- مدارس میں طریقت اور خانقاہوں میں شریعت کا نفاذ مفتی نظام الدین رضوی 192
 اکابر صوفیہ کے عمل کو اپنے رویے کا حصہ بنائیں! پروفیسر اختر الواسع 195
 تصوف کا احیاء صرف متقدمین کے اصولوں پر ممکن ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی 197

شناسائی

201-248

- مفتی عبید الرحمن رشیدی صاحب سے گفتگو حسن سعید صفوی 202
 خانقاہ عالیہ رشیدیہ جوں پور - تاریخ اور کارنامے مجیب الرحمن علی 218

صوفی ادب

249-270

- تعلیمات تصوف اور مشنوی مولانا روم پروفیسر عبدالحمید اکبر 250
 امیر خسرو کی عربی نثر نگاری ضیاء الرحمن علی 256
 امیر خسرو کی فارسی نعتیہ شاعری مولانا ارشد عالم نعمانی 264

زاویہ

حضرت مجدد الف ثانی کی شخصیت اور ان کے اصلاحی کارناموں پر خصوصی گوشہ

271-366

- آئینہ حیات حضرت مجدد دارہ 272
 وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان پروفیسر اختر الواسع 274
 مجدد الف ثانی - حیات اور کارنامے رفعت رضا نوری 279
 مجدد الف ثانی کی تجدیدی خدمات ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی 297
 مکتوبات امام ربانی میں تصوف کے اسرار و رموز ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی 308
 مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ - افکار کا تقابلی مطالعہ پروفیسر یحییٰ مظہر صدیقی 328
 مجدد الف ثانی کے چند ممتاز خلفا مولانا امیر رضا مصباحی 353

پیمانہ

367-372

- شاہ ولی اللہ کی صوفیانہ شرح حدیث پروفیسر یحییٰ مظہر صدیقی 368
 امیر خسرو (میوزیکل اوپیرا) / فصیح اکمل 269
 سہ ماہی انوارِ مخدوم (خصوصی شمارہ) / ڈاکٹر طفیل احمد 370
 جانشین غریب نواز / پروفیسر غلام یحییٰ انجم 371
 تذکرہ صائبیہ / شاہ محمد انور علی سمیل فریدی 372

مکتوبات

373-406

- مفتی عبید الرحمن رشیدی ○ شمس الرحمن فاروقی ○ پروفیسر یحییٰ مظہر صدیقی ○ ڈاکٹر سید علیم
 اشرف چاکسی ○ ڈاکٹر سید حسین احمد ○ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی ○ ڈاکٹر شاہد پرویز ○ ڈاکٹر شجاع
 الدین فاروقی ○ محمد بدیع الدین فریدی ○ ڈاکٹر کوثر مظہری ○ مفتی الطاف حسین رضوی
 ○ مولانا محمد شہروز مصباحی ○ مولانا ساجد رضا مصباحی ○ مولانا طفیل احمد مصباحی ○ مولانا
 مظہر حسین علی ○ اسلم رضا قادری ○ مولانا محمد آفتاب مصباحی

غزل

حسن کی کم نہ ہوئی گرمی بازار ہنوز
 نقد جاں تک لیے پھرتے ہیں خریدار ہنوز
 طائر جاں قفس تن سے تو چھوٹا لیکن
 دام گیسو میں کسی کے ہے گرفتار ہنوز
 ساتھ چھوڑا سرِ ملکِ عدم میں سب نے
 ساتھ لپٹی ہی رہی صرست دیدار ہنوز
 اپنی عیسیٰ نفسی کی بھی تو کچھ شرم کرو
 چشمِ پیار کے پیارہ ہیں پیار ہنوز
 ہم بھی تھے روزِ ازلِ صحتِ بزمِ الست
 بھوتی ہی نہیں وہ لذتِ گفتار ہنوز
 کیا ثرلہاتیوں کو حضرت آسی نہ ملے
 کہ سلامت ہے وہی جہد و ہستار ہنوز

بادہ و ساغر

غزل

باغک تکبیر بلند است زیت خانہ ما
لوحش اللہ زہے مشرب زندانہ ما

بادۂ ناب بھر کز مے عشق صنم
ساقیا روز ازل پر شدہ پیانہ ما

خرقہ سوزیم بنوشیم شراب گلگوں
مختسب کرد طواف در کاشانہ ما

می شود روشن اگر سرمہ کند یک دو شبے
دیدہ شمع ز خاکستر پروانہ ما

آپ بہ خاک نہ ریزد چو سحاب کرمش
کے شود سبز ولایت بہ زمیں دانہ ما

غزل

یاد وہ تیری کیا کہ جو گردشِ خوں بہا نہ دے
ذکر وہ تیرا کیا کہ جو ہر بن موجلا نہ دے

میرے سر نیاز کی محبتیں مٹا نہ دے
موت ہو یا حیات ہو کوئی مجھے صدا نہ دے

آف رے مری فدا دگی، آف رے کمالِ محنتگی
آئے وہ فرشِ خاک پر عرش پہ جو پتا نہ دے

اس کی حریم ناز میں موجِ نفس بھی روک لے
ہوش کو بھی تیر نہ ہو عقل کو بھی ہوا نہ دے

غزل

اس آستان پہ جہیں رکھ کے پھر اٹھا نہ سکے
ہم ایک در کے سوا سر کہیں بھکا نہ سے
دل غریب میں آکر سا گئے دیکھو
وہی جو عرصہ کونین میں سا نہ سکے
ازل سے جو کہ ہیں نحو بلندی پر وار
عروج پیکر خاکی کو وہ بھی پا نہ سکے
عجب نہیں کہ وہاں اک قدم میں پہنچا ہوں
جہاں کہ حضرت جبریل آپ جا نہ سکے
بشر کے پردے میں جلوہ نما تھے وہ لیکن
ہم عالم بشریت سے آگے جا نہ سکے
طریق فقر میں کافر ہے وہ خدا کی قسم
جو اپنی ہستی موبہوم کو مٹا نہ سکے
ادب نہ ہوتا جو حاکم تو ہم گزر جاتے
اسی مقام سے آگے جہاں کہ جا نہ سکے
اٹھایا ہے تو ہمیں نے بعد نیاز سعید
وہ بار غم کہ فرشتے جسے اٹھا نہ سکے

غزل

محبت کو سراپا حسن پہنائی سمجھتے ہیں
ہمیں ہیں جو کچھ اپنی فتنہ سامانی سمجھتے ہیں
نہ ہو بیا تو جینا سخت ناوانی سمجھتے ہیں
جو مٹتے ہیں یہیں، دنیا کو وہ فانی سمجھتے ہیں
نگاہ شوق پر سب کو گماں ہے بے زبانی کا
مگر وہ عشق کی باتیں بہ آسانی سمجھتے ہیں
یہ دنیا اور تیرے درد سے نا آشنا دنیا
یہ آبادی نہیں ہم اس کو ویرانی سمجھتے ہیں
بیت باریک پردے ہیں تبسم کے ترنم کے
مگر ہم اضطراب دل کی عریانی سمجھتے ہیں
چلی جاتی ہے بحر زندگی میں عشق کی کشتی
سکوں سے ہے غرض ہم کو نہ طغیانی سمجھتے ہیں
خدا محفوظ رکھے میکدے کی رسم مستی کو
یہیں کچھ عاقلوں کی لوگ ناوانی سمجھتے ہیں
بیت پردے میں ہے ہر چند تیری میکھی صہبا
مگر اہل نظر چہرے کی تابانی سمجھتے ہیں

ابنت اثیہ

انسان چاہے جس قدر باصلاحیت اور خوب صورت ہو، اسی وقت تک وہ کارآمد ہے جب تک اس کے جسم اور اس کی روح دونوں میں اتفاق و اتحاد ہے۔ اگر روح نے جسم سے اپنا رشتہ توڑ لیا تو اب اس کا شمار انسانوں میں نہیں کیا جائے گا۔ یوں ہی اگر انسان کی روح اور اس کے جسم میں اتفاق و اتحاد ہو مگر جسم کسی عارضے کی وجہ سے لاغر اور کم زور ہو چکا ہو، حرکت کی سکت بھی باقی نہ ہو، اپنے روزمرہ کے معمولات کو بھی انجام نہ دے پاتا ہو تو ایسا شخص انسانوں کی صف میں شمار تو کیا جائے گا مگر ایسا انسان کسی کام کا نہیں ہوگا۔ معلوم ہوا کہ روح اپنے ظاہری اور خارجی وجود میں جسم کی محتاج ہے اور جسم اپنی حقیقت و ماہیت میں روح کا حاجت مند ہے۔

شریعت اور طریقت کا رشتہ بھی روح اور جسم ہی کی طرح ہے۔ طریقت بے شریعت کے ناقص ہے اور شریعت بغیر طریقت کے ناقص۔ بقول حضرت شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صغومی مدظلہ العالی:

بے شریعت کے طریقت ہے حرام

بے طریقت کے شریعت ناقص

شریعت نام ہے جسم کا اور طریقت نام ہے روح کا۔ ان دونوں میں سے کسی ایک کو بھی نظر انداز کیا گیا تو یہ عمل غیر دانش مندانہ ہوگا۔ ان دونوں کی صحت کے ساتھ زندگی بسر کرنا ہی اصل زندگی ہے۔ شریعت بغیر طریقت کے ریا ہے اور طریقت بغیر شریعت کے منافقت اور ہدایتی ہے اور ان دونوں کی حفاظت کرنا اور ان دونوں طریقوں کے مطابق اپنی زندگی بسر کرنے کا نام ہی تصوف ہے۔ صوفیہ اسلام نے اسی تصوف کی تبلیغ و اشاعت کی ہے اور کر رہے ہیں۔

احوال

”الاحسان“ تصوف اور اہل تصوف کا علمی، فکری اور دعوتی ترجمان ہے۔ اس کے ذریعے تزکیہ و احسان کے قرآنی اور حدیثی نظریات کو افراط و تفریط سے بچاتے ہوئے صالح تحقیقی معیار کے مطابق موافقین و حاملین تصوف کے ساتھ متکثرین تصوف اور اہل قدین تصوف تک پہنچایا، اس کی اشاعت کا خاص مقصد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ”الاحسان“ موافقین و مخالفین دونوں کے دروول کو صرف سنتا ہی نہیں بلکہ اس کو دوسروں تک پہنچانے کی سعی بھی کرتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ”الاحسان“ تصوف کے تعلق سے مختلف نقطہ نظر کے حاملین کے لیے علمی و تحقیقی اور منجیدہ مکالمے کی راہ فراہم کرتا ہے۔ اصحاب علم اپنے نظریات و خیالات کو علمی اسلوب میں بے لاگ انداز سے پیش کرتے ہیں اور فراخ دلی کے ساتھ دوسروں کی باتیں سنتے ہیں۔ تصوف یہی سکھاتا بھی ہے۔ تصوف نام ہے ایک ایسے آلے کا جو انسان کے سامنے اس کے اپنے عیب و ہنر کو ظاہر کرتا ہے اور دل و دماغ کو حق قبول کرنے کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ امید ہے کہ ”الاحسان“ کے ذریعے بہت سارے نظری بے سرنگوں ہوں گے اور بہت سارے صالح خیالات و نظریات اہل علم و دانش کے دل و دماغ میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوں گے۔

الاحسان کا تیسرا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ پچھلے دونوں شماروں کی طرح اس شمارے کو بھی حتی الوسع بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس بار کئی نئے چہرے اپنے نئے افکار و پیغامات کے ساتھ آپ کے روبرو ہیں۔ جناب محمد ساحل سعیدی (سرحدیت سنگھ) اور مہترہ رابعہ خاتون (رتنی) کے سفر ایمان کی داستان، ایمان افروز بھی ہے اور عبرت آموز بھی۔ تحقیق و تنقید کے کالم میں اس بار مولانا طفیل احمد مصباحی، پروفیسر بدیع الدین صابری، ڈاکٹر ارشاد احمد ساحل، ہسٹری، مولانا ساجد رضا مصباحی اور مولانا وارث مظہری پہلی بار ”الاحسان“ کے مہرے گدے میں حاضر ہوئے ہیں۔ ہم ان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ صدر شعبہ افتاء، جامعہ اشرفیہ مبارک پور مفتی محمد نظام الدین رضوی نے بھی پہلی بار اس مہرے خانہ روحانیت کو شرف بخشا ہے اور بحث و نظر کے کالم کی توقیر بڑھاتی ہے۔ ہمارے پیہم اصرار پر اپنی تمام تر مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی نے بھی بالآخر اس بار شرکت فرما کر ہمارا حوصلہ بڑھایا ہے۔ اسی طرح پہلی بار پروفیسر عبدالحمید اکبر اور مولانا ارشاد عالم نعمانی نے صوفی ادب میں شرکت کے ساتھ اپنی آمد کا احساس دلایا ہے۔ مولانا آزاد یونیورسٹی حیدرآباد سے ڈاکٹر سید علیم اشرف چائسی صاحب بھی پہلی بار ”الاحسان“ میں اپنے طویل مکتوب کے ساتھ جلوہ افروز ہوئے ہیں، جو کئی مقالوں پر بھاری ہے۔ ہم ان سب حضرات کے شکر گزار ہیں۔ ساتھ ہی یہ عرض کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ ”الاحسان“ مناظرے کا نہیں دعوت و اصلاح

اور مکالمے کا پلیٹ فارم ہے۔ اس لیے ہم امید کرتے ہیں کہ مکتوبات کے کالم میں ڈاکٹر سید علیم اشرف چائسی اور دیگر اہل علم کے معروضات کو ہمارے محسن اہل قلم منجیدگی سے لیں گے اور کوشش کریں گے کہ ”الاحسان“ دعوت سے جہاد اور اختلاف سے مخالفت کی طرف گامزن نہ ہو۔

”شنا ساقی“ کے کالم میں ہندوستان کے قدیم دینی و روحانی مرکز، خانقاہ رشیدیہ کے موجودہ مجاہد نشین حضرت مفتی عبید الرحمن رشیدی مدظلہ العالی کا تحریری انٹرویو اور ”خانقاہ رشیدیہ جون پور: تاریخ اور کارنامے“ کے عنوان سے مولانا مجیب الرحمن علی کی تحریر زینت شمار ہے جو اس قدیم خانقاہ کی تاریخ، اہمیت اور دعوتی و تبلیغی خدمات سے آگاہ کرتی ہے۔

اس بار ”زاویہ“ کا کالم طابع دین الہی، امام ربانی، مجدد و الق باقی شیخ احمد سرہندی قدس سرہ کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے لیے خاص ہے۔ اس کالم میں ۶ مقالات شامل ہیں اور ہر مقالہ اپنے موضوع پر اہم اور وسیع ہے۔ پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر یونس مظہر صدیقی، مولانا رفعت رضا نوری، ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی، ڈاکٹر قمر الہدی فریدی اور مولانا امیر رضا مصباحی نے اپنے اپنے عنوان پر گراں قدر تحریریں سپرد قلم کی ہیں۔ آخر الذکر تینوں اہل قلم بھی ”الاحسان“ کے لیے نئے ہیں۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ان کے علمی تعاون کا سلسلہ قائم رہے گا۔

مولانا عبدالحمید نعمانی، پروفیسر اختر الواسع اور پروفیسر یونس مظہر صدیقی ”الاحسان“ ہم کی طرف سے خصوصی تشکر کے مستحق ہیں کہ مذکورہ تینوں حضرات ”الاحسان“ کو پہلے شمارے سے اپنی علمی و فکری اور اصلاحی نگارشات سے مستقل نواز رہے ہیں۔ ہم آئندہ بھی ان کی علمی نوازشات کے امیدوار ہیں۔ اللہ انہیں صحت و سلامتی سے رکھے اور احسان و تزکیہ کی اس علمی، فکری اور دعوتی تحریک کو ان سے تقویت بخشنے۔ آمین!

تصوف کے تعلق سے علامہ ابن جوزی اور شیخ ابن تیمیہ کے خیالات کو پیش کرنے کے بعد مولانا ضیاء الرحمن علی حانظہ ابن قیم کے ذوق تصوف کے ساتھ شریک بزم ہیں۔ گزشتہ دونوں تحریروں کی طرح ان کی یہ تحریر بھی عالمانہ اور جانبدار نہیں کو چونکا دینے والی ہے۔ اس بار مختلف اسباب کے تحت ”حاصل مطالعہ“ کا کالم حذف کرنا پڑا۔ مجموعی طور پر ادارہ ”الاحسان“ نے تیسرے شمارے کو نیا وہ سے زیادہ علمی اور معلوماتی بنانے اور اغلاط سے پاک رکھنے کی کوشش کی ہے۔ ادارہ اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہے، اس کا فیصلہ آپ قارئین کے حوالے ہے۔ ویسے یہ شمارہ اور بھی وسیع ہوتا اگر ہمیں وہ مقالات مل جاتے جن کو حاصل کرنے میں ہم اپنی توقع اور اصرار مسلسل کے باوجود ناکام رہے۔ ظاہر ہے قلم کاروں کی شدید مصروفیت یا ہمارے خلوص میں کمی کے سوا اس کی وجہ اور کیا ہوگی!

نا سچائی ہوگی اگر ہم اپنے تمام قلم کاروں کا شکریہ ادا نہ کریں جنہوں نے اپنا قیمتی وقت صرف کیا اور اپنے علمی، تحقیقی اور تنقیدی مقالات و مکتوبات سے نواز کر ہمارا تحریری و علمی تعاون کیا۔ بہت افسوس کے ساتھ یہ بات بھی عرض ہے کہ اس وقت جب ہم ”الاحسان“ کا تیسرا شمارہ پیش کر رہے ہیں اور وہ اپنا ایک اہم قلم کار رکھو چکا ہے جس کی تحریر ادارہ کو سب سے پہلے موصول ہوا کرتی تھی۔ تیسرے شمارے کے لیے بھی ان کی خدمت میں دُعا و دعا پیش کیا جا چکا تھا، امید تھی کہ ان کی تحریر بھی جلد ہی موصول ہو جائے گی کہ اچانک یہ خبر ملی کہ حضرت علامہ شاہ شتیاق عالم قنیا شہبازی زہیب آستانہ عالیہ شہبازیہ بھاگل پور بہار، اس دار فانی کو الوداع کہہ کر اپنے محبوب حقیقی سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ادارہ ”الاحسان“ کو شدید صدمہ ہوا، اللہ ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے اہل و عیال، خولیش و قارب اور مریدین و متوسلین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ (آمین!)

آخر میں ادارہ ”الاحسان“ اپنے سرپرست اعلیٰ داعی اسلام شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی کی بارگاہ میں خراج عقیدت پیش کرنا اپنے لیے باعث افتخار خیال کرتا ہے جن کی سرپرستی میں ”الاحسان“ جیسا تحقیقی اور علمی رسالہ پیش کرنے میں ہم کامیاب ہو رہے ہیں۔ دعا ہے کہ مولیٰ تعالیٰ ان کی قیامت و تربیت میں علمی تصوف کی تہج سے عملی تصوف کی تعمیل تک ہم سب کی رسائی فرمائے اور ہمارے سروں پر ان کے سایہ عاطفت کو ہمیشہ قائم رکھے۔ (آمین!)

محمد معین مصطفیٰ

وارثیات

تصوف اپنے حامیوں کے بقول تصوف قرآنی ”تزکیہ“ اور تعبیر حدیث ”احسان“ کے ہم معنی ہے اور اپنے مخالفین کی نظر میں عجم کی پیداوار، فلسفہ و پیدائش کی صوفیانہ تعبیر اور ایک غیر اسلامی طرز فکر و عمل ہے۔ یہ بات ایک عرصے سے کہی جا رہی ہے۔ دونوں طرف اپنی بات کی صداقت پر اصرار و اترا سے کیا جاتا رہا ہے، مناظر انداز میں بھی اور جارحانہ و افتداز انداز میں بھی۔ یہ گفتگو ابھی مزید جاری رہنی چاہیے، فقط انداز بدل کر، اب اس کا انداز نہ تو مناظرانہ ہونا چاہیے اور نہ ہی جارحانہ بلکہ یہ بحث مکالمے کی شکل میں آگے بڑھ سکتی ہے۔ مکالمہ موجودہ بحثی معاشرے کی ضرورت ہے۔ مکالمہ صرف بولنا نہیں سکھاتا، سننا بھی سکھاتا ہے۔ ہمارے بیشتر مسائل حل ہونے کی بجائے پیچیدہ اس لیے ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اپنی بات کہنے کا فن تو آتا ہے، دوسرے کی بات سننے کا ہنر نہیں آتا۔ ”الاحسان“ کا پہلا شمارہ آج سے دو سال پہلے ۲۰۱۰ء میں آیا تھا اور اس میں اس کے دیگر مقاصد کے ساتھ یہ بات بھی کہی گئی تھی کہ ”الاحسان“ دراصل تصوف پر مختلف نقطہ نظر رکھنے والے اہل علم کے لیے ایک مکالمے کی میز کی طرح ہے جہاں ہر کوئی شائستگی کے ساتھ اپنی بات کہہ سکے گا اور دوسرے کی بات سن سکے گا۔ ”الاحسان“ کے گزشتہ دونوں شمارے اس بات کی شہادت ہیں کہ اس کو اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیابی ملی ہے، لیکن تصوف کے حوالے سے جس وسیع سطح پر غلط فہمیاں پھیلانی گئی ہیں اور تصوف کے نام پر جن کثیر گمراہیوں کا بازار گرم ہے ان کی اصلاح و قزلے کے لیے اور تصوف کے حامیوں اور مخالفوں کو جاوہر اعتدال پر لانے کے لیے ابھی اس سلسلے کو مزید جاری رکھنا ہوگا، پوری توانائی کے ساتھ، تحمل کے ساتھ، عیست کے ساتھ اور توسع و تنگ نظر کے ساتھ، ایک طویل مدت تک۔

شریعت و طریقت میں نسبت کیا ہے؟ ماضی میں اس پر طویل بحثیں ہو چکی ہیں۔ یہ بحث آج بھی جاری ہے۔ اس کا بڑا سہ اصغر تکیہ سب نے اس پر اظہار خیال کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ اس نسبت کو بیان کرتے ہوئے باطنیت زدہ افراد نے شریعت کی اہمیت کو کم ثابت کرنے کی پر زور کوشش کی ہے جب کہ ظاہر پرستوں نے شریعت اور طریقت کو اس طور پر دیکھا ہے کہ جیسے شریعت پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیا ہوا نظام ہو اور طریقت بعد کے اووار میں صوفیہ کا ایجاد کردہ نظام۔ کسی نے شریعت کو کل کہا اور طریقت کو جز کہا تو کسی نے شریعت کو قشر اور طریقت کو مغز بتایا اور کسی نے شریعت اور طریقت دونوں کو دین کا جز بتایا اور دین کا ایک کل نظام قرار دیا۔ یہ اور اس طرح کے اختلافات میں بعض اختلافات وہ ہیں جو واقعی ہیں اور بعض لفظی اور تعبیری ہیں۔ اس حوالے سے حیرت اس وقت ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ تصوف کے بڑے بڑے محققین کا تصور بھی واضح نہیں ہے۔ وہ ان اختلافات کو صحیح طور سے نہیں سمجھ پاتے اور جہاں اختلاف لفظ و تعبیر کا ہوتا ہے اس کو واقعی سمجھ لیتے ہیں اور جہاں واقعی اختلاف ہوتا ہے وہاں اسے تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔

در اصل شریعت کا اطلاق الگ الگ دو معنوں پر کیا جاتا ہے۔ کبھی شریعت سے اسلام کا پورا نظام دین مراد ہوتا ہے۔ اس وقت طریقت اس کا ایک جز ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے جس طرح ایمانیات اور تقویات، عقائد و اعمال سب شریعت اسلامی کے اجزا ہیں اسی طرح طریقت بھی شریعت کا ایک جز ہے، جو عقائد و اعمال میں حسن اور اخلاص کی بات کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح ایمان لانا اور نیک عمل کرنا شریعت کی تعلیمات کا حصہ ہیں، اسی طرح ایمان میں اخلاص اور عمل میں احسان لانے کی جو تدابیر ہیں یہ سب بھی شریعت کی تعلیمات کا ہی حصہ ہیں۔

کبھی شریعت بول کر اسلام کے ظاہری یا فقہی احکام مراد لیتے ہیں۔ اس وقت شریعت اور طریقت دونوں دین کا حصہ ہوتے ہیں اور آپس میں اسی طرح الگ الگ ہوتے ہیں جس طرح شریعت / فقہ اسلامی اور عقائد / مسائل کلام، دین کا حصہ ہوتے ہوئے بھی آپس میں الگ الگ ہیں اور دونوں کی الگ الگ اپنی اہمیت ہے۔ یہ بات مزید آسانی کے ساتھ اس وقت سمجھ میں آئے گی جب ہم حدیث جبریل کو اپنے سامنے رکھیں جس میں ایمان، اسلام اور احسان کی الگ الگ تشریح کی گئی ہے اور تینوں کے مجموعے پر لفظ ”دین“ کا اطلاق کیا گیا ہے۔

شریعت پہلے اطلاق میں کل ہے اور طریقت اس کا جز ہے، جب کہ دوسرے اطلاق میں دونوں باہم تقسیم ہیں اور یہ دونوں بشمول عقائد کے، دین کا حصہ ہیں اور تینوں کا مجموعہ دین ہے اور تینوں کی اہمیت اس طور سے ہے کہ ایمان (عقائد قبول کرنے) کے بعد بندہ وائرہ اسلام میں داخل

ہوتا ہے، اسلام (شریعت کی پابندی) کے بعد عام نگاہوں میں وہ ایک نیک مسلمان بنتا ہے اور احسان (طریقت) کے بعد وہ عبداللہ مومن و مسلم ہوتا ہے اور درجات کا مستحق قرار پاتا ہے۔ اسی اعتبار سے طریقت کو عین شریعت، یعنی حاصل شریعت، مغز شریعت اور مطلوب شریعت کہا جاسکتا ہے۔ طریقت کا تقاضا یہ ہے کہ شریعت کی پابندی تمام و کمال اور باحسن و جوہ کی جائے تاکہ رضاے مولیٰ حاصل ہو۔ جو لوگ شریعت کی پابندی کے بغیر طریقت کا تصور رکھتے ہیں یا طریقت کو شریعت کے بالقابل ایک متوازی نظام (Parallel System) کے طور پر دیکھتے ہیں وہ تصور دین سے نا آشنا سخت گم رہی کا شکار ہیں۔

تصوف عمل سے علم، علم سے فن اور فن سے فلسفہ: مختلف مدارج طے کر چکا ہے۔ اس کے اندر بڑی وسعت، ہمہ گیریت، رنگارنگی، بحیریت اور ہمہ جہتیت و آفاقیت پیدا ہو چکی ہے۔ اس کی اتنی جہات ہیں، تصوف کے نام پر ایسے ایسے بت تراشے گئے ہیں، اس کے مسائل میں اس قدر تنوع و تکثر پیدا ہوا ہے کہ یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے کسی بھی شخص پر تصوف کے حامی یا مخالف ہونے کا لیبل لگانا بڑا مشکل ہے۔ آج کسی کو اس اصطلاح سے اختلاف ہے، کوئی اسے قرآنی وحدہ شی تعبیر تک درست مانتا ہے، کوئی اسے صرف عملی اور شخصی و داخلی کیفیت تک محدود کرتا ہے، کسی کو تصوف سے تو یہ نہیں مگر فلسفہ تصوف سے خدا واسطے پیر ہے، بعض وہ لوگ ہیں جو یہ سب کچھ تسلیم کرتے ہیں لیکن تصوف کی اس شکل کے منکر ہیں جو گریز، رہبانیت اور ترک دنیا سے متعلق ہے۔ بعض افراد کو یہ سب بھی تسلیم ہے لیکن تصوف کے نام پر جو آج دکان داری چل رہی ہے، وہ اس کے خلاف ہیں، ان تمام پہلوؤں کو دیکھتے ہوئے کسی بھی شخص کو تصوف کا حامی یا مخالف کہنا ایک مبہم بات ہے۔ آج تصوف پر کھل کر بات کرنے کی ضرورت ہے۔ صرف یہ کہہ دینا کہ فلاں شخص تصوف کا مخالف ہے، کلی انصاف نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ اسے تصوف سے اختلاف ہے تو کس جہت سے ہے۔

ابن جوزی، ابن تیمیہ اور ابن قیم، تصوف کے مخالفین میں بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ایک طبقہ وہ ہے جو ان کو بالکل مسترد کرتا ہے، اس خیال میں کہ یہ حضرات تصوف کے مخالف ہیں اور ایک دوسرا طبقہ وہ ہے جو بالکل تصوف کو مسترد کرتا ہے، اس خیال میں کہ وہ ان شخصیات کو اپنے لیے آمیزیل تصور کرتا ہے اور انہیں مخالف تصوف سمجھتا ہے۔ میرے دوست اور ”الاحسان“ کے شریک مرتب مولانا ضیاء الرحمن عظمیٰ نے مذکورہ بالا اصول کے تحت کہ کسی کو کئی طور پر تصوف کا حامی

کہنیا کلی طور پر تصوف کا مخالف کہنا ایک غیر منصفانہ اور غیر واضح بات ہے، ان تینوں شخصیات کے تصوف و احسان سے متعلق افکار کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کیا اور وہ بات لکھی جو ان کے اپنے مطالعہ و تحقیق سے ثابت ہوئی۔ ان کی تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ مذکورہ تینوں شخصیتیں نہ تصوف کو کلی طور پر مسترد کرتی ہیں اور نہ ہی کلی طور پر قبول کرتی ہیں۔ وہ تصوف کے بعض پہلوؤں کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ ان پر عامل بھی ہیں، البتہ بعض امور میں انہیں اختلاف رائے ہے اور وہ دلائل کی بنیاد پر ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ تفصیل کے لیے مولانا کی تینوں تحریریں دیکھی جاسکتی ہیں۔

مولانا ضیاء الرحمن کی تحقیق اس طبقے کے لیے موت کا پیغام ہے جو تصوف کو کلی طور پر مسترد کرتا ہے، یہ کہتے ہوئے کہ ہمارے آئیڈیل علماء اس کے مخالف ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب یہ ثابت ہو گیا کہ مذکورہ تینوں علماء تصوف کے کلی مخالف نہیں ہیں تو اب ان کی ہم نوائی کا دم بھرتے ہوئے تصوف کو کلی طور سے مسترد کرنا ممکن نہیں رہا۔ ہمیں خوشی ہے کہ اس حوالے سے تحریر بہت موثر و مفید ثابت ہوئی ہے۔ کچھ بت بھی گرے ہیں، کچھ میں ابھی لرزش ہے، یہ بحث یوں ہی جاری رہی تو ان شاء اللہ اس کے دور رس اثرات مرتب ہوں گے اور تصوف کے تعلق سے ایک طرف غلط بیانی اور ہوا خیزی کا ماحول کم ہوگا۔

ضیاء الرحمن صاحب کی تحقیق اس طبقے کے لیے سراپا مسرت اور شادمانی رہی جو تصوف کے تو حامی ہیں مگر مذکورہ بالا علماء کو تصوف مخالف سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب کسی کو یہ معلوم ہو کہ ہمارا مخالف بھی ہماری بات سے کسی حد تک اتفاق رکھتا ہے تو اس کا خوش ہونا تو فطری ہے ہی۔ مگر اس حوالے سے ایک افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے بعض تصوف نواز احباب کو ہم سے شکایت ہے کہ ان علماء کو اس رسالے میں کوڑیج کیوں دیا گیا ہے اور اگر دیا گیا تو ان کا ردِ تبلیغ کیوں نہیں کیا گیا؟ ہمیں ایسے مخلصوں سے ہم دردی ہے۔ ان حضرات نے یا تو ضیاء صاحب کی تحقیقات کا مطالعہ نہیں کیا ہے، یا مطالعہ کیا ہے تو اسے کلی طور سے سمجھا نہیں ہے، یا سمجھا ہے لیکن اس تحقیق کے جو مثبت اثرات ہیں وہ ان سے بے خبر ہیں، یا وہ اپنے مخالفین کی مخالفت میں اس حد تک بڑھے ہوئے ہیں کہ انہیں اپنے مخالف کے منہ سے اپنی حمایت میں بھی کچھ سننا کوارا نہیں ہے۔

شیخ یوسف القرضاوی موجودہ اسلامی علمی دنیا کا ایک متعارف نام ہے۔ موصوف کا ایک انٹرویو کسی عربی جریہ سے میں نے پڑھا تھا جس میں ان کے اس بیان کو شہ سرفی بنایا گیا تھا:

”ہماری دعوت یہ ہے کہ صوفی سلفی بن جائیں اور سلفی صوفی بن جائیں۔“

”ندعو الی تصوف السلفیة وتسلیف الصوفیة۔“

موصوف کا اس سے اپنا مقصود کیا ہے، یہ وہ جانیں، اس کا جو بہتر مفہوم اور اچھی تاویل

میرے ذہن میں آئی وہ یہ ہے کہ عصر حاضر میں اہل سنت و جماعت سے اپنا انتساب کرنے والے دو گروپ میں بیٹھ ہوئے ہیں۔ ایک بڑی جماعت ہے، جسے صوفی کہا جاتا ہے جب کہ اس کے بالفاظ ایک چھوٹا سا گروہ ہے جو خود کو سلفی اور اس کے مخالف اسے وہابی کہتے ہیں اور یہ خود جماعت صوفیہ کو بدعتی کہتا ہے۔ صوفیہ یا جہز بد و پارسائی، رواداری اور زندہ دلی بالعموم تحقیقات کی بجائے روایات پر اور نصوص کی بجائے ملفوظات پر ارتکاز کیے ہوئے ہیں، جب کہ سلفی حضرات ظوہر نصوص کو تھامے ہوئے ہیں، ان کے دل سخت ہیں اور دماغ پراسرار و تشدد و سوار ہے۔ ایسے میں قرضادی صاحب یہ چاہتے ہیں کہ سلفی لفظوں کی تفصیل سے آگے بڑھ کر معانی کے قلعے میں انہیں اور دماغ کی زرخیزی کے ساتھ قلب کی شادمانی پیدا کریں، عقل کی روشنی کے ساتھ عشق کی مہربانی سے استفادہ کریں اور دوسری طرف صوفی حضرات روایات کے ساتھ اسانید کی طرف بھی متوجہ ہوں، شب زندہ داری کی اہمیت مسلم ہے مگر یہ عمل اگر علم کی روشنی کے بغیر کیا گیا تو گمراہی میں دور تک نکل جانے کا اندیشہ ہے۔ دل کے ساتھ عقل کی پاسبانی اور طریقت کے ساتھ شریعت کی ناگزیریت سے کسے انکار ہو سکتا ہے؟

اگر قرضادی صاحب کا اپنی دعوت سے مقصود یہی ہے تو ان کے ساتھ اتفاق کیا جانا چاہیے۔ کیوں کہ عصر حاضر کا جبری تقاضا ہے کہ صوفیانہ بصیرت کے ساتھ محض نہ بصارت بھی ہو، موجودہ عہد کے علماء صوفی القلب اور فقہانہ النظر ہو گئے تو وین و دنیا کے سارے معرکے مرہوس ہو سکتے ہیں۔ اس سے آخرت بھی آبا و ہوگی اور دنیا بھی شاداب ہوگی۔ یہی رویہ عصر حاضر کے علمی و روحانی تقاضوں کے مطابق بھی ہے اور اصلاح فکر و عمل، امتحان و بین المسلمین اور صلاح دین و قلاج دنیا کے لیے ضمانت بھی۔

تصوف اپنی اصل کے اعتبار سے اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر میں الاحسان ہے۔ الاحسان بارگاہ خداوندی میں حضوری کی کیفیت ہے جس کی تشریح ان تعبد اللہ کاذک تراہ وان لم تکن تراہ ظاہر براءک سے کی گئی ہے، یعنی:

”عبادت اس کیفیت کے ساتھ کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو، اور اگر یہ کیفیت نہ ہو تو کم از کم یہ کیفیت ضرور ہو کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔“

یہ مقام، ایمان، یعنی عقائد اسلامی کو قبول کرنے، اسلام، یعنی اعمال اسلامی کے بجالانے کے بعد کا ہے۔ تصوف اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ عقائد اسلامی کو قبول کر لینے کے بعد اسلامی احکام کا اتباع کیے جانا، عرف اتقائے کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ ہی بھی ضروری ہے کہ ہم نے اول مرحلہ میں جس جامع صفات خدا کے وجود کو تسلیم کیا ہے اسے احکام اسلامی اور اعمال شریعت

انجام دیتے وقت ہمہ وقت یاد رکھیں۔ اس کے تصور سے لمحہ بھر بھی غافل نہ ہوں تاکہ ہمارے اعمال میں حسن و اخلاص پیدا ہو اور وہ احسن طور پر انجام پائیں۔ گویا تصوف اپنی اصل کے اعتبار سے نیت میں حسن و اخلاص اور عمل میں کمال و احسنیت کا تقاضا کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد میں حسن نیت اور حسن عمل کے سوا سب کچھ ہے۔ ہماری دنیا میں جو کچھ بھی بگاڑے اس کی بنیاد ہی وہی یہی ہے کہ ہمارے عقائد و اعمال سے اخلاص اور حسن نیت مفقود ہو گئے ہیں۔ اگر اس صحیح مفقود کو حاصل کر لیا گیا تو ہمارے تمام مسائل ہی حد تک از خود حل ہو جائیں گے۔ اس طرح حقیقی تصوف کی بازیابی اپنے آپ میں معاصر دنیا کے تمام مسائل کا حل ہے۔

ترتیب کے لحاظ سے الاحسان یا تصوف کا نمبر ایمان اور اسلام کے بعد آتا ہے؛ لیکن صوفیہ کرام نے اپنی حکیمانہ دعوت میں اس ترتیب کو پلٹ دیا اور ایمان و اسلام کی تفصیلات اور کلام و فقہ کے دقائق اور مغالطات کو پیش کرتے کی بجائے سب سے پہلے نیت کی اصلاح اور دلوں کے تزکیے کی طرف متوجہ ہوئے۔ چونکہ صورت حال یہ تھی کہ لوگوں کے پاس علم الکتاب بھی تھا اور حکمت و بصیرت بھی تھی لیکن دنیاوی اغراض نے نیتوں کو فاسد کر دیا تھا۔ اس لیے اصل کام نیتوں کی اصلاح اور دلوں کے تزکیے کا تھا جس فریضے کو بحسن و خوبی صوفیہ کرام نے انجام دیا۔ یہ کام عملی طور پر بھی آسان اور موثر تھا، کیوں کہ اگر کسی کو ایمان کی دعوت دی جائے اور اس کو کہا جائے کہ اپنے عقیدے کو اس طور پر کر لو جس طرح ہمارا ہے تو وہ آسانی کے ساتھ اپنے عقائد و تصورات کو غلط تسلیم نہیں کرے گا اور نہ ہی ان سے تائب ہوگا۔ اگر ارکان اسلام؛ نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ کے مسائل بتائیں تو اس میں بھی فقہاء کے اختلافات ہیں اور مخاطب مناظرہ بازمی پر اتر سکتا ہے۔ اسی لیے صوفیہ نے پہلے مرحلے میں تیسرے مرحلے کا کام کیا۔ دلوں میں خوف خدا پیدا کیا، نیتوں میں اخلاص کے جوت جگائے جس کے بعد انسان فطری طور پر بحث و جدال کی بجائے اصلاح حال کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اخلاص کے ساتھ فکر و عمل کے لیے اس راہ کو اختیار کرتا ہے جس کی صداقت پر اس کا دل گواہی دیتا ہے۔ جہاں فکر و عمل میں اصلاح و انقلاب کے لیے صوفیہ کا یہ اسلوب ماضی میں بے پناہ موثر ثابت ہوا اور آج بھی اگر اس اسلوب کو ہم اختیار کرتے ہیں تو اس کے بے پناہ ثمرات حاصل ہوں گے۔ عصر حاضر کو اس اسلوب دعوت کی ضرورت ہے۔

تصوف کی روح اور تصوف و صوفیہ کا مقصود و احسان ہے؛ جسے تزکیہ قلب، اصلاح نفس، اخلاص نیت، کیفیت حضور کی اور اسی طرح کے دوسرے نام بھی دیے جاسکتے ہیں۔ بعد کے اوار

میں صوفیہ نے اس مقصود کو حاصل کرنے کے لیے جو روح و دین اور عین شریعت ہے، اپنے اپنے زمانے میں مختلف طریقے، رسوم، مجاہدے، ریاضتیں اور قیام وضع کیے جو فی الجملہ سب کے سب تصوف کا حصہ اور قلب میں روح و دین کو جائز کرنے کے موثر تدابیر ہیں، لیکن اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ ان سب کا تعلق تصوف سے ثانوی ہے، اولین نہیں ہے۔ اس امر کو ملحوظ رکھا جائے تو کئی فوائد حاصل ہوں گے۔ مثلاً:

۱۔ رسوم تصوف میں الجھ کر حقیقت تصوف سے غافل نہ ہوں گے اور اصل و فرع کی تمیز ہمیں ہر غلط فہمی و گم راہی سے محفوظ رکھے گی۔

۲۔ ہماری شریعت، شریعت سے الگ نہ ہوگی، جیسا کہ موجودہ بیشتر مدعیان شریعت کا حال ہے، بلکہ شریعت کی اکمل اور احسن صورت ہوگی، جو ہمارے اکابر صوفیہ کے یہاں ملتی ہے۔

۳۔ رسوم تصوف، حقیقت تصوف تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔ اس لیے عصر حاضر میں ان رسوم کی پابندی کریں گے جو عصری تقاضوں کے مطابق حقیقت تصوف تک رسائی کا ذریعہ ہیں۔ بلکہ اگر عصری تقاضوں کے مطابق کچھ نئی رسموں کی وضع کی ضرورت پڑے جن سے حقیقت تصوف کا حصول ممکن ہو تو ان کی وضع پر بھی غور کریں گے اور خواہی نہ خواہی رسموں کی پابندی کو اپنے اوپر اس طرح لازم نہیں کر لیں گے کہ وہ اصل پر غالب آجائیں اور ہماری حالت یہ ہو جائے کہ روح تصوف چائے تو چائے رسوم تصوف ترک ہونے نہ پائیں، جیسا کہ اکثر اس کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔

۴۔ جو بعض رسوم تصوف کا مخالف ہو، اسے تصوف کا مخالف سمجھتے اور جو رسوم تصوف کے التزام کے ساتھ حقیقت تصوف سے بے بہرہ ہو، اسے تصوف کا موافق سمجھنے کی غلطی سے ہم محفوظ رہیں گے۔

۵۔ اس سے تصوف کی تبلیغ و اشاعت میں آسانی پیدا ہوگی۔ عصر حاضر روح تصوف کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔ اگر ہم نے رسموں پر زیادہ اصرار کیا تو شاید تصوف کی تبلیغ و ترسیل میں ہم خود رکاوٹ بنیں گے۔

اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم حقیقت تصوف، فلسفہ تصوف اور رسوم تصوف کے فرق کو سمجھیں اور اس فرق کے جو تقاضے ہیں، انہیں ملحوظ رکھیں۔

ضمیمہ (۱) عصر حاضر میں

شیخ ابونصر سراج
ترجمہ: سعید اسرار بخاری

بادہ کہنہ

صوفیہ کی نظر میں فقہ اور فقہاء

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جسے اللہ تعالیٰ بھلائی سے نوازا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا فرماتا ہے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فقیہ کی تعریف بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”فقہ دنیا سے دل نہ لگانے والے، آخرت کو چاہنے والے اور امور دین میں بصیرت رکھنے والے کو کہتے ہیں۔ قول باری تعالیٰ ہے: فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِنْهُمْ طَائِفَةٌ لِيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ. (تو کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکلے کہ دین کی سمجھ حاصل کرے۔)

مذکورہ آیت مبارکہ میں لفظ دین ظاہری و باطنی احکامات سے عبارت ہے۔ اسی بنیاد پر ہم یہ کہتے ہیں کہ احوال و مقامات سلوک کے احکامات و معانی کی سمجھ حاصل کرنا؛ طلاق، طہارہ، قصاص، حدود و اورغلاموں کو آزاد کرتے جیسے مسائل جان لینے اور سمجھ لینے سے کسی طرح کم فائدہ مند نہیں۔ یہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ احکام ظاہری سے متعلق مسائل سمجھنے کی ضرورت اس قدر نہیں پڑتی جس قدر باطنی احکامات کے مسائل کی۔ کیوں کہ ظاہری احکامات کے مسائل ہر وقت پیش نہیں آتے بلکہ جب بھی اس طرح کی کوئی صورت واقع ہو تو کسی فقیہ سے اس کے بارے میں پوچھ لیا جاتا ہے اور اس طرح اس مسئلے کے پھر واقع ہونے کے بعد سوال کرنے والا اس سے بری الذمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن باطنی احکامات، احوال و مقامات سلوک کا جاننا عمر کے ہر حصے میں ہمہ وقت تمام مسلمانوں پر فرض ہے۔ جیسے صدق، اخلاص، ذکر الہی اور ترک غفلت جیسے احوال کو اختیار کرنے کے لیے کوئی معین وقت نہیں، بلکہ بندے پر ہر لمحہ یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ ان پر عمل پیرا رہے۔ صوفیہ کرام ان احوال و مقامات سے کامل آگاہی رکھتے ہیں اور اس کی جملہ تفصیلات بیان کرتے پرقا و رہتے ہیں۔

بندے کو اس بات کا علم رکھنا چاہیے کہ اس کا ارادہ و خیال کیا ہے؟ اگر وہ حقوق سے تعلق

رکتا ہو تو اسے پورا کرے اور کسی خواہش نفس سے متعلق ہو تو اسے ترک کرے۔ جیسا کہ رب کائنات جل جلالہ نے فخر رسل سید الکونین علیہ الخیرہ والسلام سے خطاب فرمایا: وَلَا تَطْعَمَنْ مِنْ غَفْلَتِكَ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبِعْ هَوَاكَ وَكَانَ امْرُؤُا فَرُطًا (اور اس کا کہنا نہ مانوس جس کا دل ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے چلا اور اس کا کام حد سے گزر گیا۔)

الغرض مذکورہ بالا احوال کا تارک وہی ہو سکتا ہے جس کے قلب پر غفلت کی تاریکیاں چھا گئی ہوں۔ موضوعات تصوف کی وسعت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ قرآن و سنت سے جس قدر احکامات تصوف، صوفیہ کرام نے اخذ کیے وہ بہر حال فقہائے کرام کے مستحب احکام سے کہیں بڑھ کر ہوں گے، کیونکہ علم تصوف کی وسعتوں کو محدود نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے راستے لطیف اشارات، دشوار گزار صحراؤں، دل کش خیالات، عطا بخشش کے خزانوں سے بھرے پڑے ہیں، اور اس کا ادراک رکھنے والے ہر آن اہل طلب کی جھولیاں بھر رہے ہیں۔

اس دنیا میں ہر علم کی ایک حد ہے اور یہ حد تصوف پر آخر ختم ہو جاتی ہے، جب کہ تصوف کی حد کسی دوسرے علم پر ختم نہیں ہوتی۔ اس کو کسی دوسرے علم کی احتیاج نہیں۔ اس کا یہ طریق ہے کہ سالک کو اپنے اعلیٰ مدارج کی طرف لے جاتی ہے۔ اس علم کا کوئی کنارہ نہیں، کیونکہ اس کے مقصود کی کوئی حد نہیں اور علم تصوف کا وہ اعلیٰ ترین درجہ جسے علم الفتوح کہتے ہیں، اللہ کی طرف سے اپنے مخصوص بندوں کو ودیعت کیا جاتا ہے، وہ جسے چاہتا ہے اس کے قلب کو اپنے کلام کی سمجھ عطا کر کے اپنے خطاب سے صحیح استنباط کا ملکہ عطا فرماتا ہے۔ ارسا وہوتا ہے:

قل لو كان البحر مددا لكلمات ربى لغدا البحر قبل ان تنفد كلمات ربى ولو جفنا بمنزلة مددا (تم فرما دو، اگر سمندر میرے رب کی باتوں کے لیے سیاحی ہو تو ضرور سمندر ختم ہو جائے گا اور میرے رب کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔ اگر چہ ہم ویسای اور اس کی مدد کو لے آئیں۔)

اور فرمایا: لئن شکرتم لازيدنکم (اگر احسان مانو گے تو میں تمہیں اور دوں گا۔) بندوں پر اس کے فضل خاص کی کوئی نہایت نہیں۔ انہیں ہر حال میں شکر ادا کرتے رہنا چاہیے، کیونکہ شکر ادا کرنا خود اپنی جگہ ایک نعمت ہے اور مستو جب شکر ہے اور اس کے بے پایاں لطف و کرم کا ضامن۔

(کتاب اللع فی التصوف، مترجم، ص: ۴۷، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، سوئیڈن، لاہور، نئی دہلی)

○○○

شیخ علی بن عثمان دہجویری
ترجمہ: سکپتان واحد بخش سعمال جشمینی

شریعت اور حقیقت

یہ دونوں اصطلاحات اس قوم کی ہیں جو شریعت سے ظاہری اعمال کی صحت اور حقیقت سے باطنی احوال کی پچھلی مراد لیتے ہیں۔ شریعت و حقیقت کے متعلق دیگر وہ غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ اول علمائے ظاہر جو شریعت و حقیقت میں فرق نہیں سمجھتے اور یہ کہتے ہیں کہ شریعت خود حقیقت ہے، اور حقیقت شریعت ہے۔ دوسرا اگر وہ ان ٹلڈین کا ہے جو ایک کا دوسری کے بغیر قائم رہنا جائز رکھتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جب حقیقت آشکارا ہو گئی تو شریعت اٹھ گئی۔ یہ عقیدہ فرقہ مشبہہ، قرامطہ، شیعہ اور حشکلیں کا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ شریعت حقیقت سے جدا ہے جیسا کہ ایمان کے لیے زبان کے اقرار سے، دل کی تصدیق جدا ہے۔ ہماری یہ دلیل ہے کہ عمل میں دل کی تصدیق کے لیے زبان سے اقرار ضروری ہے۔

بات یہ ہے کہ صرف دل کی تصدیق سے یعنی زبان کے اقرار کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا اور نہ ہی صرف زبان کے اقرار سے، یعنی بغیر تصدیق قلب، انسان مومن بن سکتا ہے۔ لہذا قول اور تصدیق کے درمیان جو فرق ہے، ظاہر ہے۔ چنانچہ حقیقت وہ چیز ہے جس کا کلمہ ناممکن ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جہان کے فنا ہونے تک حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ مطلق تعالیٰ کی معرفت اور اعمال کی صحت خلوس نیت پر مبنی ہے اور شریعت وہ چیز ہے کہ جس کے ساتھ تہذیب و تعمیر جائز ہے جیسا کہ احکام و اوامر الہی (مثلاً قرآن میں بعض آیات ناسخ اور بعض منسوخ ہیں)۔

پس شریعت بندہ کا فعل ہے اور حقیقت خدا تعالیٰ کی نگہبانی، حفاظت اور عصمت کا نام ہے۔ پس شریعت کا قیام حقیقت کے بغیر محال ہے اور حقیقت کا قائم کرنا شریعت کے بغیر محال ہے۔ مثال کے طور پر ہر شخص روح کے ساتھ زندہ ہے اور جب روح نکل جاتی ہے تو انسان مردہ ہو جاتا ہے۔ روح اور جسم کے اکٹھا ہونے سے انسان زندہ ہے۔ یہی شریعت و حقیقت کا باہمی تعلق

ہے شریعت بغیر حقیقت کے رہا ہے اور حقیقت بغیر شریعت کے منافقت ہے۔ خداوند تعالیٰ کا فرمان ہے: **وَالْمُؤْمِنُونَ جَاهِدُوا لِنَهْضِهِمْ سَبِيلَنَا** (جو لوگ ہماری خاطر جدوجہد کرتے ہیں ہم ان کو اپنی طرف کی راہیں دکھاتے ہیں)۔ اس آیت میں مجاہدہ شریعت ہے اور ہدایت سے مراد حقیقت سے آگاہی ہے۔ شریعت فعل بندہ ہے یعنی اس کے ظاہری اعمال اور حقیقت فعل حق ہے، یعنی باطنی قرب حق کا عطا ہونا ہے۔ بالفاظ دیگر شریعت کا تعلق مکاسب (اعمال) سے ہے اور حقیقت کا تعلق مواہب سے یعنی حق تعالیٰ کے انعامات اور عطیات سے ہے۔

(شرح کشف المحجوب، ص: ۹۰۶، اشاعت: ۱۹۵۷ء، مکتبہ رضویہ، ۵۱، نمیا محل، نئی دہلی ۶)

○○○

شیخ احمد سرحدی
ترجمہ: احسن سعید صفوی

علمائے دنیا اور علمائے آخرت

۳۳۳ او اس مکتوب علمائے سو کی مذمت کے بیان میں ہے جو دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں اور جنہوں نے علم دین کو دنیا کے حصول کا ذریعہ بنا لیا ہے، اور علمائے زاہدین کی مدح میں ہے جو دنیا سے بے رغبت ہیں۔ علمائے دنیا کی محبت اور اس کی جانب رغبت ان کے رخ زیبا پر واضح ہے۔ لوگوں کو اگر چہ ان سے فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن ان کا علم خود ان کے حق میں سودمند نہیں ہوتا۔ یہ بات صحیح ہے کہ ان حضرات سے شریعت کو تائید و تقویت حاصل ہوتی ہے لیکن بسا اوقات اس طرح کی تائید و تقویت تو اہل فجور، ارباب فتنہ و رادین سے غافل لوگوں سے بھی ہوتی ہے، جیسا کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے فاجر شخص سے دین کی تائید کے بارے میں خبر دیتے ہوئے فرمایا: **ان الله ليس يريد هذا الدين بالمرجل الفاجر** (بے شک اللہ تعالیٰ اس دین کو فاجر شخص کے ذریعے تائید و تقویت عطا فرمائے گا)۔ کیا رس کی یہ خصوصیت ہے کہ تائید اور لو با جب اس سے چھو جاتا ہے تو سوتا بن جاتا ہے، جب کہ وہ اپنی ذات میں پتھر ہی رہتا ہے۔ یوں ہی پتھر اور بانس میں جو آگ و دھیت کی ہوئی ہے اس سے لوگ توفیق حاصل کرتے ہیں لیکن خود پتھر اور بانس اپنی اسی پوشیدہ آگ سے محروم رہتے ہیں، بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ ان کے حق میں یہ علم نقصان دہ ہے، اس لیے کہ ان کے علم نے خود ان کے اوپر اتمام حجت کر دیا۔ **ان الله الساس عذابا يوم القيمة عالم لم ينفعه الله بعلمه** (قیامت کے روز سب سے زیادہ عذاب اس عالم کو ہوگا جس کو اس کے علم سے نفع نہیں پہنچا)۔ بھلا وہ علم ان کے لیے ضرر رساں کیسے نہیں ہوگا کہ وہ علم جو اللہ عزوجل کے نزدیک عزت والا اور تمام موجودات میں سب سے زیادہ شرف والا ہے، اس کو ان لوگوں نے سبکین دنیا یعنی مال و جاہ اور دنیا کا ذریعہ بنا لیا ہے، جب کہ حقیقی صورت حال یہ ہے کہ دنیا حق تعالیٰ کے نزدیک ذلیل و خوار اور بدترین مخلوق ہے۔ چنانچہ رب تعالیٰ کے نزدیک معزز چیز کو ذلیل کرنا اور اس کی بارگاہ

میں ذلیل و بے وقعت چیز کو عزت دینا بہت ہی قبیح بات ہے اور درحقیقت حق تعالیٰ سے مقابلہ اور معارضہ کرنا ہے۔ تدریس و امتحان وقت نفع بخش ہوتا ہے جب کہ وہ خالص رب تعالیٰ کی رضا کے لیے ہو اور چاہ و ریاست، مال و رفعت کی محبت کے مقابلے سے پاک ہو، اور اس مقابلے سے پاک ہونے کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے زہد اور دنیا و مافیہا سے بے رغبتی ہو، جو علما اس بلا میں مبتلا ہیں اور اس کمینہ دنیا کی زلف محبت کے اسیر ہیں وہ علمائے دنیا ہیں، علمائے سو، بدترین خلائق اور دین کے چور ہیں، اور حال یہ ہے کہ خود کو یہ لوگ دین کا مقتدا اور مخلوق میں سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔

”وَيَحْسِبُونَ أَنَّهُمْ عَلَىٰ شَيْءٍ أَلَّا أَنَّهُمْ هُمُ الْكَافِرُونَ اسْتَحْذِرُوا عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانَ فَإِنَّهُمْ ذَكَرَ اللَّهُ أَوْلَٰئِكَ حِزْبُ الشَّيْطَانِ أَلَا إِنَّ حِزْبَ الشَّيْطَانِ هُمُ الْخَاسِرُونَ“

(یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ انہوں نے کچھ کیا ہے۔ سن لو یہ جھوٹے ہیں، شیطان نے ان پر غالب آکر ذکر الہی کو بھلا دیا، یہ لوگ شیطان کے گروہ ہیں اور سن لو یقیناً شیطان کا گروہ ہی گھٹاٹے میں ہے۔)

اکابر میں سے کسی نے شیطان ملعون کو دیکھا کہ وہ گمراہ کرنے کی اپنی ذمہ داری سے بالکل مطمئن اور فارغ بیٹھا ہوا ہے، آپ بزرگ نے اس کا راز پوچھا تو اس ملعون نے جواب دیا کہ اس وقت علمائے سواس کام میں ہماری بڑی مدد کر رہے ہیں اور انہوں نے مجھ کو اس ذمہ داری سے فارغ کر دیا ہے۔ بلاشبہ اس زمانے میں شرعی امور میں جو بھی سستی، مدافعت اور دین و ملت کی ترویج و اشاعت میں جو بھی فتور اور کوتاہی پائی جا رہی ہے، یہ سب علمائے سو کی شامت اور ان کی نیتوں کے فساد کی وجہ سے ہے۔ ہاں! وہ علما جو دنیا سے بے رغبت، چاہ و ریاست اور مال و رفعت کی محبت سے آزاد ہیں، وہ لوگ علمائے آخرت ہیں، انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث اور مخلوق میں سب سے بہتر ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے قلم کی سیاہی کو کل قیامت کے دن اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے خون سے ٹولا جائے گا، اور ان کے قلم کی روشنائی شہدائے خون پر غالب آجائے گی۔ حدیث پاک ”نُومُ الْعُلَمَاءِ عِبَادَةٌ“ (علماء کا سونا عبادت ہے۔) انہی لوگوں کے بارے میں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی نگاہوں کو آخرت کا جمال بھا گیا ہے اور دنیا کی قباحت و شامت ان کے مشاہدے میں آگئی ہے۔ انہوں نے دیکھ لیا ہے کہ آخرت کے لیے بقاء ہے اور دنیا کی پیشانی پر زوال کا دھبہ ہے۔ لہذا انہوں نے خود کو باقی کے حوالے کر دیا اور فانی سے منہ موڑ لیا۔ آخرت کی عظمت کا شہو درحقیقت ذات لایزال کی عظمت جلال کے شہو کا ثمرہ ہے۔ دنیا و مافیہا کو ذلیل سمجھنا عظمت آخرت کے مشاہدے کا لازمہ ہے۔ لَٰنَ السُّلَٰمِیْنَ وَالْآخِرَةِ ضَرْبَانِ اِنْ وَضِیْتَ اِحَدَهُمَا مَسْخَطَ الْآخِرَى (اس لیے کہ دنیا اور آخرت دو سوکنوں کی طرح ہیں، اگر ایک خوش ہوگی تو دوسری ناراض ہو جائے گی۔) اگر دنیا عزیز ہوگی تو آخرت خوار ہوگی اور اگر دنیا

خوار ہوگی تو آخرت عزیز ہوگی، ان دونوں کو جمع کرنا دو متضاد چیزوں کو جمع کرنے کی قییل سے ہے۔

مَا أَحْسَنَ الْمَدِينِ وَالْمَدِينَا لَوِ اجْتَمَعَا (وین اور دنیا اگر جمع ہو جائیں تو کیا ہی خوب ہو۔)

ہاں! مشائخ کی ایک جماعت جو اپنے نفس اور اپنے ارادے کی غلامی سے بالکل آزاد و ہوشیار ہے، انہوں نے بعض حقایق نیتوں کے پیش نظر دنیا داروں کی صورت اختیار کی اور بظاہر دنیا کی طرف رغبت دکھائی، لیکن درحقیقت ان کا دنیا سے کوئی تعلق نہیں رہا اور وہ تمام آلائشوں سے پاک رہے۔ رجال لاتلہیہم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ۔ (اللہ کے بندے کچھ ایسے ہیں جنہیں تجارت اور خرید و فروخت، اللہ کے ذکر سے غافل نہیں کرتی۔) تجارت اور خرید و فروخت ان لوگوں کے لیے ذکر الہی سے مانع نہیں ہوتی۔ ان امور سے تعلق رکھتے ہوئے بھی وہ التعلق ہوتے ہیں۔ حضرت خواجہ نقشبند قدس اللہ سرہ نے فرمایا ہے کہ مٹی کے بازار میں ایک تاجر کو میں نے دیکھا کہ اس نے تم و بیش پچاس ہزار دینار کی خرید و فروخت کی لیکن ایک لمحے کے لیے بھی اس کا دل اللہ کی یا سے غافل نہیں ہوا۔

(مکتوبات امام ربانی، ص: ۹۵ تا ۹۷، مطبوعہ سعید کمپنی، کراچی، ۱۹۷۷ء)

○○○

افادات: شیخ ابوسعید احسان اللہ صفوی
ترتیب: حبیب الرحمن علیوی

مقصد حیات انسانی - مقام احسان کا حصول

علم ایک نور ہے۔ اس کی روشنی میں انسان حلال و حرام، جائز و ناجائز اور حق و باطل میں تمیز کرتا ہے۔ علم کا مقصد جس قدر اعلیٰ ہوگا اسی قدر علم بھی اعلیٰ و افضل شمار کیا جائے گا۔ انسان کی زندگی کا مقصد اعلیٰ معرفت الہی کا حصول ہے۔ کائنات کے خالق کی طرف جو علم رہ نمائی کرے اس کی ذلت و مفات، اسما و افعال کا جو علم پتا بتائے، اس کے احکام سے جو علم آگاہ کرے، وہ علم سب سے اعلیٰ اور افضل قرار پائے گا۔

اللہ رب العزت نے فرمایا: ”وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون“ حضرت ابن عباس کی روایت کے مطابق ليعبدون کی تفسیر ليعبرفون سے کی گئی ہے۔ یعنی ہم نے انسان و جنات کو اپنی معرفت حاصل کرنے کے لیے پیدا کیا۔ معلوم ہوا کہ تخلیق انس و جن کا مقصد معرفت الہی کا حصول ہے۔ اب مخلوق اگر اپنے خالق و مالک کی معرفت حاصل کرتی ہے تو وہ کامیاب اور با مقصد قرار دی جائے گی، ورنہ کام اور بے مقصد کہی جائے گی۔ حضرت ابن عباس کی اس روایت کی تائید اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس حدیث سے ہوتی ہے جسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کے سوال کے جواب میں فرمایا۔ سوال کیا گیا: ایا احسان؟ تو آپ نے جواباً فرمایا: ان تعبدوا اللہ کما انک تراه وان لم تکن تراه فانہ یراک، یعنی تمہارا اس طرح عبادت کرنا کہ تم اپنے رب کو دیکھ رہے ہو، یہی تصوف اور احسان ہے اور اگر ایسا نہ ہو تو کم از کم دل میں یہ یقین اور دماغ پر یہ تصور چھایا ہو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے۔ یعنی عبادت کرو تو تم کو اپنے خالق و مالک کی معرفت مشاہدہ حاصل ہو ورنہ اس کی معرفت استدلالی یقینی ضرور ہو۔ یہی احسان اور تصوف ہے۔ خالق کی یقینی معرفت ہی احسان ہے اور معرفت الہی ہی مقصد حیات ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ احسان تک رسائی ہی مقصد زندگی اور خلاصہ حیات ہے۔

تذکیر

احسان کے بارے میں اس سوال و جواب سے قبل بھی دو سوال اور بھی ہو چکے تھے۔ پہلا سوال اسلام کے بارے میں تھا اور دوسرا سوال ایمان کے متعلق تھا۔ یہ تیسرا سوال جو احسان و تصوف کے بارے میں کیا گیا تھا، اس کا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا اور پھر اپنے صحابہ کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا: جانتے ہو یہ سائل کون تھے؟ یہ حضرت جبریل تھے جو تم کو تمہارا وین سکھانے آئے تھے۔ تین سوالات ہوئے اور تینوں کے جوابات آپ نے ارشاد فرمائے اور پھر فرمایا کہ تم کو تمہارا دین سکھانے آئے تھے۔ معلوم ہوا کہ اسلام، ایمان اور احسان کے مجموعے کو دین کہا جاتا ہے۔ نہ صرف اسلام دین کامل ہے اور نہ ایمان دین کامل ہے اور نہ احسان ہی تنہا دین ہے، بلکہ دین نام ہے ان تینوں کے مجموعے کا۔ اسلام نام ہے ظاہر دین کا اور ایمان نام ہے باطن دین کا اور احسان نام ہے مقصد دین کا۔ دین کا مقصد اس وقت تک حاصل نہ ہوگا جب تک ظاہر و باطن دونوں یکساں نہ ہو جائیں۔ یعنی جس طرح انسان اپنی زندگی کے مقصد کو اس وقت تک حاصل نہیں کر سکتا، جب تک جسم و روح کی توانائی اس کو حاصل نہ ہو، یوں ہی مقصد دین تک اس وقت تک رسائی نہیں ہو سکتی جب تک اسلام و ایمان کے مطالبات پورے نہ کرے اور ان دونوں کی خوبیوں کو اپنی زندگی میں نہ تارے۔ جب کوئی انسان اسلام و ایمان دونوں کے مطالبات کو پورا کرے گا تو اس کے لیے احسان تک رسائی ممکن ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں جب انسان احکام اسلام کا پابند، قلب سے اللہ کی ربوبیت، رسول کی رسالت اور احکام الہی کی تعذیق کرنے والا ہوگا اور اپنے ظاہر و باطن میں یکسانیت رکھتا ہوگا تو اس کے لیے احسان یعنی دین کے مقررہ حصول آسان ہو سکتا ہے۔ ورنہ احسان یعنی مقصد حیات تک رسائی محال کی طرح ہے۔

اپنے ظاہر و باطن کو یکساں کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر احکام اسلام کے مطابق ہو، حلال و حرام کی تمیز کرنے، جائز و ناجائز میں عملی طور پر فرق کرنے اور فرائض و واجبات کی پابندی کرنے والا ہو، اور باطن میں صفاتی و تزکیہ رکھتا ہو یعنی بغض و حسد، کینہ و عداوت، عجب و ریا، بدگمانی اور تکبر و تعصب جیسے مہلک و مہلک امراض سے اپنے قلب کو پاک رکھے۔

یہ سب کو معلوم ہے کہ ظاہر نماز تک اور ہمارے درمیان موجود کاغذ پر مکتوب قرآن تک پہنچنے کے لیے جس طرح شریعت کے بتائے ہوئے مخصوص طریقے پر بدن کے بعض حصوں کو وضو یعنی وضو کرنا ضروری ہے، اسی طرح کتاب کثوں، روح نماز اور حقیقت عبادت تک رسائی حاصل کرنے کے لیے طریقت کے مطابق وضو کرنا ضروری ہے اور یہ دل کا وضو ہے۔ دل کو تمام تر ناپاک خیالات، مہلکی خصلتوں، بغض و حسد، کبر و ریا، کینہ و عداوت، بدگمانی و بدظنی اور خود بینی وغیرہ پرستی سے محفوظ رکھنا ضروری ہے۔

ظاہری طہارت کا طریقہ اور اس کا علم جس طرح علم شریعت اور عالم شریعت کی صحبت کے بغیر ممکن نہیں، اسی طرح باطنی طہارت کا حصول علم طریقت اور عالم طریقت کی صحبت کے بغیر ممکن نہیں ہے، بلکہ طریقت اور تصوف تو ایک فن ہے اور کوئی بھی فن بغیر فن کار کی صحبت کے کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے؟ اپنے آپ کو جو مر و خیال کرتا ہے اس کو چاہیے کہ مجاز سے ترقی کر کے حقیقت کی طرف آئے اور رسم عبادت سے عروج کر کے روح عبادت کی طرف پیش قدمی کرے۔ ظاہر نماز کے ساتھ باطن نماز اور حقیقت نماز تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

اے گرفتار مجاز، اے بے حیا
چھوڑ کر بغض و حسد، کبر و ریا
جا کسی درویش کامل کے حضور
خاک پہ رکھ دے جبین پر غرور
پوچھ پچھر اس مرد دانا سے یہ راز
کس طرح ہوتی ہے مستوں کی نماز



تکبر، تفاخر اور عصبیت کی تباہ کاریاں

خود کو اوروں سے اعلیٰ و افضل جانتا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا تکبر ہے۔ تکبر ایسی قبیح اور مذموم صفت ہے جو سخت حرام اور گناہ ہے، بلکہ ہزاروں گناہوں کا سبب۔ یہی وہ گناہ ہے جس نے ہمیشہ کے لیے الٹیس کے گلے میں لعنت کا طوق ڈال کر اس کو مردود بنا دیا۔

خرابیاں

غرض تکبر بہت سی برائیوں کی جڑ ہے، بالخصوص اس سے یہ برائیاں پیدا ہوتی ہیں:

- (۱) تکبر صرف خدا ہی کو زیبا ہے لہذا تکبر کرنے والا گویا خدا کا مقابلہ کرتا ہے۔
- (۲) تکبر کرنے والا اپنے آگے دوسرے مسلمان بھائیوں کو حقیر و ذلیل سمجھتا ہے۔ جو ان کی ایذا کا سبب ہے اور مومن کو ایذا دینا خدا اور رسول کو ایذا دینے کے مترادف ہے، جیسا کہ حدیث پاک میں ہے:

”مَنْ أَذَى مُسْلِمًا أَذَى وَمَنْ أَذَى اللَّهِ“ (جامع الصغیر للمسیوطی)
جس نے کسی مسلمان کو تکلیف دی، اس نے گویا مجھ کو ایذا دی اور جس نے مجھ کو ایذا دی گویا اس نے خدا کو ایذا دی۔

(۳) متکبر آدمی سے لوگ دور بھاگتے ہیں، اس سے ملنا بھی کوئی پسند نہیں کرتا۔

(۴) متکبر آدمی بے مروت اور سخت دل ہو جاتا ہے۔ دوسروں پر مروت نہیں کرتا۔

(۵) متکبر آدمی اپنی برائی کو باقی رکھنے کے لیے بہت سے دوسرے ناجائز کاموں کا بھی ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ اس کی فکر صرف ایک ہوتی ہے کہ اس کی ناک اور شان اونچی رہے۔ اس کے لیے فضول خرچی، رشوت، دھوکا، ایذا رسانی آسان ہوتی ہے، حتیٰ کہ اپنے ہی بھائی کے قتل تک سے دریغ نہیں کرتا، اگرچہ کبھی خود ہی قتل ہو جاتا ہے۔

(۶) بعض گناہ چھپے رہتے ہیں صرف کرنے والا جانتا ہے اور خدا کے علام الغیوب، یا کبھی

کبھی وہ دوسروں پر ظاہر ہوتے ہیں لیکن تکبر ایسا گناہ ہے جو انداز گفتگو، مکان، دوکان، لباس، تقریبات حتیٰ کہ چال و حال سے بھی عیاں ہوتا ہے۔

(۷) بعض گناہ وہ بلکہ اکثر گناہ مومن چھپانے کی کوشش کرتا ہے لیکن تکبر ایسا گناہ ہے جسے متکبر ظاہر کیے بغیر نہیں رہتا، بلکہ ظاہر کرنے میں مسرت و لذت محسوس کرتا ہے جب کہ گناہ کو ظاہر کرنا بھی گناہ ہے۔ گویا یہ ایک ایسا متعدی گناہ ہے جو کئی گناہوں کا موجب ہے۔

(۸) تکبر الٹیس کی عادت ہے اور تو انفع فرشتوں کا طریقہ ہے۔

(۹) متکبر کے دل پر اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے جس کی وجہ سے وہ حق بات سننا ہی نہیں جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

كَذَلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَى قُلُوبِ مُتَكَبِّرِينَ (المومن: ۳۵/۴۰)

اللہ یوں ہی مہر کر دیتا ہے متکبر سرکش کے سارے دل پر۔ (کنز الایمان)

(۱۰) تکبر سے آدمی شیطان کا ساتھی ہو جاتا ہے کہ سب سے پہلے تکبر شیطان ہی نے کیا۔

خلاصہ یہ کہ تکبر ایسا گناہ ہے جس کی برائی پر سب عقلا متفق ہیں اور مزے کی بات یہ ہے کہ تکبر کرنے والا تکبر تو شوق سے کرتا ہے لیکن جب کبھی اس کو کہہ دیا جاتا ہے کہ تو برا متکبر ہے، گھمنڈی ہے، شیخی باز ہے تو ناراض بھی ہو جاتا ہے، بلکہ آگ بگولا ہو جاتا ہے، یعنی متکبر خود بھی اس کو برا ہی سمجھتا ہے لیکن تیجے کی کوشش نہیں کرتا کہ اس پر دنیا غالب ہوتی ہے اور شیطان مسلط۔

علاج

تکبر کا علاج یہ ہے کہ دنیا کی مذمت میں جو آیات و احادیث وارد ہوئی ہیں ان کا مطالعہ کرے، بزرگان دین اور اولیاء اللہ کی کثرت عبادت اور دنیا سے بے رغبتی کے واقعات پڑھے۔ غریبوں اور یتیموں کے سروں پر ہاتھ پھیرے، ان کے احوال و کوائف کو جان کر عبرت حاصل کرے اور تکبر کی برائی میں جو آیات اور حدیثیں آئی ہیں ان کو بھی بار بار پڑھے، یا ان کو متکبرین کے سامنے بار بار پڑھا جائے تو امید ہے کہ جلد اس مرض روحانی سے نجات مل جائے گی اور آخرت برپا ہونے سے بچ جائے گی۔

اب ذیل میں تکبر کی برائی میں آیات و احادیث ملاحظہ ہوں:

آیات قرآنیہ

(۱) الٹیس نے جب ”اِنَّا خَلَقْنَاهُ“ (میں آدم سے بہتر ہوں) کہہ کر تکبر کی بنیاد ڈالی تو رب تبارک و تعالیٰ نے فرمایا:

فَاَهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَنْ تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاَنْخَرْ مِنْ اِنَّكَ مِنْ

الصَّغِيرِينَ. (الاعراف: ۱۳/۷)

تو یہاں (جنت) سے اتر جا، تجھے نہیں پہنچتا کہ یہاں رہ کر غرور کرے، نکل تو ہے ذلت والوں میں۔ (کنز الایمان)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنت تکبیر کرنے والوں کی جگہ نہیں، جنت تو واضح کرنے والوں کا ٹھکانا ہے۔

(۲) پھر آگے ارشاد خداوندی ہوتا ہے:

أَخْرُجْ مِنْهَا مَذْذُورًا مَذْحُورًا. لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ أَجْمَعِينَ. (الاعراف: ۱۸/۷)

یہاں سے نکل جا، روکیا گیا راندہ ہوا، ضرور جوان میں سے تیرے کبے پر چلا، میں تم سب سے جہنم بھروں گا۔ (کنز الایمان)

اس آیت سے معلوم ہوا کہ متکبر بارگاہ خداوندی کا راندہ ہوتا ہے بلکہ سب کی لعنت کا مستحق، اور یہ کہ جہنم تکبر والوں سے بھر دیا جائے گا۔

(۳) قرآن نے متکبرین کا ٹھکانا جہنم بتایا ہے، ارشاد ربانی ہے:

فَلْيَسْأَلْهُمْ مَتَى الْمُنْكَرُونَ. (النحل: ۲۹/۱۶)

تو کیا ہی برا ٹھکانا مغروروں کا۔ (کنز الایمان)

(۴) اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَتَى لِّلْمُنْكَرُونَ. (الزمر: ۶۰/۳۹)

کیا مغروروں کا ٹھکانا جہنم میں نہیں؟ (کنز الایمان)

(۵) متکبر اللہ کو پسند نہیں، ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

”إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْتَكْبِرِينَ“ (النحل: ۲۳/۱۶)

بیشک وہ مغروروں کو پسند نہیں فرماتا۔ (کنز الایمان)

(۶) اللہ تعالیٰ کو تکبر کی چال بھی پسند نہیں۔ چنانچہ اللہ عزوجل فرماتا ہے:

وَلَا تَمْسَسْ يَدَايَاكَ الْأَرْضَ لَنْ تَصْحَوْقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا. كُلُّ ذَلِكَ كَانَ سَيِّئُهُ عِنْدَ رَبِّكَ مَكْرُوهًا. (نبی اسرائیل: ۶۷/۱۷)

اور زمین میں اترا کرتے چل، بے شک ہرگز تو زمین نہیں چیر ڈالے گا اور ہرگز بلند ی میں پہاڑوں کو نہ پہنچے گا، یہ جو کچھ گڑ را ان میں کی بری بات تیرے رب کو نا پسند ہے۔ (کنز الایمان)

(۷) تکبر کرنے والے قبول حق سے محروم رہتے ہیں، ان کی عقلوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ رب عزوجل فرماتا ہے:

مَنْ أَضْرَفُ عَنْ آيَاتِي الْبَلْبَيْنِ يَنْكَرُونَ فِي الْأَرْضِ بَغْيَ الْحَقِّ (الاعراف: ۱۳/۷)

میں اپنی آیتوں سے انھیں پھیر دوں گا جو زمین میں مانتی بڑائی چاہتے ہیں۔

(کنز الایمان)

قرآن میں بہت سی آیات اس پر دلالت کرتی ہیں کہ جب انبیاء کرام علیہم السلام دین حق اور خدا کی آیات لے کر آئے تو کافروں نے ازراہ تکبر انکار کیا جس سے یہاں بت ہوتا ہے کہ حق سے دوری اور آیات ربانیہ کا انکار زیادہ تر تکبر ہی کی وجہ سے واقع ہوا۔ آج بھی تجربہ ہے کہ کسی متواضع، متقی اور نیک آدمی کے سامنے شریعت اسلامیہ کا کوئی مسئلہ رکھا جاتا ہے تو وہ فوراً تسلیم ٹم کر دیتا ہے اور حق بات قبول کر لیتا ہے، لیکن وہی مسئلہ جب کسی متکبر اور مغرور کے پاس پیش ہوتا ہے تو جھٹ انکار کر دیتا ہے اور عقلی و منطقی جواب دے کر کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کرتا ہے بلکہ کبھی اگلے نصیحت کرنے والوں ہی پر ناراض ہو کر اپنا غصہ اتارنے لگتا ہے اور کبھی تو صریح کفریات کا ارتکاب کر بیٹھتا ہے۔ مثلاً یہ کہتا ہے کہ اپنا فتویٰ اپنے پاس رکھو، ہمیں شریعت کی ضرورت نہیں، اب شریعت پر عمل کا زمانہ نہیں۔ اس طرح وہ ایمان جیسی عظیم دولت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے، چوتکبر کا سب سے بڑا نقصان ہے۔

قرآن نے اس کی منظر کشی متعدد آیات میں کی ہے، یہاں ایک آیت مثال کے طور پر پیش کی جاتی ہے:

(۸) قَالَ الْمَلَأُ الْبَلْبَيْنِ اسْتَغْبِرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ اسْتَضَعُوا آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا مُّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ. قَالَ الْبَلْبَيْنِ اسْتَغْبِرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنْتُمْ بِهِ كَاذِبُونَ. (الاعراف: ۷۶/۷۵)

اس کی قوم کے تکبر والے، کمزور مسلمانوں سے بولے: کیا تم جانتے ہو کہ صالح اپنے رب کے رسول ہیں، بولے وہ جو سمجھ لے کر بھیجے گئے، ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں، متکبر بولے:

جس پر تم ایمان لائے ہمیں اس سے انکار ہے۔ (کنز الایمان)

(۹) حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تذکرے میں ہے کہ انھوں نے متکبرین سے پناہ مانگی ہے۔ ارشاد باری ہے:

وَقَالَ مُوسَىٰ إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ مِنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ. (المؤمن: ۲۷/۲۰)

اور موسیٰ نے کہا میں تمہارے اور اپنے رب کی پناہ لیتا ہوں ہر متکبر سے کہ حساب کے دن پر یقین نہیں لاتا۔ (کنز الایمان)

اس سے معلوم ہوا کہ تکبر کرنے والے بالعموم قیامت اور حساب و کتاب پر ایمان نہیں رکھتے یا رکھتے ہیں تو بھولے رہتے ہیں۔ اگر قیامت کا خوف ہو تو کوئی تکبر نہ کرے بلکہ تواضع کو اپنا شعار بنائے۔

(۱۰) حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو جو نصیحت کی اس کا ذکر کرتے ہوئے قرآن فرماتا ہے:
وَلَا تُصَبِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ. (لقمان: ۱۸/۳۱)

اور کسی سے بات کرنے میں اپنا رخسارہ کج نہ کر اور زمین میں اترانا نہ چل۔ بے شک اللہ کو نہیں بھاتا کوئی اترانا فخر کرنا۔ (کنز الایمان)

جیسا کہ تکبر لوگ کسی عام آدمی سے بات کرتے وقت اپنی توجہ اس شخص کی طرف نہیں کرتے اور اسے حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، قرآن نے اس سے بھی منع کیا ہے، اتر کر چلنے کو بھی مذموم قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ اللہ کو تکبر کرنے والے پسند نہیں، نہ فخر و غرور والے: اور جو اللہ کو پسند نہ ہو اسے سوچ لینا چاہیے کہ اس کا ٹھکانا کہاں ہوگا۔

قرآن حکیم میں یہ مضمون بار بار بیان کیا گیا ہے کہ کافر محض مسلمانوں بالخصوص کم زور لوگوں کی جلن میں ایمان نہیں لائے کہ یہ کم زور اور گئے گزرے لوگ ایمان لائے ہیں تو ہم ان کے ساتھ کیوں ہوں، ہم تو اونچی ناک اور بلند شان والے ہیں، ہمارا معاملہ تو کچھ الگ ہی رہنا چاہیے۔ چنانچہ اسی روش پر آج کے تکبر لوگ بھی چل رہے ہیں۔ ان میں اکثر کا حال یہی ہے کہ علمائے دین، ائمہ کرام، حفاظ قرآن اور دیگر دیندار لوگوں کو اپنے سامنے بیٹھتے ہیں اور اپنے بچوں کو عالم و حافظ و قاری بنانے میں ذلت محسوس کرتے ہیں۔ ہزاروں روپے دنیاوی تعلیم پر لگا دیتے ہیں لیکن قرآن اور دین پڑھنے پڑھانے پر کچھ خرچ کرنے میں تکلف محسوس کرتے ہیں۔ یہ سب دنیا کی محبت اور تکبر کی کافرمانی ہے، معمولی عز و جل اس بری بلا سے ہمیں نجات دے۔ آمین۔

احادیث مبارکہ

اب ذیل میں تکبر کے سلسلے کی چند حدیثیں بھی ملاحظہ کرتے چلیں اور صبر حاصل کریں:

(۱) حضرت حارث بن وہب سے مروی ہے، انھوں نے کہا، رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تم کو جنت والوں کے بارے میں نہ بتا دوں؟ (کہ وہ کون لوگ ہوں گے) ہر وہ کم زور اور لوگوں کی نظر میں حقیر کہ اگر اللہ پر قسم کھائے تو وہ اس کی قسم پوری فرما دے۔

کیا میں تمہیں جہنمیوں کے بارے میں نہ بتا دوں؟ (کہ کون لوگ ہوں گے) ہر سخت دل اور بخیل اور تکبر کرنے والے۔ (مشکوٰۃ المصابیح: ص ۴۳۳ باب الغضب و تکبر، بحوالہ بخاری و مسلم)

(۲) حضرت عبد اللہ ابن مسعود ہی سے مروی ہے کہ نبی معظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جنت میں وہ شخص داخل نہیں ہوگا جس کے دل میں ذرہ برابر تکبر ہوگا تو ایک شخص نے عرض کیا: آدمی چاہتا ہے کہ اس کے کپڑے اچھے ہوں، اس کے جوتے عمدہ ہوں (تو کیا یہ تکبر ہے؟) اس پر مہر کار نے ارشاد فرمایا:

اللہ جمیل ہے (یعنی وہ حسن و جمال کا خالق ہے یا صفات جمیلہ خدا کا مالک ہے) اور جمال کو پسند فرماتا ہے۔ (یعنی اسے پسند ہے کہ اس کے بندے حسب توفیق حسن و جمال کا اظہار کریں)۔ تکبر تو حق کی مخالفت، اس کا انکار اور لوگوں کو حقیر جاننا ہے۔

(مسلم شریف ۱/۳۶۵، ترمذی ۲/۲۱۲، مشکوٰۃ: ص ۴۳۳)

(۳) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: تین شخصوں سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں فرمائے گا (یعنی سخت ناراض ہوگا) اور نہ انھیں پاک فرمائے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ نہ ہی ان کی طرف نظر کرے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے، ایک تو بوڑھا زانی، دوسرا جھوٹا بادشاہ، تیسرا مستکبر فقیر۔

(مسلم شریف، مشکوٰۃ: ص ۴۳۳)

کچھ لوگ سمجھتے ہیں کہ تکبر صرف بڑے مال داروں کے ساتھ خاص ہے، نہیں، جو محتاج ہوتا ہے وہ بھی تکبر کرتا ہے اور اس کا تکبر زیادہ ہے کہ بظاہر اس کے پاس تکبر کے اسباب بھی نہیں پھر بھی تکبر کرتا ہے جو اس کی انتہائی کمینگی پر دلالت کرتا ہے۔ بعض کم درجے کے لوگ شرفا کو بلا فائدہ برا کہتے ہیں اور ان سے حسد کرتے ہیں، یہ بھی تکبر میں داخل ہے، مثلاً کہتے ہیں: ہم غریب ہیں تو کیا ہوا، کسی سے کم نہیں ہیں، یا ان بڑوں نے ہمیشہ ہمیں ذلیل سمجھا، اب موقع ہاتھ آیا ہے ہم بھی ان کو ذلیل کیے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ یہ سب تکبر کے جملے ہیں اور انتقام پر دلالت کرتے ہیں۔ اگر کوئی گالی دے تو الٹ کر اس کو گالی دینا عقل مندی اور دین داری نہیں، انھیں باتوں سے معاشرے میں تعصب جنم لیتا ہے، لہذا ان سے پرہیز کرنا چاہیے۔

(۴) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ کبریائی اور عظمت میری خاص غفتیں ہیں، مجھ کو ہی زیب دیتی ہیں، جو ان دونوں میں سے کسی ایک کے بارے میں مجھ سے جھگڑے گا (یعنی عظمت و کبریائی اپنے لیے ثابت کرے گا) میں اس کو آگ میں داخل کروں گا۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں اس کو آگ میں پھینک دوں گا۔ (مسلم شریف، مشکوٰۃ: ص ۳۳۳)

(۵) حضرت سلمہ ابن اکوع رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، حضور انور صلی اللہ تعالیٰ

علیہ وسلم نے فرمایا: آدمی اپنے آپ کو اونچا بناتا ہے (یعنی تکبر کرتا ہے) حتیٰ کہ وہ جبارین (سرکش متکبرین) میں لکھ دیا جاتا ہے، پھر جو عذاب ان کو پہنچتا ہے وہی اس کو بھی پہنچتا ہے۔

(ترمذی ۲۱۱۲، رشیدیہ دہلی)

(۶) حضرت عمر و بن شعیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے والد گرامی اور وہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: متکبر لوگ قیامت کے دن چوٹیوں کی طرح اٹھائے جائیں گے مردوں کی صورت میں کہ ان پر ذلت ہی ذلت ہوگی، اور ان کو جہنم کے ایک قید خانے کی طرف ہانکا جائے گا جس کا نام ہو کس ہے، ان پر آگ ہی آگ چھائے گی، جہنمیوں کا نچوڑ (ہتھپ) انھیں پلا یا جائے گا، جس کو طینۃ الغیال کہتے ہیں۔ (ترمذی مشکوٰۃ ۴۳۴۴)

(۷) حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے منبر پر لوگوں کو خطاب کر کے فرمایا: تواضع کرو، کیوں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سنا، فرما رہے تھے: جو اللہ کے لیے تواضع کرتا ہے، اللہ اس کو بلندی عطا فرماتا ہے۔ ایسا شخص اپنے نفس میں چھوٹا ہوگا مگر لوگوں کی نظر میں بڑا ہوگا اور جو غرور کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پست کرتا ہے۔ ایسا شخص لوگوں کی نظر میں ذلیل ہوتا ہے اگرچہ اپنے نفس میں وہ خود کو بڑا سمجھتا ہے حتیٰ کہ وہ لوگوں کے نزدیک کتے اور سور سے بھی ذلیل ہو جاتا ہے۔ (بیہقی، شعب الایمان، مشکوٰۃ ۴۳۴۵)

(۸) اب ایک ایسی حدیث پاک ملاحظہ کریں، جو تکبر کی رگوں کو کاٹ ڈالنے والی اور غرور کی عمارت ڈھا دینے والی ہے:

حضرت اسماء بنت عقیس رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ میں نے رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو فرماتے سنا:

ایمراہ بندہ وہ بندہ ہے جو غرور کرے اور اکڑ کر چلے، اور بڑی شان والے (رب) کو بھول جائے۔

ایمراہ بندہ وہ بندہ ہے جو ظلم و زیادتی کرے اور قہار علی (رب) کو بھول جائے۔

ایمراہ بندہ وہ بندہ ہے جو غفلت سے کھیل میں لگ جائے اور قبر کو اور اس میں سڑنے لگنے کو بھول جائے۔

ایمراہ بندہ وہ بندہ جو حد سے گزرنے والا، متکبر اور سرکش ہو اور اپنی ابتداء اور انتہا کو (یعنی پیدائش اور موت) کو بھول جائے۔

ایمراہ بندہ وہ بندہ جو دنیا کو دین کے ذریعے دھوکہ دے۔ (یعنی دنیا والوں کو دھوکا دینے کے لیے دین پر عمل کرے، اور دین کو آڑ بنائے۔)

ایمراہ کتنا ہی برا ہے وہ بندہ جو دین کو شہادت کے ذریعے دھوکہ دے۔ (یعنی متقی پر ہیزگار بن کر دین داری ظاہری کرے کہ لوگوں میں مقبول ہو، حالانکہ عمل خیر اللہ کے لیے ہونا چاہیے نہ کہ بندوں کے لیے۔)

ایمراہ کیا ہی برا ہے وہ بندہ جسے ہوس اور لالچ کھینچنے لیے جاری ہے۔ (یعنی وہ حرص و ہوس کا پابند ہو گیا ہے۔)

ایمراہ بندہ جسے خواہش نفس گمراہ کرے۔

ایمراہ بندہ بہت برا ہے جسے رقبتیں اور خواہشیں ذلیل کریں۔

(ترمذی شریف، بیہقی فی شعب الایمان، مشکوٰۃ ۴۳۴۶)

(۹) ایک شخص دو چادریں اوڑھے اترا اترا کر چل رہا تھا اور بہت گھمنڈ میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک زمین میں دھنسا ہی چلا جائے گا۔

(مشکوٰۃ ۴۳۴۷، باب الجلبوس والنوم، المشی، بخاری و مسلم)

یہ روایت حضرت ابو ہریرہ کی ہے اور حضرت ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایت میں ہے کہ گھمنڈ سے اپنے تہہ بند کو تھیسٹ رہا تھا۔ (مشکوٰۃ ۴۳۴۸، کتاب اللباس)

اس سے وہ لوگ سبق لیں جو اپنے تہہ بند اور پانچاے خوب نیچے کر کے اتارتے چلتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس میں کوئی حرج ہی نہیں اور اس سے بدرجہم اس بیٹھ کا ہے جو وضع نصاریٰ بھی ہے اور خوب نیچا کر کے پہنا جاتا ہے اور چلنے کا انداز بھی متکبرانہ ہوتا ہے اور اگر بیٹھ چست ہے تو اس میں بے حیائی کے مظاہرے کی قیامت مزید بڑھ جاتی ہے، اور حیا ایمان کا شعبہ ہے۔

(۱۰) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر رحمت نہیں فرمائے گا جو گھمنڈ میں اپنے تہہ بند کو کھینچتا ہے۔ (مشکوٰۃ ۴۳۴۹، ص ۳۷)

(۱۱) حضرت ثابہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سامنے عرض کیا گیا، فلاں شخص کتنا متکبر ہے!! تو سرکار نے ارشاد فرمایا: کیا اس کے پیچھے موت نہیں لگی ہوئی ہے۔

(شعب الایمان، حدیث: ۲۸۰۹، ج ۲، ۲۹۳)

یعنی جس کو مرنا ہے اس کو تکبر کسی طرح زیب نہیں دیتا کبریائی تو اس جی، قیوم کو زیبا ہے جو ہماری کائنات کا رب ہے۔

تکبر کی قسمیں

تکبر کی تین قسمیں ہیں:

(۱) اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں تکبر کرنا۔

(۲) رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے مقابلے میں تکبر کرنا -

(۳) مخلوق خدا کے مقابلے میں تکبر کرنا -

پہلا دو ٹوں تکبر کفر ہے، اور تیسرا حرام، ہاں! کفار کے مقابلے کے وقت کفر کو ذلیل کرنے اور اسلام کو عزت دینے کی غرض سے جو تکبر ظاہر کیا جائے وہ جائز ہے۔ اس وقت بھی اپنی بڑائی مقصود ہو تو جائز نہیں۔

تکبر علما، امراء، حفاظ، ائمہ، خطباء، حکام اور تعلیم یافتہ سب میں پایا جاتا ہے۔ ہر ایک کو اپنے اپنے نفس کا جائزہ لینا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ تکبر کس قدر بڑا ہے اور جس قدر بھی تکبر کا احساس اپنے اندر ہو اس کو دور کرنے اور اس سے توبہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

بعض علما و رساوات اپنے لیے خود تعظیم و امتیاز کے طالب ہوتے ہیں اور اگر عوام سے کچھ کوتاہی ہوتی ہے تو بہت زیادہ ناک بھوں سکڑتے اور ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بھی تکبر میں داخل ہے۔ ہاں! عوام خود تعظیم و امتیاز کا برتاؤ کریں تو انھیں روا ہے۔ اس سلسلے میں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان قادری مدظلہ العالی کی یہ روایت دیکھیں:

”علما و رساوات کو یہ ناجائز و ممنوع ہے کہ آپ اپنے لیے سب سے امتیاز چاہیں اور اپنے نفس کو اور مسلمانوں سے بڑا جانیں کہ یہ تکبر ہے اور تکبر ملک جبار تخت عظمت کے سوا کسی کو لائق نہیں، بندہ کے حق میں گناہ اکبر ہے۔“ (الکبیر فی جہنم مَشْهُوٰی لِّلْمُتَكَبِّرِیْنَ) (الترمذی: ۶۰/۳۹) کیا جہنم میں نہیں ہے غم کا تکبر والوں کا۔ جب علما کے آقا، سب رساوات کے باپ حضور انور سید المرسلین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم امتیاز کی تواضع فرماتے اور مقام و مجلس و خوروش و روش (انٹھنے بیٹھنے کھانے، چلنے) کسی امر میں اپنے بندگان (غلامان) بارگاہ پر امتیاز نہ چاہتے تو دوسرے کی کیا حقیقت ہے، مگر مسلمانوں کو حکم ہے کہ سب سے زائد علما و رساوات کا اعزاز و امتیاز کریں۔ یہ ایسا ہے کہ کسی شخص کو لوگوں سے اپنے لیے طالب قیام (قیام تعظیمی کا طالب) ہونا مکروہ اور لوگوں کا تعظیم دینی (دین داریز رگ) کے لیے قیام (تعظیمی) مندوب (پسندیدہ)۔ پھر جب اہل اسلام ان کے ساتھ امتیاز خاص کا برتاؤ کریں تو اس کو قبول انھیں ممنوع نہیں۔ امیر المومنین علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الاسبغی تشریف فرما ہوئے، صاحب خانہ نے حضرت کے لیے مسند حاضر کی، امیر المومنین اس پر رونق افروز ہوئے اور فرمایا کہ کوئی گدھا ہی عزت کی بات قبول نہ کرے گا۔ (فتاویٰ رضویہ، امام احمد رضا قادری جلد: ۹/۴۷، رضا کیڈی، ممبئی)

لیکن اپنے کو دوسروں سے بہتر سمجھنا تکبر ہے، اعلیٰ حضرت قدس سرہ فرماتے ہیں:

رہا اپنے آپ کو بہتر سمجھنا تکبر ہے۔ (فتاویٰ رضویہ: ۱۳۸/۹)

لہذا ہمیں تکبر جیسی مذموم صفت سے بچنے کی پوری کوشش کرنی چاہیے، تاکہ تکبر کی محسوسات سے نجات ملے اور تواضع و انکساری کر کے اللہ کی بارگاہ کے مقبول و محبوب بنیں۔

عصیبت یا تعصب بھی تکبر ہی کی پیداوار ہے لہذا قیام میں اس پر بھی روشنی ڈالی جاتی ہے:

عصیبت و تقاضا

معاشرے کو تباہیوں سے دوچار کرنے والی ایک بری خصلت خاندانی تقاضا، علاقائی اور براہرانہ عصیبت بھی ہے جس کی بنیاد پر آج بھی اکثر جنگ و جدال اور لڑائی جھگڑے کی نوبت آجایا کرتی ہے۔ اس سلسلے میں بھی حضور پغیر اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے امت کو واضح رہنمائی سے نوازا ہے۔ ذیل میں مدنی آقا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ارشادات ملاحظہ کریں اور ان کی روشنی میں اپنے نفس اور اپنے معاشرے کا جائزہ لیں۔

(۱) حضرت عیاض بن حمار مجاشعی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ نے میری طرف وحی فرمائی ہے کہ تواضع اختیار کرو، یہاں تک کہ کوئی ایک دوسرے پر فخر نہ کرے اور نہ کوئی دوسرے پر ظلم کرے۔

(مسلم، مشکوٰۃ: ۴/۴۱، باب المفاخرۃ والعصیبت)

(۲) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگ غرور اپنے ان آیا و اجداد پر فخر کرنے سے باز رہیں جو مرچکے ہیں۔ وہ تو جہنم کے کونکے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ پر بالکل آسان ہے کہ وہ گیرٹا ہو جائیں جو نجاست کو اپنی ناک سے ڈھکیٹا ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کا غرور اور آیا و اجداد پر فخر کرنا دور فرما دیا ہے۔ اب کوئی مومن متقی ہو یا قاسم و بد بخت، سب حضرت آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں۔

(ترمذی، ابوداؤد، مشکوٰۃ: ۴/۴۱)

(۳) حضرت عبدالرحمن بن ابی عقیبہ حضرت عقبہ سے روایت کرتے ہیں، انھوں نے کہا: میں ایک فارسی غلام تھا، میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ساتھ غزوہ احد میں شریک ہوا، مشرکین میں سے ایک شخص کو قتل کیا، پھر کہا یہ لے مجھ سے میں فارسی غلام ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم میری طرف متوجہ ہو کر بولے، تو نے یہ کیوں نہیں کہا، یہ لے مجھ سے میں ایک انصاری غلام ہوں۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: ۴/۴۱۸)

یہ ابو عقبہ نسلاً فارسی تھے لیکن جابر بن عتیق انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے آزاد کردہ غلام تھے، اس لیے انصاری بھی ہوئے، رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے آپ کے نسل و وطن پر فخر کرنے کو پسند فرمایا: اور کہا، اگر فخر ہی کرنا ہے تو انصاری ہونے پر فخر کرو، کیوں کہ انصار کا تعلق کسی

نسب یا خاندان یا جگہ سے نہیں، بلکہ اس کا تعلق نصرت اسلام و مسلمین سے ہے، لہذا اسلامی نسبت پر تو فخر کیا جاسکتا ہے مگر نسل و قوم اور وطن و ملک پر فخر جائز نہیں اور نہ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش۔ افسوس! آج اسلام کا نام لینے اور اپنا نام مسلمانوں جیسا بتانے میں لوگوں کو شرم آتی ہے، مگر نسبت اور قوم پر فخر طرہ امتیاز بن گیا ہے۔ اسی کے خلاف علامہ جامی علیہ الرحمہ یوں آواز اٹھاتے ہیں:

بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جاتی

کہ دریں راہ قلاں و بن قلاں چیز سے نیست

(۴) حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، وہ رسول اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ سرکارِ مدینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: جو اپنی قوم کی مدد و حق بات پر کرے تو گویا وہ ایسا ہے کہ اونٹ گڑھے میں گر گیا ہو اور یہ اس کی دم پکڑ کر اسے اوپر کھینچ رہا ہے۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: ۴۱۸)

یعنی گرے ہوئے اونٹ کو جیسے دم پکڑ کر نہیں نکالا جاسکتا، اسی طرح کسی قوم کی مدد و حق کر کے اسے عزت نہیں دی جاسکتی۔ عزت تو حق سے ہے اور حق میں ہے۔ حق پر رہو، حق کا ساتھ دو تو خدا کی طرف سے بھی مدد ہوگی، پھر کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔

(۵) حضرت واصلہ ابن اسحاق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، انھوں نے عرض کیا، یا رسول اللہ! عصبیت کیا چیز ہے؟ سرکار نے فرمایا: عصبیت یہ ہے کہ تم اپنی قوم کی غلطی پر مدد کرو۔

(ابوداؤد، مشکوٰۃ: ۴۱۸)

یہاں غلطی سے ہر گناہ مراد ہے یعنی کسی گناہ پر اپنی قوم کی مدد کرنا عصبیت ہے۔ افسوس! اس ارشاد پاک کو آج پس پشت ڈال دیا گیا۔ آج لوگوں کا حال یہ ہے کہ اپنی قوم کا ہے تو ضرور اس کی مدد کی جاتی ہے، چاہے وہ ناحق پر ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ اپنی قوم کو غلطی و زیادتیاں سے بچایا جائے اور حق پر چلا دیا جائے۔

(۶) حضرت سراقہ بن مالک بن عیشم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے ہمیں خطبہ دیا، فرمایا: تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے کنبہ سے اس وقت تک دفاع کرے جب تک وہ گناہ نہ کرے۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: ۴۱۸)

یعنی اپنے کنبہ کی طرف سے لڑنے اور ان کی حمایت کی اجازت ہے مگر اسی وقت تک کہ وہ حق پر ہوں اور گناہ پر اڑے نہ ہوں، اور جب حق سے ہٹ کر ناحق پر مدد چاہیں تو ان کی مدد نہیں کی جاسکتی، اگر چہ اپنے کیسے ہی قریبی کیوں نہ ہوں۔ گناہ کے معاملے میں یہ ہونا چاہیے کہ اپنے آدمیوں کو ہدایت

گناہ سے روکیں، عذاب سے ڈرائیں اور نہ ماننے پر مقاطعہ کی دھمکی دیں۔

(۷) حضرت جبیر بن مطعم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی طرف بلائے، وہ ہم میں سے نہیں جو عصبیت کی بنیاد پر لڑے، وہ ہم میں سے نہیں جو تعصب پر مرے۔ (ابوداؤد، مشکوٰۃ: ۴۱۸)

یعنی تعصب میں لڑ کر مرے، یا اس حالت میں مرے کہ اس کے اندر رہے جا تعصب کا بیج موجود ہے تو سرکار فرماتے ہیں: وہ ہم میں سے نہیں۔

(۸) حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کیا عصبیت یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم سے محبت کرے ہر کار نے ارشاد فرمایا: نہیں! لیکن عصبیت یہ ہے کہ آدمی اپنی قوم کی غلطی پر مدد کرے۔ (احمد بن ماجہ، مشکوٰۃ: ۴۱۸)

یہ بیماری آج کل مسلمانوں میں بہت عام ہے۔ قومی تعصب، نسلی تعصب، صوبائی تعصب، ملکی تعصب حتیٰ کہ لسانی تعصب بہت پروان چڑھ رہا ہے۔ انہیں تعصبات نے آج مسلمانوں کی کمزوری کو رکھ دی ہے، حالانکہ سارے مسلمان ایک قوم اور آپس میں بھائی بھائی ہیں، شرط یہ ہے کہ ایمان سلامت ہو۔

(۹) حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: یہ تمہارے نسب تم میں سے کسی کو گالی دینے (برا کہنے) کے لیے نہیں ہیں۔ تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو، جیسے صاع کی چیز صاع سے، جس کو اس نے بھرا نہ ہو (یعنی جیسے ایک صاع کو دوسرے صاع میں ڈالنا اس کو نہیں بھرتا) کسی کو کسی پر بزرگی نہیں، مگر دین واری اور تقویٰ و پرہیزگاری کی بنیاد پر، آدمی کی ذلت کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ بد زبان، بد خلق اور بخیل ہو۔

(احمد، تہذیبی، شعب الایمان، مشکوٰۃ شریف: ۴۱۸)

یعنی سمجھ کی بیشی آدمی کے اندر ہوتی ہے، اس کی بنیاد پر کسی کو برا کہنا، طعن دینا، اس پر فضیلت جتنا جائز نہیں، آدمی کو تقویٰ سے آراستہ ہونا چاہیے اور بد گوئی، بد زبان، بد خلقی اور بخل سے بچنا چاہیے کہ یہ خصلتیں باعث ذلت و عار ہیں۔ کسی کو برا سمجھا جاسکتا ہے تو ان شرعی عیوب کی بنیاد پر، نہ ذات و نسب پر۔ سرکارِ مدنی ناہدار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے یہ ارشادات آج کے ان لوگوں کے لیے درسِ عبرت ہیں جو بات پر اپنے خاندانی تفاخر کو ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

حضرت شیخ محقق فرماتے ہیں: تعصب اگر حق کے لیے ہو، اس میں غلطی نہ ہو تو خوب ہے اور اگر باطل طریقے سے ہے تو مذموم ہے، اور اکثر تعصب کا اطلاق ناحق ہی پر ہوتا ہے۔

(ابو عبد اللہ)

تواضع

تکبر اور غرور و مہاباہت نیز عصبیت کے مقابلے میں جو صفت آتی ہے وہ تواضع و انکساری ہے، جو اللہ کو محبوب ہے۔ صوفیہ کرام کے اندر یہ صفت بہت نمایاں ہوا کرتی ہے بلکہ بغیر تواضع کے کوئی صوفی ہو ہی نہیں سکتا۔ تواضع کی حدیثوں میں بھی بڑی فضیلت آئی ہے اور قرآن پاک میں بھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَبَشِّرِ الْمُتَعَبِينَ. الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَالصَّابِرِينَ عَلَى مَا أَصَابَهُمْ وَالْمُقِيمِي الصَّلَاةِ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ. (الحج: ۳۴، ۳۵)

اے محبوب! خوشی سنا دو ان تواضع والوں کو کہ جب اللہ کا ذکر ہوتا ہے ان کے دل ڈرنے لگتے ہیں اور جو افتاد پر عاس کے سہنے والے اور نماز پر پارس کرنے والے اور ہمارے دیے سے خرچ کرتے ہیں۔ (کنز الایمان)

”مُتَعَبِينَ“ سے مراد وہ مومن کامل ہے جو متواضع اور منکسر المزاج ہو، تکبر و غرور اور تفاخر و تعصب سے اسے کچھ واسطہ ہی نہ ہو، پھر قرآن نے خود ہی ان کی بعض اہم صفات کو بیان کر دیا ہے کہ اللہ کے ذکر سے ان کے دل تپکھل جاتے ہیں۔ جو کچھ مشکلات آتی ہیں خندہ پیشانی کے ساتھ انھیں جھیل لیتے ہیں۔ نماز کی ادائیگی پر پورے طریقے سے کاربند رہتے ہیں اور اللہ کی دی ہوئی دولت میں نکل نہیں کرتے بلکہ اس کو ضرورت مندوں پر بے دریغ خرچ کرتے ہیں۔

ان صفات میں سب سے اہم اور مقدم یہ ہے کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے معمور رہتے ہیں اور خشیت ربانی سے نرم پڑ جاتے ہیں، اور جب کبھی ان کے سامنے ذکر الہی ہوتا ہے تو سن کر ان کے دل کانپ جاتے ہیں۔

رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو بھی تواضع کا حکم دیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ. فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ يَأْسَىٰ بِرَبِّكَ. وَمِمَّا تَعْمَلُونَ.“ (الشعرا: ۲۶، ۲۷، ۲۸)

اور اپنی رحمت کا بازو بچھاؤ اپنے پیرو مسلمانوں کے لیے تو اگر وہ تمہارا حکم نہ مانیں تو فرما دو میں تمہارے کاموں سے بے علاقہ۔ (بے تعلق ہوں)۔ (کنز الایمان)

دوسری جگہ ارشاد ہوا:

”وَاحْفَظْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ“ (الحجر: ۸۸)

اور مسلمانوں کو اپنی رحمت کے پروں میں لے لو۔ (کنز الایمان)

یعنی ان کو اپنے کرم سے نوازو، انھیں اپنی صحبتوں سے شاد کام کرو، اپنے قرب میں جگہ دو، اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی نعمتوں کے جن خزانوں پر مامور فرمایا ہے ان سے انہیں بھی فیض یاب کرو، مگر توں کو تمام لو، دکھ درو کے ماروں کا مداوا کرو۔ چنانچہ سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے تواضع کا یہ حال تھا کہ صحابہ کرام میں ایسے مل جل کر بیٹھتے کہ اپنا کچھ احتیاز نہ رکھتے۔

اب ذرا بعض احادیث کی سیر کرتے چلیں۔ سرکارِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں:

صدقہ خیرات کرنے سے مال کم نہیں ہوتا اور معاف کرنے سے اللہ تعالیٰ عزت ہی بڑھاتا ہے اور جو صرف اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اسے بلندی عطا فرماتا ہے۔

(ریاض الصالحین، امام نووی ص: ۲۸۲)

ایک بار حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے منبر پر کھڑے ہو کر فرمایا: اے لوگو! تواضع اختیار کرو کیوں کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے جس نے اللہ کے لیے خاکساری اختیار کی اللہ اسے بلند کر دے گا۔ وہ اپنی نظر میں چھوٹا ہو گا مگر عام ہند گان حق کی نگاہ میں اونچا ہو گا، اور جو تکبر اختیار کرے گا اللہ تعالیٰ اسے نیچے گرا دے گا۔ وہ اپنے خیال میں بڑا ہو گا لیکن لوگوں کی نگاہ میں چھوٹا ہو گا یہاں تک کہ وہ (دوسروں کی نگاہ میں) کتوں اور خنزیروں سے بھی زیادہ ذلیل و خوار ہو گا۔ (شعب الایمان تہذیبی: ۶/۲)

پھر حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ تزک بھڑک، شان و شوکت کا اظہار حضور کی کسی ادا سے نہیں ہوتا تھا۔ تواضع کا یہ حال تھا کہ خالی چٹائی ہی پر سو جاتے۔ چنانچہ

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں سرکارِ رسالت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ آپ کھجور کے پتوں سے بنی ہوئی چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں اور اس پر کوئی بستر نہیں جو آپ کے جسم پاک اور چٹائی کے درمیان حائل ہوتا، جس کی وجہ سے چٹائی کی بناؤں کے

نشانات آپ کے جسم اطہر پر پڑ گئے ہیں۔ چڑے کی تکیہ پر ٹیک لگائے ہوئے تھے جس میں سمجھور کی چھال بھری ہوئی تھی۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے دعا کیجیے وہ آپ کی امت پر

وسعت فرمائے کیوں کہ فارس اور روم پر بڑی وسعت اور کشادگی ہے حالانکہ وہ اللہ کی عبادت نہیں کرتے سفر مایا: ۱۷۱ بن خطاب! تم کیا اس خیال میں ہو، یہ تو وہ قوم ہے کہ دنیاوی زندگی میں ان کی

نعتیں انہیں دے دی گئی ہیں۔ ایک روایت میں اتنا اور ہے: کیا تم اس سے راضی نہیں کہ دنیا ان کے لیے ہوا اور آخرت ہمارے لیے۔ (بخاری و مسلم، مشکوٰۃ: ۴۲، باب فضل الفقر)

ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک دن دیکھا کہ

نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تا ریک گھر میں ایک گرم چٹائی پر لیٹے ہوئے ہیں۔ گھر کے گوشے میں چڑے کا ایک کٹڑا تھا اور ایک دوپرانے بدن پر سے تھے، یہ دیکھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہہ کر رو رو پڑے۔ سرکار نے فرمایا: اے ابن خطاب! کیوں روتے ہو؟ عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے دیکھا کہ اللہ کا حبیب اس حال میں اور قیصر و کسریٰ ماز و نعمت میں ہیں۔ پھر اوپر والی حدیث کا وہ حصہ ہے جو مذکور ہوا۔ (امجد الممعات)

تکبر و تفاخر کی پیاری ایسی ہے کہ کم ہی کوئی اس سے بچا ہوگا۔ علما، پیران کرام اور عوام سب کو اس برائی میں مبتلا دیکھا جا رہا ہے، الا ماشاء اللہ۔ لہذا اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا علاج کیا ہے اور اس سے بچنے کی تدبیر کیا ہے؟ تو میں اپنی طرف سے کوئی تدبیر و تجویز نہ بتا کر حدیث پاک کے ہی ذخیرے سے اس کا علاج سامنے رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ حدیث ملاحظہ کریں:

”آدمی زیا و جہت بڑے بنے، عیش و آرام پانے اور مصائب و مشکلات سے بچنے کے لیے ہی تکبر کرتا ہے۔ اگر کوئی قناعت پسند ہو جائے تو خود بخود اس کے اندر سے تکبر کی بلا دور بھاگ جائے گی اور تواضع و صبر کا خور ہو جائے گا۔“

اللہ تبارک و تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو تکبر، تفاخر اور تعصب سے بچنے اور تواضع و انکساری اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بجاہ مبد المرسلین علیہم التحیۃ والتسلیم۔



محمد ساحل سعیدی (سرورِ بحیث سنگھ)

کفر سے ایمان تک

محمد ساحل سعیدی ۱۹۷۶ء میں پنجاب میں پیدا ہوئے۔ پیدائشی نام سرورِ بحیث سنگھ ہے۔ سید پور ضلع کپورتھلہ میں آج بھی آپ کا خاندان آباد ہے۔ والد کا نام پیارا سنگھ ہے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد آپ اپنے پیر و مرشد داعی اسلام حضرت شیخ ابو سعید دام ظلہ العالی کے خادم ہو گئے۔ آپ حضرت کی گاڑی ڈرائیو کرتے ہیں۔ اپنے مرشد کے اشاروں کو بھی سمجھتے ہیں۔ علم و دیوباری آپ کی عادت ہے۔ ہنکارنا اور خوش رہنا آپ کا شیوہ ہے، صبر و فکر آپ کی فطرت ہے اور آپ کی صحبت طالبین و سالکین کے لیے اکسیر ہے۔ ”کفر سے ایمان تک“ موصوف کی یہ داستان شوق قابل مطالعہ اور ایمان افزہ ہے۔ (ڈاکٹر)

میں سرورِ بحیث سنگھ، باپ کا نام پیارا سنگھ، سید پور ضلع کپورتھلہ پنجاب کا رہنے والا ہوں۔ ۱۹۷۶ء میں سکھ گھرانے میں پیدا ہوا۔ میں چار بھائیوں اور دو بہنوں میں سب سے چھوٹا ہوں۔ میرا گھرانہ میڈیم ہے، نہ بہت مال دار و نہ بہت غریب۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ سید پور میں سرکاری اسکول سے ۱۹۹۱ء میں ہائی اسکول پاس کیا، ۱۹۹۵ء میں سوٹر میکینک میں ڈپلومہ کیا، پھر ۱۹۹۸ء تک جالندھر میں ماروتی ورک شاپ پر کام کیا۔ اس کے بعد انگلینڈ جانے کا ارادہ تھا۔ ساری تیاری ہو گئی تھی مگر کچھ رکاوٹ آرہی تھی۔ میری ایک بہن جن کا نام جسوندر کور ہے، جو جالندھر میں رہتی ہیں، میں ان کے گھر جایا کرتا تھا۔ ان کے گھر ایک مسلم صوفی ڈاکٹر اصغر آیا کرتے تھے۔ چند بار ان سے میری بھی ملاقات تھی۔ جب انگلینڈ جانے میں رکاوٹ آئی تو میں دعا کروانے کے لیے ڈاکٹر صاحب کے پاس گیا۔ اس بار ان کے پاس بیٹھنے کا موقع ملا۔ ان کی

باتوں میں منہاس تھی۔ دل کو سکون ملا اور اب ان سے محبت ہو گئی اور یہ محبت بڑھتی گئی، یہاں تک کہ ان کے کہنے پر رمضان کا روزہ بھی رکھنے لگا۔ پہلے بھی میں کسی مذہب سے نفرت نہیں رکھتا تھا، اگرچہ میں سکھ مذہب کا پابند اور مذہبی رسومات ادا کرنے والا تھا۔ ڈاکٹر صاحب سے جب کچھ سوال کرتا تو وہ اپنے پیروں کے بارے میں کہتے کہ ان سے ملاقات کرواؤں گا، ان سے دعا کرواؤں گا۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب کے پیروں کے بارے میں سرکار شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ العالی جالندھر میں میری بہن کے گھر بھی آئے مگر میری ملاقات نہ ہوئی۔ دوسری بار ۱۹۹۹ء میں میرے سرکار انبالہ میں سبھاش چند (شہید احمد علی) کے گھر آئے اور میں چند دوستوں کے ساتھ ملاقات کی غرض سے انبالہ گیا۔ امید لگا رکھی تھی کہ سرکار دوعافر ما دیں گے اور انگلینڈ جانا کثفرم ہو جائے گا۔ مگر مالک کو سمجھا اور یہی منظور تھا۔

رات میں محفل سماع ہوئی، میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ محفل سماع میں بیٹھا رہا۔ سب لوگ سرکار کو نذرانہ پیش کر رہے تھے، میں نے بھی لوگوں کی طرح سرکار کو باریک داند نہ پیش کیا۔ زندگی میں پہلی بار میں نے کسی قوم کو دیکھا کہ وہ اپنے ”ست گرو“ سے اس طرح محبت کرتی ہے۔ تمام لوگ اپنے امیر کے فرماؤں پر دار اور جاں نثار ہیں۔ دوسرے دن ماسٹر نیا حسن جو پہلے ہندو مذہب سے تعلق رکھتے تھے، اس وقت انبالہ ہی میں ایک کتیا میں رہتے تھے، ان کی کتیا (خانقاہ) پر محفل سماع کا پروگرام ہوا، یہاں بھی میں حاضر تھا۔ اس بار بھی مجھ کو اچھا لگا اور دل کو سکون ملا۔ میں نے اسی محفل میں اسلام قبول کرنے کا ارادہ بنا لیا۔ قل کی فاتحہ کے بعد سرکار کے ایک خادم قاسم بابا سے بات چیت ہو رہی تھی، اس درمیان قاسم بابا نے مجھ کو نماز کی دعوت دی اور کہا کہ نماز پڑھا کرو تمہارا سکون باقی رہے گا۔

انبالہ سے واپسی کے بعد میں نماز بھی پڑھنے لگا اور مکمل روزہ بھی رکھتا تھا۔ اب میرا راوہ انگلینڈ جانے کا نہ تھا، اب یہ خیال تھا کہ کسی مسلم کنٹری میں جاؤں گا تا کہ دین اسلام کی پابندی بھی کرنا رہوں۔ ایک بار ڈاکٹر صاحب سے یہ ساری باتیں بتانے کے ساتھ ہی دعا کی درخواست کی اور اپنے ایمان کا اظہار کیا تو ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ کسی کے دباؤ یا لالچ میں تو اسلام قبول کرنا نہیں چاہتے ہو؟ میں نے کہا نہیں، میں اپنی مرضی اور خوشی سے اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب نے کلمہ پڑھایا اور غسل کرایا اور کچھ وظائف بتائے اور ہندی زبان میں ایک کتاب ”آفتاب عالم“ نام کی دی جو محمد ﷺ کی سیرت پر تھی۔ اس کے مطالعے کے بعد ایمان میں اور یقین پیدا ہوا۔ اس نعمت کے حاصل کرنے میں میری کوئی محنت نہ تھی۔ یہ سب ڈاکٹر اصغر مرحوم کی محبت اور انبالہ میں سرکار سے ملاقات کا نتیجہ تھا۔ اسلام قبول کرنے کا جو خیال محفل سماع میں پیدا ہوا تھا وہ

صرف ایک ہفتہ میں اقرار سے بدل گیا۔ ڈاکٹر صاحب سے محبت ہوئی تھی، اب اسلام سے محبت ہو گئی۔ یہ سب میرے سرکار کا کرم تھا۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ ادبی نعمت۔

اب میرے دل دماغ میں صرف اسلام تھا۔ میرا خیال تھا کہ انگلینڈ کی جگہ کسی عرب کنٹری میں چلا جاؤں تا کہ اسلام پر عمل کرتا رہوں۔ یہ سب کچھ ہوا مگر میں نے اپنے گھر والوں کو نہ بتایا، کیوں کہ میرے گھر والے کٹر سکھ تھے۔ ڈاکٹر اصغر مرحوم سے اگرچہ وہ لوگ بھی محبت کرتے تھے، مگر مجھ کو منع کرتے اور کہتے کہ ان کے پاس مت جایا کرو۔ مت بیٹھا کرو۔

۲۰۰۳ء کے شروع میں ڈاکٹر صاحب کی طبیعت بہت نیا وہ خراب ہوئی۔ پنجاب کے ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی آخری خواہش تھی کہ وہ سید سراواں شریف الہ آباد میں اپنے سرکار کے قدموں میں دفن ہوں۔ پرائیویٹ گاڑی سے ان کو اسی حالت میں لے کر ہم الہ آباد آ رہے تھے کہ ان پور میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ ان کے درجات کو بلند کرے۔

اس سفر میں میرے ساتھ حاجی اقبال صاحب بھی تھے، جو پنجاب کے رہنے والے ہیں۔ آپ بھی پہلے سکھ تھے اور آپ بھی سرکار کے ہاتھ پر اسلام لائے تھے اور ڈاکٹر صاحب کے ایک اور دوست جو پنڈت تھے اور ڈاکٹر صاحب کی بہن جو ان کو لینے پنجاب گئی تھیں، یہ سب لوگ میرے ساتھ تھے۔ پنجاب سے چلتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ تم رتنی جو تمہاری رشتہ دار بھی ہے اور تم سے پہلے اسلام قبول کیا ہے اور بہت نیک لڑکی ہے، جس کا اسلامی نام رابعہ ہے، اس کو کسی طرح الہ آباد سرکار کے پاس پہنچا دینا، ورنہ اللہ کی بارگاہ میں ہم سب کو جواب دینا ہوگا۔ رابعہ، میری بہن جسوند رکور جو جالندھر میں رتنی ہیں، کی منڈ ہے۔

ہم لوگ ڈاکٹر صاحب کی باڈی کو لے کر الہ آباد سرکار کے پاس حاضر ہو گئے، کفن و دفن ہوا، دو روز کے بعد میں نے جب پنجاب جانے کا ارادہ کیا تو سرکار نے روکا کہ تم یہیں رہو مگر ڈاکٹر صاحب کے وعدے کو پورا کرنے کے لیے سرکار سے اجازت لی اور پنجاب واپس ہو گیا۔ ۲۰۰۳ء ہی میں رمضان کے مہینے میں ۱۲ رمضان کو رابعہ کو لے کر ٹرین سے چلا، ۱۳ رمضان کو الہ آباد حاضر ہوا اور ۱۴ رمضان کو سرکار نے ہم دونوں کا نکاح کر دیا۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے سوچا بھی نہ تھا کہ رابعہ جو میری بہن کی منڈ ہوتی ہے، وہ میری بیوی ہوگی کیوں کہ سکھ مذہب کے مطابق یہ رشتہ نہیں ہو سکتا مگر وہی ہوا جو مالک کے ٹیک بندوں کو منظور تھا۔

الہ آباد کا شہر اگرچہ پسند نہ آتا تھا مگر خانقاہ کے اندر خوب دل لگتا تھا اور اب خانقاہ کی سوکھی روٹی اور چٹائی کا بستر ہی اچھا لگتا تھا۔ پنجاب سے چلتے وقت تقریباً ڈیڑھ لاکھ روپیہ بھی ساتھ تھا۔ دل میں خیال آیا کہ ان روپیوں سے ضرورت کی کچھ چیزیں جیسے تخت وغیرہ کا انتظام کر لوں مگر سرکار

نے فرمایا کہ کیا فقیری میں سکون نہیں ہے؟ اس کے بعد جو روپیہ پنجاب سے لایا تھا اس کو بیٹی کاموں پر خرچ کر دیا اور اپنے سارے مسائل سرکار پر چھوڑ دیے۔ اللہ کا فضل اور سرکار کا کرم رہا کہ آج تک کبھی ایسی پریشانی نہ آئی جو ہم کو ہمارے دین سے الگ کرے۔ نماز تو پہلے بھی پڑھتا تھا مگر سرکاری بارگاہ میں ایمان کی قوت اور شریعت کی پابندی کا جذبہ بڑھتا رہا۔ اللہ کا کرم ہے کہ خانقاہ میں آنے کے بعد جان بوجھ کر آج تک کوئی نماز قضا نہ کی، پیروں کا کرم ہے ورنہ میرے بس کا نہ تھا۔

رابعہ سے شادی کو کئی سال ہو گئے تھے مگر کوئی اولاد نہ ہوئی، لوگوں نے بار بار کہنا کہ سرکار سے گزارش کرو، دعا فرمادیں گے۔ یہاں سے تو غیر بھی خالی نہیں جاتے۔ مگر ہمیشہ یہ خیال آتا کہ ہو سکتا ہے کہ میری قسمت میں کوئی نیک اولاد نہ ہو، اس لیے سرکار دعا نہیں فرماتے۔ اللہ کا فضل اور پیروں کا کرم ہوا اور ۲۵ جولائی ۲۰۱۰ء کو ایک لڑکا پیدا ہوا، سرکار نے اس کا نام محمد زکریا رکھا۔

۲۰۰۳ء میں خانقاہ آنے کے بعد ایک دوپار کسب کے لیے کوشش بھی کی، مگر میں کچھ مذہب سے اسلام کی طرف آیا تھا۔ اس لیے کوئی مناسب کام ملنا چھوڑا دیا۔ آخر میں سرکار نے اپنا خادم بنالیا۔ سرکار جس گاڑی پر سوار ہوتے ہیں اس کی صفائی ستھرائی اور ڈرائیونگ کرنا میرا کام ہے، جس پر ہم اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

خانقاہ آنے کے بعد میرے گھر والوں نے کئی بار کوشش کی کہ میں اپنے گھر واپس چلا جاؤں، مگر میرے دل نے اس کو قبول نہ کیا اور نہ ہی سرکار کی اجازت ہوئی۔ دوپار تو میرے ماں باپ بھی مجھ کو لینے آئے، مگر نہ گیا۔ لوگوں کے کہنے اور سرکاری اجازت سے ۲۰۱۱ء کے رمضان میں اپنے آبائی وطن گیا۔ اپنے والدین اور بھائیوں سے ملاقات کی۔ ایک ہفتہ قیام رہا۔ دوست اور رشتہ دار ملنے آئے۔ سب نے محبتوں کا اظہار کیا۔ نماز ان لوگوں کے سامنے اپنے گھر بلکہ اپنے بھائیوں کے گھر پر ادا کرتا رہا۔ کوئی پریشانی نہ ہوئی۔ ان لوگوں کو اب یہ یقین ہو گیا ہے کہ ہر ذہنیت اب اسلام سے الگ نہیں ہو سکتا، اس لیے اب کوئی کوشش بھی نہیں کرتا، مگر میری کوشش ہے کہ وہ اسلام کی طرف آجائیں۔ ایک مالک کے بندے ہونے کا ثبوت دیں اور دین حق کے ماننے والے ہو جائیں تاکہ کل اللہ کی بارگاہ میں ہم سب اپنے سرکار ابومیاں کے ساتھ حاضر ہوں اور اللہ ہم سب سے راضی ہو جائے۔ ہمارے گھر والے اور دوست رشتہ دار بھی اللہ کے ابدی عذاب سے محفوظ ہو جائیں۔

باتیں تو بہت ہیں۔ مگر میں آخر میں صرف ایک بات عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ میں اسلام کی طرف تو مسلم صوفیوں کو دیکھ کر مائل ہوا، سب سے پہلے میں نے اس اسلام کو دیکھا جو مسلم صوفیوں نے اپنے کروار سے پیش کیا۔ اسلام لانے کا سبب تو ان کی محبت، ان کا کردار اور

ان کی سچائی تھی۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سچائی حقیقت میں اسلام کی سچائی ہے اور صوفیہ ہی اسلام کے سچے پرچارک اور مبلغ ہیں۔ انھوں نے اسلام کو اپنی زندگی میں ڈھال لیا جو ان کو دیکھتا ہے، جو ان سے ملتا ہے، وہ گویا اسلام سے مل جاتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ سب سے زیادہ انسانوں کی ہدایت کا کام ان صوفیوں ہی کے ذریعے ہوا ہے۔

مجھے اسلام کی جو بات سب سے اچھی معلوم ہوئی، وہ یہ کہ یہاں ایک مالک کو مانا بھی جاتا ہے اور ایک ہی کی پوجا بھی کی جاتی ہے۔ یوں تو ”سب کا مالک ایک“ کا لفظ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب لگتے ہیں، مگر وہ ایک مالک کون ہے، کیسا ہے، اس کو ڈیٹا کن کرنے سے اسلام کے علاوہ ہر مذہب عاجز ہے۔ قرآن کی ایک چھوٹی سورت سورہ اخلاص نے ایک مالک کا جیسا تعارف پیش کیا ہے وہ دوسرے کسی مذہب میں نہیں ہے۔ قل هو اللہ احد اللہ ایک ہے۔ اللہ الصمد اللہ بے نیاز ہے۔ لم یلد ولم یولد نہ اس نے کسی کو جنم دیا اور نہ اس کو کسی نے جنم دیا یعنی نہ وہ باپ ہے نہ بیٹا۔ اگر وہ باپ ہوتا تو اس کا بیٹا بھی خدا ہوتا اور یہ نسل جاری رہتی تو خداؤں کی بھیڑ لگ جاتی جیسا کہ ہندو مذہب میں ہے۔ اور اگر ایسا نہیں تو پھر وہ کامل خدا نہیں ہو سکتا کیوں کہ یہ عیب ہے کہ خدا کا بیٹا خدا نہ ہو، بلکہ انسان ہو، جیسے اگر کسی انسان کی اولاد چانو رہو تو یہ اس انسان کے لیے عیب کی بات ہوگی۔ اور اللہ ہر عیب و کمی سے پاک ہے۔ عیسائیوں نے خدا کو حضرت عیسیٰ روح اللہ کا باپ بنا کر عیب دار کیا اور گمراہ ہوئے۔ مگر اسلام وہ اسلام جو ہم کو مسلم صوفیوں سے ملا، جس اسلام کو ہم نے اپنے پیر کے ذریعے حاصل کیا اور ان کی صحبت میں جو اسلامی تعلیمات حاصل ہوئیں، اس میں ایسا ہی تعارف کرایا گیا ہے، جو سورہ اخلاص میں موجود ہے۔ اسی پر ہمارا ایمان و عقیدہ ہے۔ خدا ہر عیب و نقص سے پاک ہے اور کوئی بھی اس کے برابر ہی کا نہیں ہے۔ ولیم یکن لہ کفؤ احد کوئی اس کا برابر اور ہمسر نہیں۔ وہ سب کا مالک ہے۔ اس کا کوئی پیدا کرنے والا نہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہے، وہ ہمیشہ رہنے والا ہے، اس کو فنا نہیں ہے۔

مسلم صوفی اسی بے عیب، بے نیاز اور محتار کل ایک مالک کی طرف انسانوں کو بلاتے ہیں۔ وہ جس طرح دوست کی ہدایت کے خواہش مند ہوتے ہیں، وہ اپنے دشمنوں کو بھی اسی مالک کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اصل اسلام اور حقیقی دین، نیک اعمال، پاک خیالات اور عمدہ عادات و اطوار کا مجموعہ ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسلام، ایمان اور احسان کے مجموعہ کو کہہ سکتے ہیں اور صوفیہ بیک وقت ان تینوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ شریعت کی پابندی ان سے بہتر شاید ہی کوئی کرے۔ توحید اور عقیدہ کو ان سے زیادہ واضح شاید ہی کوئی دوسرا بیان کر سکے۔ انسانوں بلکہ جانوروں کے ساتھ بھی ان سے بہتر سلوک کرنے والا دوسرا مشکل ہی سے نظر آئے گا۔

یہ ساری چیزیں بس ہم کو ہمارے پیروں میں سکھایا اور سکھا رہے ہیں۔ ابھی تک میں جتنا ان کے قریب گیا اتنا حیران رہا اور جس قدر اللہ اور رسول اور ان کی تعلیمات کے بارے میں جانتا جا رہا ہوں اسی قدر میرے ایمان و یقین میں مضبوطی آرہی ہے اور اسی قدر شریعت پر عمل کرنا میرے لیے آسان ہوتا چلا جا رہا ہے۔ میری ولی خواہش ہے کہ میرے پیروں کا پیغام پوری دنیا میں عام ہو جائے اور لوگ جھگڑا لڑائی، بغض و حسد، کینہ اور دشمنی سے باز آجائیں اور دوسرے انسانوں کو اپنا بھائی جانیں اور ایک مالک سے اپنا رشتہ مضبوط کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں۔ اللہ کہنے سے زیادہ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین



رابعہ خاتون (رجنی)

رجنی سے رابعہ: ایک ایمانی سفر

رابعہ خاتون ۱۹۷۸ء میں جالندھر، پنجاب میں پیدا ہوئیں۔ پیدائشی نام رجنی ہے۔ ۲۰۰۳ء میں خانقاہ عالیہ عارفیہ سیدسراواں الہ آباد پہنچیں جب کہ اسلام کی دولت ان کو میسر آچکی تھی۔ داعی اسلام حضرت شیخ ابوسعید محمد غلام العالی نے ان کا اسلامی نام رابعہ رکھا۔ موصوفہ بہت ہی نیک اور باعمل خاتون ہیں۔ ان کی باتوں میں بلا کا اثر ہے۔ سیکڑوں مسلم عورتیں ان کے ذریعے تائب ہو چکی ہیں۔ جو بھی ان کی باتیں سنتا ہے وہ جذب و کیف کا لطف اٹھائے بغیر نہیں رہتا۔ حضرت داعی اسلام نے ان کو محضر حاضر کی رابعہ بصریہ اور رابعہ ثانیہ فرمایا ہے۔ آج کل یہ مستقل خانقاہ عارفیہ سیدسراواں دہلی میں اپنے شوہر ساحل سعیدی (سرفہریت سنگھ) کے ساتھ رہتی ہیں اور دعوت و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ رجنی سے رابعہ تک کا ان کا ایمانی سفر عبرت انگیز بھی ہے اور پر کیف و نشاط انگیز بھی۔ (لاورہ)

میرا نام رجنی ہے۔ میں ۱۹۷۸ء میں محلہ تچ مہن گمر، ہشتی شیخ، گلی نمبر ۵، جالندھر پنجاب کے ایک متوسط سکھ گھرانے میں پیدا ہوئی۔ باپ کا نام پورن سنگھ جو ایک ایماندار ڈرائیور تھے، کمپنی کی گاڑی چلاتے تھے۔ کمپنی کے ذمہ دار لوگ ان پر بہت بھروسہ کرتے تھے۔ میں تین بھائیوں اور چھ بہنوں میں سب سے چھوٹی ہوں۔ سب سے بڑی بہن کا نام راج رائی ہے، دوسری بہن کا نام نرملہ عرف بلویدی (۳) رملہ (۴) نیلم (۵) جسوندر۔ تین بھائی (۱) سکھ دیو سنگھ (۲) سوم ناتھ سنگھ (۳) سرندر سنگھ۔ ۲ کلاسوں میں تک ہم نے اپنے شہر میں اسکول سے تعلیم حاصل کی۔

۱۹۹۲ء یا ۱۹۹۳ء کا واقعہ ہے کہ میری والدہ کی طبیعت خراب ہو گئی۔ دوا علاج سے کوئی فائدہ

نہ ہوا۔ جالندھر میں اجیر سے ایک غلام رسول نام کے بابا آیا کرتے تھے۔ لوگ ان سے خوب دعا کروا دیتے تھے۔ میرے بھی دل میں خیال آیا کہ اپنی والدہ کے لیے ان سے دعا کی درخواست کروں۔ اچانک ایک دن میں نے روتے ہوئے ان کا دامن پکڑ لیا اور دعا کی گزارش کی۔ انہوں نے میری والدہ کے لیے دعا کی اور تعویذ دیا۔ بابا غلام رسول کے ذریعے جالندھر کے بہت سارے سکھ لوگ اپنی پوری فیملی کے ساتھ اجیر جاتے تھے۔ ۱۹۹۵ء میں میری والدہ کا انتقال ہو گیا۔ ۱۹۹۶ء میں، میں بھی پہلی بار اجیر گئی۔ بابا غلام رسول کے گھر پر ہمارے تمام سانھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ میں بھی ان ہی لوگوں کے ساتھ تھی۔ یہاں میں نے پہلی بار مسلم عورتوں کو نقاب میں دیکھا۔ اسی وقت میرے دل میں خیال آیا کہ کاش میں بھی ان مسلم عورتوں کی طرح نقاب پہنتی تو اچھا لگتا۔ اجیر سے میں پنجاب آ تو گئی مگر میرا دل اجیر ہی کی طرف کھینچا جا رہا تھا۔ خواجہ کے دربار میں حاضری کے بعد جب اجیر سے روانہ ہونے لگی تو مجھے نہیں معلوم کہ میں کیوں رونے لگی۔ بابا غلام رسول کا ایک چھوٹا لڑکا تھا جس نے مجھ کو روتے ہوئے دیکھ کر نذرانہ میں کچھ روپیہ اور ایک چادر دی۔

۱۹۹۷ء میں اجیر کا دوسرا سفر تھا مگر اس سے قبل اسلام کی محبت اور مسلم کلچر اپنانے کی خواہش میرے دل میں جگہ بنا چکی تھی اور میں روزہ بھی رکھنے لگی تھی۔ میری دو بہنیں غلام رسول بابا کے ہاتھ پر اسلام بھی قبول کر چکی تھیں۔ جالندھر میں ایک مسلم لڑکا تھا جو ہم لوگوں سے اسلام کی وجہ سے محبت رکھتا تھا۔ ایک بار ان کے گھر ایک پروگرام ہوا۔ ہم لوگوں کو بھی دعوت دی۔ میں اپنی بہنوں کے ساتھ اس کے گھر گئی۔ اس کے گھر میں ایک تخت پر میں بیٹھ گئی۔ اس کی والدہ نے مجھ کو یہ کہتے ہوئے ڈانٹا کہ تم لوگ ناپاک ہو اور میرے اس تخت پر بیٹھ گئی جہاں اللہ کا کلام قرآن رکھا ہوا ہے۔ یہ کہتے ہوئے اس نے مجھ کو تخت سے اٹھا دیا۔ اس وقت مجھ کو بہت دکھ ہوا۔ میں رونے لگی اور مایوس اپنے گھر واپس ہو گئی۔ مگر میرے دل میں یہ خیال بار بار رہا کہ کیا میں قرآن نہیں چھو سکتی اور کیا میں اس کو نہیں پڑھ سکتی؟

۱۹۹۷ء میں جب دوسری بار اجیر کے سفر کا ارادہ ہوا تو میرے دل و دماغ میں صرف ایک بات تھی، وہ یہ کہ اس بار خواجہ صاحب سے میں اپنے دل کی بات کہوں گی اور دعا کروں گی کہ خواجہ! تو ہم کو بھی مسلم عورتوں کی طرح نقاب پہننے اور قرآن پڑھنے والی بنا دے۔ خواجہ صاحب سے ان کے روٹنے پر بیٹھ کر مسلسل یہ دعا کرتی رہی۔ جب روضہ کے اندر داخل ہوئی تو خادم نے خواجہ صاحب کے مزار سے ایک چادر لے کر میرے سر پر ڈال دی۔ مجھ کو ایسا لگا کہ میری مراد پوری ہو گئی۔ اس سفر سے واپسی کے بعد مکمل طور پر میرا دل اسلام کو قبول کر چکا تھا۔

بابا غلام رسول صاحب کے ساتھ ایک ڈاکٹر اصغر صاحب آیا کرتے تھے۔ وہ اکثر میرے

گھر بھی آتے جاتے تھے۔ میری دو بہنیں، اپنے شوہروں کے ساتھ ڈاکٹر صاحب ہی کی کوشش سے اسلام بھی قبول کر چکی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب میری بھی تربیت کرتے تھے۔ ہندی زبان میں ڈاکٹر صاحب نے مجھ کو تین کتابیں (۱) آفتاب عالم (۲) قرآن مجید (۳) معرکہ کربلا دی تھیں۔ میں اکثر ان کتابوں کو پڑھتی تھی ستر قرآن کا ترجمہ بھی پڑھتی تھی۔ ان کتابوں کو پڑھنے سے اسلام کی محبت بڑھتی گئی۔ ایک دن آیا کہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے اپنا سارا حال سنا دیا۔ انہوں نے مجھ کو کلہ پڑھایا اور روزہ رکھنے اور نماز پڑھنے کو کہا۔ روزہ رکھنا تو آسان تھا مگر نماز پڑھنا میرے لیے مشکل تھا۔ ۱۹۹۸ء کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے پیر و مرشد ہمارے سرکار میاں حضور (شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی) ہمارے گھر تشریف لائے، میں نے ان کو وضو کا پانی دیا۔ انہوں نے دعا دی اور کہا کہ بیٹا! نماز کی پابندی کرنا، میں نے روتے ہوئے عرض کیا سرکار میں روزہ تو رکھ سکتی ہوں، لیکن نماز کیسے پڑھوں؟ سرکار نے ڈاکٹر صاحب کو نماز سکھانے کا حکم دیا۔ ڈاکٹر صاحب ہندی زبان میں سورہ دعا وغیرہ لکھ کر دینے لگے۔ میں یاد کرتی گئی، میرا اس کے علاوہ کوئی کام بھی نہ تھا اور دوسرے کاموں میں میرا دل بھی نہیں لگتا تھا۔ نماز پڑھنا بھی مجھ کو جلد ہی آ گیا۔

جب میں نماز کی پابندی کرنے لگی تو میرے گھر والوں نے مجھ پر سختی شروع کر دی اور مجھ کو ہر طرح سے پریشان کرنا چاہا۔ مگر میں ہر حال میں اپنے مالک کو یاد کرتی رہی۔ ایسے حالات میں میری بہن راج رانی نے میرا ساتھ دیا اور گھر والوں کو سمجھایا کہ وہ مالک کو یاد دہی تو کرتی ہے، کوئی غلطی تو نہیں ہے۔ اس کے بعد کافی حد تک میرے گھر والے نرم ہو گئے۔

میرے گھر کے پیچھے تھوڑی دوری پر ایک مزار بھی تھا، جہاں میں بچپن ہی سے جایا کرتی تھی اور صفائی ستھرائی کر کے واپس آ جاتی۔ یہ مجھ کو اچھا لگتا تھا، مگر چہ اس وقت مجھ کو کچھ بھی معلوم نہ تھا۔ میرے گھر والوں نے جب پریشان کرنا شروع کیا تو میں کبھی کبھی اس مزار پر جاتی یا اپنے گھر کی چھت ہی سے اس مزار کی طرف متوجہ ہو کر اللہ سے دعا کرتی اور مجھ کو سکون ملتا تھا۔

اسی دور میں میری شادی کا مسئلہ بھی آیا۔ کئی رشتے آئے۔ پہلے تو میں شادی سے انکار کرتی رہی، بعد میں، میں نے یہ شرط لگا دی کہ جس سے میں شادی کروں گی وہ اسلام قبول کر لے مگر ایسا بھی نہ ہوا۔ آخر کار میری بہنوں کا بھی اب دباؤ شروع ہو گیا۔ باپ بھائی تو پہلے ہی سے ناراض تھے، اب بہنوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ ایک لڑکا جو ۵۵ ہزار روپیہ مہینہ کماتا تھا، اس کا رشتہ آیا۔ اس کے گھر والے مجھ کو دیکھنے آئے۔ ان لوگوں نے پسند بھی کر لیا۔ اب میرے سامنے انکار کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہ تھا۔ اب میرے اوپر سختی بڑھتی گئی۔ نماز پر پابندی لگ گئی۔ گھر میں بند کر دیا گیا۔ میں صرف روتی رہتی تھی اور اپنے سرکار میاں کو یاد کرتی اور ان کو خط لکھتی کہ مجھ

کو اس کفر کی واہی سے سرکار جلد نکال لیا جائے اور اپنی خانقاہ میں تھوڑی سی جگہ دے دیں، میں وہیں پڑی رہوں گی۔

وہ دور تھا جب میں اکثر خواجہ صاحب کو خواب میں دیکھتی اور ان سے اپنے سارے حالات بیان کرتی۔ وہ مجھ کو تسلی دیتے اور کہتے جلد تم یہاں سے دوسری جگہ چلی جاؤ گی۔ لیکن میری کوشش تھی کہ اب میری شادی کسی مسلم لڑکے کے ساتھ ایسی جگہ ہو کہ جہاں مجھ کو چاروں طرف سے اذان کی آواز سنائی دے اور اسلام پر عمل کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ سرکار ابو میاں سے ملاقات ۱۹۹۸ء میں ہوئی۔ دوسری ملاقات ۱۹۹۹ء میں انہاں میں سبھا ش چند کے گھر ہوئی تھی۔ پہلی ملاقات ہی ایسی تھی کہ ان کی کریم اور رحیمی کو دیکھ کر سب کچھ انہی کو مان لیا تھا۔ ہر دو گھر میں ان ہی کو پکارتی تھی۔ ہر غم بزدل رعبہ خط ان ہی سے بیان کرتی تھی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ڈاکٹر اصغر صاحب جنہوں نے ہم کو اسلام کی دعوت دی، اور میاں حضور جیسا پیر و مرشد دیا، ایک لمبے عرصے تک غلام رسول بابا کی صحبت میں رہنے کے بعد جب ان کو کچھ نہ ملا تو مولوی عبدالقیوم صاحب کے ذریعے سرکار ابو میاں کے پاس حاضر ہوئے اور خود بھی میاں کے ہو گئے اور ہم جیسے گمراہ لوگوں کو بھی اس دیگاہ کے غلاموں میں شامل کر دیا۔

سردیجیت سنگھ جو میری بھائی کے بھائی ہیں، وہ میرے گھر آیا کرتے تھے۔ ان سے میری گفتگو بھی ہوتی تھی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے ان کو بھی اسلام کی دعوت دی اور ۱۹۹۹ء میں ہمارے ساتھ یہ بھی میاں حضور سے ملنے کے لیے انہاں آئے تھے۔ اسی وقت ان کی دنیا بدل گئی تھی۔ اب ان سے میری نسبت بھی بڑھ گئی۔ سکھ مذہب کے مطابق ہم دونوں کا رشتہ جائز نہیں، مگر اب جب کہ ہم دونوں اسلام قبول کر چکے تھے تو میرے دل میں آیا کہ ہم دونوں اسلام میں ایک دوسرے کے مددگار ہو سکتے ہیں اور دونوں اپنی اجتماعی زندگی بھی گزار سکتے ہیں۔ یہ بات میں نے اپنے پیر و مرشد میاں حضور سے اس وقت عرض کی جب ڈاکٹر اصغر مرحوم کو لے کر سردیجیت الہ آباد خانقاہ شریف میں آئے تھے اور پیر و مرشد نے میری اس بات کی لاج بھی رکھ لی۔

۱۹۹۸ء سے ۲۰۰۳ء تک سرکار میاں حضور سے بڑی رعبہ خط اپنے سارے حالات بیان کرتی رہی اور امید لگا رکھی تھی کہ کوئی دن آئے گا جب مجھ کو میرے سرکار کے قدموں میں جگہ مل جائے گی۔ ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر اصغر صاحب کی طبیعت جب زیادہ خراب ہو گئی اور پنجاب سے الہ آباد آنے ہی میں انتقال ہو گیا اور وہ خانقاہ شریف الہ آباد میں مدفون بھی ہو گئے تو اب پنجاب میں میرا بظاہر کوئی سہارا نہ رہا۔

سردیجیت جو ڈاکٹر اصغر صاحب کے ذریعے ہی اسلام قبول کر چکے تھے، انہوں نے خفیہ

پلان بنایا اور الہ آباد کے لیے سفر کا ارادہ کر لیا۔ گورگچہر کا ایک مسلم لڑکا جو میرے گھر کے پاس ہی دوکان میں کام کرتا تھا، اس نے بھی ہماری مدد کی۔ خانقاہ آنے سے پہلے میں نے اس سے گزارش کی کہ تم ہمارا سامان الہ آباد پہنچا دو، پہلے تو اس نے انکار کیا اور معافی مانگی کہ تمہارے بھائی، باپ مجھ کو مار ڈالیں گے، مگر جب میں نے اللہ و رسول کا واسطہ دیا اور عرض کیا کہ میرا سامان ہی کیا ہے، چند کپڑے ہیں اور چند کتابیں ہیں جن کے ذریعے میں نے اللہ، رسول کو جانا ہے، جن میں قرآن پاک بھی ہے۔ اگر ہم نے ان کتابوں کو گھر میں چھوڑا تو لوگ اس کی عزت نہ کریں گے اور اس کا عذاب ہم کو ہو گا۔ اس لڑکے نے ہمارا ساتھ دینے کا وعدہ کیا اور پھر ہمارے الہ آباد آنے سے ایک ہفتہ پہلے ہمارا تھوڑا سا سامان تھا اس کو الہ آباد خانقاہ میں پہنچا دیا۔ اللہ اس کا دنیا اور آخرت میں بھلا کرے۔

ڈاکٹر اصغر صاحب جو پنجاب ہی میں رہتے اور لوگوں سے محبت اور نرمی کا سلوک کرتے، سارے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ میرے گھر والے بھی ان کا احترام کرتے تھے۔ میرے اسلام لانے کے بعد بھی میرے گھر والوں نے ڈاکٹر صاحب کو کچھ نہ کہا اور ان کی عزت کرتے رہے۔ بلکہ ۲۰۰۳ء میں ڈاکٹر صاحب کا جب انتقال ہو گیا تو میرے باپا کے ساتھ پیری بنین راج رانی اور نرملہ عرف بلویدی بھی خانقاہ آئی تھیں اور میاں حضور سے ملاقات بھی کی تھیں۔ راج رانی تو اس کے علاوہ بھی دوبار خانقاہ آچکی ہے۔ ہماری دو بہنیں جنہوں نے اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ بابا غلام رسول کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا تھا ان میں ایک تو نرملہ عرف بلویدی، شوہر کا نام بلجیت سنگھ جو جالندھر کے رہنے والے ہیں، ان کے دو بچوں کا تختہ بھی ہوا، بلجیت سنگھ نے حج بھی کیا، مگر افسوس کہ آج تک مکمل طور پر اسلام میں داخل نہ ہو سکے۔ دوسری ارملہ، شوہر کا نام بلد یو سنگھ، یہ جالندھر کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے ہیں، ارملہ کی مافی الحال بہت اچھی تھی، مگر ایک دور بہت خراب بھی آیا۔ اسی دور میں اپنے زیورات بیچ کر وہ مجھ سے ملنے کے لیے الہ آباد آئی تھی۔ سننے میں آیا ہے کہ ۲۰۱۰ء میں اس کا انتقال بھی ہو گیا۔ ان کے بچوں سے اس وقت میرا رابطہ نہیں ہے۔

ہماری ان دونوں بہنوں اور ان کے گھر والوں کو صحیح طور پر اسلام کی تعلیمات سے آگاہ کرنے والا کوئی نہ ملا۔ اسلام کی حقانیت نے ان کو اپنی طرف کھینچا اور اسلام کا اقرار تو ہوا مگر دلوں میں ایمان داخل نہ ہوا جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ دو کشتی پر سوار رہے اور شیطان نے اپنا کام کیا یا تو گمراہ ہو گئے یا ہم سے راستے پر چل پڑے۔ اسلام کا حاصل ہونا تو آسان تھا مگر ایمان کی دولت تو صرف مخلص بندوں کی صحبت ہی میں مل سکتی ہے۔ میرے سرکار نے بار بار بتایا کہ اسلام لانے اور بظاہر کلمہ پڑھ لینے سے دنیا میں تو آدمی مسلمان کہلائے گا مگر آخرت کی کامیابی کا دار و مدار ایمان پر ہے۔ یہ تو اللہ کا خاص فضل ہوا کہ اس نے مجھ جیسے ناپاک انسان کو سرکار میاں حضور جیسے پیر کی بارگاہ

میں لا کر رکھ دیا جہاں ہم کو سب کچھ ملا۔ میں نے پیر پالیا، ان کو پا کر میں نے اللہ و رسول، ماں باپ سب کو پالیا۔ ان کے گھر والوں نے بھی ہم کو ہمیشہ اپنے بھائی بہن کا سہارا دیا۔ ہمارا پیر ہی ہمارے لیے سب کچھ ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ ہمارے پیر کی زندگی لمبی کرے اور زیادہ سے زیادہ لوگ ان سے فیض یاب ہوں۔ جن کو میرے سرکار کی طرح مرشد مل جائے گا وہ کبھی گمراہ نہ ہوگا، شرط ہے کہ ان کی صحبت میں کچھ دن رہے۔ ان کی صحبت میں دل زندہ ہوتا ہے، ایمان و یقین حاصل ہوتا ہے، ان کے دیدار سے اللہ یاد آتا ہے اور ان کی گفتگو سے حق و باطل، حلال و حرام کا فرق معلوم ہوتا ہے۔

۲۰۰۳ء میں رمضان کے مہینے میں سرفوجیت جواب ہمارے شو ہر بھی ہیں اور ہمارے سرکار کے خادم بھی۔ ان کے ساتھ الہ آباد آگئی۔ الہ آباد اسٹیشن سے چند کلومیٹر کی دوری پر منڈیرہ میں ہم لوگ ٹھہرے، دوسرے ہی دن وہاں ہی ہم دونوں کا نکاح ہوا اور پھر تین چار دنوں کے بعد سپد سراواں شریف سرکار کے پاس خانقاہ میں حاضر ہو گئے۔

خانقاہ آنے سے پہلے میں دوپہر راجپور شریف خواجہ صاحب کے دربار میں حاضر ہوئی۔ اس کے علاوہ دہلی میں سلطان جی (سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا) اور قطب صاحب (حضرت قطب الدین گجراتی) اور بعلی شاہ تلہ پانی پت اور صاحب پاک کبیر شریف میں بھی حاضر ہو چکی تھی۔ کبیر میں حاضری کے وقت ایک فقیر سے ملاقات ہوئی تھی جنہوں نے دعائیں دیں اور اپنی ایک تصویر بھی دی اور کہا تھا بیٹی جب کبھی کوئی پریشانی ہو تو اس تصویر سے کہتا، مگر اللہ کا کرم کہ میاں کی صورت میں ایسی تصویر مل گئی کہ کوئی حاجت ہی نہ رہی۔ میں نے اپنے گھر والوں کو چھوڑا، مگر میاں کو پا کر اور ان کے گھر والے حسن سرکار، حسین سرکار، علی سرکار، زینب آپا، فاطمہ آپا، ان سب کو پا کر میں خوش ہوں، بلکہ اللہ کا شکر ادا کرتی ہوں کہ میاں کی صورت میں اتنا اچھا باپ اور پیرانی جی کی صورت میں اتنی اچھی ماں مل گئی۔ حسن بھائی، حسین بھائی، علی بھائی نے اپنے بھائی بہن سے زیادہ پیار دیا۔ خواجہ صاحب کا بڑا کرم رہا کہ انھوں نے میری دعا سن لی اور میاں جیسا حقیقی پیر دیا، پیر، شوہر، اولاد، سامان سب کچھ مل گیا۔ میاں کو پا کر سب کچھ پالیا۔ جہاں بھی میں جاتی ہوں وہاں لوگ میری عزت کرتے ہیں اور میری بات بھی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ سب میرے میاں کا کرم ہے۔ میری عزت صرف میاں کی وجہ سے ہے۔ ورنہ لوگ اگر ہماری حقیقت جان جائیں تو کوئی ہماری طرف جھوکتا بھی پسند نہ کرے۔ دعا ہے کہ اللہ میرے میاں کو لمبی عمر عطا کرے اور ان سے پہلے ہم اس دنیا سے چلے جائیں۔

۲۰۰۳ء میں ہم جب گھر (پنجاب) سے خانقاہ (الہ آباد) آ گئے تو دس دن کے بعد

میرے والد کا انتقال ہو گیا۔ میرے بھائیوں کا کہنا ہے کہ تمہاری وجہ سے پا پا ختم ہو گئے، جب کہ موت و حیات اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا وقت متعین ہے۔ یوں ہی میری شادی کو کئی سال ہو گئے تھے اور کوئی اولاد نہ ہوئی اور لوگ بھی کچھ کہنے لگے تھے مگر میں ہمیشہ اللہ سے دعا کرتی تھی کہ مولیٰ! اولاد دینا تو نیک اور اپنی راہ پر چلنے والا دینا۔ اللہ کا خاص کرم ہوا اور ۲۵ جولائی ۲۰۱۰ء کو ایک لڑکا ہوا جس کو دیکھنے سرکار ہاسپتال گئے اور تمام لوگوں نے مبارکباد دی سرکار نے اس کا نام محمد زکریا رکھا۔

اب میری ولی خواہش ہے کہ میں سچی سچی مسلمان ہو جاؤں، اپنے پیر کے نقش قدم پر چلنے والی ہو جاؤں، ظاہر و باطن ایک ہو جائے، کسی کو ہم سے تکلیف نہ ہو، میری زبان اور ہاتھ سے سارے لوگ محفوظ رہیں، میں اس عورت کو بھی دعا دیتی ہوں جس نے ہم کو ڈانٹا تھا، اس کا بھی شکریہ ادا کرتی ہوں کہ اس کی وجہ سے میرے دل میں قرآن اور اسلام کی محبت آئی۔

غلام رسول بابا کے حق میں بھی میں دعا کرتی ہوں کہ اگر ہم کو یہ ملے ہو تو شاید میں حق کی طرف نہ آتی۔ میرا دل یہ کہتا ہے کہ میں پوری دنیا میں اسلام کو پہنچا دوں اور اپنے میاں کے مشن کو دنیا میں پھیلا دوں۔ میں اپنے گھر والوں کے لیے اور دوسروں کے لیے بھی پریشان ہوں کہ سب حق کی طرف آجائیں اور پوری دنیا حق اور سچ کو جان جائے۔ میرے گھر والوں کا اسلام کی طرف آنا ظاہر میں تھوڑا مشکل لگتا ہے مگر میرے میاں کی توجہ ہو جائے تو سب حق کی طرف آجائیں گے۔ یہ صرف کرم کی بات ہے ورنہ کون ہے جو ہدایت پا جائے، کمال اسلام قبول کرنے والے کا نہیں ہے بلکہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے ہم جیسے کتوں کو اسلام جیسی نعمت دی۔ میری خواہش ہے کہ اس کو جو کوئی پڑھے وہ میرے حق میں دعا کرے کہ اللہ ہم سے راضی ہو جائے اور اپنے دین کا کام لے لے اور میرے میاں سے ملنے آئے اور ان سے دین کو جاننے کی کوشش کرے۔

○○○

تحقیق و تنقید

تصوف اور صوفیہ: علامہ ابن حجر کی پیم کی نظر میں

تصوف اور صوفیہ کرام کے بارے میں بالعموم افراط یا تفریط سے کام لیا جاتا ہے۔ صحیح نقطہ نظر قائم کر کے تصوف اور صوفیہ سے متعلق معتدل رائے اختیار کرنا نہایت ضروری ہے۔ ایک گروہ صوفیہ اور تصوف کے حوالے سے مبالغہ آمیز تعریف کرتا ہے، دوسرا گروہ انہیں برا بھلا کہتا ہے، جب کہ تیسرا گروہ اعتدال و انصاف کی راہ پر ہے۔ یہ تیسرا گروہ ان بالغ نظر علما و محققین کا ہے جنہوں نے تصوف کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے اور اس فن کو میزان شریعت پر تولنے کے بعد ہی یہ اعتدال پسندانہ موقف اختیار کیا ہے۔ علامہ ابن حجر کی قیمی قدس سرہ (متوفی: ۸۰۷ھ) کا شمار ان علما و محدثین میں ہوتا ہے جو تصوف اور صوفیہ کرام کے بارے میں مسلک اعتدال پر قائم ہیں۔

شیخ تقی الدین ابن تیمیہ لکھتے ہیں: قطائفہ ذمت الصوفیۃ والتصوف وقالموا: إنهم مبتدعون خارجون عن السنة..... وطائفة غلت فيهم فادعوا أنهم أفضل الخلق وأكملهم بعد الأنبياء وكلا طرفي هذه الأمور ذميم والصواب أنهم مجتهدون في طاعة الله كما اجتهد غيرهم من أهل طاعة الله.

(مجموعہ فتاویٰ احمد بن تیمیہ ۱۸/۱، مکتبہ ابن تیمیہ، بیروت)

ترجمہ: تصوف اور صوفیہ کرام کے بارے میں لوگ تین خانوں میں بیٹے ہوئے ہیں: پہلا گروہ ان کا کہنا ہے کہ تصوف اور اس کی نمائندگی کرنے والے صوفیہ کرام بدعتی اور دائرہ شریعت سے خارج ہیں۔

دوسرا گروہ صوفیہ اور تصوف کے حق میں غلو اور افراط سے کام لیتا ہے، یہاں تک کہ یہ گروہ صوفیہ عقلم کو انبیاء کرام کے بعد افضل ترین مخلوق سمجھتا ہے۔ یہ دونوں طریقے غلط ہیں۔ درست قول اور سچی بات تو یہی ہے کہ صوفیہ کرام طاعت الہی اور عبادتِ خداوندی میں حد درجہ مشقت اٹھاتے والے ہیں۔

بقول ابن تیمیہ جوگر وہ اطاعت خداوندی میں بہت زیادہ اجتہاد اور مشقت اٹھاتا ہو بھلا وہ اپنے علم و عمل کی بنیاد کتاب و سنت کے بجائے اسرار و رموز پر کیسے رکھ سکتا ہے؟

علامہ ابن جوزی جیسے صوفیہ کے مخالف بھی یہ کہنے پر مجبور ہیں: وما كان المتقدمون في التصوف إلا رؤساء في القرآن والفقه والحديث والتفسير. (تلمیس التلمیس ص: ۳۴۵)

یعنی صوفیہ معتقدین قرآن و حدیث، فقہ اور تفسیر میں بلند مقام پر فائز ہوا کرتے۔

بہر کیف! اب اصل موضوع کی طرف پلٹتے ہیں اور علامہ ابن حجر مکی دہلی کے افکار کے تناظر میں تصوف اور صوفیہ پر روشنی ڈالتے ہیں۔

علامہ ابن حجر مکی دہلی

علامہ ابن حجر مکی دہلی قدس سرہ دسویں صدی ہجری کی مایہ ناز شخصیت کا نام ہے۔ ابن حجر مکی صرف محدث یا فقیہ نہیں تھے، بلکہ مروجہ علوم و فنون پر مجتہدانہ بصیرت اور کامل دست گاہ رکھنے والے اپنے دور کے زبردست عالم اور بلند پایہ محقق بھی تھے۔ خاتم المحققین آپ کا مشہور لقب ہے۔

پورا نام ابو العباس شہاب الدین احمد بن محمد بن علی بن حجر مکی دہلی شافعی ہے۔ ۱۲۹۴ھ مصر کے گاہوں "ہتیم" میں آپ کی ولادت ہوئی۔ بچپن میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ امام شمس الدین بن ابی

حماک اور امام شمس الدین شادوی نے کفالت فرمائی قرآن کریم اور ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۹۴۲ھ میں جامع اہل مصر میں داخل ہوئے اور وہاں جلیل القدر اساتذہ سے مختلف علوم و فنون

میں کمال حاصل کیا۔ شیخ شہاب الدین ربیع، شمس مہودی، شہاب ابن نجار، علی اور شہاب بن صالح آپ کے اساتذہ میں سے ہیں۔ قاضی زکریا، معمر بن عبدالحق سبعاہلی، امین غمری، (تلمیذ ابن حجر

عسقلانی) امام سیوطی اور ابوالحسن بکری سے حدیث کا درس لیا اور اس طرح جملہ علوم و فنون میں کامل و اکمل بن کر ابھرے۔ زبردست قوت حافظہ کے مالک تھے۔ ۲۰ سال سے بھی کم عمر میں

آپ کے اساتذہ و مشائخ نے تدریس و افتاء کی اجازت عطا فرمادی۔ ۹۴۳ھ میں دوبارہ حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے۔ ۹۴۰ھ میں مکہ شریف میں مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہیں درس

و تدریس، افتاء اور تصنیف و تالیف کی خدمات انجام دینے لگے۔ مندرجہ ذیل کتابیں آپ کی شاہکار اور لا جواب تصنیف ہیں جو علوم و فنون میں آپ کی اجتہادی بصیرت پر گواہ ہیں: (۱) فصح الالہ

شرح مشکاة (۲) الصواعق المحرقة (۳) الخیرات الحسان (۴) اتمام النعمة الکبریٰ علی العالم (۵) تحریر الکلام فی القیام عند مولود مہد الانام (۶)

الاعلام بقواطع الاسلام (۷) الزواجر عن اقتراف الکبائر (۸) الجوهر المنظم وغیرہ (مقدمة الجوهر المنظم ص: ۱)

۲۔ آسان فضل و کمال کا یہ ہر کامل نصف صدی تک پوری دنیا میں اپنی روشنی پھیلانے کے بعد ۱۲۹۴ھ میں ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ اللہ تبارک و تعالیٰ اپنے حبیب کے صلوات و تہنیت

قیامت آپ کی قبر انور پر رحمت و نور کی بارشیں فرمائے۔ (آمین)

"فتاویٰ حدیثہ" آپ کی گراں قدر تصنیف ہے جو آپ کے "مجموعہ فتاویٰ فقہیہ" کی ایک اہم کڑی اور زعفران حصہ ہے۔ اس کتاب میں ہم ابن حجر مکی کا محدثانہ مقام، فقیہانہ رنگ و آہنگ،

مشکلاتہ عظمت، مجتہدانہ شان اور محققانہ طرز استدلال، بخوبی ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ تصوف و صوفی کی تعریف، صوفی کی وجہ تسمیہ، تصوف کا آغاز و ارتقاء، فقہائے عظام کا صوفیہ کرام سے اختلاف، منکرین

اولیاء اور عداوت صوفیہ کا بھیا تک انجام تصوف و فقر اور زہد میں فرق و امتیاز اور ای طرح صوفی، متصوف اور متشعبہ کے درمیان بنیادی فرق اور شیخ محی الدین ابن عربی سے متعلق جب علامہ ابن حجر مکی سے سوال

ہوا تو آپ نے ان تمام سوالوں کا مدلل اور تشفی بخش جواب دیا اور سچ پوچھیے تو جواب کا حق ادا کر دیا۔ تصوف و صوفیہ اور اس کے متعلقات پر ابن حجر مکی کے علمی افادات اور نفیس ابحاث اختصار

کے ساتھ پیر و فقر طاس ہیں:

عصر ف علامہ ابن حجر مکی ہی کی کیا تخصیص۔ ہر دور کے علمائے نفس تصوف اور صوفیہ کرام کو عقیدت و احترام کی نظروں سے دیکھا ہے۔ ہاں! وہ جلیل صوفیہ اور زہدان خشک جو بظاہر تصوف کا

لباؤہ اوڑھ کر کھلے بندوں شریعت کی خلاف ورزی کرتے تھے، ایسے لوگوں کی ہر دور میں علمائے مخالفت کی ہے اور جو نفوس قدسیہ واقعی صوفی صافی اور تیج شریعت ہوتے، علمائے کرام انہیں سر

آنکھوں پر بٹھاتے، ان کی عزت و احترام اور تواضع میں کوئی کمی نہ ہونے دیتے۔ امام عبدالوہاب شعرانی رقم طراز ہیں:

"ولم یکن أحد منهم (الصوفیة) فی عصر من الأمصار إلا وعلماء ذالک الزمان یشواضعون له ویعملون بإشارته ویطلبون منه تفریج کربهم فی الشدائد" (الأنوار القدسیة فی بیان قواعد الصوفیة، ص: ۹۲، مکتبہ دار صادر، بیروت)

یعنی ہر دور میں علمائے کرام، صوفیہ عظام کے ساتھ تواضع اور احترام و عقیدت کا یہ تواتر کرتے، ان کے مشورے پر عمل کرتے اور مصیبت کی گھڑی میں ان سے ازالہ مصیبت کی درخواست کرتے۔

امام احمد بن حنبل کی علمی جلالت اپنی جگہ مسلم ہے، لیکن جب کسی مسئلے میں آپ کو توقف ہوتا تو ابوہریرہ بغدادی سے پوچھتے: صوفی صاحب! اس مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اور ان کی

رائے پر اعتماد کرتے۔ (انوار قدسیہ ص: ۹۱)

تصوف اور صوفی کی تعریف

علامہ ابن حجر مکی "تصوف اور صوفی کی تعریف" کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
شرائط تصوف اور اس کے آداب کا لحاظ کرتے ہوئے صوفیہ کرام نے تصوف کی مختلف تعریفیں کی ہیں، یہاں تک کہ تصوف کی ایک ہزار سے زیادہ تعریف منقول ہے۔ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی فرماتے ہیں: "تصوف نام ہے ذکر، وجہ اور اتباع شریعت کا"۔
شیخ رویم کا قول ہے: "نفس کو مرضی مولیٰ کا پابند بنادینا اور اپنے آپ کو مکمل طور سے خدا کے حوالے کر دینا ہی تصوف ہے۔"

ابو محمد حریری کا ارشاد ہے: "عمدہ اخلاق اور بلند کردار کے زیور سے مزین ہونا اور برے اخلاق سے بچنے کا نام تصوف ہے۔"

ابن حجر مکی تصوف کے بعد "صوفی" کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

حضرت جنید بغدادی کے بقول صوفی وہ ہے جو زمین کے مانند عکبر عجز ہو کہ اس پر ہر طرح کی اچھی بری اور بے کار شئی ڈال دی جاتی ہے مگر یہی بے کار شئی زمین میں فنا ہو کر ایک کارآمد اور عمدہ فصل کی صورت میں تیار ہو کر نکلتی ہے۔

ابو محمد کھل بن عبد اللہ تسری نے کہا ہے: "صوفی وہ ہے جو ہر طرح کی دنیاوی آلائشوں سے پاک و مخلوق سے رشتہ توڑ کر اللہ تعالیٰ کی جانب ہمہ تن متوجہ ہو اور اس کی نگاہ میں سوا اور ٹھیکرا برآمد ہو۔"

حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک صوفی اس گروہ کو کہتے ہیں جس نے تمام چیزوں پر اللہ تعالیٰ کو ترجیح دے دی تو اللہ نے بھی اسے ہر چیز پر ترجیح دے دی اور دیگر مخلوق میں منفرد و ممتاز بنا دیا۔ (فتاویٰ حدیثیہ، ص: ۳۲۶)

صوفی کی وجہ تسمیہ اور ماخذ اشتقاق

صوفی کی وجہ تسمیہ اور ماخذ اشتقاق میں بھی اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض اسے "عمدہ بمعنی چبوترہ" اور بعض "صفاء" سے مشتق مانتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ صوفیہ کرام کے قلوب چوں کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہوتے ہیں اور وہ قرب الی اللہ کے بلند مقام اور "صف اول" کے مرتبے پر فائز ہوتے ہیں۔ اسی "صف اول" کی طرف نسبت کرتے ہوئے انہیں "صوفی" کہا جاتا ہے۔ ایک قول یہ بھی ہے کہ صوفی "صوف" بمعنی اون سے مشتق ہے صوفیہ کرام ہر اعموم اون کا لباس زیب تن کیا کرتے تھے اس لیے انہیں صوفی کہا جاتا ہے۔

ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ صوفی کی وجہ تسمیہ اور ماخذ اشتقاق سے متعلق مختلف اقوال نقل کرنے

کے بعد آخر میں امام یافعی کے حوالے سے لکھتے ہیں "هذا القول الثالث هو المناسب للاشتقاق اللغوي ای النسبة إلى الصوف" (فتاویٰ حدیثیہ، ص: ۳۲۷)۔

یعنی راجح قول یہی ہے کہ صوفی، صوف بمعنی اون سے مشتق ہے اور یہی مناسبت لغوی کے زیادہ قریب ہے۔

تصوف کا آغاز و ارتقاء

ان مباحث کو سمیٹنے کے بعد مصنف علام نے "تصوف کے آغاز و ارتقاء" پر کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ زمانہ رسالت سے لے کر دوسری ہجری کے اوائل تک تصوف اور صوفی کا لفظ متعارف نہیں تھا اور لوگوں کے کان اس لفظ سے نا آشنا تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جن لوگوں نے ایمان و یقین کی حالت میں اپنی آنکھوں سے بحال ثبوت کا مشاہدہ کیا، ان کے لیے "صحابی" کا لفظ ہی ہر اعتبار سے موزوں تھا کیوں کہ شرف صحابیت سے بڑھ کر کوئی دوسرا وصف نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین صوفی کے لقب سے ملقب نہیں ہوئے۔ (ورنہ شریعت مطہرہ کے سانچے میں مکمل طور سے دخلی ہوتی صحابہ کرام کی سادہ اور زہادانہ زندگی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک صوفی اور تصوف کے بام رفیع پر متمکن تھے۔)

اسی طرح جن نفوس قدسیہ نے صحابہ کرام کی زیارت کی اور ان سے اکتساب فیض کیا ان کے لیے "تابعی" کا لفظ انسب ٹھہرا۔ البتہ ان کا زمانہ جیسے جیسے عہد رسالت سے دور ہوتا گیا، بے راہ روی عام ہوتی چلی گئی۔ دنیا کی طرف رغبت بڑھنے لگی اور افکار و نظریات میں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ فتنہ و فساد کا بازار گرم ہونے لگا اور بدعت کا چیلن عام ہو گیا۔ حضور کی سنتیں مردہ ہونے لگیں۔ امت مسلمہ مختلف فرقوں اور ٹولیوں میں بٹ گئی۔

ایسے ہوش ربا ماحول میں ہر ایک گروہ یہ دعویٰ کرنے لگا کہ زہد و تقویٰ صرف ہمارے اندر پایا جاتا ہے۔ زہاد و متقی اور شریعت کے مطابق زندگی گزارنے والے صرف ہم ہیں۔ جب صورت حال یہ تھی تو ایسے میں اہل سنت کے عابد و زہاد و تقویٰ شعار بزرگوں کی شناخت دشوار ہو گئی۔ لہذا علامت کے طور پر ان خواص اہل سنت کو "صوفی" کہا جانے لگا اور دوسری صدی ہجری سے قبل ہی "تصوف" کا لفظ متعارف و مشہور ہو گیا۔ (فتاویٰ حدیثیہ، ص: ۳۲۷)

تصوف فقہ اور زہد میں فرق

تصوف ابتدا میں صرف زہد و عبادت کا نام تھا۔ حدیث کی امہات کتب "صحاح ستہ" وغیرہ میں "کتاب الزہد و الرقاق" کے عنوان سے ایک مستقل باب ہوتا ہے۔ اہل علم بیان کرتے ہیں کہ یہی زہد و رفاق آگے چل کر تصوف کی بنیاد بنا۔ زہد جس قدر بڑھتا گیا تصوف میں تنوع اور

وسعت پیدا ہوتی گئی اور اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ متحدہ میں صوفیہ کو تصوف کی نوع بنوے، لغویہ کی نوع بنوے اور اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ متحدہ میں صوفیہ کو تصوف کی نوع بنوے، لغویہ کی نوع بنوے اور اس کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ متحدہ میں صوفیہ کو تصوف کی نوع بنوے، لغویہ کی نوع بنوے۔

تصوف، زہد اور فقر کے مابین جو بنیادی فرق ہے، اسے علامہ ابن حجر کی نے بڑے محققانہ انداز میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ آپ لکھتے ہیں: شیخ شہاب الدین سرور دی کے بقول تصوف، زہد و فقر کے معانی کو شامل ہونے کے ساتھ بعض اور اوصاف کے مجموعے کا نام ہے۔ یعنی تصوف کے لیے صرف زہد و فقر ہی کافی نہیں، جب تک کہ زہد و فقر کے ساتھ اور دیگر اوصاف حمیدہ کی آمیزش نہ ہو جائے تصوف کا وجود نہیں ہو سکتا۔ انسان کے اندر زہد و فقر کے لاکھ اوصاف جمع ہو جائیں وہ زہد و فقر تو ہو سکتا ہے مگر صوفی نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے تو کہا گیا ہے نہایۃ الفقر بدایۃ التصوف کہ جہاں فقر کی منزل ختم ہوتی ہے وہیں سے تصوف اپنا سفر شروع کرتا ہے۔ اہل شام فقر اور صوفیہ میں فرق نہیں کرتے۔ بلکہ دیگر یہ لوگ فقر اور تصوف میں اتحاد کے قائل ہیں۔

اس موقف کو رد کرتے ہوئے ابن حجر کی فرماتے ہیں: والحق أن بينهما فرقا یعنی فقر کو کہ تصوف کی اساس ہے مگر دونوں کی حقیقت ایک نہیں۔ فقر جاوہ فقر کا مسافر ہونا ہے۔ یہ دامن فقر کو ہر حال میں مضبوطی سے تھامے رہتا ہے۔ فقر باقی کو فانی پر ترجیح دیتے ہیں، تاہم آخرت میں حصول اجر کے طلب گار بھی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فقر، اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ اس کے برعکس صوفیہ اپنے آپ کو مکمل طور سے مرضی مولیٰ کا پابند بنالیتے ہیں، انہیں نہ کسی چیز کی طلب ہوتی ہے، نہ باقی اور فانی کے ملنے کی خواہش رکھتے ہیں۔ گویا یہ لوگ ہر حال میں ”مرضی مولیٰ ازہم اولیٰ“ کے فلسفے پر عمل کرتے ہیں۔

فقیہ اور صوفی میں دوسرا بنیادی فرق یہ ہے کہ فقر ”فقر عاجل“، یعنی دنیا ہی میں مل جانے والے حصہ اجر و ثواب کو اپنے ارادہ و اختیار سے قصد ترک کر دیتا ہے، جب کہ صوفی اپنے ارادہ و اختیار پر بالکل نظر نہیں ڈالتا بلکہ جملہ معاملات میں اپنے اختیار کو مرضی مولیٰ اور ارادۃ الہی کے تابع بنا دیتا ہے۔ ”والا اختيار والإرادة علة في حال الصوفي“ (اپنا اختیار اور ارادہ صوفی کے حال کے لحاظ سے عیب ہے۔)

فقر اگرچہ تصوف کی اساس اور بنیاد ہے، فقر کا راستہ طے کیے بغیر کوئی تصوف کی منزل

تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا، تاہم فقر کے وجود سے تصوف اور تصوف کے وجود سے فقر کا وجود بھی لازم آئے، یہ کوئی ضروری نہیں۔ تصوف اور فقر میں یہی بنیادی فرق ہے۔

فقر اور زہد میں فرق یہ ہے کہ فقر میں تواضع و انکساری، خلوت نشینی، عبادت و ریاضت اور اخلاق و آداب وغیرہ اوصاف حسہ سے آراستہ ہو کر تکبر، حسد، عجب وغیرہ اوصاف زلیہ سے پرہیز کیا جاتا ہے۔ ”وهذه قد لا يوجد مع الزهد“ اور یہ اوصاف بعض اوقات زہد کے ساتھ پائے نہیں جاتے۔ ”والحاصل أن محاسن الزهد بعض محاسن الفقر ومحاسن الفقر بعض محاسن الصوفي“۔ خلاصہ کلام یہ کہ زہد کے بعض اوصاف و محاسن فقیر میں اور فقیر کے بعض اوصاف و محاسن زہد میں پائے جاتے ہیں، یہی حال فقیر اور صوفی کا بھی ہے کہ فقیر صوفی کے بعض اوصاف سے آراستہ ہوتا ہے اور صوفی فقیر کے بعض اوصاف سے متصف ہوتا ہے۔

صوفی، متصوف اور متعبہ

تصوف کا ابتدائی مرحلہ ایمان، درمیانی مرحلہ علم اور آخری مرحلہ ذوق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صوفیہ یہ تینوں مراحل کمال مشقت سے طے کرتے ہیں اور ان اوصاف خلاصہ کے جامع ہوتے ہیں، جب کہ متصوف صاحب علم ہوتا ہے اور متعبہ صا حسب ایمان۔

میدان تصوف میں قدم رکھنے کے بعد متصوف صادق کو صوفی کے فضل و کمال کا حصہ ملتا ہے اور متعبہ کو تصوف کے حال سے یک گونہ فیض ملتا ہے۔ صوفی مقابلیت روح میں مشغول اور صاحب مشاہدہ ہوتا ہے، متصوف مقابلیت قلب میں مستہکم اور صاحب مراقبہ ہوتا ہے، جب کہ متعبہ مقابلیت نفس میں الجھا ہوا اور صاحب مجاہدہ ہوتا ہے۔ ان تینوں کا میدان اور وارۃ عمل جدا ہوتا ہے۔ مکمل بعمل علیٰ ہذا مکملہ۔ یہ تینوں گروہ اپنے اپنے دائرے میں رہ کر تصوف کی خاردار دیواروں کو طے کرتے ہیں اور العطا یا بقدر البلا یا (تو از شات بلاؤں اور از زائشوں گے اندازے سے ہوتی ہیں۔) کے تحت اجر و ثواب کا حق وار ہوتا ہے۔ فلاح و کامرانی اور نجات اخروی تینوں سے متعلق ہے۔

متعبہ از راہ محبت صوفیہ کی مشابہت اختیار کرتا ہے تا کہ اسے بھی صوفیہ کی برکت حاصل ہو اور صوفیہ کی طرح اسے بھی عقبی کی سعادت مل سکے۔ تو متعبہ کا گروہ حدیث پاک ”المسرء مع من احب“ کے مطابق جماعت صوفیہ میں داخل ہے، بشرطیکہ صوفیہ کی سیرت اور اسوۂ حسنہ کو اپنی عملی زندگی کا لازمی حصہ بنالے۔ آداب تصوف سے بیگانہ محض صوفیوں جیسا لباس پہننے، صوفیوں جیسی وضع قطع اور صوفیوں جیسا بھیجیں اختیار کر لینے سے کوئی ”متعبہ“ نہیں بن سکتا بلکہ وہ حدیث ”من تشبه بقوم فهو منهم“ کے زمرے میں داخل ہوگا۔ (قاوی حدیث ص: ۳۴۰)

انکار اولیا اور عداوتِ صوفیہ کا بھیا تک انجام

با ضابطہ ایک مستقل فن کی حیثیت سے تصوف کے وجود میں آنے کے بعد بہت جلد اس کا مکہ اطراف عالم میں پھیلنے لگا۔ مسلم و غیر مسلم معاشرے میں صوفیہ کرام کو عزت و وقار کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔ تصوف اور صوفیہ کا رنگ دن بدن نکھرنا ہی چلا گیا، مگر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ تصوف اور صوفیہ کو لے کر حسد اور حرص کا بازار بھی گرم ہوا۔ دنیا دار لوگوں نے طلب جاہ اور حصول منفعت کی خاطر تصوف کا چولا پہن لیا اور بعض اہل علم محض حسد اور رقابت کے سبب تصوف اور صوفیہ کے دشمن بن گئے اور ہر محاذ پر صوفیہ کے روحانی و اخلاقی مشن کو ناکام بنانے کے لیے زبان و قلم کی تلوار تیار کر لی۔ اس طرح انکار اولیا اور عداوتِ صوفیہ کا ایک نیا دور شروع ہو گیا، یہاں تک کہ کبار صوفیہ مثلاً شیخ محی الدین ابن عربی، امام غزالی، شیخ ابن فارض اور منصور راجح کی تفہیم و تھلیل کی گئی اور مباحث تصوف اور طریقت کے سراسر اور رموز پر مشتمل ان کی کتابیں نذر راتش کی گئیں۔

بہر کیف! تصوف اور صوفیہ کے خلاف ہر دور میں آندھیاں چلیں اور خدا جانے کہ تک یہ آندھیاں تصوف کے نشین کو تاراج کرنے کی کوششیں کرتی رہیں گی؟ تصوف اور صوفیہ کے خلاف مورچہ سنبھالنے والے افراد ان کا تو کچھ نہیں بگاڑتے مگر نادانی سے اپنی دنیا و آخرت ضرور برباد کر دالتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ متکبرین صوفیہ اور دشمنان تصوف بڑے عبرت ناک انجام سے دوچار ہوئے۔ آئیے علامہ ابن حجر مکی کے الفاظ میں دشمنانِ صوفیہ کا بھیا تک انجام اور عبرت انگیز داستان ملاحظہ کریں:

آپ فرماتے ہیں: معتزلہ جو کرامات اولیا کے منکر ہیں، ان پر کچھ تعجب نہیں بلکہ تعجب اور افسوس تو ان بعض علما پر ہے جو اہل سنت سے تعلق رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود صوفیہ کرام پر پھتیاں کھتے ہیں۔ مبالغہ اور تشدد آمیز لہجے میں ان مقدس گروہ کا انکار و ابطال کرتے ہیں۔ حقیقتاً یہ افسوس ناک رویہ، محرومی، نقصان اور بھیا تک انجام کا باعث ہے۔ تصوف کے قائل ہونے کے باوجود علامہ ابن جوزی نے اپنی کتاب ”تلمیذس المیس“ میں ساداتِ صوفیہ اور کبار اصحابِ طریقت کو اپنی جارحانہ تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اونا و ابدال، صدیقین اور صالحین تک کو نہیں چھوڑا۔ ابن حجر مکی نے ابن جوزی کی اس انتہا پسندی پر سخت افسوس کا اظہار کیا ہے اور وہ لوگ الفاظ میں اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا ہے کہ ”تقدیم و جدید احمد و فقہاء اور علمائے امتِ صوفیہ کرام کے معتقد تھے۔ (باستثنائے بعض) یہ علما و فقہاء صوفیہ کرام کی تعظیم و توقیر اور عزت و احترام کرتے، ان سے برکتیں حاصل کرتے اور بوقتِ ضرورت ازالہِ معصیت کی ان سے درخواست کرتے اور مدد طلب کرتے۔“

ابن قیم عید اپنے دور کے ایک بزرگ اور صوفی با مفاہیض کے بارے میں لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک ایک صوفی سلفیہ یا ہزار فقیہ سے بہتر ہے۔ فخر المحدثین امام نووی قدس سرہ شیخ یحییٰ مزمین کے بڑے معتقد تھے۔ امام نووی ان کا بہت احترام کرتے اور ان کے مشورے پر عمل کرتے۔ اسی طرح عز الدین ابن عبد السلام صوفیہ کرام کی تعظیم و توقیر میں حد درجہ مبالغہ فرماتے۔ (فتاویٰ حدیثیہ ص: ۳۰۶)۔

ابن حجر مکی مزید لکھتے ہیں: جن لوگوں نے محض تعصب اور حسد کی بنا پر اولیا کے کرام اور ساداتِ صوفیہ کا انکار کر کے انہیں اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، وہ لوگ خائب و خاسر اور بھیا تک انجام سے دوچار ہوئے۔ ان کی عزت و شہرت خاک میں مل گئی، اپنے بلند مرتبہ و علم و فضل سے گمراہی و گمناہی کے گدھے میں دفن ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ذلیل اور رسوا کر دیا۔ نعوذ باللہ من ذالک! بعض عارفین نے سچ فرمایا ہے: اللہ کے نیک بندے صوفیہ عظام اور اولیا کے کرام کو اذیت پہنچاتے ہوئے کسی کو دیکھتے تو جان لو کہ وہ اللہ کا دشمن ہے۔ منکرین اولیا اور عظمتِ صوفیہ سے کھلواڑ کرنے والوں کے انجام ہمہ بد کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ حدیث پاک: ”من اذی لى ولیا فقد اذنتہ بالحرب“ کے تحت داخل ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے جنگ مول لینے والوں کو دنیا و آخرت میں اس کا انجام بھگتنا پڑے گا۔ صوفیہ عظام سے عداوت رکھنے والوں کا سب سے ہلکا انجام یہ ہے کہ وہ اس مبارک جماعت کی برکت سے محروم رہتے ہیں۔ علما و اہلِ سنیہ کے خاتمہ کا بھی اندیشہ ہے۔ لہذا صوفیہ کرام اور اولیا ء اللہ سے ہرگز عداوت نہ رکھو، کیوں کہ یہ عداوت زیرِ قاف ہے، دولتِ ایمان سے محروم ہو جانے کا خدشہ ہے۔

عداوتِ صوفیہ کے انجام ہمہ بد کے حوالے سے مشہور واقعہ ہے کہ ابن سقائہ اولیا ء اللہ کے منکر اور دشمن تھے۔ اس زمانے کے ایک ولی نے یہ پیشین گوئی کی کہ وہ کفر کی حالت میں مرے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور نصرا نیت کی حالت میں اس کی موت ہوئی۔ حالانکہ ابن سقائہ اپنے وقت کے مایہ ناز عالم تھے۔ علم و ادب، فضل و کمال اور ذکاوت و شہرت کے اعلیٰ مقام پر فائز تھے مگر عداوتِ اولیا کے باعث اس کا علم و فضل کام نہ آسکا۔

امام ابو سعید بن ابی مصریون کے ساتھ بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ آج ہمارے زمانے میں بھی منکرین اولیا اور دشمنانِ صوفیہ کی کمی نہیں ہے۔ ان واقعات سے ایسے لوگوں کو درسِ عبرت حاصل کرنا چاہیے اور ان نفوسِ قدسیہ کی شان میں گستاخیاں اور نازیبا کلمات استعمال کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

علامہ ابن حجر مکی کی مندرجہ ذیل نصیحت ہمیں بار بار دعوتِ فکر و عمل دیتی ہے۔ اسی اقتباس

پر ہم اپنا مضمون بھی ختم کرتے ہیں۔ اللہ تبارک و تعالیٰ ہمیں اولیاء کرام، بزرگان دین اور صوفیہ کا ملین کے فیوض و برکات سے مالا مال فرمائے، آمین۔ علامہ ابن حجر کی فرماتے ہیں:

”وینبغي للإنسان حيث أمكنه عدم الانتقاد على السادة الصوفية نفعنا الله بمعارفهم وقد شاهدنا من بالغ في الانتقاد عليهم مع نوع تعصب فابتلاه الله بالانحطاط عن مرتبته وأزال عنه عوائد لطفه وأسرار حضرته.“

(فتاویٰ حدیثیہ ص: ۸۱)

ترجمہ: جہاں تک ہو سکے انسان صوفیہ کرام کی شان میں زبان طعن دراز کرنے سے پرہیز کرے۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جن لوگوں نے ان پر طعن و تشنیع اور تنقید کا نشر چلانے میں مبالغہ اور تعصب سے کام لیا ہے، اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کے بلند مرتبے سے گرا دیا ہے اور اپنے الطاف و عنایت سے انہیں محروم کر دیا ہے۔



مولانا سکندر امجد قادری

بیعت و اجازت - احادیث کی روشنی میں

رسول کریم ﷺ کے عہد ظاہری میں متعدد اقسام کی بیعتیں رائج تھیں اور صحابہ کرام کے دلوں میں بیعت کا شوق و جذبہ تھا، نیز سرکارِ دو عالم ﷺ وقتاً فوقتاً بیعت کی اہمیت کے پیش نظر اپنے جاں نثاروں کے دلوں میں ترغیب و تشویق پیدا فرماتے رہتے تھے جس کے سبب صحابہ ہما مت و درجماعت حاضر خدمت ہو کر دست نبوی پر بیعت کرتے اور صرف یہی نہیں کہ خود بیعت ہوتے بلکہ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بھی بیعت کے لیے پیش کرتے پھر سرکارِ دو عالم ﷺ زراہ نوازش انہیں بھی بیعت کر لیتے اور کبھی دعاؤں سے نواز کر بغیر بیعت واپس فرما دیتے۔ بیعت کی ادائیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس قدر مقبول تھیں کہ آیتیں نازل ہوتیں اور انھیں بتایا جاتا کہ اے دیوانو! تم میرے محبوب کے ہاتھ میں ہاتھ دے دے ہو تو یقیناً کامل رکھو کہ تمہارا ہاتھ صرف محبوب کے ہاتھ میں نہیں ہوتا بلکہ تمہارے خالق و مالک رب تعالیٰ کے دستِ قدرت میں ہوتا ہے اور تمہیں اس پر مبارک باد دی جاتی ہے۔

عہد صحابہ میں جتنی قسم کی بیعتیں رائج تھیں، اس کے تعلق سے آئندہ حدیثیں آ رہی ہیں، سر دست ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نفسِ بیعت قرآن حکیم کی روشنی میں جائز ہے یا نہیں۔

يا ايها النبي اذا جاءك المؤمنات يبايعنك على ان لا يبشر كن بالله شيعا ولا يسرقن ولا يزنين ولا يقتلن اولادهن ولا ياتين ببهتان يفتريه بين ايديهن وارجلهن ولا يعصينك في معروف فبايعهن واستغفر لهن الله ان الله غفور رحيم - (۱)

اے نبی! جب تمہارے حضور مسلمان عورتیں حاضر ہوں، اس پر بیعت کرنے کو کہ اللہ کا کچھ شریک نہ ٹھہرائیں گی اور نہ چوری کریں گی اور نہ بدکاری اور نہ اپنی اولاد قتل کریں گی اور نہ وہ بہتان لائیں گی جسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان یعنی موضعِ ولادت میں اٹھائیں گی اور کسی نیک بات میں تمہاری مافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت لو، اللہ سے ان کی مغفرت چاہو، بے

فك الله بختهم ولا مهربان ہے۔

لقد رضى الله عن المؤمنين اذ يبايعونك تحت الشجرة فعلم ما فى قلوبهم فانزل السكينة عليهم وااثبهم فتحا قريبا. (۲)

بے شک اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جب وہ اس درخت کے نیچے تمہاری بیعت کرتے تھے تو اللہ نے جانا جوان کے دلوں میں ہے تو ان پر اطمینان آتا را اور انہیں جلد آنے والی فتح کا انعام دیا۔

إن الذين يبايعونك إنما يبايعون الله، يد الله فوق أيديهم فمن نكث فانما ينعكث على نفسه ومن أوفى بما عاهد عليه الله فسيؤتيه اجرا عظيما۔ (۳)

جو تمہاری بیعت کرتے ہیں وہ تو اللہ ہی سے بیعت کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھوں پر اللہ کا ہاتھ ہے۔ جو جس نے عہد توڑا تو اس نے اپنے بڑے کو عہد کو توڑا اور جس نے پورا کیا وہ عہد جو اس نے اللہ سے کیا تھا تو بہت جلد اللہ اسے بڑا ثواب دے گا۔

إن الله اشترى من المؤمنين انفسهم وأموالهم بان لهم الجنة. (۴)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں سے ان کی جان اور مال کو بخت کے بدلہ میں خرید لیا۔

اس آیت کریمہ کا شان نزول بیان کرتے ہوئے امام رازی لکھتے ہیں:

علامہ قرطبی نے بیان کیا ہے کہ جب مکہ میں لیلۃ العقیقہ کو ستر اھزار نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی تو حضرت عبد اللہ بن رواحہ نے کہا: آپ اپنے رب کے لیے اور اپنے نفس کے لیے ہم سے جو شرط چاہیں متوالیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: مرے رب کے لیے یہ شرط ہے کہ تم اپنی جانوں اور مالوں کو جن چیزوں سے باز رکھتے ہو ان سے مجھ کو بھی باز رکھنا، یعنی جس طرح اپنی جانوں اور مالوں کی حفاظت کرتے ہو اس طرح میری حفاظت کرنا۔ صحابہ کرام نے عرض کیا: جب ہم ایسا کر لیں تو ہمیں اس کا صلہ کیا ملے گا؟ آپ نے فرمایا: جنت۔ صحابہ نے کہا: یہ نفع بخش بیعت ہے۔ ہم اس بیعت کو توثیق کریں گے اور توثیق کرنے کا مطالبہ کریں گے۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (۵)

چشم بصیرت سے آیات مذکورہ کو بغور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ صوفیہ کرام نے جو بیعت کی طرح ڈالی ہے یہ کوئی نئی چیز نہیں بلکہ حکم قرآن کے عین مطابق اور سنت نبوی و اتباع رسول پر مبنی ہے۔

بیعت تقویٰ کی ابتدا و ارتقا

کتب احادیث و آثار میں بیعت سے متعلق جتنی حدیثیں مذکور ہیں سب کا مطالعہ اس نتیجہ پر لاتا ہے کہ عہد صحابہ میں رائج بیعتیں حسب ذیل اقسام پر مشتمل تھیں:

(۱) بیعت تقویٰ (۲) بیعت اسلام (۳) بیعت ہجرت (۴) بیعت امارت (۵) بیعت جہاد۔ آج مشائخ اسلام و صوفیہ کرام کے یہاں جو طریقہ بیعت رائج ہے اسے بیعت تقویٰ یا بیعت توہد کہتے ہیں۔ اس کی ابتدا و ارتقا کی کیفیت جاننے کے لیے صحابی رسول حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کا تاریخی بیان ملاحظہ کریں:

عن عبادة ابن الصامت رضى الله عنه قال: كنت ممن حضر العقیبة الاولى ومكنا اثني عشر رجلا فبايعنا رسول الله ﷺ على بيعة النساء وذلك قبل أن يفرض الحرب على أن لا تشرك بالله ولا تسرق ولا تزني ولا تقتل أولادنا ولا تاتى بهتتان فتفترينه بين أيدينا وأرجلنا ولا تعصيه فى معروف وقال فان وفيتم فلکم الجنة۔ (۶)

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے فرمایا میں ان لوگوں میں سے ہوں جو عقبہ اولیٰ کے موقع پر حاضر تھے۔ ہم سب بارہ مرد تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے ہم لوگوں نے عورتوں والی بیعت کی۔ یہ بیعت جہاد فرض ہونے سے پہلے ہوئی۔ بیعت اس پر ہوئی کہ اللہ کے ساتھ شریک نہیں کریں گے، چوری، زنا نہیں کریں گے، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گے، ہاتھ پیر کے درمیان کے معاملے میں کسی پر الزام نہیں لگائیں گے، بھلے احکام میں بافرمانی نہیں کریں گے۔ حضور ﷺ نے فرمایا: اگر تم نے وعدہ پورا کیا تو تمہارے لیے جنت ہے۔

حدیث مذکور کو کچھ فرق کلمات کے ساتھ حسب ذیل ائمہ کرام نے اپنی اپنی کتابوں میں تحریر فرمائی ہے۔

امام مسلم۔

امام ابو داؤد۔

امام ترمذی۔

خلاصہ حدیث

یہ بیعت عقبہ اولیٰ کے موقع پر ہوئی یعنی قبل ہجرت اور اعلان نبوت کے بارہویں سال۔ یہ بیعت حکم جہاد کے نزول سے پہلے ہوئی۔

اس موقع پر بارہ مرد حاضر بارگاہ تھے۔

یہ بیعت مکہ مکرمہ میں ہوئی۔ اس طرح کی بیعت کو صحابہ کی زبان میں بیعة النساء (عورتوں والی بیعت) کہا جاتا تھا۔

بیعت النساء سے مراد وہی بیعت توہد یا بیعت تقویٰ ہے جس کا ذکر قرآن شریف کے

سورہ ممتحنہ میں ہوا ہے۔ بیعت عقبہ کے بعد یہ سلسلہ چل پڑا اور عام رواج کی شکل اختیار کر گیا۔ چنانچہ متعدد صحابہ کرام کی بیعت کا تذکرہ حدیث میں مذکور ہے، مثلاً:

عن جریر بن عبد اللہ البجلي رضى الله عنه قال بايعت رسول الله ﷺ على اقامة الصلوة وايتاء الزكوة والنصح لكل مسلم. (۷)

حضرت جریر بن عبد اللہ فرماتے ہیں: میں نے اقامت صلوٰۃ، ادائیگی زکوٰۃ اور ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی کرنے پر رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی۔

عن عبد الله بن عمر رضى الله عنه كذا نبأ عن رسول الله ﷺ على السمع والطاعة فيقول لنا فيما استطعنا. (۸)

حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ہم لوگ رسول اللہ ﷺ اس بات پر بیعت کیا کرتے تھے کہ ہم آپ کی ہر بات سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ آپ فرماتے تھے کہ جہاں تک تم سے ممکن ہو۔

عن عطية رضى الله عنها قالت بايعنا النبي ﷺ فقراً على أن لا يشركن بالله شيئاً ونهانا عن النباحة. (۹)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ہم لوگوں نے نبی ﷺ سے بیعت کی تو آپ نے سورہ ممتحنہ کی آیت لا یشرکن باللہ شیناً کی تلاوت فرمائی اور ہم لوگوں کو نوحہ خوانی سے منع فرمایا۔

الفاظ بیعت مرفق

حضور ﷺ کی بعثت کا مقصد قرآن مقدس میں یوں بیان کیا گیا:

لقد صدقنا الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسولا من انفسهم يتلو عليهم

آياته ويزكيهم ويعلمهم الكتاب والحكمة - (۱۰)

آپ ﷺ کے فرائض منصبی کی فہرست میں آیات الہیہ کی تلاوت، تزکیہ نفوس، تطہیر باطن اور تعلیم کتاب و حکمت جیسے بنیادی مسائل خصوصی توجہ کے مستحق تھے۔ ان ہی کے ذریعے معاشرتی، سماجی، معاشی، سیاسی، انفرادی، اجتماعی احوال کی اصلاح فرما کر ایک صالح نظام برپا کرنا تھا۔ ظلم و تعدی کو مٹانا، امن و سکون کا ماحول پیدا کرنا، انسانی اقدار کو پروان چڑھانا اور حیوانی شعور و ادراک ختم کر کے ربانی علم و آگہی کی دولت سے افراد انسانی کو فیض یاب کرنا تھا۔ اس لیے نبوی نگاہ شعبہ انسانی کے ہر پہلو و ہر گوشہ پر برابر نگاہ رہتی تھی۔ جب جہاں جیسی ضرورت محسوس ہوتی وہاں اسی کے مطابق احکام و فرمودات جاری ہوئے اور تقاضے و احوال کے پیش نظر عملی تحریک کی گئی۔

مذکورہ احادیث پر نظر ڈالیں تو بیعت کے الفاظ میں یکسانیت نہیں ملے گی۔ کبھی شرک،

چوری، زنا، ناحق قتل، الزام تراشی، احکام کی نافرمانی سے بچنے پر بیعت لے گئی، کبھی اقامت نماز، ادائیگی زکوٰۃ اور مسلمانوں کی خیر خواہی پر بیعت لی گئی، کبھی اطاعت و فرمانبرداری اور نوحہ خوانی سے احتراز پر بیعت لی گئی۔ یہ اختلاف صرف اور صرف اس وجہ سے تھا کہ بیعت ہونے والوں کی ضرورتوں میں اختلاف تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

قال القرطبي كانت مبايعة النبي ﷺ لا صحابه بحسب ما يحتاج اليه من تجديد عهد او توكيد فلذلك اختلف الفاظهم - (۱۱)

علامہ قرطبی نے فرمایا رسول اللہ ﷺ کی اپنے اصحاب سے بیعت ان کی ضرورت کے لحاظ سے ہوتی تھی، اس کا تعلق تجدید عہد یا کسی کام کی تاکید سے ہوتا تھا، اسی لیے الفاظ بیعت میں اختلاف تھا۔

تجدید بیعت

بیعت، عہد و وعدہ ہے جس کی تکرار، جسے بار بار دہرانا، یاد دہانی کرنا، معاہدہ میں توانائی پیدا کرنا ہے۔ ممکن ہے کہ پہلی مرتبہ بیعت کے بعد کچھ دنوں تک وعدہ نبھانے کا ذوق و شوق کامل طور پر تھا لیکن رفتہ رفتہ سستی پیدا ہونے لگی تو دوسری بیعت اس کو از سر نو تازہ دم کر دے گی اور آدنی پھر عہد کی پابندی میں ہمہ تن مشغول ہو جائے گا۔ روحانی بالیدگی میں اگر کچھ کی آنے لگی تھی تو دوبارہ نئی قوت پا کر پروان چڑھنے لگے گی۔ آئینہ قلب پر اگر گناہوں کی کثافت جم گئی تھی تو دوسری بیعت ان کثافتوں کو دور کر کے شفافیت پیدا کر دے گی۔ اسی بنیاد پر مشائخ صوفیہ تجدید بیعت کے قائل ہیں۔ سرکارِ دو عالم ﷺ کی نگاہ نبوت اور صحابہ کرام کی نگاہ عشق و محبت میں تجدید بیعت کی کتنی اہمیت تھی اسے ملاحظہ کریں:

عن عوف بن مالك الاشجعي قال كنا عند النبي ﷺ سبعة او ثمانية او تسعة فقال ألا تباعون رسول الله ﷺ فبسطنا أيدينا فقال قائل: يا رسول الله ﷺ انا قد بايعناك، فعلى ما نبأيعك قال ان تعبدوا الله ولا تشركوا به شيئاً وتقيموا الصلوة الخمس وتسمعوا و تطيعوا وأسر كلمة خفية: و لا تستنلوا الناس شيئاً - (۱۲)

حضرت عوف بن مالک اشجعی فرماتے ہیں کہ ہم سات یا آٹھ یا نو آدمی رسول اللہ کی بارگاہ میں حاضر تھے۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے فرمایا کیا تم لوگ اللہ کے رسول سے بیعت نہ کرو گے؟ تو ہم لوگوں نے ہاتھ بڑھالیا۔ ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ! ہم لوگ تو بیعت کر چکے ہیں، اب کس بات پر بیعت کریں؟ آپ نے فرمایا اس بات پر کہ تم اللہ کی عبادت کرو گے، اس

کے ساتھ شرک نہ کرو گے، پانچوں وقت کی نماز ادا کرو گے، احکام سنو گے اور اطاعت کرو گے اور آہستہ سے فرمایا: کسی سے کچھ مانگنا نہیں۔

عن سلمة قال بايعته اول الناس، ثم بايع وبائع حتى اذا كان وسط قال: بايع باسلمة قلت: بايعتك، قال: وايضا، فبايعته، ثم بايع حتى اذا كان خرج الناس قال: الاتبايعني باسلمة، قلت: يا رسول الله بايعتك في اول الناس وفي وسط الناس قال: وايضا، فبايعته الثالثة. (۱۳)

حضرت سلمہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے حضور ﷺ سے سب سے پہلے بیعت کی پھر آپ نے بیعت کی۔ جب آدھے لوگوں کی بیعت ہو چکی تو آپ نے فرمایا: اے سلمہ! بیعت کرلو، عرض کیا، حضور! بیعت کر لی ہے، فرمایا: پھر کرلو: تو میں نے پھر بیعت کی، جب لوگ ٹھٹھکے گئے تو آپ نے فرمایا: اے سلمہ! کیا مجھ سے بیعت نہ کرو گے؟ میں نے عرض کی: حضور سب سے پہلے میں نے بیعت کی پھر درمیان میں بیعت کی، آپ نے فرمایا پھر کرلو، تو تیسری مرتبہ پھر بیعت کی۔

بچوں کی بیعت

بیعت چوں کہ ایک طرح سے اطاعت الہی، اتباع رسول کا معاہدہ اور روحانی منازل طے کرنے کا عہد و پیمان ہے اور بچے غیر شعوری مرحلے میں ہونے کے باعث تکالیف شرعیہ کے مکلف نہیں اور کسی مسئلہ یا عمل کا وعدہ کر لینا اور اسے پورا کرنا ضروری ہے۔

واوفوا بالعہد ان العہد کان مستغلا. (۱۴)

اور وعدہ وفا کرو، کیوں کہ وعدے کے بارے میں پوچھ ہوگی۔

اسی سبب سے رسول کریم ﷺ نے احکام شرعیہ سے جن جن لوگوں کو جدا رکھا اور جن کی گردن پر کسی شرعی حکم کا بوجھ نہیں ڈالا ان میں بچے بھی شامل ہیں۔ بایں سبب سرکارِ دو عالم بچوں سے بیعت نہیں لیتے تھے۔ ہاں جب سرکارِ دو عالم ﷺ کی خدمت میں بچے لائے جاتے تو انھیں دعاؤں سے فیض یاب فرماتے۔

عن ابی عقیل زہرۃ بن معبد عن جدہ عبد اللہ بن ہشام وکان قد أدرك النبی ﷺ وذہبت بہ امہ زینب بنت حمید الی رسول اللہ ﷺ فقالت: یا رسول اللہ بايعہ فقال النبی ﷺ هو صغیر فمسح رأسہ ودعاه. (۱۵)

زہرہ بن معبد اپنے دادا عبد اللہ بن ہشام سے روایت کرتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن ہشام نے رسول کریم ﷺ کا زمانہ پایا تھا۔ ان کی والدہ زینب انہیں بارگاہِ اقدس میں لے کر حاضر

ہوئیں، عرض کی: یا رسول اللہ! اس کی بیعت کر لیجئے سرکارِ اقدس نے فرمایا: یہ بچہ ہے، پھر ان کے سر پر دست شفیقت پھیرا اور دعا سے نوازا۔

ما شاء اللہ کتنا اچھا رواج تھا بیعت تقویٰ کا۔ صحابہ و صحابیات بیعت کے لیے اپنے بچوں کو بارگاہِ اقدس میں لے کر حاضر ہوتیں اور کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا کہ بچے خود ہی سرکارِ اقدس میں حاضر ہو کر بیعت کی درخواست پیش کرتے۔

عن الہرماس بن زیاد قال مددت یدی الی النبی ﷺ وأنا غلام یباعنی فلم یباعنی. (۱۶)

حضرت ہرماس بن زیاد نے فرمایا کہ میں نے نبی کریم ﷺ کی طرف بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا، اس وقت میں بچہ تھا تو آپ نے مجھے بیعت نہیں کیا۔

بچے والدین کے لیے رب کی طرف سے امانت ہوتے ہیں۔ ان کی اچھی پرورش، تربیت و تعلیم کا انتظام، ان کے اندر اسلامی سیرت و کردار اور دینی مزاج پیدا کرنے کے لیے ابتدا ہی سے عبادت و ریاضت اور شریعت کی پابندی کی عادت ڈالنا والدین کی ذمہ داری ہے۔

عن عمرو بن شعیب عن ایہ عن جدہ قال قال رسول اللہ ﷺ: مروا اولادکم بالصلوۃ وہم ابناء سبع سنین واضربوہم علیہا وہم ابناء عشر سنین وفرقوا بینہم فی المضاجع. (۱۷)

اس کی کیا وجہ ہے؟ عرف اور عرف یہ کہ نماز ان کی عادت بن جائے تاکہ جب حد بلوغ کو پہنچیں تو ان کے اندر عبادت کا شوق و جذبہ موجود رہے۔ اسی طرح دوسرے دینی امور کی پابندی کا بھی شوق پیدا کرنے کے لیے ان کے جذبات کو صحیح سمت دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اسی وجہ سے مشائخ نے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بیعت کیا تاکہ اطاعت الہی کی تشویق و ترغیب ہو اور بچے ابتدا ہی سے اولیائے کرام و صوفیہ اسلام کے طرز زندگی کو اپنے لیے نمونہ عمل بنائیں۔ سرکارِ دو عالم ﷺ نے اسی شوق و ترغیب کو پیدا کرنے کے لیے بچوں کی بیعت لی ہے۔

عن ہشام بن عروۃ عن ایہ أن عبد اللہ بن الزبیر وعبد اللہ بن جعفر بايعا النبی ﷺ وهما ابن سبع سنین (یقال اوثمان سنین) وان رسول اللہ ﷺ لما رآہما تبسم وبسط یدہ فبايعہما. (۱۸)

حضرت ہشام بن عروہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن زبیر اور عبد اللہ بن جعفر نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی اور وہ دونوں سات سال کے تھے۔ ایک قول یہ ہے کہ آٹھ برس کے تھے۔ رسول کریم ﷺ نے جب ان دونوں کو دیکھا تو مسکرائے، ہاتھ بڑھایا اور دونوں کو بیعت کیا۔

بیعت مع مصافحہ

مرشد کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کر بیعت کرنا، یہ تو قرآن کریم سے ثابت ہے اور بیعت مع مصافحہ عرف اور عرف مردوں کے ساتھ خاص ہے۔ حضور ﷺ نے بیعت لیتے وقت کبھی کسی عورت سے مصافحہ نہیں کیا بلکہ ان کے ہاتھ کو چھوا تک نہیں۔

عن عائشة الصلیقة رضی اللہ عنہا قالت: کان النبی ﷺ یباع النساء بالکلام لهذه الآیة لا یشرکوا باللہ شیئا ما مست ید رسول اللہ ﷺ ید امرأة إلا امرأة یملکها. (۱۹)

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ عورتوں سے آیت لا یشرکوا باللہ شیئا پر عہد کر بیعت لیتے تھے۔ آپ ﷺ کے دست پاک نے کسی عورت کے ہاتھ کو نہیں چھوا سوائے ان عورتوں کے جو آپ کے تعارف میں تھیں۔

لیکن مردوں کو بیعت کے وقت محسوس اتصال یعنی مصافحہ کے ذریعے جو فیض ملتا تھا اس سے عورتوں کو بھی محروم نہیں رکھا بلکہ انہیں بھی اسی طرح فیض پہنچایا گیا لیکن تھوڑی صورت بدلی ہوئی تھی۔ امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

اختلفوا فی کیفیة المیابة فقالوا کان یدبعن ویدین یدبعن ثوب. (۲۰)
علمائے کرام نے بیعت کے طریقہ کار میں اختلاف کیا ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عورتوں سے بیعت لیتے تھے تو آپ کے دست مبارک اور ان کے ہاتھوں کے درمیان کپڑا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ دوسرا طریقہ یہ تھا:

دعا بقدرح من ماء فغمس یدہ فیہ ثم غمسن یدبعن یدبعن فیہ. (۲۱)
آپ نے ایک پیالہ پانی منگایا، اس میں دست اقدس ڈالا پھر عورتوں نے اپنا ہاتھ اس میں ڈالا۔ معلوم ہوا کہ عورتوں سے بیعت لیتے وقت کپڑا کا واسطہ لیتا یا پانی میں ہاتھ ڈال کر ان کے حوالے کر دینا تاکہ وہ اپنا ہاتھ اس میں ڈالیں یہ سنت ہے جب کہ مردوں کے لیے بیعت مع مصافحہ سنت ہے۔ غیر متقلد عالم مولانا عبدالرحمن مبارکپوری لکھتے ہیں:

اعلم ان السنة ان تتكون ببيعة الرجال بالمصافحة. (۲۲) جان لو کہ سنت طریقہ یہ ہے کہ مردوں کی بیعت بطریق مصافحہ ہو۔

اجازت بیعت

بیعت تقویٰ کا تعلق پوری نوع انسانی سے ہے۔ اس سے حاصل ہونے والے فوائد کسی خاص دور کے انسانوں کے ساتھ مخصوص نہیں تو بدو و انابت، روحانی بالیدگی، اتباع شریعت کا پختہ

ارادہ، اس ارادے کو عملی شکل دینا، کسی مرد صالح سے اپنے لیے دعا کرنا اور اس کے زیر نگرانی روحانی تربیت حاصل کرنا وغیرہ، یہ وہ چیزیں ہیں جو ہر شخص سے مطلوب ہیں۔ اس لیے بیعت تقویٰ نہ تو کسی دور کے ساتھ خاص ہوئی اور نہ ہی کسی شخصیت کے ساتھ مخصوص۔ یہ وہ بیعت ہے جسے ہر زمانہ اور ہر دور میں جاری رہنا ضروری تھا۔ لہذا اس سنت کو باقی رکھنے کے لیے آپ ﷺ نے دوسرے کو بیعت لینے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

عن ام عطیة رضی اللہ عنہا قالت: لما قدم رسول اللہ ﷺ جمع نساء الانصار فی بیت ثم أرسل الینا عمر بن الخطاب فقام علی الباب وسلم علینا فرددن أو فرددنا قال: انما رسول رسول اللہ ﷺ الیکن قالت: فقلنا مرحبا برسول رسول اللہ، فقال: تبایعن علی ان لا تشرکن باللہ ولا تسرقن ولا تزنین قالت: فقلنا: نعم! قالت: مد یدہ خارج الباب او البیت ومددنا یدینا من داخل البیت ثم قال اللهم اشہد. (۲۳)

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ مدینہ منورہ تشریف لائے تو انصار کی عورتوں کو ایک گھر میں جمع کیا اور ان کے پاس حضرت فاروق اعظم کو بھیجا۔ حضرت عمر دروازے پر آئے اور ہم لوگوں کو سلام کیا۔ ہم نے جواب دیا۔ انہوں نے کہا: میں تم لوگوں کے پاس رسول اللہ ﷺ کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔ حضرت ام عطیہ نے کہا تو ہم لوگوں نے کہا رسول اللہ کے نمائندے خوش آمدید! حضرت عمر نے کہا: تم لوگ بیعت کرو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کروگی، چوری نہ کروگی، زنا نہ کروگی۔ ہم لوگوں نے کہا ہاں! حضرت ام عطیہ فرماتی ہیں حضرت عمر نے گھریا دروازے کے باہر ہاتھ بڑھایا اور ہم لوگوں نے گھر کے اندر سے ہاتھ بڑھایا۔ حضرت عمر نے فرمایا: اللہ تو گواہ رہے۔

خلاصہ حدیث

- (۱) بیعت کے لیے کسی جگہ لوگوں کو جمع کرنا سنت ہے۔
- (۲) بیعت کے لیے لوگوں کو ترغیب دینا سنت ہے۔
- (۳) بیعت لینے کے لیے کسی صاحب صلاحیت شخص کو اجازت (خلافت) دینا سنت ہے۔
- (۴) بیعت کے بعد دعا فرمانا سنت ہے۔
- (۵) بیعت لینے سے پہلے اپنے اجازت دینے والے (یعنی سلسلہ) کے نام کی مراحت کروینا سنت ہے۔

- (۶) بیعت لیتے وقت عورتوں کا باپ وہ ہونا ضروری ہے۔

راقم الحروف نے بیعت کی متعدد مجالس میں شرکت کی، کہیں کہیں دیکھا کہ مجمع کثیر ہے، سیکڑوں افراد فروکش ہیں اور شیخ طریقت بیعت لے رہے ہیں لیکن شیخ کی آواز نہیں پہنچی پا رہی ہے۔ اس کے لیے یہ انتظام دیکھا کہ کوئی بلند شخص کھڑا ہو کر شیخ کے الفاظ کو زور و زور سے چلا کر لوگوں تک پہنچا رہا ہے اور لوگ سن کر ان کلمات کو دہرا رہے ہیں۔ یہ انداز بیعت بھی سنت رسول سے ثابت ہے۔ آئیے اس سلسلے میں حضرت امام رازی کی ایک عبارت ملاحظہ کریں:

ان النبی ﷺ لما فرغ يوم الفتح من بيعة الرجال اخذ في بيعة النساء وهو على الصفا وعمر اسفل منه يبايع النساء بامر رسول الله ﷺ ويبلغن عنه - (۲۴)
رسول کریم ﷺ فتح مکہ کے دن جب مردوں کی بیعت سے فارغ ہوئے تو عورتوں کی بیعت شروع فرمائی۔ آپ صفا کی بلند ی پر تھے اور حضرت عمران سے نیچے تھے اور حضرت عمر رسول اللہ ﷺ کے حکم سے عورتوں سے بیعت لے رہے تھے اور حضوری کی جانب سے بیعت کے الفاظ پہنچا رہے تھے۔
بیعت تقویٰ یا بیعت توبہ کے تعلق سے بارہ حدیثیں پیش کی گئیں۔ انصاف کی نظر سے کام لیا جائے تو مرفہ بیعت و اجازت کی اہمیت و مقام اور شرعی حیثیت اظہر من الشمس ہو کر سامنے آجائے گی اور اگر ذہن کسی خارجی دباؤ کا شکار نہ ہوگا تو ضرور بیعت تقویٰ کو مستنون و مقبول اور محبوب و مرغوب تصور کرے گا اور اس کے ضمیر کی آواز ہوگی کہ

بیعت تقویٰ

روحانی بالیدگی کا ذریعہ ہے۔

ایمان کی پختگی و اسلامی استحکام کا وسیلہ ہے۔

ارکان اسلام کی پابندی و توبہ و انابت بجالانے کا سبب ہے۔

جکھیلے گناہوں سے تائب ہو کر آئندہ احتراز معصیت کا پر عزم عہد ہے۔

کسی مرد صالح کو گواہ بنا کر ارتکاب کبائر و صغائر سے پختہ توبہ کرنا ہے۔

وابتغوا اليه الوسيلة کی عملی قبولیت کا آئینہ ہے۔

سکون و مع الصادقین کی فعلی تعبیر ہے۔

اطاعت رسول کا مظہر جمیل ہے۔

ادائے صحابہ کرام کی پیروی ہے۔

بزرگان سلف و خلف کو اپنا رہنما و امیر بنانا ہے۔

عمین اتباع شریعت ہے، نہ بدعت و ضلالت۔

اور اللہ والوں کے قریبے تقرب الہی پانے کی راہ ہے۔

حوالہ جات

۱۔ قرآن کریم، مکتبہ: ۱۱

۲۔ قرآن کریم، فتح: ۱۷

۳۔ قرآن کریم، فتح: ۱۷

۴۔ قرآن کریم، توبہ: ۱۱۱

۵۔ تفسیر کبیر جلد ۲، ص: ۵۰۶

۶۔ بخاری شریف جلد ۲، ص: ۱۰۶۹

۷۔ بخاری شریف جلد اول، ص: ۱۳

۸۔ سنن ترمذی جلد اول، ص: ۲۰۵

۹۔ بخاری جلد ۲، ص: ۱۰۷۱

۱۰۔ قرآن مقدس، آل عمران: ۱۶۴

۱۱۔ فتح الباری جلد اول، ص: ۱۳۵-۱۳۹

۱۲۔ سنن ابن ماجہ، ص: ۲۸۱

۱۳۔ صحیح مسلم جلد دوم، ص: ۱۱۳

۱۴۔ قرآن شریف، بنی اسرائیل: ۳۴

۱۵۔ بخاری شریف جلد ۲، ص: ۱۰۷۰

۱۶۔ سنن نسائی جلد ۲، ص: ۱۸۳

۱۷۔ مشکوٰۃ شریف، ص: ۵۸

۱۸۔ مستدرک حاکم، جلد ۳، ص: ۵۹۷

۱۹۔ فتح الباری، جلد ۷، ص: ۱۹۵

۲۰۔ تفسیر رازی سورہ ممتحنہ، ص: ۱۹۳

۲۱۔ تفسیر رازی سورہ ممتحنہ، ص: ۱۹۳

۲۲۔ تفسیر الاحوذی جلد ۲، ص: ۳۵۹

۲۳۔ تفسیر ابن کثیر جلد ۳، ص: ۲۸۹

۲۴۔ تفسیر رازی سورہ ممتحنہ، ص: ۱۹۴

حضرت جنید بغدادی: علمی تبحر اور روحانی مشاغل

علم کی تین قسمیں ہیں، علم من اللہ، جسے شریعت کہا جاتا ہے اور علم مع اللہ وہ علم مقامات و درجات اولیا اور علم طریق حق ہے اور علم یا اللہ۔ اسی کو علم معرفت کہا جاتا ہے۔ وہ اولیا جن کو ان تینوں علوم سے حظ وافر ملا ہے ان میں سے ایک سید الطائفہ ابو القاسم حضرت جنید بن محمد زجاج قزاقی بغدادی علیہ الرحمۃ والرضوان کا شمار ہوتا ہے۔ آپ کے آبا و اجداد کا تعلق نہایت سے ہے اور آپ کی جائے ولادت اور نشوونما بغداد میں ہوئی۔

حضرت جنید بغدادی جس طرح طریقت کے امام الائمہ ہیں اسی طرح آپ شریعت کے بھی امام ہیں۔ آپ نے حضرت امام شافعی کے شاگرد حضرت ابو ثور سے فقہ میں تلمذ حاصل کیا اور انہیں کے مذہب کے مطابق ان کی موجودگی میں بیس سال کی عمر میں فتویٰ دینا شروع کیا۔ (۱)

حضرت جنید بغدادی اپنے ماموں حضرت سری سقطی، حارث محاسبی اور محمد بن علی قصاب علیہ الرحمۃ کے علوم سے فیض یاب ہوئے۔ آپ کی ذات علما کے لیے زینت تھی، اس لیے آپ کے معاصرین آپ کو ”طایفوس العلماء“ کے لقب سے پکارتے تھے۔ (۲) آپ کے ماموں اور پیر و مرشد حضرت سری سقطی بھی عظمت و طریقت میں آپ کی امامت کے قائل تھے۔ ایک مرتبہ لوگوں نے حضرت سری سقطی سے پوچھا کہ کیا کوئی مرید اپنے پیر سے بلند مرتبہ ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا ہاں! اور اس کا ثبوت ظاہر ہے کہ حضرت جنید کا درجہ پیر سے بلند ہے۔ (۳)

صاحب اقتباس الانوار لکھتے ہیں کہ آپ بالانفاق مشائخ کے مقتدا اور پیروا ہیں۔ الشیخ فی قلوبہ کالنبی فی امتہ۔ (شیخ اپنی قوم میں ایسا ہوتا ہے جیسے نبی اپنی امت میں)۔ گویا محض آپ کی شان میں وارد ہوئی ہے۔ (۴)

حضرت عارف باللہ سیدی عبدالوہاب شعرانی اپنے طبقات میں رقم طراز ہیں:

عراق کے آٹھواں دہائی: (۱) حضرت معروف کرشی (۲) امام احمد بن حنبل (۳) بشر حافی

(۴) منصور بن عمار (۵) حضرت جنید (۶) سری سقطی (۷) سہل بن عبد اللہ استری (۸) اور حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہم اجمعین۔ (۵)

حضرت ابو عبد اللہ بن حقیق فرماتے ہیں:

ہمارے شیوخ میں پانچ کی اقتدا کرو اور باقی کو ان کے حال پر چھوڑ دو (۱) حارث بن اسد محاسبی (۲) جنید بن محمد (۳) ابو محمد رویم (۴) ابو العباس بن عطا (۵) و عمر بن عثمان مکی علیہم الرحمۃ کیونکہ یہ لوگ علم اور تحقیق دونوں کے جامع ہیں۔ (۶) طریقت کے میدان میں حضرت جنید بغدادی کو وہ نمایاں مقام حاصل ہے کہ صاحب کشف المحجوب حضرت داتا گنج بخش لاہوری آپ کے مسلک کے متعلق ایک مستقل فصل منعقد کرتے ہوئے کہتے ہیں: ”جنیدی مسلک و شرب تمام مذاہب میں سب سے زیادہ مشہور و معروف ہے۔“ (۷)

تیسری صدی کو تصوف اور طریقت کا سنہری دور سمجھا جاتا ہے۔ یہ عظیم ترین اور عہد ساز صوفیوں کا زمانہ ہے۔ اس زمانے میں صوفیہ کی خانقاہوں کا قیام بھی شروع ہوا۔ حضرت علامہ جامی کے ایک بیان کے مطابق صوفیہ کے سرخیل حضرت شیخ جنید بغدادی نے بھی اپنی خانقاہ قائم کی تھی۔ (۸) آپ کا سب سے بڑا کارنامہ غلو پسند صوفیہ کی بد عملی سے تصوف کی تطہیر اور تجدید ہے۔ اس طریق کی حفاظت کے لیے آپ نے عمل پر خوب زور دیا۔

ایک مرتبہ ایک شخص معرفت کا ذکر کرتے ہوئے کہہ رہا تھا: اہل معرفت مرقی کرتے کرتے ایسے مقام پر پہنچ جاتے ہیں کہ نیکی اور تقرب الی اللہ کے لیے حرکت کرنا بند کر دیتے ہیں۔ (۹) اس کی مراد یہ تھی کہ انہیں عمل کی ضرورت نہیں ہوتی) تو آپ نے فرمایا: یہ ان لوگوں کا قول ہے جو اعمال کے ساقط ہو جانے کے قائل ہیں اور یہ میرے نزدیک بڑا گناہ ہے۔ اس بات کے قائل سے وہ شخص بہتر ہے جو چوری کرتا ہے اور زنا بھی، کیوں کہ عارفین باللہ نے اعمال کا حکم اللہ سے لیا ہے اور اعمال میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اگر میں ایک ہزار سال بھی زندہ رہوں تب بھی ذرہ برابر بھی نیک اعمال کو ترک نہ کر سکوں گا مگر یہ کہ درمیان میں کوئی بات حائل ہو جائے۔ (۱۰)

آپ فرمایا کرتے تھے: مخلوق پر سارے راستے بند ہیں سوائے ان کے جو رسول بھیجتے کے نقش قدم پر چلیں۔ (۱۱) آپ نے صوفیہ کا لباس یعنی خرقہ پہن کر بد عملی کا شکار ہونے والوں کی سخت مذمت فرمائی۔ حضرت محبوب الہی کے ملفوظات الفضل الفوائد میں منقول ہے کہ ایک دفعہ حضرت جنید علیہ الرحمۃ سے پوچھا گیا کہ خرقہ قابل اعتبار ہے یا نہیں؟ فرمایا نہیں، پوچھا گیا کیوں؟ فرمایا اس لیے کہ بہت سے خرقہ پوش ایسے ہیں جن سے افعال قبیحہ سرزد ہوتے ہیں اور قیامت کے

دن وہی خرقہ ان کا مدنی بنے گا، ایسے اشخاص ووزخ کے مستحق ہوں گے، محض خرقہ معتبر نہیں بلکہ خرقہ اس خرقہ پوش کی وجہ سے قابل اعتبار ہوتا ہے جو اسے پہن کر اس کا حق ادا کرے، ایسے شخص کے خرقے کی عزت ہوتی ہے۔ (۱۱)

اور ایک موقع پر فرمایا: ہر روز ہمارے باطن میں یہ ندا کی جاتی ہے کہ لیس الاعصار بالخرقة انما الاعتبار بالحرفة، یعنی خرقے کا کوئی اعتبار نہیں، عرف حرفہ یعنی عمل کا اعتبار ہے۔ (۱۲) آپ شریعت کا بے انتہا پاس و لیاظ کرتے تھے۔ آپ کا یہ قول مشہور ہے: ”علمنا مشہد بالمکتاب والسنة“ ہمارا علم کتاب و سنت سے مستحکم ہے۔ ہر وہ طریق جو کتاب و سنت کے خلاف ہو، مردود اور باطل ہے۔ (۱۳)

علمی تبحر

ایک علم کا تعلق قابلیت سے ہے اور ایک کا تعلق قبولیت سے۔ جس کا تعلق قبولیت سے ہوتا ہے وہ مقبول ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت جنید بغدادی کے علم معرفت کو قبولیت عامہ عطا فرمایا۔ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز علیہ الرحمۃ والرضوان نے فرمایا: حضرت جنید کے زمانے میں بہت سے مردان کامل تھے لیکن علم میں کوئی ان سے بڑھ کر نہ تھا (۱۴) اور حضرت امام شعرانی نے فرمایا: حضرت جنید علم میں قطب تھے، جبکہ سہیل تستری مقام میں قطب تھے اور حضرت بازید حال میں قطب تھے۔ (۱۵) اگر کوئی مخالفت کی نیت سے ایک مرتبہ بھی آپ کی مجلس میں جاتا تو آپ کے علمی تبحر کا اعتراف کیے بغیر نہیں لوٹتا تھا۔

رسالہ قشیریہ میں منقول ہے کہ: عبد اللہ بن سعید بن کلاب سے کہا گیا کہ تم ہر شخص کے کلام پر جرح کیا کرتے ہو اور یہاں جنید نامی ایک شخص ہے کیا تم اس پر بھی اعتراض کر سکتے ہو یا نہیں؟ چنانچہ وہ آپ کے حلقہ میں حاضر ہوا اور حضرت جنید سے توحید کے تعلق سے سوال کیا تو انھوں نے ایسا جواب دیا کہ عبد اللہ حیران ہو گئے اور کلام کے دہرائے کی درخواست کی تو حضرت جنید نے عبارت بدل کر بات دہرائی۔ اس پر عبد اللہ نے کہا یہ تو کوئی اور ہی بات ہے جو مجھے نہیں آتی۔ ذرا پھر دہرایے انھوں نے اسی بات کو دوسری عبارت میں دہرایا عبد اللہ نے کہا: آپ نے جو فرمایا مجھے یاد رکھنا ممکن نہیں، مجھے لکھ دیجئے تو حضرت جنید نے فرمایا: اگر آپ سلوک کا راستہ سٹے کر سکتے ہو تو میں لکھ دیتا ہوں۔ اس پر عبد اللہ کھڑے ہو گئے اور آپ کی فضیلت اور آپ کی شان بلند کا اعتراف کیا۔ (۱۶)

آپ کی فکر بچپن ہی سے علمی تھی، اس کی دلیل یہ ہے کہ حضرت جنید علیہ الرحمہ خود فرماتے ہیں: میں ابھی سات سال کا تھا اور میری سقطی علیہ الرحمہ کے سامنے کھیل رہا تھا، اس

وقت ان کے سامنے ایک جماعت شکر کے متعلق گفتگو کر رہی تھی تو آپ نے مجھ سے پوچھا شکر کیا ہے؟ تو میں نے عرض کیا؟ لا تعصی اللہ بنعمہ۔ تو اللہ کے احسان کے بدلے میں اس کی نافرمانی نہ کرے۔ اس پر حضرت سری علیہ الرحمہ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ عن قریب تجھے زبان عطا کرے گا۔ (۱۷)

حضرت جنید بغدادی کی علمی شان کی مقبولیت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی نگاہ عنایت آپ کے مثال حال تھی، آپ علم سے مزین ہونے کے باوجود ابتدا میں وعظ نہیں کرتے تھے۔ آپ کا خود بیان ہے کہ حضرت سری علیہ الرحمہ لوگوں کو وعظ کرنے کا حکم کرتے تھے، میں وعظ کرنے میں جھجک محسوس کرتا تھا اور میں اپنے آپ کو اس کا اہل نہ سمجھتا تھا۔ میں نے ایک جمعہ کی رات حضور نبی کریم ﷺ کو خواب میں دیکھا، آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا: لوگوں کو وعظ کرو، میں اٹھ کر صبح ہونے سے پہلے ہی حضرت سری کے دروازے پر آیا اور دستک دی۔ انھوں نے کہا تم نے ہماری بات نہیں مانی، یہاں تک کہ نبی کریم ﷺ نے تجھ سے فرمایا۔ دوسرے دن حضرت جنید جامع مسجد میں لوگوں کو وعظ کرنے کے لیے بیٹھے، لوگوں میں یہ بات پھیل گئی کہ جنید لوگوں کو وعظ فرمانے لگے ہیں، تو ایک عیسائی لڑکا بھیس بدل کر اٹھا اور آپ سے عرض کی: اے شیخ! رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کے کیا معنی ہیں؟ اتقوا فراسة المومن فانه ينظر بنور الله (مومن کی فراست سے بچو کیوں کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔) تو حضرت جنید نے اپنے سر کو جھکایا، پھر اپنے سر کو اٹھا کر فرمایا: تو مسلمان ہو جا؛ کیوں کہ تیرے اسلام لانے کا وقت آ گیا ہے۔ وہ لڑکا مسلمان ہو گیا۔ (۱۸)

آپ کی مجلس میں شرکت کی برکت سے اہل علم کے علوم ترقی پاتے تھے، جیسا کہ ابو نعیم علی بن ابراہیم الحداد کا بیان ہے کہ میں قاضی ابو العباس بن شریع کی مجلس میں گیا تو انہوں نے اصول اور فروع کے متعلق ایسی عمدہ تقریر کی کہ مجھے اس سے بہت تعجب ہوا۔ جب انہوں نے میرے اس تعجب کو دیکھا تو کہا تجھے معلوم ہے کہ یہ علم میں نے کہاں سے حاصل کیا؟ میں نے کہا: آپ ہی فرمادیں تو انھوں نے کہا: یہ ابو القاسم جنید کی مجلس میں بیٹھنے کی برکت ہے۔ (۱۹)

آپ نے جس جامعیت کے ساتھ تصوف اور صوفی کی تعریف کی ہے، یہ آپ کے علمی تبحر کی دلیل ہے، جیسا کہ کشف الجوب میں یہ روایت ہے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: تصوف کی بنیاد آٹھ خصلتوں پر ہے: (۱) سخاوت (۲) رضا (۳) صبر (۴) شامہ (۵) غربت، یعنی اجنبی بن کر رہنا (۶) گدڑی (۷) سیاہی (۸) اور فقر۔ یہ آٹھ خصلتیں آٹھ انبیاء کی اقتدا ہے۔ سخاوت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی؛ کیوں کہ آپ نے فرزند کو فدا کیا،

رضا حضرت اسماعیل علیہ السلام کی: کیوں کہ بوقت ذبح اپنی جان عزیز کو بارگاہ خداوندی میں اپنی رضا سے پیش کر دیا، مہر حضرت ایوب علیہ السلام کی: کہ آپ رب کی طرف سے آئی ہوئی ابتلا و آزمائش پر ثابت قدم رہے اور امثالہ حضرت زکریا علیہ السلام کی: کہ حق تعالیٰ نے فرمایا: ان لا تکلم الناس ثلاثة ايام الا رمزا۔ آپ نے تین دن لوگوں سے اشارہ کے سوا کلام نہ فرمایا۔ اسی سلسلے میں ارشاد ہے: اذ نادى ربه نداء خفيا۔ (انھوں نے اپنے رب کو آہستہ پکارا۔) اور غربت حضرت یحییٰ علیہ السلام کی: کہ وہ اپنے وطن میں مسافروں کی مانند رہے اور خاندان میں رہتے ہوئے اپنوں سے پیگ نہ رہے اور سیاحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی: کہ آپ نے یکا و تنها مجرد زندگی گزاری اور سوائے ایک پیالہ و کھجور کے کچھ پاس نہ رکھا۔ جب انھوں نے دیکھا کہ کسی نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر پانی پی رہا ہے تو انھوں نے پیالہ بھی توڑ دیا اور جب کسی کو دیکھا کہ انگلیوں سے بالوں میں لٹکتی کر رہا ہے تو لٹکتی بھی توڑ دی: اور گدڑی یعنی صوف کا لباس حضرت موسیٰ علیہ السلام کی: کہ انھوں نے شیشی کپڑے پہنے اور فخر سید عالم رحمۃ اللعالمین علیہ کی جنہیں روئے زمین کے تمام خزانوں کی کنجیاں عتایت فرمادی گئی تھیں اور ارشاد ہوا کہ آپ خود کو مشقت میں نہ ڈالیں بلکہ اپنے ان خزانوں کا استعمال کریں اور آزمائش اختیار فرمائیں: لیکن بارگاہ الہی میں آپ نے عرض کی: اے خدا! اس کی حاجت نہیں ہے، میری خواہش یہ ہے کہ ایک دن پیٹ بھر کر کھاؤں تو دو روز فاقہ کروں۔ (۲۵)

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے صوفی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا: صوفی زمین کی مانند ہے جسے ٹیک و بد ہر ایک روندتا ہے اور وہ امر کی مانند ہے کہ ہر ایک پر سایہ لگن ہوتا ہے اور بارش کی طرح ہے کہ ہر ایک کو سیراب کرتا ہے۔ (۲۱)

آپ نے قرب و فراق والی حدیث شریف سے استدلال کرتے ہوئے محبت کی تعریف ایک نئے انداز میں کی ہے۔ صاحب عوارف المعارف رقم طراز ہیں: حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے محبت کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ عاشق کا اپنی صفات ترک کر کے محبوب کی صفات کو قبول کر لینا محبت ہے اور اللہ تعالیٰ کے (حدیث قدسی میں) اس ارشاد کا یہی مفہوم و مطلب ہے فاذا احببتہ کنت له سمعاً وبصراً۔ (جب میں اس سے محبت کرتا ہوں تو اس کی سماعت و بینائی بن جاتا ہوں۔) (۲۲)

ہر ایک کی تمنا ہے کہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ رب سے کتنا قریب ہے۔ حضرت جنید بغدادی نے اس کا بہترین معیار اپنے اس قول سے مقرر فرمایا: اللہ تعالیٰ بندوں کے دلوں سے اتنا ہی قریب ہوتا ہے جتنا وہ بندوں کے دلوں کو اپنے سے قریب پاتا ہے اور تم یہ دیکھو کہ وہ

تمہارے دل سے کتنا قریب ہے۔ (۲۳)

کتاب اللہ کے اسرار و حقائق پر آپ کی گہری نظر تھی۔ قرآنی آیات سے آپ کے استدلال اس کی تین دلیل ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ، حضرت محمد بن سیرین اور حضرت ابو العباس بن عطار رحمہم اللہ ایک جگہ جمع تھے، تو ال نے چند اشعار پڑھے، دونوں باہم وجد کرنے لگے اور حضرت جنید ساکن بیٹھے رہے۔ وہ کہنے لگے اے شیخ! اس سماع میں آپ کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ حضرت جنید نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول پڑھا: تحسبھا جامدة وہی تمر مر السحاب، (۲۴) تم ان کو جامد اور ساکن خیال کرتے ہو حالانکہ وہ گزرنے والے بادلوں کی مانند گزر جاتے ہیں۔) ابن شاکین نے حضرت جنید سے ”مع“ کے معنی دریافت کیے تو فرمایا: ”مع“ کے دو معنی ہیں: انمیا کا ذکر ہو تو اس سے مراد دو اور حفاظت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: انسی معکما اسمع وادی۔ (ط: ۲۶۰) بے شک میں تم دونوں کے ساتھ ہوں، میں تمہاری باتیں سنتا ہوں اور تمہیں دیکھتا ہوں۔ اگر عوام کا ذکر ہو تو اس سے علم اور احاطہ ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: نسیکون من نسجی ثلاثۃ الا هو رابعہم۔ (الحج: ۷) یعنی جو پویشیدہا تیس تین آدمیوں میں ہوتی ہیں تو اللہ اس کے ساتھ ہوتا ہے یعنی اس کی باتوں کو جانتا ہے۔ (۲۵)

حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کا بیان ہے کہ ایک دن میں حضرت مری سقطی کی خدمت میں حاضر ہوا، وہاں ایک شخص کو دیکھا جس پر غشی طاری ہے، میں نے عرض کی اسے کیا ہوا؟ فرمایا: اس نے قرآن پاک کی ایک آیت سنی اور غشی طاری ہو گئی۔ میں نے کہا: اس پر وہی آیت دوبارہ پڑھی جائے، جب آیت پڑھی گئی اسے اتفاقاً ہو گیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کے سبب حضرت یعقوب علیہ السلام کی آنکھوں کی پیمائی متاثر ہوئی، پھر اسی سے پیمائی درست ہوئی۔ آپ نے اسے بہت پسند فرمایا۔ (۲۶)

لوگوں نے حضرت جنید قدس سرہ العزیز سے پوچھا کہ آپ اس شخص کے بارے میں کیا کہتے ہیں جس کے پاس دنیا کے مال میں سے صرف ایک پرانی کھجور کی مقدار چھانے کے لیے رہ گیا ہو؟ فرمایا کہ مکاتب غلام ہی رہے گا، اگر چہ اس پر ایک درہم باقی رہے۔ (۲۷) حضرت جنید بغدادی کے جو کچھ عالمانہ اور عارفانہ اقوال ہم تک پہنچے وہ کثیر ہونے کے باوجود قلیل ہیں۔ اس لیے کہ آپ اسرار البہیہ کی حفاظت اور اتقا کا حد درجہ اہتمام فرماتے تھے، جیسا کہ مروی ہے کہ آپ اکثر اپنے مرید حضرت شیخ شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے فرماتے تھے کہ حجاب والوں کے سامنے اللہ تعالیٰ کا عقدہ نہ کھولا کرو۔ (۲۸)

روحانی مشاغل

اہل اللہ کے سارے روحانی مشاغل اس حدیث کی تفسیر ہوا کرتے ہیں: **إِنَّ تَعْبِيدَ اللَّهِ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَانْهَ بِيَاكٍ**۔ (تو اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو اسے دیکھ رہا ہے اور اگر تجھ سے یہ نہ ہو سکے تو یہ تصور رکھ کہ وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔) (۲۹)

اس حدیث شریف کے مطابق حضرت جنید بغدادی کی ساری زندگی اور آپ کے روحانی مشاغل، مراقبہ و مشاہدہ اور حضور و شہود پر مشتمل تھے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ مجھ پر ایسا زمانہ بھی گزرا کہ تمام زمین و آسمان والے میری پریشانی پر روتے تھے۔ پھر ایسا زمانہ بھی آیا ہے کہ ان کے مفقود ہونے پر میں روتا تھا، اب ایسا زمانہ آگیا ہے کہ مجھے نہ اپنی خبر ہے نہ زمین و آسمان کی۔ صاحب کشف الکجوب فرماتے ہیں: یہ حضور حق کے شائق بہترین اشارہ ہے۔ (۳۰) افضل القوافل ملفوظات حضرت محبوب الہی کی روایت کے مطابق حضرت جنید بغدادی نے فرمایا: دس سال میں بیابان میں پھرتا رہا اور دل کی نگہداشت کرتا رہا، اب بیس سال سے مجھ کو کسی کی خبر نہیں، پھر کہا کہ بیس سال حق تعالیٰ جنید کی زبان سے بات کرتا رہا لیکن جنید کا کچھ میں کوئی دخل نہ تھا اور نہ ہی خدا کے سوا کسی کو اس بات کی خبر تھی۔ (۳۱)

آپ کے روحانی مشاغل میں سے ایک مشغلہ مراقبہ ہے، جیسا کہ صاحب کشف الکجوب نے فرمایا: باطن کا مراقبہ جنیدیوں کا امتیاز ہے۔ (۳۲)

حضرت جنید بغدادی مشاہدے کے کس عظیم مرتبے پر تھے، اس کا کشف الکجوب کی اس روایت سے پتا چلتا ہے: ایک شخص حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا، آپ نے اس سے پوچھا: کہاں سے آئے ہو؟ اس نے کہا: حج کر کے آیا ہوں، آپ نے فرمایا: حج کر لیا؟ اس نے کہا: ہاں! آپ نے فرمایا: جب تم اپنے مکان سے چلے، وطن سے کوچ کیا، کیا اس وقت تم نے گناہوں سے بھی کوچ کر لیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: تم نے کوچ ہی نہ کیا، اس کے بعد فرمایا: جب تم گھر سے چلے اور ہر منزل میں رات کو قیام کیا تو کیا تم نے راہ حق کا قیام بھی طے کیا؟ اس نے کہا نہیں؟ آپ نے فرمایا: تم نے کوئی منزل طے نہیں کی، پھر فرمایا: جب تم نے میقات سے احرام باندھا تو کیا بشری صفات سے جدا ہو گئے تھے؟ جیسا کہ تم کپڑوں سے جدا ہوئے تھے۔ اس نے کہا نہیں، فرمایا: تو تم محرم بھی نہ ہوئے۔ پھر فرمایا: جب تم نے عرفات میں وقوف کیا تھا تو کیا مجاہدے کے لیے کشف میں بیٹھا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: تمہیں عرفات کا وقوف بھی میسر نہ آیا۔ پھر فرمایا: جب تم مزدلفہ میں اترے تھے اور تمہاری مراد برائی تھی تو کیا تم نے تمام نفسانی خواہشوں کو چھوڑ دیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: بس تو مزدلفہ کا نزول بھی حاصل نہ ہوا، پھر فرمایا: جب تم نے خانہ کعبہ کا

طواف کیا تھا تو کیا تم نے اپنے سر کی آنکھوں سے مقام تنزیہ میں حق تعالیٰ کے جمال کے لحاظ رکھ کر بھی دیکھا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: تو طواف بھی حاصل نہ ہوا، پھر فرمایا: جب تم نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کی تھی تو صفا کا مقام اور مروہ کے درجے کا اور رک کیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: ابھی سعی بھی تعصیب نہیں ہوئی، پھر فرمایا: جب منیٰ میں آئے تو کیا تمہاری ہتھیلیاں تم سے جدا ہو گئیں تھیں؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: ابھی تم منیٰ بھی نہیں پہنچے، پھر فرمایا: جب قربان گاہ میں تم نے قربانی کی تھی اس وقت تم نے نفسانی خواہشوں کی بھی قربانی کی تھی؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: بس تو قربانی بھی نہیں ہوئی۔ پھر فرمایا: جب تم نے حمرات پر سنگ ریزے پھینکے تھے اس وقت تمہارے ساتھ جو نفسانی تمنائیں تھیں کیا ان سب کو بھی پھینک دیا تھا؟ اس نے کہا نہیں، فرمایا: تم نے سنگ ریزے بھی نہیں پھینکے اور حج بھی نہیں کیا، جاؤ، ان صفات کے ساتھ پھر حج کرو تا کہ مقام امیر ایم علیہ السلام تک رسائی ہو۔ (۳۳)

حضرت جنید بغدادی کو یہ مقام کیسے حاصل ہوا، خود ان کی زبانی سنئے:

کسی نے آپ سے پوچھا: آپ نے یہ علم کہاں سے حاصل کیا؟ تو آپ نے اپنے گھر کی سڑھی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا: اس سڑھی کے نیچے اللہ کے سامنے تیس سال بیٹھے رہنے سے۔ (۳۴) آپ کی ساری زندگی مجاہدوں سے تعمیر ہے جیسا کہ آپ نے فرمایا: ہم نے یہ علم تصوف قبل وقال کے ذریعے حاصل نہیں کیا بلکہ بھوک، ترک دنیا اور ترک مال و فوات اور سختیات سے قطع تعلق کر کے پایا ہے۔ (۳۵) آپ نے اللہ تعالیٰ سے تقرب کے ہر قسم کے ذرائع کو اپنا محبوب مشغلہ بنایا۔ عوارف المعارف کی روایت کے مطابق جہاں آپ صائم الدیر تھے وہیں آپ کے معمولات میں نوافل کی کثرت تھی، صاحب رسالہ تغیر یہ اپنے استاذ ابو علی دقاق سے روایت کرتے ہیں کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ ہر روز اپنی دوکان پر آ کر پر وہ رکنا دیتے تھے اور چار سو رکعت ادا کر کے گھر کو لوٹتے تھے۔ (۳۶) قیامت کے دن مصیبتوں کا ثواب کیا ہے؟ اگر اس کی حقیقت معلوم ہو جائے تو انسان نعمت کے ملنے سے بڑھ کر مصیبت کے آنے پر رب کا شکر ادا کرے گا، جیسا کہ بزرگوں کا معمول ہے۔ چنانچہ امیر الاولیاء ملفوظات حضرت خواجہ فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ میں منقول ہے کہ جب خواجہ جنید بغدادی قدس سرہ العزیز بخارا دریا کسی اور مصیبت میں مبتلا ہوتے تو شکرمانے میں اس روز ہزار رکعت نماز ادا کرتے۔ (۳۷) بڑھاپے میں بھی آپ کے شوق و ذوق اور عبادت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صاحب کشف الکجوب نے روایت کرتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ جب بوڑھے ہو گئے تو اس بڑھاپے میں بھی جوانی کے کسی درد کو نہ چھوڑا۔ لوگوں نے عرض کی: اب آپ بوڑھے ہو گئے، کمزور ہو گئے ہیں، ان میں سے کچھ نوافل چھوڑ دیجیے، انھوں نے فرمایا: بلکہ تو وہ چیزیں ہیں جن کو ابتدا میں کر کے اس مرتبہ کو پایا ہے، اب یہ ممکن ہے کہ انتہا پر پہنچ کر ان سے دستبردار ہو جاؤں۔ (۳۸)

جب آپ کے ہاتھ میں تسبیح دیکھی گئی تو کسی نے عرض کی: باوجود اس قدر شرف و عظمت کے کیا آپ بھی اپنے ہاتھ میں تسبیح رکھتے ہیں؟ آپ نے جواب دیا ہاں! جس راستے سے ہم اللہ تک پہنچے ہم اسے ہرگز نہیں چھوڑیں گے۔ (۳۹) آپ کا دن جس طرح نمازوں سے معمور تھا، آپ کی راتیں بھی اللہ کے ذکر سے روشن تھیں۔ صاحب الفضل الفوائد نقل فرماتے ہیں کہ رات بھر اللہ اللہ کرتے اور یہ شعر پڑھتے تھے:

من لم یکن للوصل اھلا
فکل احسان له ذنوب

جو وصال کا اہل نہیں تو اس کی ہر نیکی گناہ ہے۔ (۴۰)

آپ کا کوئی وقت ایسا نہیں گزرتا جو ذکر الہی سے خالی ہو، صاحب رسالہ قشیر یہ روایت کرتے ہیں حضرت جنید سے کہا گیا: لا الہ الا اللہ کہیے تو فرمایا: میں اسے بھولا نہیں ہوں کہ اسے یاد کروں اور کہا:

وحاضر فی القلب بعمره

فھو مولای ومعتمدی ونصبی منہ اوفرہ

(وہ تو دل میں حاضر ہے، جس سے دل آباد ہے، میں اسے بھولتا نہیں ہوں کہ یاد کروں۔)

وہ میرا مولیٰ اور میرا سہارا ہے اور مجھے اس سے وافر حصہ ملتا ہے۔ (۴۱)

آپ عبادت کی طرح مخلوق کی دل جوئی و حاجت روائی کو بھی فرض سمجھتے تھے جیسا کہ صاحب اسرار الاولیا لکھتے ہیں: خواجہ جنید بغدادی قدس سرہ العزیز جب سجادے پر بیٹھ کر باطن میں مشغول ہوتے اور کوئی آجاتا تو چھوڑ کر باتیں کرنے لگتے اور باتوں ہی میں جس حاجت کے لیے آتا پوری کرتے، جب وہ واپس چلا جاتا تو آپ تلاوت میں مشغول ہوتے۔ (۴۲) سماع بھی آپ کا روحانی مشغلہ تھا، اگرچہ زندگی کے آخری حصے میں اس کی شرط نہ پائے جانے کی وجہ سے ترک کر دیا۔ حضرت خواجہ بندہ نواز زکیو دراز رحمۃ اللہ علیہ کی ایک روایت کے مطابق آپ نے سماع کو طبیب العیش مع اللہ (اللہ کے ساتھ بہترین وقت گزارنا) قرار دیا۔ (۴۳) حضرت امام شعرانی نقل فرماتے ہیں کہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ نے فرمایا: فقہر پر تین مقامات میں رخصت کا نزول ہوتا ہے: سماع کے وقت؛ کیوں کہ وہ صرف حق سے ہی سنتے ہیں اور صرف وجد سے ہی کھڑے ہوتے ہیں۔ کھانا کھاتے وقت؛ کیوں کہ وہ صرف فاقے سے ہی کھاتے ہیں اور علم کے فدا کر کے وقت؛ کیوں کہ وہ صرف اولیاء اللہ کے احوال ہی کا تذکرہ کرتے ہیں۔ (۴۴)

صاحب عوارف المعارف لکھتے ہیں کہ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ پہلے تو آپ سماع سے رغبت رکھتے تھے (اب کیوں چھوڑ دیا) تو انہوں نے فرمایا: میں کس کے ساتھ سنتا تھا اور کن لوگوں سے

سنتا تھا؟ خود ہی فرمایا کہ ان کے اہل کے ساتھ سنتا تھا پھر جب ایسے لوگ ناپید ہو گئے تو چھوڑ دیا۔ (۴۵) آپ کے علمی مشاغل کا ایک حصہ تصنیف و تالیف بھی تھا مختلف کتب میں آپ کی تصانیف کی جو فہرست ملتی ہے وہ یہ ہے: کتاب الرسائل، امثال القرآن، معانی الہم، المقصد الی اللہ تعالیٰ (۴۶)، کتاب العمدة (۴۷)، کتاب الخوف، کتاب النوع، کتاب الرہبان، کتاب المحبة علیہ السلام (۴۸)

بوخت و وفات آپ کے روحانی مشاغل کی کیفیات کا اہل رشتہ ہیں۔ فضل الفوائد ملفوظات حضرت محبوب الہی رحمۃ اللہ علیہ میں یہ کیفیت تفصیل سے بیان کی گئی ہے:

جب خواجہ جنید بغدادی کا آخری وقت قریب آپ پہنچا تو وٹو کر کے سجدہ کیا اور روتے، لوگوں نے پوچھا سید طریقت! آپ نے اس قدر طاعت و عبادت کی ہے، پھر یہ رونے کا مقام کون سا ہے؟ فرمایا: میرے لیے اس گھڑی سے بڑھ کر اور کوئی احتیاج کا وقت نہیں۔ پھر قرآن شریف پڑھنا شروع کیا۔ لوگوں نے آپ سے پوچھا کہ آپ اس وقت قرآن شریف پڑھتے ہیں؟ فرمایا: میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا؟ کیوں کہ میں دیکھتا ہوں کہ ابھی میری عمر کا صحیفہ پلیٹ لیا جائے گا اور میری ستر سالہ طاعت و عبادت ہوا میں بال سے لگی ہوئی دکھائی دے رہی ہے، جسے ہوا ہلا رہی ہے۔ ایک طرف ٹپس صراط ہے اور ایک طرف ملک السموت اور قاضی عادل، اور سامنے راہ ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ مجھے کس راہ سے لے جایا جائے۔ بعد ازاں جب قرآن شریف ختم کیا تو سورہ بقرہ کی ستر آیتیں اور پڑھیں، جب وقت بالکل قریب آپ پہنچا تو حاضرین نے عرض کی کہ اللہ کہیں تو فرمایا: میں تو اسے بھولا نہیں، پھر تسبیح پڑھتے ہوئے انگلیاں بند کرنی شروع کیں جب چار بند کر چکے تو سہا پہ کو سیدھی کر کے بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھی اور آنکھیں بند کر کے جان دوست کے حوالے کی۔ نہلاتے وقت غسال نے چاہا کہ خواجہ جنید کی آنکھوں میں پانی پہنچائے، آواز آئی کہ ہمارے دوست سے ہاتھ اٹھالے، جو آنکھ ہمارے نام پر بند کی ہے، وہ ہمارے حکم کے سوا نہیں کھلیں گی۔ بعد ازاں خواجہ جنید کو خواب میں ایک شخص نے دیکھ کر پوچھا کہ آپ کو منکر نکیر سے کس طرح خلاصی ہوئی؟ فرمایا کہ جب دونوں فرشتے آئے اور مجھ سے پوچھا کہ تیرا رب کون ہے تو میں نے ان کی طرف منکر کر دیکھا اور کہا: جس روز اس نے المسکت پر حکم پوچھا تھا اس روز میں نے بلسی کہہ دیا تھا، اب تم پوچھنے آئے ہو کہ تمہارا رب کون ہے؟ جواب دہشا کہ جواب دے چکا ہوں اسے بادشاہ کے غلاموں سے کیا ہجرا! آج میں بھی اسی کی زبان سے جواب دیتا ہوں۔ یہ سن کر فرشتے چلے گئے اور کہا ابھی یہ عاشق محبت کے نشے میں ہے۔ (۴۹) آپ کی وفات شنبہ کے دن ۲۷ رجب ۲۹۷ھ کو ہوئی جب کہ آپ کی عمر شریف نوے (۹۰) سال کی تھی۔

حوالہ جات

- (۱) طبقات الاولیاء ہراج الدین ابو حفص عمر علی المصری المعروف بابن الملقن جس: ۱۱۱۰، الرسالة القشیریہ للامام ابی القاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری، دارالکتب العلمیہ، بیروت، لبنان، ص: ۵۰
- (۲) کشف الحجب، حضرت داتا گنج لاہوری، رضوی کتاب گھر، بیسویڈی، ص: ۲۷۳
- (۳) نفس مصدر: ۱۹۵
- (۴) اقتباس الانوار، شیخ محمد اکرم قدوسی، حامد جمیل پرنٹرز، لاہور، ص: ۵۴
- (۵) طبقات امام شعرانی، سید عبدالوہاب شعرانی، ص: ۲۸۱
- (۶) الرسالة القشیریہ، ص: ۵۰
- (۷) کشف الحجب، ص: ۲۷۳
- (۸) مجلہ الاحسان، شامعی اکیڈمی خانقاہ عارفیہ، الہ آباد، ۷/۹
- (۹) الرسالة القشیریہ، ص: ۵۰
- (۱۰) نفس مصدر، ص: ۵۰
- (۱۱) فضل القوائد، ملفوظات حضرت محبوب الہی نظام اولیاء (ہشت بہشت: ۱/۹۳-۹۴)
- (۱۲) نفس مصدر، ۱/۹۷
- (۱۳) تحصیل التعرف فی معرفۃ الفقہ والتصوف، شاہ عبدالحق محدث دہلوی، ترجمہ علامہ محمد عبدالکریم شرف قادری، ص: ۱۰۱
- (۱۴) جوامع الکلم، ملفوظات خواجہ بندہ نواز گیسو دراز رحمہ اللہ، ادبی دنیا، دہلی، ص: ۲۳۴
- (۱۵) طبقات امام شعرانی، ص: ۴۳۲
- (۱۶) رسالہ قشیریہ، ص: ۲۲۶، ۲۲۵
- (۱۷) نفس مصدر، ص: ۲۱۲
- (۱۸) نفس مصدر، ص: ۲۸۵-۲۸۴
- (۱۹) رسالہ قشیریہ، ص: ۵۱
- (۲۰) کشف الحجب، ص: ۷۴
- (۲۱) عوارف المعارف، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ، ص: ۱۹۹
- (۲۲) نفس مصدر، ص: ۶۷
- (۲۳) نفس مصدر، ص: ۶۸۴

- (۲۴) کشف الحجب، ص: ۵۸۷
- (۲۵) رسالہ قشیریہ، ص: ۷۴
- (۲۶) طبقات امام شعرانی، ص: ۱۹۹
- (۲۷) سبع سنائن شریف، میر میر عبد الواحد بکمرانی، ص: ۲۰۴
- (۲۸) طبقات امام شعرانی، ص: ۶۴
- (۲۹) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان
- (۳۰) کشف الحجب، ص: ۳۶۶
- (۳۱) افضل القوائد (ہشت بہشت: ۱/۹۷)
- (۳۲) کشف الحجب، ص: ۲۸۴
- (۳۳) نفس مصدر، ص: ۴۷۳-۴۷۴
- (۳۴) رسالہ قشیریہ، ص: ۵۱
- (۳۵) عوارف المعارف، ص: ۱۹۳
- (۳۶) رسالہ قشیریہ، ص: ۵۱
- (۳۷) اسرار الاولیاء، ملفوظات بابا فرید الدین گنج شکر (ہشت بہشت: ۱۳۹-۱۴۰)
- (۳۸) کشف الحجب، ص: ۲۳۶
- (۳۹) رسالہ قشیریہ، ص: ۵۱/طبقات الاولیاء، ص: ۱۱۱
- (۴۰) افضل القوائد، ۱/۹۷
- (۴۱) رسالہ قشیریہ، ص: ۳۳۸-۳۳۹
- (۴۲) اسرار الاولیاء، ص: ۱۴۲
- (۴۳) جوامع الکلم، ص: ۷۸
- (۴۴) طبقات امام شعرانی، ص: ۱۹۹
- (۴۵) عوارف المعارف، ص: ۳۳۶
- (۴۶) قمر ست لابن ندیم مع حاشیہ، دارالمعرفہ، بیروت، ص: ۳۲۳
- (۴۷) راحت القلوب، ملفوظات بابا فرید الدین گنج شکر رحمۃ اللہ علیہ، ص: ۷۴
- (۴۸) مقدمہ عوارف المعارف، شمس بریلوی، ص: ۱۳
- (۴۹) افضل القوائد، ۱/۳۹

روزگار کی تلاش میں نکلا اور بغداد پہنچا پھر وہاں سے ایران ہوتے ہوئے افغانستان میں چند سال ٹھہرا، اس کے بعد پنجاب آیا۔ ایک مدت تک وہیں رہا پھر دہلی اجمیر ہوتے ہوئے گجرات آ کر بس گیا۔ سترہویں صدی عیسوی کے اوائل میں اس خاندان کی آمد میسور میں ہوئی اور وہیں تک میسور کی حکمرانی اس خاندان میں رہی۔ حضرت شیخ سلطان علیہ الرحمہ کی شہادت ۲۸ ذیقعدہ ۱۲۱۳ھ مطابق ۱۲ مئی ۱۷۹۹ء کو ہوئی اور حضرت سرکار عالی بدرالہند کا وصال مبارک ۶ نومبر ۱۹۲۳ء کو ہوا ہے۔ اس طرح آپ کے وصال اور آپ کے جد کریم حضرت شیخ سلطان علیہ الرحمہ کی شہادت کے درمیان تقریباً ۱۲۴ سال کا فاصلہ ہے۔ اس وقت سے حضرت سرکار عالی کی عمر شریف کا کچھ اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

سید شاہ بہاء الدین بنگلوری: حیات اور تعلیمات

قطب العارفین، زبدۃ السالکین، بدرالہند حضرت سید شاہ بہاء الدین قادری قدس سرہ اپنے عہد کے ممتاز ترین اور بہت بافیض بزرگ ہیں۔ ذوق و شوق، زہد و تقویٰ، علم و فضل، اتباع شریعت اور مشرب قادریت کے ساتھ خدا کا راند لگاؤ آپ کی پہچان ہے۔ فضل ربانی، عنایت مصطفویٰ اور فیضان غوث اعظم نے آپ کے وجود مقدس کو کندن بنا دیا تھا۔ روحانی تصرفات، جنوں کی تغیر، دلوں پر حکومت، غیبی خزانوں تک آپ کی دسترس اور سلب امراض کے واقعات اس قدر کثیر ہیں کہ وارزہ تحریر میں لانا مشکل ہے۔ آج بھی آپ کے آستان کرم سے فیض و کرم کے آبیہ جاری ہیں اور ایک زمانہ مستفیض ہو رہا ہے۔

حضرت بدرالہند، شیر میسور سید فتح علی معروف بہ شیخ سلطان کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں، جن کے عسکری جبروت، ایمانی قوت، نظام عدل، حکمت و شجاعت کے سامنے فرنگی سورا بھی عاجز تھے، لیکن ہماری شامت اعمال سے چند ملت فروٹوں کی وجہ سے سلطان شیخ نے بہت بہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا اور پھر آپ کے خاندان کے افراد کلکتہ میں نظر بند کیے گئے اور کچھ حکومت کی نگاہ سے بچ کر لکا ویپ اور مالدیپ کے جزیروں کی طرف نکل گئے۔ انہیں میں سرکار عالی کے والد ماجد سلطان سید شہاب الدین قدس سرہ بھی تھے۔ انہوں نے سرکار عالی بدرالہند کی ابتدائی زندگی کی تفصیلات بالکل دستياب نہیں، حتیٰ کہ سال ولادت بھی معلوم نہیں۔ آپ کی سوانح پر دو کتابیں دیکھنے کو ملیں: ۱۔ حیات ولی: اور ۲۔ نور غوث: دونوں سوانحی تفصیلات سے خالی ہیں۔ ۱۔ میں ”حیات ولی“ غنیمت ہے۔

سلطان فتح علی شیخ کے خاندان کے بارے میں اکثر مورخین کی رائے یہ ہے کہ آپ قریشی تھے۔ خاندان نبوت سے تعلق تھا۔ سولہویں صدی عیسوی کے اواخر میں یہ خاندان مکہ مکرمہ سے

تذکرہ نگاروں کے مطابق لکا ویپ کے ایک مختصر جزیرے پر آپ کے والد ماجد حضرت سید شہاب الدین حکمران تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد آپ کو اعلیٰ تعلیم کے لیے آکسفورڈ لندن بھیجا گیا لیکن آپ کو وہاں کی فضا راس نہ آئی اور آپ معاملات دنیا سے کنارہ کش ہو کر دینی علوم کے حصول کے لیے جامعہ اہل مصر تشریف لے گئے جہاں سارے رائج اسلامی علوم آپ نے لیکن سے حاصل کیے۔ مصر سے عراق تشریف لے گئے اور بغداد مقدس میں حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ مصطفیٰ بغدادی قدس سرہ کے دست مبارک پر سلسلہ عالیہ قادریہ میں مرید ہوئے۔ بڑی رہائشیں اور مجاہدے کیے اور مرشد گرامی سے کثیر باطنی نعمتیں حاصل کیں اور اجازت و خلافت پائی۔ پھر مشائخ کے روحانی اشارے پر سلسلہ عالیہ چشتیہ صامیہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر کی قدس سرہ سے مکہ معظمہ میں، سلسلہ عالیہ نقشبندیہ حضرت خواجہ عبدالرحمن مدراسی قدس سرہ سے مدراس میں اور سلسلہ عالیہ سہروردیہ حضرت مخدوم محمد نور سہروردی قدس سرہ سے بہار شریف میں حاصل کیا۔ راہ سلوک کی جتنی رہائشیں اور مجاہدے ہو سکتے ہیں، وہ سب سرکار عالی نے کیے۔ بغداد و قیام کے دوران مضافات کے جنگلات اور دریاے دجلہ کے ریگزار آپ کے متانہ غروں اور اذکار الہیہ سے گونجتے رہتے۔ اکثر و بیشتر استغراق و بے خودی کی کیفیت طاری رہتی۔ آپ کے مرشد برحق حضرت سید شاہ پیر مصطفیٰ بغدادی قدس سرہ آپ کو ”دیوانہ“ فرمایا کرتے۔ آپ مرشد برحق کی اجازت و خلافت اور نعمت باطنی سے سرفراز ہونے کے بعد حرمین طہیین پہنچے جہاں شیخ امداد اللہ مہاجر کی سے سلسلہ صامیہ کی نعمت بات تھو آئی، پھر پیادہ کئی حج فرمائے۔ سفر حج میں دیگر حجاج کی خدمت بھی کرتے جاتے، وہاں سے آپ بمبئی پھر مظفر گھر، اس کے بعد بلند شہر کے قصبہ دان پور تشریف لائے لیکن ان ایام کی تفصیلات نہیں ملتیں۔ بس

اتمام معلوم ہے کہ بمبئی میں ایک تاجر کی صورت میں خود کو چھپائے رکھا۔ مظفر گھر یونی پینچ تو درازی عمر کے باوجود ریسر کے طالب علم ہونے کا حجاب اپنے اوپر ڈال لیا۔ عشق الہی کی جو آگ آپ کے مقدس دل میں روشن تھی، اس نے آپ کے وجود کو کندن بنا ڈالا تھا۔ بھلا سوزش عشق اور انوار الہیہ کوئی چھپنے کی چیزیں ہیں۔ ہر جگہ آپ سے کرامات اور خوارق عادت کا ظہور ہوا اور کثیر خلق خدا نے آپ سے فیض اٹھایا۔ بہت سارے لوگ آپ کے دست حق پرست پر سرکار غوث اعظم کے حلقہ غلامی میں داخل ہوئے۔ مریض شفا یاب ہوئے۔ پریشان لوگوں کی پریشانیاں دور ہوئیں، آسیب زدہ اور سحر میں مبتلا افراد صحت یاب ہوئے۔ آپ کی طبعی روش تھی کہ جہاں آپ کی بزرگی کا چرچا عام ہوتا اور مخلوق خدا کی بھیڑ بڑھنے لگتی، آپ فوراً اس جگہ سے چل دیتے۔ ۱۸۹۴ء میں مظفر گھر کی انارواں مسجد میں آپ قیام فرما ہوئے۔ آپ کے انفس سوخت کی برکت اور توجہ باطنی سے وہ انا رکا درخت بہت باہرکت اور فیض بار ہو گیا۔ ہر قسم کے مریض اس کی پیوں سے شفا یاب ہونے لگے۔ چند سال رہنے کے بعد آپ نے مظفر گھر کو بھی الوداع کہا اور خاموشی کے ساتھ وہاں سے نکل پڑے۔ تقریباً دو سال تک آپ روپوش رہے پھر حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے روحانی اشارے پر آپ ۱۹۰۰ء میں موضع دان پور ضلع بلند شہر میں جلوہ افروز ہوئے اور یہاں چار پانچ سال قیام فرمایا۔ ثواب دان پور آپ کا بہت معتقد تھا۔ اس دوران آپ نے کئی چٹے کیے۔ ایک چلہ بطور زمیں کیر فرمایا جو چھ مہینے پر منقش ہوتا ہے اور خواص اولیائے کرام کا حصہ ہے۔ پھر آپ حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اشارے سے ۱۹۰۵ء/۱۳۲۳ھ میں اپنے جال نثار مرید حافظ عبدالکریم خان قادری رئیس چونڈیہرہ کے بے حد اصرار پر "غیر شریف" تشریف لائے اور پھر اخیر و موت تک یہیں قیام فرمایا۔

بمبئی جہاں پر آستانہ عالیہ ہے، دان پور سے معمولی فاصلے پر ہے۔ یہاں راجپوت راجہ سالباہن کا قلعہ تھا جسے اس نے حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے دست حق پرست پر ایمان لانے کے بعد تعمیر کیا تھا۔ یہ قلعہ سرکار عالی کے زمانے تک منہدم ہو کر ایک ٹیلے کی صورت میں رہ گیا تھا اور جنات و شیاطین کا مسکن بنا ہوا تھا۔ یہ نقطہ اراضی حافظ عبدالکریم خان قادری رئیس چونڈیہرہ کی ملکیت تھا جسے انھوں نے بعد عازمی و احترام اصرار کر کے سرکار عالی کی نذر کیا۔ سرکار عالی یہاں ۱۳۲۳ھ/۱۹۰۵ء میں تشریف لائے اور اس ٹیلے کو مسطح کر کے دربار غوثیہ قائم فرمایا۔ ابتدا میں جناتوں کی یلغار رہی لیکن سرکار عالی کے قدموں کی برکت سے یہ خطہ خاتوں کے اثرات سے بالکل پاک ہو گیا۔

سرکار عالی قدس سرہ مظفر گھر میں چار سال سے زیادہ قیام پذیر رہے، دان پور آپ کے مقدس قدموں کی برکت سے تقریباً پانچ سال سرفراز رہا لیکن "غیر شریف" میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۳ء وقت اخیر تک قیام مبارک رہا جس کی مدت تقریباً اٹھارہ سال ہوتی ہے۔ اس دوران آپ کے فیضان و مہکات کا جو بہن بہاروں پر تھا۔ کثیر خلق خدا آپ کے دست حق پرست پر اپنے گناہوں سے تائب اور سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی غلامی میں داخل ہوئی۔ نہ جانے کتنے مریض آپ کی دعاؤں کی برکت سے شفا یاب ہوئے، آسیب اور سحر کے اثرات بد سے نجات پائے اور ان کی مشکلات اور امرا دیاں ختم ہوئیں۔

سرکار عالی کو رب جمیل نے بہت عمدہ ذوق جمال عطا فرمایا تھا۔ آپ نے "غیر شریف" میں اٹھارہ سال قیام فرمایا اور اس مدت میں دربار غوثیہ کو خوب سنوارا سجایا۔ بہت عمدہ تعمیرات کیں۔ ان میں خانہ خدا کی تعمیر بہت دل کش اور دیدہ زیب طرز کی ہے۔ سرکار عالی نے تقریباً دس فٹ اونچی کرسی دے کر یہ شاندار مسجد تعمیر فرمائی اور اس کے تعمیر کاروں میں بخش نفیس حصہ لیا۔ فن تعمیر کا یہ دل فریب نمونہ آج بھی دعوتِ نظرارہ دیتا ہے۔ اس خانہ خدا کی تعمیر ۱۳۳۱ھ میں مکمل ہوئی۔ اس کے دو تارنگی مادے برآمد کیے گئے جو مسجد کی لوح پیشانی پر درج ہیں:

۱- عِبَادِی فَاذْعُوْا اِلَیَّ ذِكْرِ اللّٰہِ [۱۳۳۱ھ]

۲- مسجد مرشد بہاء الدین شاہ درالہند [۱۳۳۱ھ]

۱- مسجد کے علاوہ، ۲- مدرسہ اسلامیہ عربیہ محی الدین [۱۳۳۲ھ]، ۳- مجلس خانہ، ۴- مہمان خانہ، ۵- زنان خانہ، ۶- لنگر خانہ، ۷- باغ، ۸- پختہ کنواں، ۹- اور مقبرہ آپ کے ذوق تعمیر کی یادگار ہیں۔ ان تمام تعمیرات کے مجموعے کو سرکار عالی دربار غوثیہ، باغ غوثیہ اور مرشد آباد کے پیارے ناموں سے یاد فرماتے۔

تقریباً اٹھارہ سال تک "غیر شریف" مرشد آباد ضلع بلند شہر یونی میں سرکار عالی سلطان بدر الہند سید شاہ بہاء الدین قادری قدس سرہ ایمان، روحانیت اور محبت کی تعینات تقسیم کرتے ہوئے ۲۶ ربیع الاول شریف ۱۳۳۲ھ/۶ نومبر ۱۹۱۳ء بروز منگل صبح ۱۰ بج کر ۱۰ منٹ پر اپنے محبوب رب کے حضور حاضر ہو گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ اخیر وقت میں بغرض علاج آپ علی گڑھ کنوڑی مشکور علی خاں کی کوٹھی میں تشریف رکھتے تھے۔ اخیر شب میں آپ کی قیام گاہ میں انوار و تجلیات الہیہ کی بارش ہو رہی تھی۔ کمرہ خوشبو سے معطر تھا۔ زبان مبارک پر ذکر "ہو" جاری تھا۔ خوب گرم پانی

طلب فرماتے۔ وصال کے بعد چہرہ مبارکہ پر ملکوتی جگمگاہٹ تھی۔ آپ کی رحلت

نشانِ مردِ مومن باتو گویم

چوں مرگ آید تبسم بربلب اوست

کی عملی تفسیر تھی۔ چھیڑ و ٹھنسن کے بعد جنازہ مبارکہ علی گڑھ سے شام کے وقت غیر شریف دربارِ رغو شید لایا گیا۔ بعد نمازِ عشا ۸ بجے شبِ تدفین، عمل میں آئی۔ نمازِ جنازہ حضرت مولانا عبدالقادر قادری علیہ الرحمہ علی گڑھی امام جامع مسجد، اپرکوٹ علی گڑھ نے پڑھائی، جو سرکارِ عالی کے مرید و خلیفہ تھے۔

وَمَا زُيِّنْ لَكَ إِلَّا رَحْمَةُ لِّلْعَالَمِينَ [۱۳۴۲ھ] سے سال وصال برآمد ہوتا ہے۔

حضرت سرکارِ عالی کو طویل عمر عطا ہوئی، اس لیے آپ کے مریدین کی تعداد بہت ہے۔ خلفا کی تعداد بھی پچاس سے کم نہیں۔ ۲۹ خلفاء کے اسمائے گرامی تو خود ”حیاتِ قدسی“ میں مذکور ہیں، جب کہ خود مولف کا اعتراف ہے کہ یہ تعداد مکمل نہیں۔ سرکارِ عالی کے خلیفہ اعظم حضرت سید یعقوب علی میرٹھی علیہ الرحمہ ہیں جو بادشاہِ جہانگیر کے پیر و مرشد حضرت شاہ پیر کے فرزندِ خاندان سے ہیں۔ حضرت سرکارِ عالی کے پہلے سجادہ نشین حضرت مولوی محمد علی رحمۃ اللہ علیہ [پور قاضی، مظفر نگر] ہوئے جنہیں سرکارِ عالی سے براہِ راست اجازت و خلافت حاصل تھی۔ اب تک درجِ ذیل حضرات دربارِ رغو شیدہ کے سجادہ نشین ہو چکے ہیں:

۱۔ حضرت مولوی محمد علی علیہ الرحمہ، پور قاضی، مظفر نگر، روڑی

۲۔ حضرت مفتی عبدالجبار علیہ الرحمہ، سرودھند

۳۔ حضرت صفی عبدالحمید علیہ الرحمہ، میرٹھ

۴۔ حضرت حافظ مولوی سید کت اللہ علیہ الرحمہ، امر وہ

۵۔ حضرت حافظ سید ولایت حسین علیہ الرحمہ، مظفر نگر

۶۔ حضرت سید ساجد علی شہید علیہ الرحمہ، ریٹول میرٹھ

۷۔ حضرت حافظ عبدالحمید علیہ الرحمہ، چمن پورہ، سہوان

۸۔ حضرت صفی قدس اللہ علیہ الرحمہ، مظفر نگر

۹۔ حضرت مرزا غلام جیلانی علیہ الرحمہ، سوروں، ایٹہ

۱۰۔ حضرت قاری طفیل احمد علیہ الرحمہ، رامپور

۱۱۔ حضرت صفی ریاض الدین، دہلی

۱۲۔ حضرت سفیر احمد صاحب، امر وہ

۱۳۔ حضرت محمد اکبر قادری صاحب، روڑی [موجودہ سجادہ نشین]

سرکارِ عالی اخلاقِ نبوی کا عکس جمیل تھے۔ سادہ لباس، کم خوراک، بے تکلف طرزِ زندگی اور شرم و حیا کے پیکر تھے۔ سرکارِ عالی نے کسی کو اپنے در سے مایوس اور محروم نہیں کونے دیا۔ حضرت سرکارِ عالی کا خود ارشادِ مبارک ہے کہ فقیر کے در سے کوئی محروم نہیں جاتا۔ اکثر و بیشتر جمالِ طاری رہتا۔ ہر ایک کے ساتھ لطف و مروت سے پیش آتے۔ جو دو خدا کا یہ عالم تھا کہ بندرانے کی ساری چیزیں مستحقین میں تقسیم فرما دیتے۔ غریبوں کی بڑی ولداری فرماتے۔ رئیسوں سے رابطہ نہ رکھتے۔ ثوابِ رامپور نے سرکارِ عالی سے ملاقات کا بہت اشتیاق ظاہر کیا لیکن آپ قطعاً راضی نہ ہوئے۔ تواضع اور خاک ساری میں بھی منتِ نبوی کی جھلک تھی۔ مہمانوں کی خدمت پر نفس نہیں فرماتے۔ اپنا کام خود سے کرتے۔ کپڑوں میں پیوند لگا لیتے۔ شفقت و محبت کا سمندر تھے۔ ستر یوں شریف میں جب احباب و متوسلین رخصت ہونے لگتے تو آپ غم زدہ ہو جاتے۔ حال پوچھنے پر فرماتے: ”فقیر بے چین ہے، بچہ لوگ جا رہا ہے۔“ مریدین کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتے اور انہیں ”بچہ لوگ“ جیسے پیارے لقب سے یاد فرماتے۔ ہر ایک کی دست گیری فرماتے۔ مشکل وقت میں کام آتے۔ لوگوں کے عیوب کی پردہ پوشی فرماتے۔ براہِ راست غلطی کی نشان دہی اور اصلاح بہت کم فرماتے۔ اکثر ایسا ہوتا کہ فرماتے: ”لوگ ایسا غلطی کرتا ہے، یہ نہ کرنا چاہیے۔“ ایک مرتبہ آپ کے مرید تحصیل دار بزمِ جمیعین کی گھڑی چوری ہو گئی۔ وہ حاضر خدمت ہو کر عرض کرتے لگے کہ حضور چور کا پتہ بتادیں۔ سرکارِ عالی نے فرمایا: فقیر کسی کا پردہ فاش نہیں کرتا۔ آپ کا گھڑی مل جائے گا، چور خود آکر رکھ جائے گا۔“

اللہ اللہ! کیسی پردہ داری ہے۔ اسی کو حدیثِ پاک میں فرمایا گیا: مَنْ سَفَرُ الْعَبْدِ سَفَرَةُ اللَّهِ۔ جس نے کسی بندے کی پردہ پوشی کی، اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کی پردہ پوشی فرمائے گا مخلوق کی حاجتِ روانی جو اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کا خاص وصف ہے، وہ سرکارِ عالی کے یہاں بھی پورے طور سے موجود ہے۔ حیاتِ مبارکہ میں ہر قسم کے حاجت مند اور پریشان حال حاضر ہوئے اور دل کی مرادیں پا گئیں اور آج بھی فیضِ و کرم کا وہی آبنما جاری ہے۔ ایک دنیا آتی ہے اور جہولیاں بھر بھر کر لے جاتی ہے۔ آپ نے جس سے جو وعدہ فرمایا، اسے وفا کیا۔ باغِ بانی، معمارِی، زراعت اور کھیتی باڑی کے کام بھی آپ نے خود کیے۔ ہم سائے اور پڑوس کے باشندوں کا آپ نے ہمیشہ خیال رکھا، ان کے دکھ درد اور خوشی کے مواقع پر شریک رہے۔ چونڈیہ،

چنڈراول، پہاسو، وان پور، علی گڑھ تک کے احباب پر خصوصی نگاہ کرم تھی۔ فرمایا کرتے: ”یہ ہمارے ہم سائے ہیں، ان کا فقیر پر حق ہے۔“ احباب و حاضرین کو ”اے حضرت!“ کے باوقار لقب سے یاد فرماتے، گویا یہ آپ کا تکیہ کلام تھا۔

حضرت سرکار عالی کی کرامات اور خوارق عادات بیان کرنے کے لیے ایک فتر چاہیے۔ حضرت کی حیات مبارکہ پر لکھی گئی تین کتابیں: ۱- حیات ولی، ۲- حیات قدسی، ۳- اور نور غوث میں کثیر کرامات درج ہیں۔ آج بھی آپ کی فیض یاریوں کا سلسلہ جاری ہے، جس کا جی چاہے، اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے جا کر دربار غوثیہ کا نظارہ کر لے۔ تفصیل کے لیے مذکورہ بالا کتابوں کو دیکھنا چاہیے۔

سرکار عالی فقر و وریشی کے ساتھ ساتھ علم و فضل کا بھی اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے۔ آنکھوں پر لندن اور جامعات برصغیر جیسی مشہور زمانہ یونیورسٹیوں کے فاضل تھے۔ عربی اور انگریزی بہت شستہ اور رواں بولتے تھے۔ اردو بولنے میں قدرے تکلف تھا۔ شریعت میں سیدنا امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مقلد تھے اور طریقت میں سرکار غوث اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فدا کی۔ آپ کا عربی سلام: ”صلی اللہ علیہ وسلم اللہ علیہ“ اور آپ کی صوفیانہ تصنیف بہار القلوب / منور القلوب آپ کی علیحدگی کی روشن دلیل ہیں۔ ان میں آپ نے عربی مثنوی کا جو ادبی پیرایہ بیان اختیار فرمایا ہے، وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ بہار القلوب میں آپ نے اسرار طریقت اور ہدایات سلوک بہت حکیمانہ انداز میں بیان فرمائے ہیں۔ فتاویٰ رضویہ میں ایک عید گاہ کے تعلق سے ایک استغنا بھی ملتا ہے جس کا سنک بنیا و آپ کے دست مبارک سے رکھا گیا۔ دیکھنے فتاویٰ رضویہ جدید ۱۵/۳۴۴] مسک اہل سنت اور عقیدہ ماتریدیہ کے بالکل پابند تھے اور شرب صوفیہ پر گام زن۔ کئی ہند سب آپ کی بابت محفل میں تائب ہوئے۔ خود ”حیات قدسی“ کے مولف پہلے وہابیت زدہ تھے لیکن سرکار عالی کی ایک نگاہ کرم کیا پڑی کہ دل کی دنیا بدل گئی اور کچے قادری عاشق رسول بن گئے۔ سرکار عالی کو میلا و شریف اور دروغوٹ پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عشق تھا، اسی لیے آپ نے ہر چیز حضور غوث پاک سے منسوب کی۔ آپ کی خانقاہ، دربار غوثیہ کہلاتی۔ آپ کے مریدین، قادری ہوئے۔ آپ نے صرف حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا عرس منایا۔ اپنے عرس کی تقریب سے منع فرمایا۔ ان باتوں سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ آپ کس قدر صوفیہ کے مذہب کے پیروکار اور حضور غوث پاک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کیسے عاشق جاں باز تھے۔

اب میں سرکار عالی کی چند قیمتی ہدایات اور کریمانہ اقوال منور القلوب اور دیگر کتابوں سے اخذ کر کے پیش کرنا ہوں۔ سرکار عالی شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

شریعت طریقت، حقیقت اور معرفت چار باب ہیں، جن کے چالیس مقام ہیں۔ ہر باب کے دس مقام ہیں۔

پہلا باب شریعت کا ہے جس کے دس مقام ہیں:

پہلا مقام اللہ تعالیٰ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر ایمان لانا ہے، یونہی تقدیر پر کہ ہر بھلائی اور برائی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے اور مرنے کے بعد اٹھنا بہ حق ہے، ان پر بھی ایمان لانا ہے۔

دوسرا مقام فرض نمازوں کی پابندی کے ساتھ ادائیگی ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے: **حَافِظُوا عَلَی الصَّلَاةِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطٰی [البقرة: ۲۳۸]** نمازوں کی نگہبانی کرو اور خصوصاً نماز عصر کی۔

تیسرا مقام زکوٰۃ دینا ہے۔ جب زکوٰۃ واجب ہو تو اسے فوراً مستحق کے حوالے کر دے۔ چوتھا مقام رمضان کے مہینے کا روزہ رکھنا ہے جس میں قرآن شریف نازل کیا گیا۔ یہ روزے اللہ تعالیٰ نے امت محمدیہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر فرض فرمائے ہیں۔ پانچواں مقام بیت اللہ شریف کا حج کرنا ہے۔ صاحب استطاعت پر پوری زندگی میں ایک مرتبہ حج کرنا فرض ہے۔

چھٹا مقام حلال روزی کمانا ہے۔ یقیناً اللہ تعالیٰ حلال روزی میں برکت عطا فرماتا ہے اور حلال کمائی کرنے والے کی دعا قبول ہوتی ہے۔

ساتواں مقام حرام کاموں سے بچنا ہے، کیوں کہ حرام فعل دل کو سیاہ کر دیتا ہے اور دل پتھر جیسا سخت ہو جاتا ہے بلکہ پتھر سے بھی سخت ہو جاتا ہے۔

آٹھواں مقام شریعت کی اطاعت میں مکمل طور سے داخل ہونا ہے۔ شریعت کی متابعت کا مطلب یہ ہے کہ اس کے احکام کی پابندی کی جائے اور اس کی منع کی ہوئی باتوں سے بچا جائے اور جسے شریعت نے حلال کیا، اسے حلال سمجھیں اور جسے حرام کیا، اس کو حرام جانیں۔

نواں مقام قرآن حکیم ہے، یعنی اس کی تلاوت کی جائے، اس کی ہر بات کی تصدیق کی جائے۔ اس کے تقاضوں پر عمل کیا جائے، اس کے معانی میں غور و خوض کیا جائے۔ اس کے اوامر کا

اجتہاد کیا جائے اور اس کے نواہی سے بچنے کی کوشش کی جائے۔

دوسرا مقام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

اقِمِ الصَّلَاةَ وَآمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ [لقمان: ۱۷] نماز پڑھو اور اچھے بات کا حکم دو اور بری بات سے منع کرو اور جو اہم و اشد چیزیں پر پڑے، اس پر صبر کرو۔ بے شک یہ ہمت کے کام ہیں۔

دوسرا باب طریقت کے بیان میں ہے اور اس کے بھی دس مقامات ہیں:

پہلا مقام توبہ ہے اور یہ ہر مکلف انسان پر فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَتُوبُوا إِلَى اللَّهِ جَمِيعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُونَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ [انور: ۳۱] اور اللہ کی طرف توبہ کرو اے مسلمانو! سب کے سب، اس امید پر کہ تم فلاح پاؤ۔

دوسرا مقام حسن خلق ہے اور اس میں تمام عمدہ خصلتیں اور سب اچھے کام داخل ہیں اور ان ہی میں سارے صالح اعمال بھی شامل ہیں۔

تیسرا مقام دین یافتگی، طاعت الہی اور ہمارے آقا و مولا محمد رسول اللہ ﷺ کی اطاعت میں خوب خوب کوشش کرنا ہے۔ کیوں کہ انوار الہی کا وہی مشاہدہ کرنا ہے جو اس کی طلب میں کوشش کرنا ہے اور جو کوشش نہیں کرتا، وہ مشاہدہ انوار الہی سے محروم رہتا ہے۔

چوتھا مقام امید اور خوف کے درمیان میں رہنا اور اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہونا ہے۔ کبھی اللہ کی آزمائش سے بے خوف نہ ہوا و کبھی اس کی رحمت سے مایوس نہ ہو۔

پانچواں مقام خواہشات نفسانی کو ترک کرنا ہے۔ کیوں کہ ایسا شہوت سے دل سخت ہوتا ہے۔ چھٹا مقام شبہات سے بچنا ہے۔ شبہات میں مشکوک اور مشتبہ چیزوں سے اجزا کرنا شامل ہے اور ای میں شک اور ریب بھی داخل ہے۔

ساتواں مقام اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں گڑگڑانا اور اس کی جناب میں توبہ اور استغفار کرنا ہے۔ دعا، خشوع و خضوع اور حضور قلب کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ ہر چیز سے توجہ ہٹائی جائے۔

آٹھواں مقام پیر و مرشد کی رضا کا طالب رہنا ہے۔ یہ مقام پیر کے ساتھ محبت اور خدمت کا تعلق رکھنے، اس کی نصیحت پر عمل کرنے اور ہر بات میں مکمل طور سے اس کی اطاعت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ پیر کے سامنے ایسے رہے جیسے مردہ غمناک کے سامنے ہوتا ہے، کہ وہ اسے جس طرح چاہتا ہے، لقمہ پلٹتا رہتا ہے۔

نواں مقام وعدہ و نصیحت سنا اور اس کے تقاضوں پر بے تکلف عمل کرنا ہے۔ جب خود

دوسروں کو نصیحت کرتے تو نرم اور لطیف انداز اختیار کرے۔

دسواں مقام اللہ کے سوا ساری دنیا سے علاحدگی اختیار کرنا ہے۔ کیوں کہ ماسوی اللہ سے میل جول اقرب الہی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔

تیسرا باب حقیقت کے بیان میں ہے اور اس کے مقامات بھی دس ہیں:

پہلا مقام یہ ہے کہ تواضع اور فروتنی اختیار کی جائے اور یہ ایک سے نرم لہجے میں بات کی جائے۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ بے گمراہ فرقوں کو ایک خانے میں رکھے، ان کے درمیان کوئی امتیاز نہ کرے۔ چونکہ یہ سب فرقے گمراہ ہیں، اس لیے ان سب سے بچتے رہنا واجب ہے۔ ہاں! صرف اہل سنت و جماعت سے میل جول رکھے، کیونکہ یہ فرقہ عند اللہ مقبول ہے۔

تیسرا مقام یہ ہے کہ قہوڑا بہت جو ماہر ہو، کھالے اور نئے یا عمدہ کھانے وغیرہ کا انتظار نہ کرے۔ چوتھا مقام یہ ہے کہ ہمیشہ حق کے راستے میں رہے اور کسی مخلوق کو تکلیف نہ پہنچائے بلکہ ان سے جو اذیتیں بھی پہنچیں ان کو برداشت کرے۔

پانچواں مقام یہ ہے کہ کسی سے بدلہ لینے کا دل میں خیال بھی نہ آئے بلکہ برائی کرنے والے کے ساتھ بھلائی کرے اور خطا کا رکاز قبول کرے اور اپنے اوپر ظلم کرنے والے کو معاف کر دے۔

چھٹا مقام یہ ہے کہ فقیروں اور مسکینوں سے متکبرانہ انداز میں نہ ملے بلکہ ان سے شفقت اور محبت سے پیش آئے اور ان سے اچھا برتاؤ رکھے۔

ساتواں مقام یہ ہے کہ اللہ کے راستے میں صرف اس کی رضا کے لیے قدم بڑھائے۔ اس میں ریاکاری اور نمائش کا دخل نہ ہو۔

آٹھواں مقام یہ ہے کہ اپنی اور دوسروں کی پوشیدہ باتیں چھپائے، کسی کا راز فاش نہ کرے۔ جب کسی کی کوئی خوبی دیکھے تو اس کا چہ چاکرے اور اگر برائی دیکھے تو اسے چھپا دے۔

نواں مقام یہ ہے کہ ہمیشہ اپنے رب سے مناجات میں اس طور سے مشغول رہے کہ دنیا کے غیر ضروری امور اس راہ میں اس کے لیے رکاوٹ نہ بنیں۔

دسواں مقام یہ ہے کہ تمام چیزوں کو بھرت کی نگاہ سے دیکھے اور علم نافع کی طلب اور اپنے نفس کی تربیت میں لگا رہے، جیسا کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ علم در حقیقت زہد ہے اور آدمی کا ادب اس کے زہد سے بہتر ہے۔

چوتھا باب معرفت کے بیان میں ہے۔ اس کے بھی دس مقامات ہیں:

پہلا مقام یہ ہے کہ ادب کی راہیں اس طور سے ملحوظ رکھے کہ خود ادب شریعت سے مکمل آراستہ ہو، ان کی پابندی کرے اور ہر قدم پر ان کی حفاظت فرمائے۔

دوسرا مقام یہ ہے کہ دوسروں کی وی ہوئی اذیت اور زیادتیوں پر صبر و تحمل سے کام لے، کسی موذی سے انتقام لینے کا خیال دل میں نہ لائے بلکہ ان کی ایذا رسانی کو برداشت کرے اور ان کے ساتھ غصہ و درگزر کا معاملہ کرے۔

تیسرا مقام یہ ہے کہ بدوں کی صحبت اور دنیا داروں کی تابع داری سے بچتا رہے اور ہر قسم کے کھلے چھپے فتنوں سے دور رہے۔

چوتھا مقام یہ ہے کہ مکمل خلوص اور سچائی کے ساتھ مشائخ کی خدمت کرتا رہے اور ظاہر و باطن ہر اعتبار سے ان کا بھی خواہ، ہمدرد اور وفا دار رہے۔

پانچواں مقام یہ ہے کہ علم تصوف، اپنے نفس اور علم تصوف کے مقامات کا عرفان رکھتا ہو۔ چھٹا مقام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت دکھانے کے لیے نہ کرے اور حق تعالیٰ کا ہر جگہ سامنے موجود خیال کرے۔ اس کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا اپنی آنکھوں سے رب تبارک و تعالیٰ کا مشاہدہ کر رہا ہے، اگر یہ نہ ہو سکتا اتنا تصور ضرور جمائے کہ رب تبارک و تعالیٰ تجھے ملاحظہ فرما رہا ہے۔ ساتواں مقام یہ ہے کہ غصہ کے وقت حلم اور بردباری سے کام لے اور اپنے معاملات میں جلد بازی کا مظاہرہ نہ کرے۔

آٹھواں مقام یہ ہے کہ ہر وہ اللہ تعالیٰ کے ذکر سے اپنے دل کے ڈنگا ردور کرتا رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوہے کی طرح انسان کے دل بھی زنگ آلود ہو جاتے ہیں تو اپنے دل کو ذکر الہی سے صاف کرتے رہا کرو۔

نواں مقام یہ ہے کہ قسم قسم کی طاعات اور عبادات کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہے۔

دسواں مقام یہ ہے کہ اپنے آپ کو سب سے کم تر جانے اور اپنے آپ کو کسی سے بہتر نہ سمجھنے۔

پیر و مرشد کے تعلق سے جو آداب مرید پر واجب ہیں، درج ذیل ہیں:

پیر کی صحبت میں رہے، اُس سے گئی محبت رکھے، اس سے معاملات میں صداقت کا ہتھوڑا کرے، اس کے ساتھ کامل گہری عقیدت رکھے، اس سے اپنی کوئی بات راز نہ رکھے، اپنے مارے معاملات بلکہ خود اپنے آپ کو بھی پیر کے پیر و کردار سے اُس پر کسی حال میں معترض نہ ہو، اس کی جانب

ظاہر و باطن، جسم و جان ہر طور سے پیر کی جانب متوجہ رہے اور پیر کے سامنے عاجزی و تواضع و فقر و مسکنت کے ساتھ پیش آئے۔ اس کی طرف پشت نہ کرے، اس پر اپنا مال فدا کرنے کا جذبہ نہ رکھے بلکہ پیر کو اپنی ماری ملو کہ چیزوں کا مالک بنا دے اور پیر و مرشد کے سامنے ایسے رہے جیسے مردہ غسال کے سامنے رہتا ہے کہ غسال مروے کو جس طرح چاہتا ہے لٹتا پلٹتا رہتا ہے۔ پیر کے آگے کبھی نہ چلے بلکہ اس سے پیچھے رہا کرے، آگے چلنے سے مکمل پرہیز کرے، پیر کا حکم ماننے میں ہرگز کبھی کوتاہی نہ کرے، وہ جس چیز سے منع کرے اس سے مکمل بچتا رہے اور اس کا کبھی ارتکاب نہ کرے، اس کی خدمت میں بھی خواہ بن کر رہے، اس کی اطاعت کی خوب کوشش کرے، اس کے احوال، اقوال اور افعال کو بغور ملاحظہ کرتا رہے، پیر جو کچھ بتائے اُسے یاد رکھنے کے لیے مستعد رہے، اُس کے راز کی حفاظت کرے، جو کچھ وہ کہے اس کو یاد رکھے اور اس کے کام کو فضول جان کر نہ چھوڑے، اُس کی باتوں کو ضائع ہونے سے بچاتا رہے۔ پیر کے آداب زندگی کو خود اپنائے، اس کے اخلاق سے خود کو آراستہ کرے، اس کے احوال، اقوال، افعال کی پیروی کرتا رہے۔ جیسا کہ پیر کو پسند ہو اسے چھوڑ دے، اُس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہ کرے، مرشد کو بتائے بغیر اپنے اختیار سے کچھ نہ کرے، اسی کے حکم پر چلے، اُس کی منع کی ہوئی باتوں سے باز رہے، جب مرشد کی بات کا حکم دے یا کسی بات سے منع کرے تو کبھی یہ نہ کہے کہ آپ نے مجھے یہ حکم کیوں دیا اور قائل چیز سے آپ نے کیوں منع کیا کیوں کہ مرشد کی باتوں پر معترض ہونے سے مرید فیض سے محروم رہتا ہے۔ مرشد کے سجادے پر نہ بیٹھے، اس کے تکیہ پر مگر رکھ کر نہ سوئے، نہ اُس کا زیب تن کیا ہوا کوئی لباس پہنے اور نہ اس کی اجازت کے بغیر اُس کے پاس حاضر ہو، نہ اس کے بعد اُس کی بیوی سے نکاح کرے کیوں کہ یہ حرماں نصیبی کا باعث ہوتا ہے۔ پیر و مرشد سے کبھی بدلہ نہ ہو، اگر چہ وہ اسے ڈانٹ پلائے یا برا بھلا کہے، ہمیشہ اُس کی محبت پر قائم رہے اور اس کی ہر نرم گرم بات کو گوارہ کرے اور اُس کی مجلس میں بغیر ضرورت کسی سے کوئی بات نہ کرے، اگر چہ وہ اپنا حقیقی بھائی ہو۔ اگر کلام کرنے کی ضرورت ہو تو بقدر ضرورت کرے۔ پیر کی موجودگی میں کوئی شخص سوال کرے تو اُس کا جواب نہ دے، پیر کی موجودگی میں یا غائبانہ میں کسی سے بحث نہ کرے، یہ اعتقاد رکھے کہ میرا پیر میرے حق میں اپنے زمانے میں سب سے زیادہ کامل ہے۔ دشمن اور حامد کے قول پر کبھی کان نہ دھرے۔ ہاں پیر کو معصوم نہ جانے، الیہ خطا سے محفوظ رہنے کا اعتقاد رکھے۔ پیر کی مجلس میں فیہ مذاق بلوائی جھگڑے اور بحث نہ کرے بلکہ خاموش رہے اور جو کچھ پیر کہے اس کو سنتا رہے اور اس کے سامنے دو زانو ہو کر بیٹھ جیسے نماز میں بیٹھتے ہیں۔ مرید کے لیے یہ آداب شیخ جو ذکر ہوئے، ٹھیک ایسی آداب والدین کے حق میں اولاد پر لازم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہی ہدایت اور توفیق ملا کرتی ہے۔

مرید کو اپنے پیر بھائیوں کے ساتھ جن آداب کی رعایت کرنی چاہیے، وہ حسب ذیل ہیں:

مرید اپنے سب پیر بھائیوں کو دوست رکھے اور جس بات میں اُن کی رضا ہو اس میں اُن کا مطیع رہے، اُن کی حاجت روائی کی کوشش کرے اور اُن کی حاجت روائی کو اپنی ضرورتوں پر مقدم جانے۔ اپنے ہر چھوٹے بڑے پیر بھائی کے پاس ادب سے بیٹھے، کسی کے سامنے کبھی تکبر نہ کرے، اُن کے احوال، اقوال اور افعال سے کبھی تعرض نہ کرے بلکہ ساری باتوں میں جہاں تک شریعت اجازت دے اُن کا ساتھ دے۔ جب کسی پیر بھائی کا انتقال ہو جائے تو اُس کے جنازے میں شرکت کرے۔ اگر کوئی اُن کا حال دریافت کرے تو اُن کے حق میں کلمہ خیر ہی کہے اور غائبانہ میں جہاں تک ہو سکے، اُن کی بے آہوئی نہ ہونے دے اور ظاہر و باطن ہر اعتبار سے اُن کا مخلص دوست بنارہے۔ اپنے پیر بھائیوں سے جب ملاقات ہو تو اُن سے اپنے حق میں دُعا کا طالب ہو۔ اُن کے بارے میں کسی بدخواہ اور حاسد کی باتوں پر ہرگز کان نہ دھرے۔ پیر بھائیوں سے اگر کوئی تکلیف پہنچ جائے تو درگزر کر دیا کرے اور اُن سے غصہ و درگزر کا مطالبہ نہ کرے۔ اُن کے خلاف کسی کی مدد نہ کرے، اگرچہ پیر بھائی کے مخالف کا اُس کے اوپر حق ہو، پیر بھائی کے مال اور سرمائے کو اپنے مال اور جائیداد کی طرح سمجھے۔ اُن میں کوئی خیانت نہ کرے، اُن کی اخروشوں کی پروردہ پوشی کرے، اُن کے حالات اور راز کو کسی پر ظاہر نہ ہونے دے، اُن کے کسی گناہ اور برے عمل پر اُن کو غیرت اور عار نہ دلائے، بشرطیکہ وہ علانیہ گناہ کا ارتکاب نہ کرتے ہو جہاں نہ ہو کیوں کہ اس صورت میں اس کے جرائم کا واضح کرنا ضروری ہے تا کہ لوگ اس سے بچیں۔ ہاں! اگر وہ اپنے غلاف گناہوں سے توبہ کر لے تو اب اس کے ساتھ گناہوں کا تذکرہ کرنا جائز نہیں۔ خلوت و جلوت میں اُن کے حق میں دُعا کرنا رہے، اُن کے ساتھ ہر خلوص محبت اور دوستی کا رشتہ رکھے، جب پیر بھائی کوئی کسی قسم کی نصیحت کرے تو برداشت نہ کرے بلکہ اسے مان لے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی پیر بھائی پر اپنی رحمتوں کے دروازے کشا دہ کرے تو اُن سے حسد نہ کرے، کیوں کہ جب اپنے بھائیوں سے حسد کرے گا تو یہ خود اس کی اپنی رسوائی اور محرومی کا سبب ہوگا۔ کسی چیز میں خود کو اُن سے ممتاز نہ سمجھے، اگر کوئی پیر بھائی کبھی فخریہ باتیں کرنے لگے تو یہ اُن سے خوشی اور فرحت کا اظہار کرے، اُن کا فخر و مہابت میں مقابلہ نہ کرنے لگے بلکہ اُن کے حق میں نعمتوں کی اور زیادتی کے لیے دعا کرے، اُن کی برائی کرنے والے کا ساتھ نہ دے گا مگر چہ وہ پنا بھائی ہی کیوں نہ ہو اور دوست بات ہی کیوں نہ کہہ رہا ہو کیونکہ اسلام میں عیب پوشی کا حکم ہے، پروردہ دری کا نہیں، بلکہ اسے چھڑک دے اور ایسی باتوں سے باز رکھے، پیر بھائیوں میں چھوٹے بڑے سب کے ساتھ یکساں سلوک کرے، اگر کوئی کئی دن سے دکھائی نہ دے تو اُس کے حالات دریافت کرے، اگر کوئی پیر بھائی ضرورت مند ہو تو اس کی مدد کرے اور وسعت بھراں کا

ہاتھ بٹائے۔ اگر کوئی پیر بھائی مقررہ قرض کی ادائیگی میں اس کی بھرپور مدد کرے کسی پیر بھائی کو اگرچہ پیر و مرشد نے خاص اہمیت دے رکھی ہو تو اس کا اتباع کرے اور بھی اسے محترم سمجھے اور اس کی خدمت بجالانے کی کوشش کرے، اگرچہ وہ شخص عمر اور مرتبے میں اس سے چھوٹا ہو۔ سارے پیر بھائیوں پر ایسے شخص کا احترام اور اس کی اقتدا ضروری ہے۔ کسی گناہ گار کو اس کے پچھلے گناہ یا دہے دلائے، بلکہ خود کو اس سے کم تر سمجھے اور یہ نہ کہے کہ میں اس سے افضل ہوں۔

وہ آداب جنہیں مرید کو اپنے ساتھ برتنے چاہئیں، وہ یہ ہیں:

مسکینی، فاقہ کشی اور عاجزی اختیار کرے، ہر چیز کا عمدہ پہلو اختیار کرے، نفسانی خواہشات اور لذتوں کو ترک کر دے، نفسِ مادہ کی بھرپور مخالفت کرنا رہے یہاں تک کہ موت طاری ہو جائے، دنیا کے معاملے میں زہد اختیار کرے، کبھی دنیا کی طرف التفات نہ کرے بلکہ اس سے بغض اور وحشت کا معاملہ رکھے، کبھی اس کی محبت دل میں نہ آنے دے کیونکہ دنیا کی محبت قرب الہی کے لیے زہد دستِ حجاب ہے، نفس سے بھرپور مجاہدہ کرنا رہے کیونکہ جو شخص مجاہدہ کرنا ہے وہ تجلیات الہی کا مشاہدہ کرنا ہے اور جو شخص مجاہدہ نہیں کرنا اسے تجلیات الہی کے مشاہدے کی سعادت نصیب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: **وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَكْفِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا** [العنکبوت: ۶۹] اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ضرورت ہم انہیں اپنے راستے دکھا دیں گے۔

یہ خیال نہ کرے کہ وہ خود وصول الی الحق کی طاقت رکھتا ہے۔ کیوں کہ یہ جہت کے لوازمات سے ہے اور وصول تو محدود چیز تک ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ حدود اور جہات سے پاک ہے۔ پس نہ تو کوئی جہت اسے گھیر سکتی ہے اور نہ کوئی مکان اسے سمو سکتا ہے۔ نفس کی غفلت پر چشم پوشی نہ کرے، اپنے اعمال کو قلیل جان کر ہرگز نہ چھوڑے، رات کے اخیر تہائی حصے میں بیدار رہے، نوجوان لڑکوں کی صحبت اور عورتوں کی محبت سے بچتا رہے، ہاں اگر وہ اس کے اہل ہوں تو سمجھ متضائق نہیں سمرشد کی اجازت کے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھائے، اگرچہ والدین کی خدمت کے لیے ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ جب انسان دہرا لہی کا قصد کرتا ہے تو اُس سے مخلوق کے حقوق ساقط ہو جاتے ہیں اور جب وہ حق [حق اللہ اور حق العباد] متعارض ہوں تو اللہ تعالیٰ کا حق، بندوں کے حق سے مقدم سمجھا جائے گا مگر کسی عارض سے۔ [شریعت بہت سی جگہوں پر حق العبد کو مقدم رکھتی ہے، اس کی اپنی مصلحتیں ہیں اور یہ تقدیم بھی اللہ و رسول کے دہرا لہی سے ہی عطا ہوئی ہے۔]

مرشد کے حقوق والدین کے حقوق پر چند وجوہ سے مقدم ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کو رشد و ہدایت کی راہ دکھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے قریب کرنا

ہے اور یہ بات والدین میں نہیں۔
 دوسری وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کو گناہوں کی پستیوں سے نکال کر نیکیوں کے باعزت عرش پر لائٹھاتا ہے، عموماً والدین کو یہ سعادت نصیب نہیں ہوتی۔
 تیسری وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کو جہالت کے اندھیرے سے نکال کر علم الہی کی روشنی عطا کرتا ہے اور شقاوت سے نکال کر سعادت ابدی سے ہم کنار کرتا ہے، جب کہ عام طور سے والدین کو یہ سعادت نہیں ملتی۔
 چوتھی وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کو دنیا سے زہد سکھاتا ہے اور آخرت کی رغبت دلاتا ہے، جب کہ والدین یہ نہیں کرتے۔
 پانچویں وجہ یہ ہے کہ مرشد، مرید کے لیے قیامت کی سول نامیوں سے نجات کا سامان اور سرمدی نعمتوں کے حصول کا سبب ہوتا ہے، لیکن والدین کے لیے یہ سعادت نہیں ہوتی، بلکہ دنیا میں بھی شریعت کی نگاہ میں مرشد اور والدین کے مراتب مختلف ہوتے ہیں۔
 مرید اپنے اوراد و وظائف کو کبھی ترک نہ کرے کیوں کہ جو شخص ایک دن کا بھی ورد چھوڑے گا، اُس سے اُس دن کی مدد منقطع ہو جائے گی۔ جو درویش کی پابندی نہیں کرتا، اللہ کے دربار سے اس کی مدد نہیں ہوتی اور جو اپنے اوراد کے آداب کی حفاظت اور نگہداشت کرتا ہے اور اُس کے حقوق کو ادا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے توفیق خیر عطا ہوگی، ان شاء اللہ تعالیٰ۔

فرمایا: ”دنیا کی کوئی خوشی جنت کی خوشی سے زیادہ نہیں اور دنیا کی کوئی تکلیف ووزخ کی تکلیف سے زیادہ نہیں۔“
 ان دونوں باتوں کو اگر لوحِ دل پر نقش کر لو گے تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر استقامت حاصل ہو جائے گی۔ تمنا سے حصولِ جنت، حسانت کی طرف مائل کرے گی اور نفور ووزخ، سینات سے بچائے گی۔

فرمایا: ”انسان کی چار قسمیں ہیں: ۱۔ وہ جو خود بھی علم حاصل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی سکھاتے ہیں۔ ۲۔ وہ لوگ ہیں جو خود راہِ مستقیم پر ہیں مگر مخلوق کو ان سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔ ۳۔ وہ ہیں کہ انھوں نے علم تو حاصل کیا لیکن وہ علم نہ ان کی ذات کے لیے مفید ہوا، نہ مخلوق کو اس سے نفع پہنچا۔ ۴۔ چہارم وہ لوگ ہیں جنہوں نے علم و ہدایت کو قبول ہی نہیں کیا۔ یہ کفار ہیں۔“

فرمایا: ادب بھی ایک عجیب نعمت ہے۔ جس کے پاس یہ دولت ہو، وہ سب کا محبوب ہو جاتا ہے۔ ایسے شخص میں غرور و خود پسندی نہیں رہتی۔

فرمایا: فقیر کی صفت یہ ہے کہ خود نہیں کھاتا، دوسروں کو کھاتا ہے۔ خود تکلیف اٹھاتا ہے، دوسروں کو راحت پہنچاتا ہے۔

فرمایا: جہاں تک ہو سکے، عاجزی و فروتنی اختیار کرنا چاہیے۔ غرور و تکبر خدا کو ہرگز پسند نہیں۔ جس قدر ممکن ہو، چھوٹا بننے کی کوشش کرے۔ پھل دار درخت، ہمیشہ جھکا رہتا ہے اور جو بے پھل ہوتا ہے، اس کی شاخیں کبھی نہیں جھکتیں۔

فرمایا: تین کام کرنے سے تین باتیں بلا مشقت حاصل ہوتی ہیں:
 ۱۔ خانہ کعبہ کو دیکھنے سے ایک گناہ معاف اور ایک نیکی مل جاتی ہے۔
 ۲۔ والدین کی صورتِ محبت و تعظیم سے دیکھنے سے ایک گناہ معاف اور ایک نیکی مل جاتی ہے۔
 ۳۔ عالم یا زنگ کی صورت دیکھنے سے ایک گناہ معاف اور ایک نیکی مل جاتی ہے۔

○○○

صوفی خواتین: ایک جائزہ

ایک مشہور صوفی کا قول ہے کہ ”پہلے تصوف ایک بے نام حقیقت تھا، مگر آج حقیقت سے خالی محض ایک نام ہے۔“ یہ درست ہے کہ لفظ تصوف یا صوف قرآن و سنت میں وارد نہیں ہوا بلکہ قرآن میں لفظ تزکیہ اور حدیث میں لفظ احسان استعمال ہوا ہے، صوفیہ کرام دراصل اسی تزکیہ و احسان کے حصول کے لیے جو طریقہ اختیار کرتے ہیں اس کا نام تصوف ہے اور چوں کہ تزکیہ و احسان ہمیشہ مطلوب رہا ہے، اس لیے اسلام کے ابتدائی ادوار میں یہ ایک حقیقت تھا، البتہ اس کو تصوف یا سلوک کے نام سے نہیں جانا جاتا تھا۔ بعد کے زمانے میں خاص طور پر تیسری صدی ہجری میں جب تصوف کی باضابطہ تشکیل ہو گئی اور وہ فقہ و کلام کی طرح ایک فن کے طور پر مدون و مروج ہو گیا تو ایسے بھی بہت سے لوگ پیدا ہو گئے جو ظاہر میں صوفی تھے لیکن باطنی آلائش و غفلت سے پاک نہیں تھے، مثلاً ان کو دیکھ کر ہی کسی نے مذکورہ بالا جملہ کہا ہوگا۔

تزکیہ و احسان یا تصوف و سلوک کی جتنی ضرورت مردوں کو ہے اتنی ہی عورتوں کو بھی ہے اور اسلام نے روحانی ترقی کا جو موقع مردوں کو دیا ہے وہی عورتوں کو دیا ہے۔ چنانچہ قرآن میں ایک جگہ ہے: ”ان کے رب نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی کا عمل ضائع نہیں کرنے والا ہوں، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔“ (آل عمران: ۱۹۵) ایک اور آیت میں فرمایا گیا: ”مردوں کے لیے اپنی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کے لیے اپنی کمائی کا حصہ ہے۔“ (النساء: ۳۲) یہاں اس کا موقع نہیں ہے ورنہ قرآن میں متعدد جگہ اس کا تذکرہ آیا ہے کہ مرد اور عورت خدا کے سامنے بالکل برابر ہیں جو نیک کام کرے گا، عمل صالح کرے گا، اچھائی کا حکم دے گا، صدقہ و خیرات کرے گا اس کو پورا پورا اجر دیا جائے گا، اس اجر میں کوئی تفریق نہیں ہوگی۔

احادیث مبارکہ میں بھی یہی بات مہربن کی گئی ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے: ”انما النساء شقائق الرجال۔“ (بے شک عورتیں مردوں کے برابر ہیں۔)

عہد رسالت اور عہد صحابہ میں ہمیں اس کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ عرب کا بدوی معاشرہ کس طرح تبدیل ہو کر ایک متمدن معاشرہ بن گیا اور کس طرح عورت اور مرد دونوں نے یکساں طور پر اپنی آخرت کی منزل کو آسان کرنے کی اور اپنے روحانی ارتقا کی کوشش کی۔ ایسی خواتین کی ایک بڑی تعداد کا تذکرہ، حدیث اور طبقات کی کتابوں میں محفوظ ہے، بلکہ ابن سعد اور ابن حجر وغیرہ مصنفین نے تو عرف عورتوں کے لیے ایک ایک جلد مخصوص کی ہے۔ ان میں عبادات، اوراد و اذکار، خیرات و زکوٰۃ، غلام آزاد کرنے اور درس و تدریس جیسے امور تک میں خواتین کی خدمات کا بھی مفصل تذکرہ ہے۔

جیسا کہ شروع میں کہا گیا تصوف اس وقت ایک بے نام حقیقت تھا۔ یعنی لفظ تصوف کا استعمال نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے کسی صحابی کو صوفی نہیں کہا جاتا اور اسی لیے اس عہد کی وہ خواتین جو عبادت و اطاعت اور زہد و تقویٰ میں سبقت لے گئیں ان کو بھی خواتین صوفیہ یا الصوفیات نہیں کہا جاتا اور یہ فرق صوفیہ کرام نے خود وارکھا ہے۔ صوفیہ کے سب سے بڑے تذکرہ نگار ابو عبد الرحمن السلمی نے صحابہ و تابعین کے عہد کے صوفیہ کا ذکر ”نساک“ کے نام سے کیا ہے اور فضیل بن عیاض کے بعد سے نساک کا ذکر لفظ صوفی سے کیا ہے۔

تصوف و سلوک کی اس روایت میں حضرت حسن بصری کو پیش وائی حاصل ہے، اگرچہ وہ بھی صوف نہیں پہنتے تھے اور انہوں نے بعض اوقات اون پہننے کو ناپسند بھی کیا ہے۔ لیکن ان کے بعض تلامذہ اون پہنتے تھے وہ اگرچہ صوفی کے نام سے مشہور نہیں تھے، لیکن وہ صوفی تھے۔ حضرت حسن بصری کو صوفیہ اپنا سرخیل اور امام مانتے ہیں۔

تصوف کی روایت میں جس طرح حضرت حسن بصری کا نام اساطین میں لیا جاتا ہے اسی طرح خواتین صوفیہ میں حضرت رابعہ بصریہ کا نام لیا جاتا ہے۔ راہ سلوک میں جس طرح صوفیہ مردوں سے اکساب فیض کرتے تھے اسی طرح خواتین سے بھی مستفید ہونے والے بہت سے صوفیہ تھے۔ خود حضرت رابعہ بصریہ کے بارے میں ہے کہ امام سفیان ثوری ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور ان کو اپنی موکو پہ کہتے تھے۔ سلمیٰ نے لکھا ہے کہ رابعہ کے علوم و حکمت کو سفیان ثوری اور شعبہ نے روایت کیا ہے۔ (ذکر النسوة المتعبدات الصوفیات، ص: ۶۸) اسی طرح حضرت شعوانہ کے بارے میں ہے کہ زاہد، عابد اور رابح قلوب ان کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور ان کے علوم سے استفادہ کرتے تھے، وہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کرتی تھیں۔ (ص: ۶۲) ذوالنون مصری نے فاطمہ فیثا پوریہ سے استفادہ کیا۔ (ص: ۶۱) ابراہیم بن سفیان نے عائشہ الدینوریہ سے تربیت حاصل کی اور ان کے وصایا کو روایت کیا۔ (ص: ۶۸) اس طرح بہت

ی صوفی خواتین موصوفیہ سے اخذ واستفادہ کرتی تھیں، جیسے بحر یہ شقیق بلخی کی مریدہ تھیں۔ (ص: ۶۶) امیر المہمد بن القاسم ابو سعید الخزاز کی شاگردہ اور خادمہ تھیں۔ (ص: ۶۹) ابو عثمان کی شاگردہ اور مریدہ فاطمہ بن احمد تھیں۔ (ص: ۸۲)

موصوفیہ نے بہت سی صوفی خواتین کی عظمت اور ان کے مقام کا اعتراف کیا ہے۔ انہوں نے ام ہارون الدمشقیہ کی بڑی تعریف کی ہے اور فرمایا ہے کہ مجھے شام میں ان سے بہتر کوئی نام نہیں معلوم۔ (ص: ۶۴) فاطمہ نیشاپوری کی ابو یزید نے بہت تعریف کی ہے۔ (ص: ۶۱) جس طرح موصوفیہ ہر طرح کے خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتے تھے اسی طرح صوفی خواتین بھی ہر طرح کے خاندانی پس منظر سے تعلق رکھتی تھیں۔ اسماعیل بن عیاش ایک عظیم محدث اور امام ہیں۔ ان کی والدہ بڑی متقی پرہیزگار اور صوفی خاتون تھیں۔ مہلب بن ابی صفر جو عہد بنی امیہ کے بڑے سرداروں میں ہیں، ان کی بیٹی اور حجاج بن یوسف کی اہلیہ ہند بھی بڑی مشہور صوفی خاتون تھیں۔ ان کے والد بھی ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ (اعلام النساء، ص: ۲۰۵-۲۰۶)

صوفی مردوں کے پہلو پہلو ان گھرانے کی خواتین بھی بڑی پائے کی گزری ہیں۔ ابو عثمان الخیر ی کی بیٹی عائشہ بہت مشہور صوفی تھیں۔ (ص: ۸۵) امام محمد بن سیرین کی بہن حفصہ بھی بہت مشہور صوفی خاتون تھیں۔ (ص: ۵۱) بشر حافی کی دو بہنیں زہدہ اور صفیہ بھی بڑی مشہور صوفی خواتین تھیں۔ (ص: ۸۸) اور ابو سلیمان دارانی کی دو بہنیں عہدہ اور آمنہ بھی بڑی پائے کی صوفیات تھیں۔ (ص: ۸۹) ان کا ذکر مختلف تذکروں میں موجود ہے۔ احمد بن ابی الحواری کی اہلیہ رابعہ بنت اسماعیل بہت مشہور صوفی خاتون تھیں۔ (ص: ۵۹) اسی طرح فاطمہ ام الیمین ابو علی الروباری کی اہلیہ بھی بڑی عابدہ و زاہدہ اور اعلیٰ پائے کی صوفی خاتون تھیں۔ (ص: ۸۶)

صوفی خواتین کی خدمات کا ایک خاص پہلو ان کا وعظ و نصیحت اور درس و تدریس ہے۔ ایسی متعدد صوفی خواتین کا تذکرہ ملتا ہے جنہوں نے عام لوگوں میں وعظ و ارشاد کی محفل آراستہ کی۔ مثلاً عبیدہ بنت ابی کلاب البصریہ کے بارے میں مشہور ہے کہ طفا نام کے مقام پر آتیں اور وعظ و ارشاد کرتیں۔ سلمیٰ نے ان کو جیرا المواعظ کہا ہے۔ (ص: ۵۷) ام لاسو اور فاطمہ کے بارے میں سلمیٰ نے لکھا ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر بیان کیا کرتی تھیں۔ (ص: ۶۳-۶۴)

صوفی خواتین کا ایک پہلو جس کا تذکرہ بعض تذکرہ نگاروں نے کیا ہے وہ صوفی اور تصوف کی تعریف سے متعلق ہے، مثلاً فاطمہ بن احمد جو ابو عبد اللہ الروباری کی اہلیہ تھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ میرا بیٹا صوفی نہیں ہے وہ ایک صالح انسان ہے، صوفی تو میرے بھائی (ابو علی الروباری) تھے۔ (ص: ۱۰۰)

بعض صوفی خواتین اپنے خطبات اور مدہوشی کے لیے بھی مشہور تھیں۔ بعض صوفی خواتین بلکہ صوفی خواتین نے راہ سلوک کے علوم و معارف اور احوال و کیفیات کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے اور انہوں نے حب، مراقبہ، محبت، نفس کی آفات وغیرہ پر بے مثال اہم نکات پیش کیے ہیں۔

راہ سلوک میں ایک مقام آتا ہے جب اعلیٰ درجات کے صوفیہ کی نگاہیں ایسے لوگوں پر ٹھہرتی ہیں جن کے یہاں تصوف ایک رسم ہے تو وہ ان صوفیہ پر تنقید کرتے ہیں اور ان کی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں یہ وصف جس طرح موصوفیہ میں ہے اسی طرح خواتین صوفیہ کے یہاں بھی اس کی نظیر مل جاتی ہے۔ سلمیٰ نے ایک خاتون کا تذکرہ کیا ہے جو صوفیہ پر تنقید کے لیے مشہور تھیں۔ ان کا نام فاطمہ الدمشقیہ ہے۔ (ص: ۹۴)

صوفی خواتین اور صوفی مردوں میں اصل فرق صرف صنف کا تھا درجات کا نہیں، ورنہ جس طرح مسلمان موصوفیہ تھے اسی طرح مسلمان عورت صوفیات تھیں۔ دونوں کی خدمات، دونوں کے تجربات اور دونوں کے افکار و معارف بالکل یکساں ہیں۔ دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ کیا ہے۔ مردوں کی استاذو رتیں رہیں اور عورتوں کے استاذ و مریدہ۔ رشتہ قہرابت رہا اور اخذ و استفادہ بھی۔

تذکرہ نویس اور مؤرخ بالعموم مرد ہوتے ہیں۔ ان مردوں کی رسائی بسا اوقات دور دراز کی خواتین تک نہیں ہوتی تھی اور جن تک ہو جاتی تھی ان کے بھی حالات تفصیل سے نہیں ملتے تھے۔ اس لیے صوفی عورتوں کے احوال تذکرہ نگاروں نے کم لکھے ہیں۔ اس کے باوجود بہت سے تذکرہ نگاروں نے صوفی خواتین کے ذکر پر مشتمل کتابیں لکھی ہیں، اپنی کتابوں میں صوفی خواتین کا تذکرہ کیا ہے، مثلاً ابو عبد الرحمن السلمی کی کتاب "ذکر النسوة الصوفيات المتعبدات" جس کا ذکر پہلے آچکا ہے، صرف عورتوں کے حالات پر لکھا گیا واحد تذکرہ ہے۔ اس میں کم و بیش ۸۰ عورتوں کا تعارف کر لیا گیا ہے۔

"ذکر النسوة الصوفيات المتعبدات" کے بعد سب سے مشہور تذکرہ جس میں خواتین کی بھی بڑی تعداد موجود ہے وہ ابن الجوزی کی صفۃ الصوفیہ ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے کم و بیش ۱۳۰ خواتین کا تذکرہ کیا ہے اور ان میں بڑی تعداد میں ایسی خواتین کی ہے مصنف کو جن کے نام کا علم نہیں، بلکہ نام معلوم عورت یا غیر معروف عورت کے نام سے ان کا تذکرہ کر دیا ہے، یا کچھ عورتوں کا تذکرہ فلاں کی بیٹی، فلاں کی بہن، فلاں کی بیوی یا فلاں کی والدہ کے نام سے کیا ہے۔

صوفی خواتین کے تذکرے میں ایک اور اچھائی اہم کتاب ہے اور وہ ہے نجات اللاس۔ یہ کتاب علامہ جامی نے لکھی ہے جو فارسی زبان میں صوفیہ کا مستند ترین تذکرہ ہے۔ اس میں ۱۶

خواتین کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ خواتین کے حالات پر بہت سی کتابیں ہیں لیکن خاص صوفی خواتین کے تذکرے پر مشتمل یہ کتابیں زیادہ شہرت رکھتی ہیں۔ بعض دوسری کتابوں میں بھی اکا دکا صوفی خواتین کا تذکرہ ہے لیکن سب سے اہم مراجع یہی ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے صوفی خواتین کے تذکرے میں تعریف و توصیف میں کمی نہیں کی اور جو حالات ملے ان کو پوری دیانت کے ساتھ بیان کر دیا، لیکن مختلف اسباب کی بنا پر خواتین کے حالات اور واقعات کم تعداد میں ملے۔

تصوف کی تاریخ میں سب سے عظیم خاتون رابعہ بصریہ ہیں لیکن حضرت رابعہ بصریہ کی شخصیت جتنی اہم ہے اتنے ہی واقفوں اور قلم کاروں نے ان کی شخصیت کے گروہ ساطیری جالے بن دیے جن کی وجہ سے آج ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ان کے وجود کو بھی مشکوک سمجھنے لگے، حتیٰ کہ دور حاضر کے مامور عالم علامہ یوسف القرضاوی نے ایک مستقل کتاب لکھ کر یہ ثابت کیا ہے کہ ان کا وجود ساطیری نہیں حقیقی ہے۔ حضرت رابعہ بصریہ کے بارے میں مراجع کی کمی ہے۔ مثلاً دور اول کے اہم تذکرے جیسے طبقات الصوفیاء از ابو عبد الرحمن السلمي، حلیۃ الاولیاء از ابو نعیم اصفہانی، میں سرے سے حضرت رابعہ کا ذکر ہی نہیں۔ الرسالۃ الششریہ از ابو القاسم الششری میں عموماً تذکرہ آیا ہے۔ ان وجوہات سے بھی ان کی شخصیت پورے طور پر واضح ہو کر سامنے نہ آسکی اور ان کا سب سے تفصیلی تذکرہ تذکرۃ الاولیاء از فرید الدین عطار میں ملتا ہے۔ اس میں کئی باتیں غیر تاریخی اور بعض کم زور روایتیں ان کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اس لیے حضرت رابعہ کی شخصیت تاریخی طور پر پردہ زہول میں چلی گئی اور صوفی روایت میں ان کے گرد کرامات اور فوق العادہ واقعات کا ایسا ہالہ بن گیا کہ ان کی اصل شخصیت ہی وضد لاگئی۔

اس کو حسن اتفاق کہا جاسکتا ہے کہ ابو عبد الرحمن السلمي نے طبقات الصوفیہ کے علاوہ ایک اور کتاب بھی لکھی تھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے یعنی ذکر النسوة الصوفیات المتعبدات، یہ کتاب تاریخ اسلامی میں صوفی خواتین کا واحد تذکرہ ہے اور اس کا زمانہ تصنیف ۴۱۴ھ ہے۔ اس میں حضرت رابعہ کا تفصیل ذکر موجود ہے اور یہ دراصل ان چیزوں سے بھی پاک ہے جو بعد میں ان کے حالات کا حصہ بن گئیں۔

ابو عبد الرحمن السلمي نے اس کتاب میں لکھا ہے کہ وہ بصرہ کی رہنے والی تھیں اور آل تنیک کی آزا کردہ باندی تھیں۔ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ ان سے مسائل دریافت کرتے تھے، ان کی باتوں پر بھروسہ کرتے تھے اور ان سے نصیحت سنتے تھے اور ان سے دعا کرانے کے متمنی رہتے تھے۔ رابعہ کے علوم و حکمت کو سفیان ثوری اور شعبہ نے روایت کیا ہے۔

جعفر بن سلیمان سے روایت ہے کہ سفیان ثوری نے میرا ہاتھ پکڑا اور کہا مجھے میری اوب

کھانے والی کے پاس لے چلو جس سے جدا ہو کر مجھے راحت نہیں ملتی۔ جب ہم رابعہ کے پاس گئے تو سفیان نے اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا اللہم انی اصلک السلاخۃ تو رابعہ رونے لگیں۔ انہوں نے پوچھا آپ کیوں رونے لگیں؟ تو جواب دیا کہ مجھے آپ نے رلایا ہے۔ پوچھا وہ کیسے؟ فرمایا آپ کو معلوم ہے کہ سلامتی یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے اسے چھوڑ دیا جائے اور یہ ہو نہیں سکتا، چوں کہ لوگ دنیا میں ڈوبے ہوئے ہیں۔

سفیان الابی کہتے ہیں کہ میں نے رابعہ کو کہتے سنا کہ ہر چیز کا ایک پھل ہوتا ہے اور معرفت کا پھل اعتراف ہے۔ یہی راوی یہ بھی روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا میں استغفار میں قلت صداقت سے اللہ کی پناہ مانگتی ہوں۔

ان سے یہ بھی مروی ہے کہ ایک مرتبہ ان سے پوچھا گیا رسول اللہ سے تمہاری محبت کا کیا عالم ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت ہے لیکن مجھے خالق کی محبت نے مخلوق کی محبت سے پھیر رکھا ہے۔ حضرت رابعہ نے ایک دن رباح کو دیکھا کہ وہ ایک چھوٹے بچے کا بوسہ لے رہے ہیں، حضرت رابعہ نے پوچھا کیا تم اس بچے سے محبت کرتے ہو؟ انہوں نے جواب دیا ہاں! حضرت رابعہ نے فرمایا کہ میں نہیں سمجھتی تھی کہ غیر اللہ کی محبت کے لیے آپ کے دل میں کوئی جگہ ہے۔ اس پر رباح بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ جب ہوش میں آئے تو کہا ”بلکہ یہ تو رحمت ہے، جس کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دلوں میں ڈالتا ہے۔“

جعفر سے روایت ہے کہ محمد بن واسع رابعہ کے پاس گئے۔ وہ جھوم رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا آپ کیوں جھوم رہی ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں رات اپنے رب کی محبت میں مدہوش ہو گئی تھی۔ جب صبح ہوئی میں اس کے شمار میں ہوں۔

حضرت سفیان ثوری نے حضرت رابعہ سے پوچھا کہ بندے کو اس کے رب سے قریب کرنے والی چیز کیا ہے؟ حضرت رابعہ رونے لگیں اور فرمایا کہ مجھ جیسی سے یہ سوال کیا جا رہا ہے! پھر جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ بندے کو اللہ تعالیٰ کے قریب کرنے والی چیز یہ ہے کہ اللہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ بندہ دنیا و آخرت میں اس کے سوا کسی چیز سے محبت نہیں کرتا۔

ایک مرتبہ حضرت سفیان ثوری نے فرمایا ہائے غم، حضرت رابعہ نے کہا جھوٹ مت بولو، یہ کہو ہائے غم کی کمی۔ چوں کہ اگر تم سچ غم زدہ ہوئے تو یہاں آرام سے نہ رہتے۔

حضرت رابعہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میرا غم یہ نہیں ہے کہ مجھے غم ہے بلکہ میرا غم یہ ہے کہ مجھے غم ہی نہیں۔ ایک مرتبہ حضرت رابعہ کا گوز بصرہ میں ایک آدمی کے پاس سے ہوا جس کو بدکاری کے جرم میں سزا دی گئی تھی۔ حضرت رابعہ نے فرمایا کہ اس زبان پر میرے ماں باپ قربان ہوں

جس سے تو لا الہ الا اللہ کہتا تھا۔ (یعنی تیرے عمل نے تیرے قول کو باطل کر دیا۔)

ایک مرتبہ صالح مری نے ان کے سامنے کہا کہ جو دروازہ کھٹکھٹائے گا اس کے لیے دروازہ کھل جائے گا۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ دروازہ تو کھلا ہوا ہے، ضرورت اس کی ہے کہ کون اس میں داخل ہوتا ہے۔

حضرت رابعہ بصریہ کے یہ وہ حالات ہیں جو ابو عبد الرحمن السلمی نے ذکر المسوۃ الصوفیات المتعبدات میں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت رابعہ کے بارے میں مستند معلومات نہیں ہیں، حالانکہ حضرت رابعہ کا تذکرہ بعد کے بہت سے معنشین نے کیا ہے، لیکن ان سب کا مرجع تذکرۃ الاولیاء (فرید الدین عطار) ہے، جس میں عام طور پر غیر محتاط واقعات نقل کیے گئے ہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے راقم الحروف کی کتاب سید الطائفہ شیخ جنید بغدادی)

حضرت رابعہ بصریہ کے سلسلہ میں ایک مشکل اور بھی ہے وہ یہ کہ رابعہ نام کی متعدد خواتین ہیں۔ تذکرہ نگاروں نے ان خواتین کو آپس میں ملتیس کر دیا ہے۔ ابو عبد الرحمن السلمی نے اپنی کتاب میں رابعہ نام کی چار صوفی خواتین کا ذکر کیا ہے جبکہ علامہ جامی نے نجات الانس میں دو رابعہ نام کی خواتین کا تذکرہ ہے۔ ایک رابعہ العدویہ (ص: ۳۸۴) اور دوسری رابعہ الشامیہ جو احمد بن ابی الحواری کی اہلیہ تھیں۔ (ص: ۳۸۶) امام ذہبی نے تاریخ الاسلام میں رابعہ العدویہ اور رابعہ بنت اسماعیل دونوں میں التباس کر دیا ہے۔ (تاریخ الاسلام ۲۴۱/۸-۲۴۲/۳) ابو عبد الرحمن السلمی نے رابعہ کے بارے میں صرف اتنا لکھا ہے کہ وہ آل تنیک کی آزاد کردہ باندی تھیں۔ والد کا نام یا خاندان کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ اہلۃ ابن الجوزی نے لکھا ہے کہ ابو عبد الرحمن نے لکھا ہے کہ رابعہ العدویہ اور رابعہ الشامیہ دونوں کے والد کا نام اسماعیل ہے۔ (مفتیہ الصوفیہ ۲/۸۷) لیکن ابو عبد الرحمن کی مطبوعہ کتاب میں اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔

صوفی خواتین میں سب سے مشہور اور بڑا نام حضرت رابعہ بصریہ کا ہے۔ ان پر مستقل کتابیں موجود ہیں۔ اردو، عربی اور انگریزی میں کئی تحقیقی کتابیں لکھی گئیں، بلکہ قدما میں ابن الجوزی نے ان کے بارے میں ایک مستقل کتاب تصنیف کی تھی جس کا تذکرہ انہوں نے مفتیہ الصوفیہ میں کیا ہے لکھا: فقد اقتصرت ہمننا علی هذا القدر من اخبار رابعة لانی قد الفردت لہا کتابا جمعت فیہ کلامہا و اخبارہا۔ (مفتیہ الصوفیہ ۲/۱۴۷)

(یہاں میں رابعہ کے حالات میں اسی قدر پر اکتفا کرتا ہوں۔ اس لیے کہ میں نے ان کے لیے ایک الگ کتاب لکھی ہے جس میں ان کا کلام اور احوال جمع کیے ہیں۔)

حضرت رابعہ بصریہ کے علاوہ مشہور صوفی خواتین میں لہابہ السعیدہ ہے۔ وہ بھی مشہور

خواتین میں سے ہیں۔ محمد بن روح نے ان کی روایات نقل کی ہیں۔ بیت المقدس کی رہنے والی تھیں۔ انہوں نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی معرفت اس کی محبت پیدا کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی محبت اس کا ذوق پیدا کرتی ہے اور اس کا ذوق اس سے انس پیدا کرتا ہے اور اس سے انس اس کی خدمت اور فرماں برداری پر دوام عطا کرتی ہے۔ (ص: ۵۲) ابن الجوزی نے مفتیہ الصوفیہ میں (ص: ۲۴) پر بھی ان کا تذکرہ کیا ہے۔

مومنہ بنت بہلول کے بارے میں ابو عبد الرحمن السلمی نے لکھا ہے کہ وہ عظیم عبادت میں سے تھیں۔ ان سے ایک مرتبہ دریافت کیا گیا کہ تم نے یہ مقامات کیسے حاصل کیے فرمایا اللہ تعالیٰ کے احکام کا اتباع، سنت رسول کی پیروی، مسلمانوں کے حقوق کی تعظیم اور تنیک مسلمانوں کی خدمت کے ذریعہ۔ (ص: ۳۴) مفتیہ الصوفیہ میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔ (ص: ۲/۵۲)

رابعہ بصریہ کی معاصر مریم البصریہ تھیں جو رابعہ کے بعد بھی زندہ رہیں۔ سفر ماتی تھیں کہ جب سے میں نے سنا ہے: وفی السماء رزقکم و ما تو علمون۔ (الذاریات: ۲۴) میں نے نہ رزق کی فکر کی اور نہ اس کی طلب میں پریشان ہوئی۔ ان کے بارے میں مشہور ہے کہ محبت الہی سے سرشار تھیں، حتیٰ کہ ایک دفعہ ایک واعظ محبت الہی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اسے سن کر ان کا پتہ پھٹ گیا اور فوت ہو گئیں۔ (۳۳)

اس عہد کی ایک صوفی خاتون شبکیہ البصریہ تھیں۔ ابو عبد الرحمن السلمی کے زمانے میں مشہور تھیں۔ انہوں نے لکھا ہے کہ وہ اپنے بھائی کی ساتھی یعنی راہ سلوک کی ساتھی تھیں، لیکن بھائی کا نام نہیں لکھا اور بعد کے کسی تذکرہ نگار نے ان کا ذکر نہیں کیا، اس لیے ان کی شخصیت اور ان کے بھائی کو متعین کرنا مشکل ہو گیا۔ البتہ ابو سعید الاعرابی نے اپنی کتاب ”الطبقات“ میں اس کا تذکرہ کیا تھا لیکن یہ کتاب مرویہ نام سے ضائع ہو گئی۔ حضرت شبکیہ فرماتی تھیں کہ ریا غستوں کے ذریعے اپنے نفس کو پاک کرو، جب نفس پاک ہو جائے گا تو عبادت میں ذوق و شوق پیدا ہو جائے گا۔ (ص: ۳۶)

رابعہ بصریہ کی ہم عصر اور انہی کے پائے کی ایک خاتون صوفی معاذہ بنت عبد اللہ العدویہ تھیں۔ دونوں میں یہی ہوتی تھی۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے چالیس سال تک اپنی آنکھیں آسمان کی طرف نہیں اٹھائیں۔ معاذہ بہت مشہور صوفی خاتون تھیں۔ ان کا تذکرہ بہت سے تذکرہ نگاروں نے کیا ہے۔ طبقات ابن سعد میں بھی ان کا ذکر ہے اور تکی بن معین نے ان کو ثقہ راویوں میں شمار کیا ہے۔ مشہور تابعی سلمہ بن اشیم العدوی کی اہلیہ تھیں۔ (سیر اعلام النبلاء، ص: ۵۰۹/۳) ابو عبد الرحمن السلمی نے ان کو رابعہ کی اقران اور دوستوں میں لکھا ہے، لیکن دیگر تذکرہ نگاروں خاص طور پر ابن سعد اور صاحبہ کے اندراج کو پیش نظر رکھا جائے تو رابعہ سے معاشرت مشکوک ہو جاتی ہے۔ سلمی کی

کتاب کے محشی نے ان کی تاریخ وفات ۸۳ھ یا ۱۰۱ھ لکھی ہے۔ اگر یہ سال درست ہے تب بھی رابعہ سے معاشرت نہیں ہو سکتی چونکہ حضرت رابعہ کی ولادت ہی اس کے بعد کی ہے۔

بصرہ میں صالح المری کے عہد میں ایک اور بزرگ خاتون تھیں، جن کا نام ریحانہ الوالدہ ہے۔ سلمیٰ نے ان کے کچھ عارفانہ اشعار نقل کیے ہیں۔ (ص: ۲۸) اور ابن الجوزی نے صفحہ الصفوۃ میں ان کا تذکرہ لکھا ہے۔ (ص: ۵۷)

یوسف بن اسباط کی بیوی نسیہ بنت سیمان بھی ایک مشہور خاتون تھیں۔ ان کا ایک مقولہ سلمیٰ نے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اپنے شوہر سے کہا کہ اللہ تعالیٰ تم سے میرے بارے میں سوال کرے گا، مجھے سوائے حلال کے کچھ مت کھانا اور میری وجہ سے کوئی مشیتہ چیز حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا۔ (ص: ۳۷)

عافہ المصنوعہ عبد القیس سے تعلق رکھتی تھیں۔ بصرہ کی رہنے والی تھیں۔ کثرت سے ذکر کرتی تھیں۔ رامت میں جائتیں، دن میں قبرستان میں جاتیں اور کہتیں کہ محبت کرنے والے اپنے محبوب سے مناجات سے نہیں بچتے اور نہ کسی اور کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ (ص: ۴۰)

شام کے محمد بن شام حنفیہ امام حنفیہ بن عیاش کی والدہ بھی ایک عابدہ و زہدہ خاتون تھیں۔ محمد بن اسماعیل سے روایت ہے کہ میرے والد نے فرمایا کہ ان کی والدہ فرماتی تھیں کہ اگر مجھ کو یہ یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ مجھ کو ضرور جنت میں داخل کر دے گا تب بھی میں عبادت و اطاعت میں زیادہ سے زیادہ کرنے کی کوشش کروں گی۔ ان کی والدہ ام عبد اللہ بنت خالد بن معدان کے نام سے مشہور تھیں۔ (ص: ۴۱)

رئیسہ بنت عمر والدہ دویہ بصرہ کی رہنے والی تھیں اور معاذہ الدویہ کی شاگرد تھیں۔ فرماتی تھیں کہ عمل کے ساتھ تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اخلاص ہو، عمل درست ہو، سنت کے موافق ہو۔ (ص: ۴۲) تب ہی قابل قبول ہوگا۔

ام الاسود بنت زید الدویہ ایک عابدہ و زہدہ خاتون تھیں۔ معاذہ الدویہ نے ان کو دودھ پلایا تھا۔ حضرت معاذہ نے ان کو نصیحت کی کہ حرام کھا کر میرے دودھ پلانے کو خراب مت کرنا۔ وہ فرماتی ہیں کہ میں نے اس کے بعد حلال رزق کے حصول کے لیے حتیٰ الوسع جدوجہد کی اور اگر کبھی میں نے کوئی مشکوک نوالہ لیا تو پھر یا تو میرا کوئی فریضہ چھوٹ گیا یا کوئی در چھوٹ گیا۔ (ص: ۵۷)

حضرت شعوانہ ایک عظیم صوفی اور عابدہ خاتون تھیں۔ ابلہ میں آتی تھیں، آواز بہت اچھی تھی، لوگوں کو وعظ لکھا کرتی تھیں، عابدہ زہدہ اور ارباب القلوب ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، وہ بہت رونے والی اور محنت و مجاہدہ کرنے والی تھیں۔ ابو یونس کہتے ہیں کہ شعوانہ ایک دفعہ اتنی

روئیں کہ ہم کو ان کے اندر سے ہونے کا اندیشہ ہوا۔ میں نے ان سے کہا کہ ہمیں ڈر ہے کہ آپ اندھی نہ ہو جائیں تو وہ اور روئیں اور کہا کہ بخدا دنیا میں اندھا ہونا مجھے آخرت میں اندھے ہونے کے مقابلے میں بہت پسند ہے۔ (ص: ۴۴)

بصرہ میں حدیث کے مشہور امام حماد بن زید کی بہن معبدہ بنت زید بھی عظیم صوفی خواتین میں سے تھیں۔ سلمیٰ نے ان کو رابعہ کے مثل لکھا ہے۔ (ص: ۴۵)

عصامہ بنت بلال بن ابی الدرداء بھی بڑی عابدہ، زہدہ اور نیک خواتین میں سے تھیں، ان کی بیوائی جاتی رہی لیکن وہ اس پر صابر و شاکر رہیں۔ ان کا تذکرہ امام احمد بن حنبل نے اپنی کتاب الترغیب میں کیا ہے۔ یہ دراصل مشہور صحابی حضرت ابو الدرداء کی پوتی تھیں۔ سلمیٰ نے ان کے کچھ اشعار نقل کیے ہیں۔ (ص: ۴۶)

امام محمد بن سیرین کی بہن حصہ کا تذکرہ بھی اپنے عہد کی بڑی عابدات اور زہدات خواتین میں کیا جاتا ہے۔ ابن سعد نے طبقات میں ان کا تذکرہ کیا ہے اور ابن الجوزی نے صفحہ الصفوۃ میں سلمیٰ نے بھی ان کا ایک مقولہ نقل کیا ہے۔ (ص: ۵۱)

بصرہ کی ام سالمہ الراسبیہ بھی عظیم صوفی خواتین میں تھیں۔ ابن جوزی نے ان کا ذکر کیا ہے اور سلمیٰ نے بھی ان کے اقوال بیان کیے ہیں۔ (ص: ۵۶)

جب اللہ تعالیٰ کی کوئی نعمت ملے تو اس کو شکر کے ساتھ آگے بڑھ کر قبول کرو، قبل اس کے کہ اس نعمت پر زوال آجائے۔ (ص: ۵۸)

رابعہ بنت اسماعیل ایک بڑے امیر گھرانے کی خاتون تھیں۔ ان کی شادی مشہور صوفی احمد بن ابی الحواری سے ہوئی اور انہوں نے اپنی ساری دولت اپنے شوہر پر قربان کر دی وہ فرماتی تھیں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی تھی کہ میرا مال آپ جیسا کوئی آدمی استعمال کرے۔

رابعہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں صرف کو دیکھتی ہوں تو اعمال ناموں کا تقسیم ہونا یاد آتا ہے۔ جب بند یوں کو دیکھتی ہوں تو میدان حشر یاد آتا ہے اور مؤذن کی اذان سنتی ہوں تو قیامت کی منادی یاد آتی ہے۔ (ص: ۶۰-۵۹)

فاطمہ نیشاپوریہ بھی اپنے عہد کی عظیم صوفی خواتین میں تھیں۔ ابو یزید بسطامی جیسے عظیم صوفی نے فاطمہ کی تعریف کی ہے۔ فرماتے تھے میں نے اپنی زندگی میں ایک مرد کو دیکھا اور ایک عورت کو یعنی اس پائے کا کسی اور کو نہیں دیکھا اور عورت فاطمہ نیشاپوریہ تھیں۔ ذوالنون مصری فرماتے تھے کہ فاطمہ اللہ کے ولیوں میں سے ایک ولیہ ہیں۔ سلمیٰ نے لکھا ہے کہ اپنے عہد میں فاطمہ سے زیادہ معزز اور بزرگ کوئی خاتون نہیں تھیں۔ (ص: ۶۱-۶۲) انجیوم اثر اھرہ میں اور صفحہ

الصوفیہ میں بھی ان کا تذکرہ ہے۔

شام میں ایک عظیم صوفی خاتون ام ہارون الدمشقیہ بھی تھیں۔ ابوسلیمان دارانی ان کے بارے میں کہتے تھے کہ میں نے شام میں ام ہارون سے بہتر کسی کو نہیں دیکھا اور احمد بن الحواری ان سے وعظ و نصیحت سنتے تھے۔ (ص: ۶۴)

بصرہ کی ایک عارفہ بحریہ بھی تھیں۔ انہوں نے شتیق بلخی کی خدمت میں رہ کر تربیت حاصل کی۔ حضرت شتیق بلخی بھی اس کی تعریف کیا کرتے تھے اور ان کی نصیحتیں بصرہ میں لوگ بیان کرتے تھے۔ سلمیٰ نے بصرہ کی ایک بڑھیا کے حوالے سے لکھا ہے کہ بحریہ فرماتی تھیں کہ جب دل شہوات کو چھوڑ دیتا ہے تو پھر اس کو علم سے انسیت ہو جاتی ہے، اس کا اتباع کرتا ہے اور جو علم اسے حاصل ہوتا ہے اس کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ (ص: ۶۶) ابن الجوزی نے بھی ان کا تذکرہ لکھا ہے۔ (صفۃ الصوفیہ ص: ۳۹/۴۰)

ابوجزہ ابو الحسن نوری اور چند بغدادی کے حالات میں ایک خاتون زینونہ کا نام آتا ہے جو دراصل ان دونوں بزرگوں کی خادمہ تھیں۔ عام طور پر مؤرخین نے ان کا تذکرہ محض ایک خادمہ کے کیا ہے۔ سلمیٰ نے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں جو تفصیلات دی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ خود بھی عظیم صوفی خاتون تھیں اور زینونہ کے نام سے مشہور تھیں، ورنہ ان کا اصل نام فاطمہ تھا۔ سلمیٰ نے ان کے ایک واقعے کا ذکر کیا ہے جو دراصل ابو الحسن نوری سے متعلق ہے اور اس کا تذکرہ خطیب بغدادی نے بھی کیا ہے۔

صفراء الرازیہ نام کی ایک عابدہ خاتون کا تذکرہ سلمیٰ نے کیا ہے۔ دراصل ابو حفص نیشاپوری نے اپنے رے کے دوران قیام اس خاتون سے شادی کی تھی اور جب رے سے جانے کا ارادہ کیا تو اس خاتون سے کہا کہ تم طلاق لے لو چوں کہ میں جا رہا ہوں اور مجھے نہیں معلوم کب واپس آؤں گا۔ اس خاتون نے اس کو پسند کیا کہ ابو حفص کے نکاح میں رہے اور چلتے ہوئے کچھ نصیحتیں ان سے سیں۔ ان میں سے کچھ کا تذکرہ سلمیٰ نے کیا ہے۔ (ص: ۳۷)

احمد بن خضر ویہ کی اہلیہ ام علی بھی بڑی عابدہ زاہدہ اور عارفہ خاتون تھیں۔ خود بہت بڑے گھرانے سے تعلق رکھتی تھیں۔ سلمیٰ نے لکھا ہے کہ کثرت منہات المروءاء والاہلحاء۔ ابو حفص نیشاپوری اور ابو یزید بسطامی نے ان کی بڑی تعریف کی ہے۔ ابو یزید بسطامی کہا کرتے تھے کہ جو کوئی راہ تصوف اختیار کرے وہ ام علی کی طرح کرے۔ سلمیٰ نے ان کے بعض اقوال بھی نقل کیے ہیں۔ (ص: ۶۷)

مشہور صوفی ابو عثمان انصاری نیشاپوری کی بیٹی عائشہ بھی عابدہ وزاہدہ خواتین شمار ہوتی ہیں۔

سلمیٰ نے لکھا ہے کہ وہ ابوعثمان کی اولادوں میں سب سے زیادہ عابد و زاہد تھیں۔ سلمیٰ نے ان کی صاحبزادی ام احمد سے ملاقات کی اور ان کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے اپنی والدہ کے متعبد و اقوال سنائے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ میری والدہ نے مجھے نصیحت کی کہ بیٹی جوئی ہونے والا ہے اس پر خوش ہونے کی ضرورت نہیں اور جو چیز جانے والی ہے اس پر غم کرنے کی ضرورت نہیں۔ خوش رہنے کے لیے اللہ کافی ہے اور اصل غم کی بات یہ ہے کہ اس کی معافی کے فیضان سے محروم ہو جاؤ۔ (ص: ۵۸)

مشہور صوفی بشر الحافی کی تین بیٹیاں بھی اپنے وقت کی عظیم صوفی خاتون تھیں۔ سلمیٰ نے زبدۃ اور مقصدہ دونوں بیٹیوں کا ذکر کیا ہے۔ (ص: ۸۸) ابن الجوزی نے تیسری بیٹی کا بھی ذکر کیا ہے۔ (ص: ۵۲۶/۵۲۷) امام یافعی نے حدیث سے متعلق امام احمد بن حنبل کے تعریفی کلمات بھی لکھے ہیں۔ (مرآۃ الجنان ص: ۹۲/۹۳)

فاطمہ دمشقیہ بھی ایک عظیم صوفی خاتون ہیں۔ سلمیٰ کے بقول وہ صوفیہ پر تنقید کرتی رہتی تھیں۔ جب ابوالحسن الماکنی دمشق آئے تو انہوں نے جامع دمشق میں تقریر کی اور اچھی تقریر کی۔ اس کے بعد فاطمہ ان کی مجلس میں آئیں اور ان سے کہا اے ابو الحسن! آپ نے تقریر کی، بلاشبہ اچھی تقریر کی اور آپ اچھی تقریر کرتے ہیں، لیکن یہ بتائیے کہ کیا آپ اچھی طرح خاموش بھی رہ سکتے ہیں؟ ابو الحسن لا جواب ہو گئے اور کچھ کچھ بھی نہیں بولے۔

اوپر کے صفحات میں صوفی خواتین سے متعلق چند باتیں عرض کی گئیں۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اسلامی میراث میں صوفی خواتین، ان کی اہمیت و معنویت اور نمونے کے طور پر چند خواتین کا ذکر کیا جائے۔ اس کا مقصد صوفی خواتین کے افکار و تجربات کا اظہار نہیں ہے بلکہ صرف میراث اسلامی میں ان کا تذکرہ اور تذکرہ کا انداز بیان کرنا مقصود ہے۔ اس لیے نمونہ کے طور پر چند خواتین کا تئمی سا تذکرہ بھی اس مضمون میں درج کر دیا گیا۔ یہ موضوع غائی وسعت اور اہمیت کے اعتبار سے مستقل تحقیقی کام کا متقاضی ہے۔

مصادر و مراجع

- ۱۔ ابو عبد الرحمن السلمی: ذکر الشوۃ المعبدات، الصوفیات، تحقیق: الدكتور محمود محمد الطنجاوی، مکتبۃ النجاشی، قاہرہ، طبع اول: ۱۹۹۳ء
- ۲۔ ابو الفرج عبد الرحمن الجوزی: صفۃ الصوفیہ، دار ابن خلدون، اسکندریہ
- ۳۔ ابو عبد الرحمن جامی: نجات الانس، اصنفیان

حافظ ابن قیم جوزی اور ان کا ذوق تصوف

حرف آغاز

تصوف ایک حقیقت ہے جو کسی خاص جامد الفاظ کا پابند نہیں۔ لہذا وہ کوئی بھی ہو، الفاظ جو بھی ہوں، تعبیر جیسی بھی ہو، اگر اس خاص حقیقت و ماہیت اور مفہوم و معنی کی تبلیغ و ترسیل ہو رہی ہو جو قرآن وحدیث میں ہے اور جسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعبیر میں ”احسان“ کہا گیا ہے، تو اسے قبول کیا جائے گا اور کسی وجہ شرعی کے بغیر اسے رد نہیں کیا جائے گا۔ بعض متقدمین علمائے اگر تصوف پر تنقید کی تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ حقیقت تصوف ”احسان“ کے منکر تھے بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کی تحقیق کے مطابق تصوف کے نام پر رائج بعض باتیں اعتدال و توازن، آسانی اور نرمی اور فلسفیانہ مویشکاریوں سے براءت، جو اسلام کی بنیادی خصوصیت ہے، اور جاوہ شریعت سے منحرف نظر آئیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے مزاج و منہاج کے مطابق تنقید کی اور اپنی سمجھ کے لحاظ سے حق کو واضح کرنے کی کوشش کی۔ ظاہر ہے کہ کسی بھی محقق سے اس کا یہ علمی حق چھینا نہیں جاسکتا۔ لیکن اس مقام پر یہ بات بھی ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جس طرح کسی بھی اسلامی محقق و مآخذ سے اصول اسلام کی روشنی میں کسی بھی نظریے کی تحقیق اور اس پر تنقید کا حق سلب کر لینا ایک علمی جرم ہے اسی طرح اس کی تحقیق کو حرف آخر سمجھ لینا اور اس کی تنقید کو وحی کا دھجہ دینا شرک فی البدوۃ کے مترادف ہے اور جس طرح اس محقق کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ کسی بھی نظریے یا عمل کو قرآن وسنت کے معیار پر پرکھے، اسی طرح آنے والے محققین کو بھی اس بات کا پورا حق حاصل ہوگا کہ وہ ان محققین و مآخذین کی تحقیقات و تنقیدات کو اسی شرعی کسوٹی پر پرکھ کر اپنا فیصلہ صادر کرے۔

متقدمین علمائے جن لوگوں نے تصوف کو قرآن وسنت کے معیار پر پرکھنے کی کوشش کی، ان میں دو شخصیتیں علامہ ابن جوزی اور شیخ ابن تیمیہ بہت مشہور ہوئیں۔ اس حوالے سے ایک تیسرا

امام حافظ ابن قیم الجوزیہ کا بھی خاص اہم ہے، جن کا ذوق تصوف اس وقت زیر بحث ہے۔ لیکن ان حضرات کی ان تنقیدوں سے کیا یہ نتیجہ نکال لیا جائے کہ یہ لوگ تصوف کو بالکل مسترد کرنے والے اور کسی صورت میں بھی اسے قبول کرنے والے نہیں تھے، تصوف سے انہیں کوئی حصہ نہیں ملا تھا اور ذوق تصوف سے یہ لوگ بالکل محروم تھے؟ یا پھر ان کی بعض تحریروں کی روشنی میں یہ فیصلہ صادر کر دیا جائے کہ یہ تینوں حضرات یکساں طور پر ذوق تصوف رکھتے تھے اور خود یہ حضرات بھی صوفی تھے؟ آخر حقیقت کیا ہے؟ اس سے قبل لکھے گئے مقالات میں اول الذکر دو شخصیتوں سے متعلق اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے، اب آنے والے صفحات میں علامہ ابن قیم جوزی کے حوالے سے بھی اسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ مقالے کا منہج یہ ہوگا کہ پہلے حافظ ابن قیم جوزی کی شخصیت، ان کے احوال زندگی اور علمی مقام کو مختصر اُبیان کیا جائے گا اور پھر تصوف سے متعلق ان کی مختلف تحریروں کو ذکر کر کے اس کا تجزیہ کیا جائے گا اور اخیر میں حاصل شدہ نتائج کو بیان کیا جائے گا۔

حافظ ابن قیم ولادت، تعلیم و تربیت

امام الجوزیہ شمس الدین ابو عبد اللہ محمد بن ابو بکر بن ایوب بن سعد بن جریر زرقی معروف بہ ابن قیم الجوزیہ ۶۹۱ھ میں دمشق میں پیدا ہوئے، وہیں اپنی زندگی کے روز و شب گزارے اور وہیں ۷۵۱ھ میں آسودۂ خاک ہوئے۔ شہاب المہسی، قاضی نقی الدین سلیمان، فاطمہ بن جوہر عینی مطہم، ابو بکر بن عبد الدائم اور اساتذہ وقت کی ایک جماعت سے حدیث کی سماعت کی۔ فقہ حنبلی میں مہارت پیدا کی اور فتویٰ نویسی شروع کی۔ (۱)

علمی مقام

یوں تو ان کو تمام اسلامی علوم میں درجہ حاصل تھا لیکن بطور خاص تفسیر میں ان کی کوئی نظیر نہیں تھی۔ اصول دین میں بھی وہ مقام کمال پر فائز تھے۔ فقہ، اصول فقہ، علوم عربیہ، علم نحو اور علم کلام میں بھی کمال حاصل تھا۔ حدیث، فقہ حدیث اور استنباط و دقائق میں ان کا کوئی ہم پلہ نہیں تھا۔ امام ذہبی نے اپنی مختصر میں لکھا ہے کہ ابن قیم کو قبول حدیث اور رجال حدیث کی طرف بڑی توجہ تھی۔ وہ فقہ کے مطالعے میں مشغول رہے اور مسائل فقہی کو بہت شرح و بسط کے ساتھ لکھتے تھے۔ قاضی برہان الدین زرقی نے فرمایا: میں اس وقت اس نیکو آسمان کے نیچان سے نیا دروہ سبج العلم نہیں پاتا۔ (۲)

شخصیت و سیرت

علامہ ابن کثیر البدریہ والنہایتہ میں لکھتے ہیں کہ حافظ ابن قیم بڑی محبت رکھنے والے آدمی تھے۔ نہ کسی سے حسد و کید رکھتے، نہ کسی کو تکلیف پہنچاتے اور نہ کسی کی عیب جوئی کرتے۔ میری ان

کے ساتھ سب سے زیادہ محبت تھی اور میں ان کو بڑا محبوب تھا۔ (۳) اور حافظ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں کہ وہ معصوم تو نہیں تھے لیکن میں نے قرآن و سنت کے معانی و مقایم اور ایمانی حقائق جیسی خصوصیات میں ان کی طرح آؤی نہیں دیکھا۔ اپنے استاذ شیخ ابن تیمیہ کی طرح وہ بھی آزمائش کے مرحلے سے گزرے۔ چنانچہ جب شیخ ابن تیمیہ قلعے میں قید کیے گئے تو وہ بھی محبوس ہوئے اور شیخ کے انتقال کے بعد ہی ان کی رہائی ہوئی۔ (۴)

علمی خدمات

حافظ ابن قیم جوزیہ نے تدریس اور تصنیف دونوں طریقے سے دین متین کی خدمات انجام دیں، چنانچہ شیخ ابن تیمیہ کی حیات میں اور ان کی وفات کے بعد لوگوں کی ایک بڑی جماعت نے ان سے استفادہ کیا۔ فضلاء زمانہ ان کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے اور ان کی شاگردی کو اپنے لیے باعث شرف سمجھتے تھے۔ انہوں نے صدریت میں تدریسی خدمت انجام دی اور جوزیہ میں طویل مدت تک امامت کے فرائض نبھائے۔ ان سے تحصیل علم کرنے والوں میں ابن عبد الہادی اور ابن رجب جیسے کامیاب شامل ہیں۔

ان کو علم سے بڑی محبت تھی۔ کتابوں کی ذخیرہ اندوزی، مطالعہ اور تصنیف ہالیف سے بڑا شغف تھا۔ چنانچہ انہوں نے وہ کتابیں ذخیرہ کر رکھی تھیں جو دوسروں کو میسر نہیں ہو سکیں۔ انہوں نے خود اپنی تصنیفات کا ایک بڑا اثاثہ یا دگار چھوڑا ہے۔ ان کی تصانیف میں سے بعض نمایاں کتابیں درج ذیل ہیں:

- (۱) تہذیب سنن ابی داؤد (۲) اعلام الموقعین عن رب العالمین
- (۳) زاد المعاد فی ہدی خیر العباد (۴) جلاء الافہام فی الصلوٰۃ والسلام
- علی محمد خیر الانام (۵) بدائع الفوائد (۶) اجتماع الجیوش الاسلامیہ
- علی غزو الفرقة الجہمیہ (۷) نقد المنقول والمحقق الممیز بین المردود
- والمقبول (۸) شرح اسماء الكتاب العزیز (۹) الکلم الطیب والعمل الصالح
- (۱۰) مقال القرآن۔ (۵)

شیخ ابن قیم کے قلمی آثار کے مطالعے کے بعد پتا چلتا ہے کہ حسن ترتیب، علمی نظم اور عمدہ پیش کش کے لحاظ سے ان کی تصنیفات شیخ ابن تیمیہ سے بھی ممتاز ہیں۔ ان کی دوسری بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی تمام تصانیفات میں تصوف کی چاشنی، فکر کی روحانیت، روح کی پاکیزگی اور عبادت کی دل کشی اور دلائل کی پائی جاتی ہے اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کے بقول یہ غالباً ان کے مزاج کا نتیجہ ہے جس میں جلال سے زیادہ جمال غالب ہے۔ (۶)

حافظ ابن قیم حنبلی درس گاہ کے مقرر تھے

شیخ ابن تیمیہ سے استفادہ کرنے والے فاضلین کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان کی شخصیت اور فکر کا جو گہرا رنگ حافظ ابن قیم کی شخصیت میں پایا جاتا ہے وہ کسی میں نہیں پایا جاتا۔ وہ ان کے علوم و افکار کے مرتب و ناشر ہیں۔ انہوں نے شیخ ابن تیمیہ کے تلمذ و اور تفرقات مثلاً زیارت قبر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیت سے سفر، مسالہ طلاق وغیرہ میں ان کی حمایت میں فتویٰ دیا اور اس سلسلے میں کتابیں بھی لکھیں۔ (۷) اپنے شیخ کی عہد امتیاز کی تو پھر آخری لمحے تک ان کے رفیق و موافق رہے اور ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے مسلک و مشرب پر قائم اور ان کی محبت میں سرشار رہے۔ وہ اپنے استاذ کی شخصیت و سیرت اور ان کے علوم و افکار کے مکمل امتیاز دار ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی کتابوں میں اپنے شیخ کے اقوال کثرت کے ساتھ نقل کرتے ہیں اور انہیں مقام استدلال میں پیش کرتے ہیں۔ (۸) استاذ اور شاگرد کی شخصیت میں صرف اتنا فرق ہے کہ استاذ کی شخصیت پر غضب و جلال غالب تھا جب کہ شاگرد کے مزاج پر جمال اور رنگ تصوف نمایاں ہے۔

ذوق تصوف کی کسوٹی

ابن قیم جوزی تصوف کو قبول کرتے ہیں یا نہیں، ان کو تصوف سے کوئی تعلق اور تصوف سے کوئی ذوق تھا یا نہیں؟ یہ ایک سوال ہے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے قبل یہ ضروری ہے کہ پہلے اس تصوف کے خط و خال کو واضح کر لیا جائے جس کے متعلق ہم یہاں گفتگو کر رہے ہیں۔ چنانچہ اگر صوفیہ کرام کے پورے مشن کا جائزہ لیا جائے تو تصوف کی جو حقیقت سامنے آتی ہے اس کو دو نقطوں میں سمجھا جاسکتا ہے: پہلا تزکیہ نفس اور دوسرا مقام احسان تک رسائی۔ ان کے مشن کا پہلا نقطہ قرآن کریم کی متعدد آیات اور احادیث طیبہ کی بہت سی تصریحات سے مستفاد ہے۔ تزکیہ کا مفہوم یہ ہے کہ نفس کو جملہ اخلاقِ رذیلہ سے پاک کر کے جملہ اخلاقِ حمیدہ سے آراستہ کیا جائے تاکہ انسان بارگاہ الہی میں حاضری کے قابل ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قد اطلع من ذنوبنا۔ (۹) (یعنی وہ شخص کا میاب ہو گیا جس نے نفس کا تزکیہ کیا۔)

صوفیہ کے مشن کا دوسرا نقطہ حدیث جبریل سے لیا گیا ہے۔ تصوف کو حدیث جبریل میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ احسان کے دو درجے ہیں: (۱) مشاہدہ: یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کی جائے کہ گویا ہم اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہے ہوں، یہ احسان کا اعلیٰ درجہ ہے۔ احسان کا دوسرا درجہ مراقبہ ہے، اور وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے وقت اگر مشاہدہ اور دیدار کی کیفیت نہ پیدا ہو سکے تو کم از کم اس یقین کے ساتھ ضرور اللہ تعالیٰ کی عبادت کی جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

تصوف کی اس تعریف کے بعد یہ طے ہو جاتا ہے کہ جو بھی جماعت اس مشن پر قائم ہوگی

وہ جماعت صوفیہ کی ہوگی اور جو بھی شخص اس مشن میں مصروف اور اس کے فروغ کے لیے اپنی شبانہ روز خدمات پیش کرنے والا ہوگا وہ یا تو صوفی ہوگا یا متصوف اور ذوق تصوف رکھنے والا اور جہاں تک بعض فقہی مسائل میں اختلاف اور شذوذ و تفرّد کی بات ہے تو علمائے اسلام کی تاریخ میں کوئی ایسا عالم نہیں ملے گا جس کے یہاں بعض مسائل میں شذوذ اور تفرّد نہ پایا جاتا ہو۔ بہر حال یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کس کرہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کہ کوئی شخص ذوق تصوف رکھتا ہے یا نہیں۔ یہاں ہمیں اس بات سے کوئی سروکار نہیں کہ وہ لفظ تصوف کو قبول کرتا ہے یا نہیں اور بعض فروعی و جزوی مسائل مثلاً سماع یا کسی عمل کے بدعت و سنت ہونے میں مکمل طور سے جماعت صوفیہ کے ساتھ ہے یا نہیں، ہمیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ وہ حقیقت تصوف کو قبول کرتا ہے یا نہیں اور اس کے اثرات اس کی زندگی میں پائے جاتے ہیں یا نہیں۔

تصوف سے متعلق ابن قیم کی رائے

حافظ ابن قیم تلمیذی درس گاہ کے بے نظیر فاضل ہیں۔ شیخ ابن تیمیہ سے علمی طور پر استفادہ کرنے والوں میں کسی پر ان کی فکر کا وہ گہرا اثر اور وہ پختہ چھاپ نہیں نظر آتی جو ابن قیم پر نظر آتی ہے۔ چنانچہ تصوف کے معاملے میں بھی وہ وہی نظر یہ رکھتے ہیں جو ان کے استاد شیخ ابن تیمیہ رکھتے تھے، یا الگ بات ہے کہ تنقید تصوف کو انہوں نے اپنی تصانیف میں باضابطہ موضوع نہیں بنایا ہے، بلکہ اس کے برعکس انہوں نے موضوعات تصوف کو کثرت سے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگر کہیں تنقید بھی کی ہے تو ان کے یہاں اس باب میں وہ شدت اور وہ تلکھاپن نہیں پایا جاتا ہے جو ان کے استاد شیخ ابن تیمیہ کی خصوصیت ہے۔

تصوف سے متعلق ان کی آرا کو مندرجہ ذیل نکات کی شکل میں پیش کیا جاسکتا ہے:

(۱) وہ فلسفیانہ تصوف کے منکر ہیں اور وحدۃ الوجود کی دقیق فلسفیانہ تعبیرات کو اپنی تحقیق کے لحاظ سے غیر شرعی ہونے کی وجہ سے بالکل رد کرتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک وحدۃ الوجود کے قائمین اتحاد و طول کا قول کرنے والے یا پھر اس تک لے جانے والے ہیں، لیکن اگر وحدۃ الوجودی اقوال مشائخ صوفیہ کی طرف منسوب ملتے ہیں تو وہ اس میں تاویل کر کے یہ بتاتے ہیں کہ دراصل وہ تو حید و حید وجودی نہیں ہے، بلکہ وہ تو حید شہودی ہے اور ان صوفیہ کا یہ مقصود نہیں ہے کہ خارجی میں ماسوائے رب کا کوئی وجود نہیں ہے بلکہ ان کی مراد یہ ہے کہ ایک خاص حالت طاری ہونے کے وقت، جسے صوفیہ فنا سے تعبیر کرتے ہیں، ماسوا کا وجود سالک کے شہود و احساس سے فنا ہو جاتا ہے۔

(۲) وہ جاہل صوفیہ پر تنقید کرنے والے ہیں اور ان کا یہ کہنا ہے کہ مشائخ صوفیہ اصول

کتاب و سنت سے جھڑے رہے اور وہ شاہ راہ ہدایت پر گام زن رہے اور جب جس قدر اس جماعت کے مترجمین و متصوفین نے اصول سے انحراف کیا اسی وقت سے اور اسی قدر وہ راہ اعتدال سے منحرف ہو گئے اور پھر ان کے وہ عقائد و نظریات سننے میں آئے جو قلب و نگاہ پر گراں ہیں۔ (۱۰)

(۳) وہ صوفیہ کو یکسر گمراہ نہیں قرار دیتے ہیں بلکہ وہ اگر وہ صوفیہ کو تین جماعتوں میں تقسیم کرتے ہیں: (۱) صوفیہ الحقائق (۲) صوفیہ الرسوم (۳) صوفیہ الارزاق۔ صوفیہ الحقائق کے بارے میں وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ وہ صوفیہ ہیں جن کے آگے علماء و فقہاء کی گردنیں جھکتی ہیں۔

شرح منازل السائرین میں لکھتے ہیں: ”الصوفیة ثلاثة اقسام: صوفیة الارزاق، و صوفیة الرسوم، و صوفیة الحقائق و بدع الغریقین المتقلمین یعرفها کل من له إلمام بالسنة والفقه..... وإنما الصوفیة صوفیة الحقائق الذین خضعت لهم رؤوس الفقهاء و المتکلمین، فهم فی الحقیقة علماء حکماء.“ (۱۱)

ترجمہ: صوفیہ کی تین قسمیں ہیں: (۱) صوفیہ الارزاق، (۲) صوفیہ الرسوم اور (۳) صوفیہ الحقائق۔ پہلے دونوں گروہوں کی بدعتوں سے ہر وہ شخص واقف ہے جس کو سنت و فقہ سے تھوڑا سا بھی لگاؤ ہے..... درحقیقت صوفیہ تو صوفیہ الحقائق ہیں جن کے آگے فقہاء و متکلمین کی گردنیں جھکتی ہیں، یہی لوگ درحقیقت علماء و حکماء ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

أعز الخلق خمسة أنفس: عالم زاهد و فقیہ صوفی، و غنی متواضع و فقیر شاکر و شریف سنی. (۱۲)

ترجمہ: مخلوق میں عزیز ترین لوگ پانچ ہیں: عالم جو زاہد ہو، فقیہ جو صوفی ہو، غنی جس کے اندر تواضع ہو، فقیر جو شکر گزار ہو اور شریف جو روشن کردار کا حامل ہو۔

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

أنهم (ای الصوفیة) كانوا أجل من هذا وهمهم اعلیٰ و اشرف، انما هم حاکمون علی اکساب الحکمة و المعرفة و طهارة القلوب و زکاة النفوس و تصحیح المعاملة۔ (۱۳)

ترجمہ: وہ لوگ (صوفیہ) اس سے بہت برتر ہیں اور ان کا مقصود اعلیٰ اور اشرف ہے۔ یہ لوگ حکمت و معرفت کے حصول، قلب کی طہارت اور نفس کی ستھرائی اور معاملے کی درستگی پر حکم لگانے والے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

التصوف زاوية من زوايا السلوك الحقيقي وتزكية النفس وتهذيبها
لتمتعها لسيورها إلى صحبة الرفيق الاعلى ومعينة من تحبه. (۱۳)
ترجمہ: تصوف سلوک حقیقی، تزکیہ و تہذیب نفس کے گوشوں میں سے ایک گوشہ ہے، تاکہ
نفس رفیق الاعلیٰ کی صحبت اور محبوب کی معیت کے سفر کے لائق ہو جائے۔
ایک دوسرے مقام پر تحریر فرماتے ہیں:

ومنها ان هذا العلم (التصوف) هو من اشرف علوم العباد وليس يعد
علم التوحيد اشرف منه وهو لا يناسب إلا النفوس الشريفة- (۱۵)
ترجمہ: اور انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ یہ علم (تصوف) بندوں کے علوم میں سب سے
زیادہ شرف والا ہے اور علم تو حید کے بعد اس علم سے زیادہ شرف والا کوئی علم نہیں اور یہ علم شریف
نفوس کے ہی لائق و مناسب ہے۔
ایک اور مقام پر لکھتے ہیں:

الدين كله خلق فمن زاد عليك في الخلق زاد عليك في الدين
وكذلك التصوف، قال ابو بكر الكتاني: التصوف خلق فمن زاد عليك في
الخلق زاد عليك في التصوف. وقال شيخ الاسلام: واجتمعت كلمة الناطقين
في هذا العلم أن التصوف هو الخلق، وجمع الكلام فيه يدور على قطب واحد
وهو بذل المعروف وكف الاذى. (۱۶)

ترجمہ: دین سراسر اخلاق ہے، تو جو تم میں سے اخلاق میں زیادہ ہوگا وہ دین میں تم سے
بڑھ کر ہوگا، اور یہی حال تصوف کا ہے۔ ابو بکر کتانی نے فرمایا: تصوف سراسر اخلاق ہے، تو جو تم سے
اخلاق میں بڑھ کر ہوگا، وہ تم سے تصوف میں بڑھ کر ہوگا۔ شیخ الاسلام (عبداللہ انصاری) نے
فرمایا: اس علم میں کلام کرنے والوں کا اتفاق ہے کہ تصوف سراسر اخلاق ہے اور اس میں کلام کا مدار
ایک ہے اور وہ یہ ہے: بھلائی پھیلانا اور تکلیف دور کرنا۔

ایک مقام پر شطحیات کا ذکر کر کے صوفیہ کے تعلق سے عادلانہ فیصلہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:
وهذه الشطحيات أوجبت فتنة على طائفتين من الناس: أحدهما
حجبت بها عن محاسن هذه الطائفة ولطف نفوسهم وصدق معاملتهم
فأهدروها لما حل من هذه الشطحيات وانكروها غاية الإنكار وأساءوا الظن
بهم مطلقا وهذا عدوان وإسراف..... وهذه الشطحيات ونحوها هي التي حذر
منها سادات القوم واذموا عاقبتها وتبرؤا منها. (۱۷)

ترجمہ: یہ شطحیات دو جماعتوں کے لیے فتنے کا سبب بنے، ایک جماعت ان کی وجہ سے
اس جماعت (صوفیہ) کے محاسن، ان کے نفوس کی لطافت اور ان کے معاملے کی سچائی سے مجبوب
ہو گئی۔ ان شطحیات کی وجہ سے انہوں نے ان کو چھوڑ دیا، ان کا شکر و مدد سے انکار کیا اور ان سے پوری
طرح بدگمان ہو گئے۔ یہ حد سے تجاوزا و اسراف ہے۔ ان شطحیات سے سادات صوفیہ نے ہوشیار
رہنے کو کہا ہے اور اس کے انجام کی مذمت کی ہے اور اس سے بدعت کا اظہار کیا ہے۔
طریقہ صوفیہ کی مدح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فاعلم أن في لسان القوم (أي الصوفية) من الاستعارات وإطلاق العام
وإرادة الخاص، وإطلاق اللفظ وإرادة الإشارة دون حقيقة معناه، ما ليس في
لسان أحد من الطوائف غيرهم. ولهذا يقولون نحن أصحاب إشارة لا أصحاب
عبارة وإشارة لنا والعبارة لغيرنا. وقد يطلقون العبارة التي يطلقها الملحد
ويريدون بها معنى لافساد فيه. وصار هذا سببا لفتنة طائفتين: طائفة تعلقوا
عليهم بظاهر عباراتهم فبدعواهم وضللواهم وطائفة نظروا إلى مقاصدهم
ومغزاهم فصبوا تلك العبارات وصححوها تلك الإشارات فطالب الحق بقبله
ممن كان ويرد ما خالفه على ما كان. (۱۸)

ترجمہ: ذہن نشین رہے کہ صوفیہ کے یہاں استعارات ہوتے ہیں، وہ عام بول کر خاص
مراد لیتے ہیں اور لفظ بول کر اشارہ مراد لیتے ہیں، اس کے حقیقی معنی مراد نہیں لیتے۔ یہ باتیں دوسری
جماعتوں میں نہیں پائی جاتیں، اسی لیے وہ کہتے ہیں: ہم اہل اشارہ ہیں، اہل عبارت نہیں، اور یہ
کہ ہمارے لیے اشارہ ہے اور دوسروں کے لیے عبارت۔ وہ لوگ کبھی حدیث کی ایسی عبارتیں بول
کر ایسے معنی مراد لیتے ہیں جس میں کوئی فساد نہیں ہوتا اور یہ چیز دو جماعتوں کے لیے فتنے کا سبب
بنی۔ ایک وہ جماعت جس نے ان کی ظاہری عبارت کو لے کر ان کو بدعتی اور گمراہ قرار دے دیا،
دوسری وہ جماعت جنہوں نے ان کے مقصود و مراد کو دیکھتے ہوئے ان عبارت سے وہ اشارہ لینا صحیح
قرار دے دیا۔ حق کا طلب گار حق کو قبول کرتا ہے جہاں سے بھی آئے اور جو حق کے مخالف ہو اس کو
رد کر دیتا ہے خواہ وہ جس دنیا و پر بھی ہو۔

طریقہ صوفیہ کے بیان کے ضمن میں وحدۃ الوجود کی تیسیرات، اس کے علوی و اتحادی پہلو
، عارفین صوفیہ کے یہاں پائے جانے والے ان الفاظ کے صحیح معانی اور پھر ان کے فہم میں غلطی
کے قوع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”فایاک ثم ایاک والا لفاظ المجملۃ المشبهة التي وقع فی اصطلاح

القوم عليها، فانها اصل البلاء، وهي مرد الصديق والزنديق، فاذا سمع الضعيف المعرفة والعلم بالله لفظ اتصال، وانفصال، ومسامرة، ومكالمة وأنه لا وجود في الحقيقة إلا وجود الله وأن وجود الكائنات خيال ووهم وهو بمنزلة وجود الظل القائم بغيره، فسمع منه ما يمدل الأذان من حلول واتحاد وشطحات، والعارفون من القوم أطلقوا هذه الالفاظ ونحوها، وأرادوا بها معاني صحيحة في نفسها فغلط الغالطون في فهم ما أرادوا ونسبوه إلى الحادهم وكفروهم. (۱۹)

ترجمہ: صوفیہ کی اصطلاح میں آنے والے مجمل اور مشتبہ الفاظ سے مکمل طور سے ہوشیار رہو، اس لیے کہ وہ بلاؤں کی جڑ ہے۔ انہیں کی پیروی سے آدمی صدیق سے زندیق ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اللہ کی کم معرفت اور اس کا کم علم رکھنے والا جب اتصال، انفصال، مسامرت (یا تہیت) اور مکالمہ کے لفظ کو سنتا ہے اور یہ سنتا ہے کہ حقیقت میں صرف اللہ کا وجود ہے اور کائنات کا وجود وہم و خیال ہے، اور وہ ظنی وجود کے درجے میں ہے جو غیر سے قائم ہوتا ہے تو اس سے طول، اتحا اور شطحات جیسی کانوں پر گراں بار باتیں سننے میں آتی ہیں، جب کہ صوفیہ عارفین نے ان الفاظ کو بول کر بڑا ہی صحیح معانی مراد لیے ہیں، ان کی مراد کو سمجھنے میں غلطی کرنے والے غلطی کر گئے اور ان کو کفر والحاد سے منسوب کر دیا۔

صوفیہ سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے استفادے کا ذکر کرتے ہوئے ایک مقام پر لکھتے ہیں:

قال الشافعي رضي الله عنه: صحبت الصوفية فما انتفعت منهم إلا بكلمتين، سمعتهما يقولون: الوقت سيف فان قطعته والا قطعك، ونفسك إن لم تشغلها بالحق وإلا شغلک بالباطل، قلت: يا لها من كلمتين، ما أنفعهما وأجمعهما وأدلهمما على علو همة قائلها ويقظته ويكفي في هذا ثناء الشافعي على طائفة إبي السادة الصوفية. (۲۰)

ترجمہ: امام شافعی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: میں صوفیہ کی صحبت میں رہا تو ان سے صرف دو باتیں سیکھیں، میں نے ان کو کہتے ہوئے سنا: وقت تلوار کی طرح ہے، اگر تم اس کو کام میں نہیں لاؤ گے تو وہ تمہارا کام کرتے ہوئے گزر جائے گا اور اپنے نفس کو تم حق کے ساتھ مشغول نہیں رکھو گے تو وہ تم کو باطل میں مشغول کر دے گا۔ میں (ابن قیم) کہتا ہوں: کتنے عظیم ہیں یہ دونوں کلمے یہ دونوں کلمے کتنے تدرب اور نافع اور جامع اور ان کے قائل کی بلند ہمتی اور ان کی بیداری پر دلالت کرنے والے ہیں۔ اس ذیل میں امام شافعی کی طرف سے صوفیہ کی تعریف بھی کافی ہے۔

چنانچہ وہ تعویذ شرعی کو مجموعی طور پر قبول کرنے والے ہیں البتہ بعض فردی مسائل مثلاً

سماح وغیرہ سے اختلاف رکھتے ہیں (۲۱) اور صوفیہ کی اصطلاحات مثلاً عارف، معرفت، فنا، بقا، سکرا اور علم لدنی کو تسلیم کرتے ہیں۔

صوفیہ کے نزدیک عارف باللہ کسے کہتے ہیں، اس پر گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

فالعارف عندهم إبي الصوفية، من عرف الله سبحانه بأسمائه وصفاته وأفعاله، ثم صدق الله في معاملته، ثم أخلص له في مقصوده ونياته، ثم انسلخ من أخلاقه الرديئة وآفاته، ثم تطهر من أوساخه ومخالفاته، ثم صبر على أحكام الله في نعمه وويلاته، ثم دعا على بصيرة بدينه وآياته، ثم جرد الدعوة إليه وحده، بما جاء به رسوله، ولم يشبهها بأراء الرجال وأذواقهم ومواجيدهم ومقاييسهم ومعقولاتهم، ولم يزن بها ما جاء به الرسول، عليه من الله أفضل صلواته، فهنا الذي يستحق اسم العارف على الحقيقة، إذا سمى به على غير الدعوى والاستعارة۔ (۲۲)

ترجمہ: صوفیہ کے نزدیک عارف وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کے صفات اور افعال کی معرفت حاصل ہو، اس کے معاملے میں سچائی ہو، اس کے قصد و مراد اور نیت میں اخلاص ہو، برے اخلاق اور اس کی آفتوں سے جدا ہو چکا ہو، گندگیوں اور مخالف باتوں سے پاک ہو چکا ہو، نعمت و آسائش اور مصیبت و آزمائش کی حالتوں میں اللہ کے احکام پر جما رہا ہو، مکمل بصیرت کے ساتھ اللہ کے دین اور اس کی آیتوں کی طرف بلائے والا ہو، اپنی اس دعوت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باتوں کے علاوہ کسی اور چیز کی آمیزش نہ کی ہو اور اس کو لوگوں کی آراء ان کے ذوق و وجدان اور قیاس و عقل سے مشابہ نہ قرار دیا ہو، ان سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی باتوں کا موازنہ نہ کیا ہو۔ درحقیقت ایسا شخص عارف کہلانے کے لائق ہے جب کہ بغیر کسی دعوے اور استعارے کے اس سے کسی کو موسوم کیا جائے۔

ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:

قال بعض السلف: نوم العارف يقظة، وأنفاسه تسبيح، ونوم العارف أفضل من صلاة الغافل، وإنما كان نوم العارف يقظة لأن قلبه حي، وعينه تنامان وروحه ساجدة تحت العرش بين يدي ربها وفاطرها، جسده في القبرش وقلبه حول العرش. (۲۳)

ترجمہ: اسلاف میں سے کسی کا قول ہے: عارف کا سونا بیداری ہے، اس کی مائیں تسبیح ہیں اور عارف کا سونا غافل کی نماز سے افضل ہے، عارف کا سونا بیداری اس لیے ہے کہ اس کا دل

بیدار ہے جب کہ اس کی آنکھیں سوری ہیں اور اس کی روح عرش کے نیچے اپنے رب اور اپنے خالق کے حضور بچہ کے میں ہے۔ اس کا جسم تو فرش پر ہے لیکن اس کا دل عرش الہی کے گرد ہے۔

عارفین کی صحبت سے استفادے پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وقيل: مجالسة العارف تدعوك من بست إلى بست: من الشك إلى اليقين، ومن الريا إلى الاخلاص، ومن الغفلة إلى الذكر، ومن الرغبة في الدنيا إلى الرغبة في الآخرة، ومن الكبر إلى التواضع ومن سوء الطوية إلى النصيحة. (۲۳)

ترجمہ: ایک قول ہے کہ عارف کی ہم نشینی تم کو چھ باتوں سے الگ کر کے چھ باتوں تک پہنچاتی ہے: شک سے یقین تک، ریا سے اخلاص تک، غفلت سے ذکر تک، دنیا کی رغبت سے آخرت کی رغبت تک، کبر سے تواضع تک، بدخواہی سے خیر خواہی تک۔

فتاے صوفیہ پر گفتگو کے ضمن میں وحدۃ الوجودی اقوال کی وحدۃ الشہودی توضح کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

والفناء الذي يشير إليه القوم ويعملون عليه: أن تذهب المحدثات في شهود العبد وتغيب في أفق العدم كما كانت قبل أن توجد، ويبقى الحق تعالى كما لم يزل ثم تزيل صورة المشاهد واسمه أيضا، فلا يبقى له صورة ولا اسم، ثم يغيب شهوده أيضا فلا يبقى له شهود ويصير الحق هو الذي يشاهد نفسه بنفسه كما كان الأمر قبل إيجاد المكنونات، وحقيقته: أن يفنى من لم يكن، ويبقى من لم يزل، وليس مرادهم فناء وجود ماسوى الله في الخارج بل فناءه عن شهودهم وحسبهم. (۲۴)

ترجمہ: وہ فنا جس کی طرف صوفیاء اشارہ کرتے ہیں اور اس پر وہ عمل کرتے ہیں یہ ہے کہ بندے کے مشاہدے میں حادث چیزیں ایسے فنا ہو جائیں جیسے کہ جو جو بخش جانے سے پہلے تھیں۔ جس طرح حق تعالیٰ ازل سے ہے اسی طرح حق تعالیٰ رہ جائے پھر مشاہد کی صورت اور اس کا اسم بھی فنا ہو جائے، کوئی صورت و اسم باقی ہی نہ رہ جائے، اس کا شہود بھی غائب ہو جائے، کوئی شہود نہ رہ جائے، حق ہی خود اپنے آپ کا مشاہدہ کرنے والا ہو، بالکل ایسے ہی جیسے کہ بخون کائنات سے قبل معاملہ تھا۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ جو نہیں تھا وہ فنا ہو جائے اور جو ازل سے ہے وہ بھی باقی رہے صوفیہ کی یہ مراد نہیں ہے کہ ماسوا کا وجود فنا ہو جائے بلکہ ماسوا ان کے شہود اور احساس سے فنا ہو جائے۔

اسی مسئلے پر مزید گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ولكن في حالة السكر والاصطلام والفناء قد يغيب عن هذا التمييز، وفي هذه الحال قد يقول صاحبها: ما يحكي

عن أبي يزيد أنه قال: سبحانه، أو ما في الحجة إلا الله، ونحو ذلك من الكلمات التي لو صدرت عن قائلها وعقله معه لكان كافرا لكن مع سقوط التمييز والشعور قد يرتفع عنه قلم المفاخذة. (۲۵)

ترجمہ: لیکن سکروفا کی حالت میں کبھی یہ تمیز فنا ہو جاتی ہے اور اس حال میں بندہ وہ کہہ اٹھتا ہے جو حضرات بائزید بسطامی سے منقول ہے کہ انہوں نے فرمایا: میرے چہے میں اللہ ہی ہے۔ اس طرح کے دوسرے کلمات جو اگر یوش و حواس کی حالت میں قائل سے صادر ہوں تو وہ کافر ہو جائے لیکن تمیز نہ رہنے کی وجہ سے وہ شخص مرفوع القلم ہو جاتا ہے۔

علم لدنی پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: الدرجة الثالثة علم لدني، يشير القوم بالعلم اللدني إلى ما يحصل للعبد من غير واسطة، بل بالهام من الله، وتعريفه منه لعبده كما حصل للخضر عليه السلام بغير واسطة موسى، قال الله تعالى: آتيناه رحمة من عندنا وعلّمناه من لدنا علما. (۲۶)

ترجمہ: تیسرا درجہ علم لدنی ہے، صوفیہ کی اصطلاح میں علم لدنی سے اس علم کی طرف اشارہ ہوتا ہے جو بندے کو بلا واسطہ بلکہ الہام ربانی اور اس کی تعلیم کے ذریعہ حاصل ہو، جیسے کہ حضرات موسیٰ علیہ السلام کے واسطے کے بغیر حضرات خضر کو علم حاصل ہوا، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ہم نے ان کو اپنی رحمت اور اپنی طرف سے علم عطا فرمایا۔

ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:

والعلم اللدني ثمرة العبودية والمتابعة والصدق مع الله والاخلاص له، وبذل الجهد في تالقي العلم من مشكاة رسوله وكمال الانقياد له، فيفتح له من فهم الكتاب والسنة، بأمر يخصه به كما قال علي بن أبي طالب رضي الله عنه وقد سئل هل خصكم رسول الله بشئ دون الناس، فقال: لا والذي خلق الحبة وبرأ النسمه إلا فهما يؤتيه الله عبدا في كتابه فهذا هو العلم اللدني الحقيقي. (۲۷)

ترجمہ: علم لدنی: عبودیت، پیروی، صدق و اخلاص کے ساتھ مشکوٰۃ رسالت سے تحصیل علم کی راہ میں جدوجہد اور مکمل فرماں برداری کا ثمرہ ہے۔ اس کی وجہ سے بندے کو کتاب و سنت میں وہ خاص فہم حاصل ہوتی ہے جو اس کے ساتھ خاص ہوتی ہے، جیسا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے جب سوال ہوا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو خاص طور سے کوئی ایسا علم عطا فرمایا ہے جو دوسروں کو عطا نہ کیا ہو؟ آپ نے فرمایا: نہیں، قسم اس ذات کی جس نے والے کو شوق کیا اور مخلوق کو پیدا کیا، ہوائے اس فہم کے جو اللہ تعالیٰ اپنی کتاب کے تعلق سے کسی بندے کو عطا فرماتا ہے

اور یہی حقیقی علم لدنی ہے۔

پوری گفتگو کو مختصر کر کے یہ بات پورے عہد کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ وہ تصوف کے رد و قبول کے معاملے میں شیخ ابن تیمیہ کی روش پر ہیں البتہ جو بات ان کو اپنے شیخ سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ بعض مسائل سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان کے یہاں خشکی اور جمود نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ صوفیہ کے مختلف ایسے اقوال جو انہیں خلاف شرع نظر آتے ہیں ان کے صحیح معنی بیان کرتے ہیں اور ان کے فہم میں عوام کو غلطی کا شکار ہونے سے بچنے کی تلقین بھی کرتے ہیں بلکہ ان کی کتابوں کے مطالعے سے عموماً اور حقیقت تصوف سے تعلق رکھنے والی کتابوں کے مطالعے سے خصوصاً ایک خاص قسم کی مٹھاس اور طراوت کا احساس ہوتا ہے۔

علامہ ابن قیم پر حقیقت تصوف کا غلبہ نظر آتا ہے جب کہ تنقید تصوف کے جو عناصر ان کے یہاں ہیں وہ یا تو بہت کم ہیں اور جو کچھ ہیں ان میں سے بہت سے عناصر سے تصوف کی عمومی صورت حال کے مد نظر اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ بعض عناصر سے اختلاف کی گنجائش ہے۔ ان میں جن عناصر تنقید کا تعلق اصول سے ہے ان کا سراپا تو فلسفیانہ تصوف سے ملتا ہے یا پھر جاہل صوفیہ یا متصوفین کے مروجہ تصوف سے۔ اور جہاں تک حقیقی تصوف کے سلسلے میں ان کی فیصلہ کن رائے کی بات ہے تو اس سلسلے میں ان کی متوازن و معتدل اور صوفیہ کے ساتھ انصاف کرنے والی رائے وہی ہے جس کو ماسبق میں آخری اور تیسرے نکتے کے تحت بیان کیا گیا ہے۔ ان کے اسی نکتے کو اساس بنا کر اب ہم اس سوال کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کریں گے کہ خوان کی تحریروں اور ان کی عملی زندگی میں رنگ تصوف پایا جاتا ہے یا نہیں؟

حافظ ابن قیم جوزی کی تحریروں میں تصوف

ابن قیم جوزی کو تصوف یا حقیقت تصوف سے کس قدر لگاؤ ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تصوف کے مختلف موضوعات پر ان کی متدرجہ ذیل کتابیں میرے علم کی حد تک موجود ہیں: ۱- اغاثۃ اللہفان من مصادد الشیطان (دو جلدیں) ۲- الفوائد ۳- الوابل الصیب ۴- حادی الارواح ۵- روضۃ المحبین ۶- جلاء الافہام فی الصلوٰۃ و السلام علی محمد خیر الانام ۷- زاد المهاجر ۸- طریق الہاجرین و باب السعادتین ۹- عدۃ الصابرین ۱۰- مفتاح دار السعاده و منشور ولایۃ العلم و الإرادۃ ۱۱- زاد السعاد فی ہدی خیر العباد (دو جلدیں) ۱۲- الروح ۱۳- مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد و ایاک نستعین (۲۹)

یہ ساری کتابیں تصوف کی حلاوت اور احسان کی شیرینی سے لبریز ہیں۔

۱- اغاثۃ اللہفان من مصادد الشیطان

یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے، اس میں تیرہ ابواب ہیں، جس کے تحت بہت سی تفصیلیں ہیں۔ پہلا باب اس بات کے بیان میں ہے کہ دل دو طرح کے ہوتے ہیں، ایک امراض سے پاک دل اور دوسرے امراض زدہ۔ دوسرا باب قلب کے امراض کی حقیقت کے بیان میں ہے۔ تیسرا باب اس بات کے بیان میں ہے کہ قلبی امراض کی دوائیں دو طرح کی ہوتی ہیں، ایک طبی اور دوسری شرعی۔ چوتھا باب اس کے بیان میں ہے کہ قلب کی زندگی اور اس کا منور ہونا ہر خیر کی اصل ہے۔ پانچواں باب اس بات کے بیان میں ہے کہ قلب کی زندگی اور اس کی صحت اسی صورت میں ہوگی جب کہ حق کا ادراک کرنے والا، حق کا ارادہ رکھنے والا اور غیر حق پر اسے ترجیح دینے والا ہو۔ چھٹا باب اس بیان میں ہے کہ قلب کی سعادت، اس کی لذت، اس کی نعمت اور اس کی بھلائی اسی صورت میں ہے جب کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کا معبود، اس کا مطلوب اور اس کا محبوب ہو۔ ساتواں باب اس بات کے بیان میں ہے کہ قرآن میں قلب کے تمام امراض کی دوائیں اور اس کا علاج موجود ہے۔ آٹھواں باب قلب کی زکوٰۃ کے بیان میں ہے۔ نواں باب گندگیوں اور نجاستوں سے قلب کی طہارت کے بیان میں ہے۔ دسواں باب قلب کے امراض کی علامتوں کے بیان میں ہے۔ گیارہواں باب غلبہ نفس کے مرض سے قلب کے علاج کے بیان میں ہے۔ بارہواں باب شیطان کے مرض سے قلب کی حفاظت اور اس کے علاج کے بیان میں ہے۔ تیرہواں باب شیطان کے ان حملوں کے بیان میں ہے جن کے ذریعے وہ ابن آدم کو فریب دیتا ہے۔

آخری باب ہی اصل کتاب ہے اور یہی باب عنوان کتاب کے مشابہت پر مشتمل مفصل باب ہے۔ اسی میں تفصیل کے ساتھ شیطان کی فریب کاریوں کو بیان کر کے سالکین راہ الہی کو ہوشیار رہنے کی دعوت دی گئی ہے۔ کتاب کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

”بسم اللہ الرحمن الرحیم، الحمد للہ الذی ظہر لأولیائہ بنعوت جلالہ وأنار قلوبہم بمشاهدۃ صفات کمالہ وتعرف إلیہم بما أسداه إلیہم من إنعامہ وإفضالہ فاعلموا أنه الواحد الأحد الفرد الصمد الذی لا شریک لہ فی ذاتہ ولا فی صفاتہ ولا فی الفعلہ۔“ (۳۰)

ترجمہ: اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان نہایت رحمت والا، تمام حمد ہے اللہ تعالیٰ کے لیے جو اپنے دوستوں کے سامنے اپنی صفات جلالیہ کے ساتھ جلوہ افروز ہوا اور ان کے دلوں کو اپنی صفات کمالیہ کے مشاہدے سے منور فرمایا اور اس نے اپنا جو فضل و انعام ان پر فرمایا اس کی معرفت ان کو عطا فرمائی تو ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ واحد ہے، احد ہے، فرد ہے، صمد ہے، اس کا کوئی

شریک نہیں، نہ اس کی ذات میں، نہ اس کی صفات میں اور نہ اس کے افعال میں۔

حمد و صلاۃ کے بعد موضوع کتاب پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کو بے کار نہیں پیدا فرمایا بلکہ اسے ادا و امر و نواہی کا مکلف بنایا اور جس بات کی طرف مجمل یا مفصل طور پر اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی رہنمائی فرمائی اس کی فہم کو لازم قرار دیا۔ ان کو شقی اور سعید میں تقسیم کیا۔ دونوں جماعتوں کے لیے ایک مقام و مرتبہ بنایا اور اپنے فضل و انعام سے ان کو قلب، سماعت، بصارت اور اعضائے جسمانی عطا کیے۔ چنانچہ جس شخص نے ان قوتوں کا استعمال اس کی طاعت و فرمان برداری میں کیا اور اس کے ذریعے اس کی معرفت کی راہ اختیار کی اور اس سے عدول نہیں کیا، اس نے ان نعمتوں کا شکر ادا کیا اور رضا الہی کی راہ پر چلا اور جس نے ان کا استعمال اپنے اراوے اور اپنی خواہش میں کیا، اپنے خالق کے حقوق کی رعایت نہیں کی، اس سے جب ان نعمتوں کے بارے میں سوال ہوگا تو وہ گھٹائے میں ڈوبا اور بڑے غم و اندوہ میں مبتلا ہوگا۔ اس لیے کہ ان اعضا کے حقوق کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ ضرور محاسبہ فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک قوت سماعت، بصارت اور قوت فہم و فکر کے بارے میں سوال ہوگا۔

چوں کہ تمام اعضا میں دل کی حیثیت اس بادشاہ کی سی ہے جو اپنے لشکر میں تعریف کرتا ہے اور جس کے حکم سے یہ لشکر حرکت میں آتا ہے اور جہاں چاہتا ہے وہاں اسے استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ یہ سارے اعضا اس کے تابع فرماں اور اس کے حکم کے غلام ہیں۔ اسی دل کی وجہ سے استقامت اور اسی سے کجی پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے سالکین نے اس کی صحیح و درستگی پر سب سے زیادہ توجہ دی ہے۔ اس کے امراض اور اس کے علاج پر عبادت گزاروں نے سب سے زیادہ دھیان دیا ہے، اور چوں کہ دشمن خدا اطمینان کو یہ بات معلوم ہے کہ ساری باتوں کا دار و مدار قلب پر ہے اس لیے اس نے قلب میں وسوسہ اندازی کی، نوع بنوع خواہشات کے ساتھ اس کی طرف متوجہ ہوا اور ان احوال و اعمال کو لوگوں کے لیے آراستہ کر کے پیش کیا جن سے وہ اپنی راہ سے رک جائیں، سرکشی کی باتیں لے کر سامنے آیا تاکہ توفیق کی راہیں بند ہو جائیں اور اس نے ایسے چال بچائے کہ اگر کوئی اس چال میں پھنسنے سے بچ بھی گیا تو اس کی وجہ سے اس کی راہ میں اڑچیس ضرور آئیں، لیکن چوں کہ اللہ رب العزت نے اپنے لطف و کرم سے اپنے بندوں کو قلب کے امراض، اس کی دواؤں اور دل میں آنے والے شیطانی وسوسوں اور ان وسوسوں سے پیدا ہونے والے اعمال اور قلب کو لاحق ہونے والے احوال سے آگاہ فرمایا ہے۔ اس لیے میں نے چاہا کہ میں ان باتوں کو اس کتاب میں ذکر کروں تاکہ ناظرین اس سے فہم اٹھائیں اور مولف کے لیے دعا ہے

رحمت و مغفرت کریں۔ اس کا نام میں نے اعثافۃ اللہ فان من مصائد الشیطان رکھا ہے اور اس کو میں نے تیرا ہواب پر مرتب کیا ہے۔ (۳۱)

بعض اختلافی مقامات کے استثناء کے ساتھ یہ کتاب سالکین راہ طریقت کے لیے بہترین توشہ ہے۔ اس میں شیطان کے پرفریب دام اور اس سے نجات کے طریقوں کو عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

شیطان کی پرفریب راہوں پر لا غویہ ہم اجمعین کی روشنی میں گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں: حضرت شقیق بنی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ہر صبح شیطان چار مقامات پر میرا انتظار کرتا ہے: آگے، پیچھے، دائیں اور بائیں، اور وہ کہتا ہے: خوف مت کرو اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے، تب میں یہ آیت کریمہ پڑھتا ہوں: بے شک میں اسے بخشنے والا ہوں جو توبہ کرے، ایمان لائے اور عمل صالح کرے پھر ہدایت کی راہ اختیار کرے۔ میرے پیچھے سے آکر مجھ کو پس ماندگان کی برادری کا خوف دلاتا ہے تو میں یہ آیت پڑھتا ہوں: روئے زمین پر چلنے والے ہر جان دار کی روزی اللہ کے ذمہ کرم پر ہے۔ میرے دائیں عورتوں کی راہ سے آتا ہے تو میں یہ آیت پڑھتا ہوں: اچھا انجام متقینوں کے لیے ہے، میرے بائیں شہوتوں کی راہ سے آتا ہے تو میں یہ آیت تلاوت کرتا ہوں: ان کے اور ان کی خواہشات کے درمیان حجاب ڈال دیا گیا۔ (۳۲)

اس پر اپنی رائے ذکر کرتے ہوئے مصنف فرماتے ہیں: میں کہتا ہوں کہ انسان کی راہیں چار ہی ہیں، ان سے زیادہ نہیں۔ وہ کبھی واپسی راہ اختیار کرتا ہے، کبھی بائیں راہ لیتا ہے، کبھی آگے چلتا ہے تو کبھی پیچھے کی طرف پلٹتا ہے۔ انسان جس طرف بھی جائے گا شیطان ادھر اس کے گھات میں ہوگا۔ ان راہوں کی طرف اگر وہ اللہ تعالیٰ کی طاعت کے لیے بڑھتا ہے تو وہ ان راہوں پر شیطانی اڑچنوں، رکاوٹوں سے دوچار رہتا ہے، جس کی وجہ سے وہ نیکی سے رک جاتا ہے یا پھر اس میں ناامول اور ناخیر ہوتی ہے، اور اگر گناہ کے لیے نکلتا ہے تو ان راہوں پر شیطان کو اپنا زمین و مدوگا را و رکناہ پر برا بھلا کرنے والا پاتا ہے اور اگر شیطان کو نیچے جا کر رکاوٹیں پیدا کرنے کی قدرت ہوتی تو وہ نیچے کی طرف سے بھی آتا ہے۔ (۳۳)

اس کتاب کی پہلی جلد ۳۹۱ صفحات پر مشتمل ہے جب کہ دوسری جلد ۳۶۷ صفحات پر پہلی ہوئی ہے، کتاب کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے: ”اللہم صل وسلم علی سیدنا محمد کلما ذکرہ المذاکرون وصل وسلم علی سیدنا محمد کلما غفل عن ذکرہ الغافلون وھدانا اللہ لھدایتہ وحشرنا فی زمرتہ تحت لوائہ وأوردنا حوضہ الذی لا یظلمأ من شرب منه وأوفر نصیبنا من شفاعتہ، انہ جواد کریم۔“ (۳۴)

۲- الفوائد

مباحث تصوف سے متعلق ابن قیم کی دوسری کتاب الفوائد ہے۔ یہ کتاب مختلف فوائد پر مشتمل ہے، جس میں متعدد وعایین کو زیر بحث لایا گیا ہے، اس میں ”قاعدۃ جلیلہ“ کہہ کر کئی اصولی باتیں بھی ذکر کی گئی ہیں۔ انہی فوائد و قواعد کے مابین بہت سی فصلیں بھی ہیں۔ اس کتاب کو ہم تصوف سے تعلق رکھنے والے مختلف موضوعات کا مجموعہ مرکب کہہ سکتے ہیں۔

کتاب کے آغاز میں ”قاعدۃ جلیلہ“ کے تحت قرآن سے نفع حاصل کرنے کا طریقہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اگر تم قرآن سے نفع حاصل کرنا چاہتے ہو تو تلاوت قرآن کریم اور اس کی سماعت کے وقت جمعیت قلبی حاصل کرو۔ کان لگاؤ اور اسی طرح اپنے آپ کو حاضر رکھو جس طرح وہ لوگ حاضر ہوتے ہیں جن سے رب تعالیٰ مخاطب ہوتا ہے اور جن سے رب تعالیٰ کلام فرماتا ہے۔ اس لیے کہ رب تعالیٰ اپنے رسول کے واسطے سے تم سے مخاطب ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک اس میں ان لوگوں کے لیے نصیحت ہے جن کے پاس دل ہے اور جو حضور قلبی کے ساتھ کان لگا کر سننے والا ہے۔ (۳۵)

”وہ ضائع ہونے والی غیر مانع چیزیں“ کے عنوان سے ایک خوبصورت بحث لکھتے ہوئے کہتے ہیں:

وہ چیزیں ضائع ہونے والی اور بے سود ہیں: پہلا وہ علم جس پر عمل نہ کیا جائے۔ دوسرا وہ عمل جس میں اخلاص نہ ہو اور جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ ہو۔ تیسرا وہ مال جس میں سے خرچ نہ کیا جائے، جس سے نہ دنیا میں فائدہ حاصل کرے اور نہ اسے آخرت کے لیے آگے بھیجے۔ چوتھا وہ دل جو اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی جانب اشتیاق اور اس کے انس سے خالی ہو۔ پانچواں وہ بدن جو اس کی اطاعت، اس کی خدمت اور اس کی محبت سے محروم ہو اور جو بدن محبوب کی خوشنودی اور اس کے احکام کا پابند نہ ہو۔ چھٹا وہ وقت جو کوتاہیوں کی تلافی، نیکی اور قرب الہی کی دولت سمیٹنے سے خالی ہو۔ ساتواں وہ فکر جس کی جولانی بے سود باتوں میں ہو۔ آٹھواں اس کی خدمت جو تمہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ سے قریب نہ کرے اور جس سے تم کو دنیاوی صلاح و نفع بھی حاصل نہ ہو۔ نواں اور دسواں تمہارا اس شخص سے خوف کھانا اور اس سے امید لگانا جس کی لگام اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہے اور جو اپنے لیے کسی نفع و نقصان، موت و حیات اور کسی کو زندہ کرنے کا مالک نہیں۔ اس مہربادی میں دو بیاویاں ایسی ہیں جو مہربادی کی اصل ہے: پہلی قلب کی مہربادی اور دوسری وقت کی مہربادی۔ قلب کی مہربادی دنیا کو آخرت پر ترجیح

دینے سے ہوتی ہے اور وقت کی مہربادی لمبی امیدیں باندھنے سے ہوتی ہے۔ چنانچہ سارا فساد خواہش کی پیروی اور روزی امید میں ہے۔ اور سارا خیر و صلاح ہدایت کی پیروی اور لقاء الہی کی تیاری میں ہے۔ اس سلسلے میں اللہ ہی سے استعانت ہے۔ تعجب تو اس پر ہے جسے کوئی حاجت پیش آتی ہے تو اسے حاجت برآری کی خواہش رب تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے لیکن وہ جہل و اعراض کی موت سے اپنے قلب کی زندگی اور شہوات و شبہات کے مرض سے شفا کے لیے وہ رب تعالیٰ کی بارگاہ میں دست سوال دراز نہیں کرتا۔ (۳۶)

پوری کتاب تصوف کے نفس مباحث پر مشتمل اور ساکنان راہ الہی کے لیے لائق مطالعہ ہے، زبان کی چاشنی اس پر مستزاد ہے۔ یہ کتاب ۲۱۲ صفحات پر مشتمل ہے۔

۳- الوابل الصیب

یہ کتاب ۲۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں تصوف و سلوک کے عمدہ مباحث ہیں۔ اس کتاب کے بنیادی طور پر تین حصے ہیں، پہلے حصے میں سعادت، استقامت قلب اور قلب کی قسموں پر گفتگو کی گئی ہے، دوسرے حصے میں ذکر الہی اور اس کے فائدے کے عنوان سے گفتگو کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ ذکر کر کے کہہ ذکر الہی سے سو سے زائد فوائد ہیں۔ تفصیل کے ساتھ اس کے ۳۷ فوائد کو شمار کر دیا گیا ہے۔ تیسرے حصے میں ”ذکر سے متعلق نفع بخش فصلیں“ کے عنوان سے ۵۷ فصلیں ہیں۔ ان فصلوں میں مختلف مواقع سے متعلق افکار اور دعائیں یا پھر اس سے متعلق مباحث کو بیان کیا گیا ہے۔

”نماز میں لوگوں کے پانچ درجے ہوتے ہیں“ اس عنوان سے گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نماز کی حالت میں لوگوں کے پانچ درجے ہوتے ہیں: پہلا اس شخص کا درجہ جو اپنے آپ پر ظلم کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا ہے، اور وہ ایسا شخص ہے جس کے وضو، جس کے وقت اور جس کے حدود و ارکان میں نقص اور کمی ہو۔ دوسرا وہ شخص جو اوقات، حدود، ظاہری ارکان اور وضو کی حفاظت کرنے والا ہے، لیکن اس نے مومنوں کو دور کرنے کے لیے اپنے نفس سے مجاہدہ نہیں کیا۔ چنانچہ اس کی نماز مومنوں سے اور افکار و خیالات کے ساتھ چلی گئی۔ تیسرا وہ شخص جس نے حدود و ارکان کی محافظت کی اور وسوسوں و افکار کو دور کرنے کے لیے نفس سے مجاہدہ بھی کیا۔ چنانچہ وہ اپنے دشمن سے مجاہدے میں مصروف ہے کہ کہیں وہ اس کی نماز چرانہ لے جائے۔ وہ شخص نماز اور جہاد میں لگا ہے۔ چوتھا وہ شخص جو نماز کے لیے کھڑا ہوا تو اس کے حقوق، ارکان، حدود کی تکمیل کی اور نماز کے حدود و حقوق کی رعایت میں اپنے قلب کو مستغرق رکھنا کہ نماز کے حدود و حقوق میں سے کچھ بھی ضائع نہ ہونے پائے، بلکہ اس کی توجہ پوری طرح شایان شان طریقے سے نماز کو قائم کرنے

میں رہی۔ نماز کی تکمیل کے دوران اس کا قلب نماز کی عظمت و شان اور رب تعالیٰ کی عبودیت میں مستغرق رہا۔ پانچواں شخص وہ ہے جو نماز میں پہلے والی شان کے ساتھ کھڑا ہوا لیکن اس نے مزید یہ کیا کہ اپنے عنان قلب کو پکڑ کر رب تعالیٰ کی بارگاہ میں ڈال دیا، اس طرح کہ وہ اپنے قلب سے اپنے رب کو دیکھ رہا ہے، اس کے مراقبے میں ہے، اس کی محبت اور اس کی عظمت کے جذبات سے اس طرح سرشار ہے گویا وہ اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے اور اس کا مشاہدہ کر رہا ہے اور اب صورت حال یہ ہے وسوسہ و خطر اٹنا ہو چکے ہیں، اس کے اور رب تعالیٰ کے مابین حجاب اٹھ چکا ہے، چنانچہ یہ شخص نماز کی حالت میں دوسرے نمازیوں سے اتنی عظمت اور فضیلت رکھتا ہے جتنی کہ آسمان کو زمین پر حاصل ہے۔ یہ شخص اپنی نماز میں اپنے رب کے ساتھ مشغول ہے اور اس کے ویدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر رہا ہے۔ پہلی قسم کے نمازی پر عقاب ہوگا، دوسری قسم کے نمازی سے حساب و محاسبہ ہوگا، تیسری قسم کے نمازی کو معاف کر دیا جائے گا، چوتھی قسم کے نمازی کو ثواب دیا جائے گا جب کہ پانچویں قسم کا نمازی اپنے رب کا مقرب ہے، اس لیے کہ اس کو دنیا میں ان لوگوں سے حصہ ملا ہے جن کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے، اور دنیا میں جس کی آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہوگی آخرت میں قرب الہی سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور دنیا میں بھی رب تعالیٰ سے اس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اور رب تعالیٰ سے جس کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں گی اس سے ہر آنکھ کو ٹھنڈک حاصل ہوگی۔ (۳۷)

۴- سادی الارواح الی بلاد الافراح

یہ کتاب جنت، جنت کی حقیقت، اس کی نعمت اور اس سے متعلق جملہ مباحث کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ اس میں ۷۰ ابواب ہیں جو مجموعی طور پر ۲۹۳ صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اس میں سالکین راہ طریقت اور مشائخ جنت کے لیے بڑی دل چسپی کا سامان ہے، خصوصیت کے ساتھ اس کے ۲۵ ویں باب میں دیدار الہی سے متعلق بڑی عمدہ بحث کی گئی ہے اور مختلف فصلیں ذکر کر کے اس بحث کو پانچ تک پہنچایا گیا ہے۔

اس باب کے آغاز میں لکھتے ہیں:

یہ باب کتاب کے ابواب میں سب سے زیادہ شرف والا، سب سے بڑے مقام و مرتبہ والا، اہل سنت و جماعت کی آنکھوں کو سب سے زیادہ ٹھنڈک پہنچانے والا اور اہل بدعت و ضلالت کے اوپر سب سے سخت اور دشوار گزار ہے۔ یہی وہ مقصود ہے جس کے لیے تیاری کرنے والے تیاری کرتے ہیں۔ مقابلہ اور مسابقت کرنے والے مقابلہ اور مسابقت کرتے ہیں۔ اسی کے لیے عمل کرنے والے عمل کرتے ہیں۔ جب اس نعمت کو جنتی پائیں گے تو جنت کی ساری نعمتیں بھول

جائیں گے اور اس سے محرومی، جہنمیوں کے لیے جہنم کے عذاب سے بھی زیادہ سخت ہوگی۔ اس نعمت کے ملنے پر انبیاء و مرسلین، تمام صحابہ، تابعین اور ہر دور کے ائمہ اسلام کا اتفاق ہے۔ (۳۸)

اس ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جنتی ہر جمعہ کو رب تعالیٰ کی زیارت کریں گے۔ پھر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان چیزوں کا ذکر فرمایا جو جنتیوں کو دی جائیں گی۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پھر رب تعالیٰ فرمائے گا حجاب اٹھاؤ، چنانچہ ایک ایک کر کے حجاب اٹھا دیا جائے گا، پھر رب تعالیٰ ان کے لیے تجلی فرمائے گا اور اپنے بیچہ کریم کا جلوہ دکھائے گا تو اس وقت جنتیوں کو ایسا معلوم ہوگا کہ انہوں نے اس سے قبل کوئی نعمت پائی ہی نہیں تھی اور رب تعالیٰ کے فرمان و لدینا صمد کا یہی مطلب ہے۔ (۳۹)

قیامت میں ظاہری آنکھوں سے دیدار الہی پر اہل حق کے تمام گروہوں کا اتفاق نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اور دیدار الہی کے سلسلے میں تابعین اور اسلام و ایمان کی جماعتیں یعنی ائمہ حدیث، ائمہ فقہ و تفسیر اور ائمہ تصوف کے اقوال کی اتنی کثرت ہے کہ ان کا احاطہ رب تعالیٰ ہی کر سکتا ہے۔ (۴۰)

آگے چل کر حضرت حسن بصری کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ اگر دنیا میں عابدوں کو معلوم ہو جائے کہ آخرت میں ان کو رب کا دیدار نہیں ہوگا تو غم کے مارے وہ دنیا میں ہی گھل جائیں۔ (۴۱)

خلاصہ کلام یہ کہ اس کتاب میں سالکین و بندگان الہی کے لیے بڑے نشاط انگیز مباحث ہیں۔ اس کے مطالعے کے بعد یقیناً دلوں میں جنت کی امنگ اور دیدار الہی کا شوق پیدا ہوگا اور بندہ عمل کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔

۵- روضة المعین و نزهة المشتاقین

یہ کتاب انتالیس ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں محبت اور اس سے متعلق علمی، نقوی اور روحانی مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے جو ۲۸ صفحات تک پھیلا ہوا ہے۔ کتاب کا آغاز حمد الہی سے ان الفاظ میں ہوتا ہے:

الحمد لله الذي جعل المحبة إلى الظفر بالمحبوب سبيلاً ونصب طاعته والخضوع له على صدق المحبة دليلاً، وحرك بها النفوس إلى أنواع الكمالات إشاراً لطلبها وتحصيلاً وأودعها العالم العلوي والسفلي لاخراج كماله من القوة إلى الفعل إيجاداً وإمداداً وقبولاً، وأثار بها الهمم السامية والعزائم العالية إلى أشرف غاياتها تخصيصاً لها وتأهيلاً۔ (۴۲)

ترجمہ: تمام حمد اللہ تعالیٰ کے لیے جس نے محبت کو محبوب تک رسائی کا ذریعہ بنایا اور اپنی اطاعت اور فرماں برداری کو محبت کی سچائی پر دلیل قرار دیا، محبت کو نوع، نوع کے کمالات کی تحصیل اور ترجیح کا محرک بنایا، محبت میں عالم علوی اور سفلی کو ودیعت کیا تا کہ وہ اپنے کمال کو امکان سے وجود خارجی کا جامہ پہنا سکے، اس میں وہ امداد کر سکے اور اس کو قبول کر سکے اور محبت کے ذریعے عالمی ہمت لوگوں اور بلند عزائم رکھنے والوں کو اس بات پر ابھارا کہ وہ سب سے زیادہ شرف رکھنے والے مقاصد کو اپنے لیے خاص کریں اور اس کی اہلیت حاصل کریں۔

ایک مقام پر نفس انسانی اور ان کی محبتوں کے تقاسم پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

نفوس تین طرح کے ہیں: سماوی اور علوی نفس، اس کی محبت کا تعلق علوم و معارف اور انسان کے لیے ممکنہ فضائل و کمالات کی تحصیل اور رد و مکمل سے اجتناب سے ہوتا ہے۔ ان کا دل ان باتوں سے لگا ہوتا ہے جس کے ذریعے وہ اپنے رفیق اعلیٰ کا قرب حاصل کر سکے۔ وہی اس کی روزی، وہی اس کی غذا اور وہی اس کی دوا ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ دوسری چیزوں میں مشغول ہونا ہی اس کے لیے مرض ہوتا ہے۔

دوسرا ہے حیوانی اور شہوانی نفس۔ اس کی محبت کا تعلق کھانے پینے اور نکاح کرنے سے ہوتا ہے۔ کبھی یہ ساری چیزیں حاصل ہوتی ہیں تو ان کی محبت کا تعلق روئے زمین میں سرکشی اور فساد سے ہوتا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی ہے اور اس کے باشندوں کو مختلف گروہوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ایک گروہ کو کم زور کر رکھا ہے، ان کے لڑکوں کو ذبح کر دیتا ہے اور ان کی عورتوں کو زندہ رکھتا ہے۔ بے شک وہ فساد پھیلانے والوں میں سے ہے اور اسی سورہ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ دار آخرت ہے، یہاں ان لوگوں کا حق ہو گا جو زمین میں سرکشی اور فساد نہیں کرتے تھے، چھانچا انجام متقیوں کے لیے ہے۔

اس دنیا میں محبت ان ہی تین طرح کے نفوس میں منحصر ہے، چنانچہ ان نفوس میں جن کو بھی ان کی طبیعت کے موافق کوئی چیز ملتی ہے اسے وہ بہتر سمجھتی ہیں، اس کی طرف مائل ہوتی ہیں اور اس سلسلے میں وہ کسی ملامت کرنے والی کی ملامت پر کان نہیں دھرتیں اور ان میں سے ہر جان یہ سمجھتی ہے کہ جس میں وہ گئی ہے وہی ترجیح کے زیادہ لائق ہے، اس کے علاوہ دوسری چیزوں میں مشغول ہونا گھٹائے کا سودا اور بے بادی ہے۔ (۳۳)

پوری کتاب لائق مطالعہ، نفع بخش اور خیر کثیر لیے ہوئے ہے۔ ارباب محبت، رضا حبان دل، مشتاقان راہ وصال اور طالبان محبت الہی کے لیے اس میں تسکین خاطر اور سیر و تفریح کا خاطر خواہ سامان موجود ہے۔

۶۔ جلاء الافہام فی الصلاۃ والسلام علی محمد خیر الانام

یہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے کے سلسلے میں جو روایتیں آئی ہیں، ان کو ذکر کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں مرسل اور موقوف احادیث کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کی آل پر درود پڑھنے کا ذکر ہے اور آل کی تفسیر بیان کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں ان مقامات کو بیان کیا گیا ہے جن میں درود پاک پڑھنا واجب یا مستحب ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے استمالیس مقامات کا ذکر کیا ہے، جہاں درود شریف پڑھنا واجب یا مستحب ہے۔ پانچویں باب میں درود شریف پڑھنے کے فوائد و ثمرات پر گفتگو کی گئی ہے۔ چھٹے باب میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ دوسروں پر اور آپ کی آل پر درود پڑھنے کی بحث ہے۔ یہ کتاب ۴۸۲ صفحات کو محیط ہے۔

اذان کے جواب سے فارغ ہو کر درود شریف پڑھنے کے بارے میں لکھتے ہیں:

درود شریف کے مقامات میں چھٹی جگہ یہ ہے کہ موزن کے جواب سے فارغ ہو کر درود شریف پڑھے، اس لیے کہ صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ جب تم اذان سنتو تو اذان کے کلمات کا اعادہ کرو، پھر مجھ پر درود پڑھو، اس لیے کہ جو مجھ پر ایک بار درود پڑھتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر دس مرتبہ درود بھیجتا ہے۔ پھر میرے لیے اللہ سے وسیلہ طلب کرو۔ (۴۴)

نماز کے بعد درود شریف پڑھنے کے سلسلے میں لکھتے ہیں:

مؤمنین و اہل مقام یہ ہے کہ نمازوں کے بعد درود شریف پڑھنا جائز ہے، اس کو حافظ ابو موسیٰ وغیرہ نے ذکر کیا ہے اور اس سلسلے میں صرف ایک حکایت ذکر کی ہے جس کو ابو موسیٰ مدینی نے عبدالغنی بن سعید کی روایت سے ذکر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اسماعیل بن احمد بن اسماعیل حاسب سے سنا، وہ کہتے ہیں کہ مجھ کو ابو بکر محمد بن عمر نے خبر دی، وہ کہتے ہیں کہ میں ابو بکر بن مجاہد کے پاس تھا کہ ان کے پاس شبلی آئے تو ان کے لیے ابو بکر بن مجاہد کھڑے ہو گئے، ان سے معاف کیا اور ان کی آنکھوں کے مابین بوسہ دیا۔ اس پر میں نے ان سے کہا: آپ شبلی کا یہ احترام کر رہے ہیں! جب کہ آپ اور بغداد کے سارے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ بخون ہیں۔ یہ سن کر ابو بکر بن مجاہد نے کہا میں نے ان کے ساتھ ہی کیا ہے جو میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کرتے دیکھا ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ شبلی آئے تو آپ ان کے لیے کھڑے ہوئے اور ان کی آنکھوں کے مابین بوسہ دیا۔ میں نے کہا: یا رسول اللہ! آپ شبلی کا یہ احترام کر رہے ہیں!! آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نماز کے بعد لقمہ جناہ کم رسول من انفسکم الخ پڑھتے ہیں اور پھر درود شریف پڑھتے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ وہ ہر فرض نماز کے بعد

لقد جاءكم بڑھ کر تین مرتبہ صلی اللہ علیہ وسلم یا محمد پڑھتے ہیں۔ (۲۵)

آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر خاص طور سے صلاۃ بھیجنے کے سلسلے میں ایک لمبی بحث کرنے کے بعد ان کی فیصلہ کن رائے یہ ہے کہ اگر رافضیوں کی طرح اس کو شعار بنا لیا جائے کہ کبھی اس کو ترک نہ کرے تو ایسی صورت میں صلاۃ نہ بھیجنا متعین ہے لیکن اگر شعار نہ بنایا جائے تو ایسی صورت میں اس میں کوئی حرج نہیں۔ (۲۶)

درویشی کے موضوع پر یہ کتاب بہت علمی، جامع اور بحث کے مختلف گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے - صوفیہ کرام درویشی کی بڑی تاکید کرتے ہیں، اس لیے موضوعات تصوف پر لکھی گئی کتابوں میں اس کتاب کے شمارے کوئی علمی مناقشہ نہیں ہونا چاہیے۔

۷۔ زاد المهاجر الى ربہ

یہ مختصر سی کتاب ۷۷ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں سالکین راہ طریقت کے لیے توشہ سفر ہے۔ اس کتاب میں ”مہاجر“ اور ”ہجرت“ دونوں صوفیہ کرام کے معانی میں استعمال کیے گئے ہیں۔ اس میں حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہ کے اقوال سے استدلال بھی موجود ہے۔ ہجرت کے صوفیانہ معانی پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

انسان کا سب سے اہم مقصود یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کرے۔ یہ ہجرت فرض عین ہے اور یہ ہجرت بروقت لازم ہے۔ اس کی فریضیت سے کوئی مستثنیٰ نہیں۔ یہی اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔ ہجرت کی دو قسمیں ہیں: پہلی جسم کے ذریعے ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف ہجرت، اس کے احکام معلوم ہیں اور یہاں وہ ہجرت زیر بحث نہیں ہے۔ دوسری ہجرت یہ ہے کہ قلب کے ذریعے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کی جائے۔ یہی یہاں مقصود ہے اور یہی ہجرت حقیقی اور اصلی ہے۔ جسم کی ہجرت تو اس کے تابع ہے۔ (۲۷)

ایک فصل کے تحت یہ ذکر کرتے ہیں کہ جب دل اس سفر ہجرت کے لیے تیار ہوتا ہے تو وہ کسی رفیق کو تلاش کرتا ہے۔ اسی ضمن میں آگے چل کر لکھتے ہیں:

جو شخص یہ سفر شروع کرنا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان مردہ نفس لوگوں کو اپنا رفیق بنالے جو حقیقی معنوں میں دنیا میں زندہ ہیں۔ ان کی رفاقت کی برکت سے وہ مقصد تک پہنچ جائے گا۔ وہ بظاہر زندہ اور درحقیقت مردوں کی صحبت سے بچے، اس لیے کہ وہ اس سفر کے رہزن ہیں۔ چنانچہ سالک کے لیے ان مردہ نفس لوگوں کی رفاقت سے زیادہ نفع بخش کوئی چیز نہیں ہے۔ (۲۸)

ایک مقام پر اسی سفر ہجرت سے متعلق گفتگو کے دوران یہ سوال کرتے ہیں کہ اگر تم یہ کہو کہ آپ نے اس عظیم الشان سفر کے بارے میں تو بتا دیا لیکن زاد سفر و طریقت سفر اور اس سفر کی سواری کے

بارے میں کچھ نہیں بتایا، تو میں کہوں گا کہ زاد سفر وہ علم ہے جو خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم سے وراثت میں ملا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی زاد سفر نہیں۔ جس کے پاس یہ توشہ نہ ہو وہ اپنے گھر سے نکلے۔ (۲۹)

آگے چل کر طریقت سفر پر کلام کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ سفر صرف آرزوؤں اور تمناؤں سے طے نہیں ہوگا بلکہ اس کے لیے پوری کوشش اور پوری جدوجہد کرنی ہوگی۔ طریقت تو یہ ہوگا اور سواری یہ ہوگی کہ رب تعالیٰ کی طرف پوری طرح متوجہ ہونا پڑے گا۔ سب سے کٹ کر اس کی جانب صدق دل کے ساتھ لو لگنا ہوگا اور اسی کی بارگاہ میں اپنی مکمل حاجت مندی کا اظہار کرنا ہوگا۔ صدق توکل کے ساتھ اس سے استعانت طلب کرنا ہوگا۔ عمل طور سے نسبت، لٹے ہوئے خود سپردگی کرنے والے انسان کی طرح اس کی بارگاہ میں خود سپردگی کرنی ہوگی۔ حاجت مندوں کی طرح اپنے بال بکھرا کر اس کے فضل و انعام کا طلب گار ہونا ہوگا، تب جا کر امید ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے بندے کی ہدایت اپنے ذمہ کرم پر لے لے اور اس سفر ہجرت کے مقامات و منازل اور اس کے پوشیدہ احوال کو اس پر سکھول دے۔ (۵۰)

اس کتاب کو پڑھ کر ہندے کے دل میں سفر ہجرت کی امنگ پیدا ہونے اور سفر پر نکلنے کی تیاریوں میں لگ جانے کی امید ہے۔ یقیناً یہ کتاب مہاجران راہ الہی کے لیے توشہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

۸۔ طریق المہجرتین وباب السعادتین

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہجرت کیا ہے اور ایسی ہجرت کن لوگوں کی شان ہوتی ہے؟ اس کتاب میں اس موضوع اور اس سے متعلق جملہ مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس میں کچھ تفصیلیں ہیں۔

خطبے کے بعد کتاب کا آغاز اس مفہوم سے کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے منتخب بندوں کے دلوں میں اپنی محبت، اپنی معرفت اور اپنی توحید کی شجر کاری فرمائی ہے۔ ان کو ساری مخلوق پر فضیلت عطا کی ہے۔ ہر آنکھ کو ان سے ٹھنڈک ملتی ہے۔ ہر طرح کے غم کے مارے ان سے خوشی حاصل کرتے ہیں۔ خوف زدہ لوگ ان سے امان حاصل کرتے ہیں۔ ان کے دیدار سے اللہ کی یاد آتی ہے۔ ان کی محبت اللہ کے لیے، ان کا بغض اللہ کے لیے، ان کا دینا اللہ کے لیے اور ان کا نہ دینا اللہ کے لیے ہی ہوتا ہے۔ ہر وقت ان کی دو ہجرتیں ہوتی ہیں: ایک ہجرت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے، اسی کی طلب، اسی کی محبت، عبودیت، توکل و امانیت، تسلیم و تقویٰ، خوف و رجا، توجہ اور اپنی حاجت مندی کے اظہار کے ذریعے، اور ان کی دوسری ہجرت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوتی ہے، اور وہ اس طرح کہ وہ اپنے حکمت و سکنت، خواہ وہ ظاہری ہوں یا باطنی، ہر حالت میں ان کی شریعت کی پیروی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی دین کو قبول نہیں کرتے۔ چنانچہ شیخ طریقت امام الطائفہ جنید بن محمد

قدس اللہ روحہ فرماتے ہیں: ساری راہیں مسدود ہیں سوائے اس کی راہ کے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے والا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: میری عزت و جلال کی قسم! اگر لوگ ساری راہوں سے آئیں اور ہر دروازے سے دستک دیں لیکن ان کے لیے دروازہ اسی وقت کھلے گا جب کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی اور پس روی کرتے ہوئے آئیں۔ اور بعض عارفین فرماتے ہیں کہ ہر وہ عمل جس میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی نہ ہو وہ عیش نفس ہے۔ (۵۱)

حقیقت فقر پر گفتگو کرتے ہوئے ایک مقام پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ فقر کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اپنے تمام احوال میں اللہ تعالیٰ کی طرف لو لگائے رہے۔ سو لکھتے ہیں کہ دنیاوی اغراض میں ملوث ہونا چوں کہ ایک قسم کی قید ہے، جو کہ بندے کو اس کے شہر حیات اور کشور نعمت کی طرف سفر کرنے سے روک دیتا ہے۔ اسی طرح جو دل محبت کا مزہ کچھ لیتا ہے، معرفت کی سوزش سے جس کو اس حاصل ہو جاتا ہے، بعض دقیق اغراض رکاوٹ بن کر اس کے سامنے آتے ہیں اور قلب کو مشاہدہ حق اور مکمل فنا سے روک دیتے ہیں۔ وہ فنا جس سے بقائے دوام حاصل ہوتا ہے جس سے نور الہی حاصل ہوتا ہے اور جو سیر و سلوک کا مقصود ہے، جس کے لیے سالکین تیار کیا کرتے ہیں اور جس کے گرد عارفین طواف کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر وہ چیز جو بندے کے قلب و نظر اور اس کی بہت کو اس کے مقصود سے روکتی ہے وہ حجاب ہے جس سے واصل، سالک اور طالب محبوب ہو جاتا ہے۔ ان چیزوں سے زہد و فقر بلند ہمتوں کے لیے ضروری ہے اور چوں کہ فقر کا پہلا ذریعہ یہ ہے کہ آخرت کی طرف رجوع کیا جائے، اس لیے آخرت کی فکر میں استغراق اور دنیا سے دونوں ہاتھ جھاڑ لینا ضروری ہے۔ یہاں سے وہ صرف اللہ تعالیٰ کے فعل کی طرف رجوع کرے گا تو اس سے عمدہ اقوال کا صدور ہوگا، اس کو بلند و بالا مقامات حاصل ہوں گے اور اس کے فعل و کرم سے اس کو رب تعالیٰ کی خوش نویدی، اس کی رحمت، اس کا قرب، اس کی کرامت اور اس کی ولایت حاصل ہوگی اور پھر اللہ تعالیٰ ہی اول و آخر ہوگا تو اس کو فقر کی حقیقت حاصل ہو جائے گی، اور اس میں جب ظاہر و باطن سے عبودیت کا ضمیر ملگ جائے گا تو وہ عارف ہو جائے گا۔ (۵۲)

اس کتاب میں فقر و غنا وغیرہ سے متعلق عمدہ گفتگو ہے، جو ۶۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب طالبین و سالکین کے لیے بہترین ذخیرہ ہے۔

۹۔ عدة الصابرين وذخيرة الشاكرين

یہ کتاب صبر و شکر کے موضوع پر ہے۔ اس میں ۲۶ ابواب ہیں۔ ان ابواب کے تحت متعدد فصلیں بھی ہیں، جن میں قرآن وحدیث اور تاریخی روشنی میں علمی، لغوی، دینی اور روحانی گفتگو کی گئی ہے۔ کل صفحات کی تعداد ۲۴۲ ہے۔

حقیقت صبر پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں: صبر عمدہ اخلاق کا نام ہے جس کے ذریعے بندہ غیر مستحسن افعال سے رک جاتا ہے۔ اس سلسلے میں چند بن محمد سے پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا: ناگواری کا اظہار کیے بغیر کڑوے ٹھونٹ پی جانا صبر ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ حرف شکایت زبان پر لائے بغیر آزمائش میں بے نیازی کا اظہار صبر ہے۔ خواہ اس نے فرمایا: صبر یہ ہے کہ کتاب و سنت کے احکام پر ثابت قدم رہا جائے۔ ابوعلی دقاق نے فرمایا: صبر کی تعریف یہ ہے کہ تقدیر پر اعتراض نہ کرے، لہذا بلا کا اظہار اگر شکوہ کے طور پر نہ ہو تو یہ صبر کے متنافی نہیں ہے۔ (۵۳)

صبر نصف ایمان ہے، اور ایمان میں دو نصف ہیں، ایک نصف صبر ہے اور دوسرا نصف شکر۔ اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے مصنف نے نو توجیہات پیش کی ہیں۔ پہلی توجیہ پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایمان بقول و عمل اور نیت کے مجموعے کا نام ہے۔ یہ دو چیزوں کی طرف راجع ہے: فعل اور ترک فعل۔ فعل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، یہی شکر کی حقیقت ہے۔ اور ترک یہ ہے کہ گناہوں کا ارتکاب نہ کیا جائے اور صبر کیا جائے۔ پورا دین انہی دو چیزوں میں منحصر ہے۔ جس کا حکم دیا گیا ہے اس کو کیا جائے اور جس سے روکا گیا ہے اس سے رک جایا جائے۔ (۵۴)

کتاب کا خاتمہ بہت ہی صوفیانہ اور ناصحانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ درمند انداز میں سالکین راہ طریقت کو اپنے نفس و عمل کے عیوب، اپنی کوتاہیوں کے مشاہدے اور عمل پر بھروسہ کرنے کی بجائے اس کے غلو و مغفرت کی طرف لو لگانے کی دعوت دی گئی ہے، لیکن گناہ کرنے کے بعد اس پر اعترار و سرکشی کے انجام سے آگاہ کیا گیا ہے کیونکہ رب تعالیٰ بڑا غیور بھی ہے، لہذا بندہ رب کی نوازشات پا کر بھی اگر غنا پر قائم رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو مہلت دے رکھی ہے تو ایسا خیال دماغ سے نکال دے، کیوں کہ اس نے مہلت نہیں دی ہے بلکہ بات صرف اتنی ہے کہ رب تعالیٰ کی ایک صفت مہربان بھی ہے، اسی لیے فوری گرفت نہیں فرما رہا ہے۔ (۵۵)

۱۰۔ مفتاح دار السعادة ومنشور ولاية العلم والإرادة

اس کتاب میں رب تعالیٰ کے مختلف افعال میں پنہاں دقائق و اسرار کو بیان کیا گیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالے جانے کے اسرار پر گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد میں ۳۵۵ صفحات ہیں۔ پہلی جلد کے اختتام پر مصنف نے لکھا ہے کہ رب تعالیٰ کے تمام افعال میں بے شمار حکمتیں ہیں۔ ان حکمتوں تک انسان کی تفصیلی طور پر رسائی اس کے بس سے باہر ہے، لہذا اللہ تعالیٰ اپنے بندوں میں جس کو چاہتا ہے اس پر کچھ حکمتیں اور کچھ اسرار و دقائق کو کھول دیتا ہے۔ (۵۶)

دوسری جلد ۷۷ صفحات پر مشتمل ہے، اس میں بھی متعدد تفصیلات ہیں۔ ان فصول کے تحت مختلف مباحث کا احاطہ کیا گیا ہے اور نوع بنوع دقائق و اسرار سے پردہ اٹھایا گیا ہے۔

گناہ میں پوشیدہ اسرار کو بیان کرتے ہوئے صاحب کتاب لکھتے ہیں: گناہ کی حکمتوں میں سے یہ بھی ہے کہ گناہگار لوگوں کے عیوب نہیں دیکھتا۔ لوگوں کے معائب کی طرف نظر نہیں کرتا۔ اس لیے کہ وہ اپنے عیوب کو دیکھنے میں لگا ہوتا ہے۔ چنانچہ بشارت ہے اس شخص کے لیے جو اپنے عیوب کو دیکھنے میں لگا ہے اور خرابی ہے اس شخص کے لیے جو اپنے عیوب کو فراموش کر کے لوگوں کی عیب جوئی میں لگا ہے۔ یہ شقاوت کی علامت ہے، جب کہ پہلی والی بات سعادت کی علامت ہے۔ انہی حکمتوں میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ بندہ جب گناہوں کے جال میں پھنستا ہے تو اسے اپنے دوسرے خطا کار بھائیوں کی یاد آتی ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ مصیبت سب کی ایک ہے اور سب کے سب اپنی حاجت اور ضرورت میں اللہ کی مغفرت، اس کے عنوکر اور اس کی رحمت کے محتاج ہیں۔ چنانچہ جس طرح اس کو یہ بات محبوب ہے کہ مسلمان بھائی اس کے لیے دعاے مغفرت کریں اسی طرح اس کے لیے بھی مناسب ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لیے مغفرت کی دعا کرے۔ (۵۷)

شریعت کی حاجت اور اس کی ضرورت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شریعت کی جانب لوگوں کا احتیاج تمام حاجتوں سے بڑھ کر ہے اور علم طب کی حاجت سے اس حاجت کا کوئی مقابلہ نہیں۔ دیکھتے نہیں کہ بہت سے لوگ دنیا میں بغیر طبیب کے ہی جیتے ہیں۔ بدوی لوگوں اور عام انسانوں کو ڈاکٹر کی حاجت نہیں ہوتی ہے۔ وہ سب سے صحت مند ہوتے ہیں اور جو ڈاکٹر سے مسلسل چیک اپ کراتا ہے ان سے بھی زیادہ وہ لوگ قوی ہوتے ہیں۔ اکثر اصول طب لوگوں کے عادات، ان کے عرف اور ان کے تجربے سے ماخوذ ہوتے ہیں، جب کہ شریعت کی بنا اس بات پر ہوتی ہے کہ بندوں کے اختیاری افعال میں اللہ کی رضا اور اس کی ممانعت کہاں کہاں ہے۔ اس کو معلوم کیا جائے۔ اور اس کا دار و مدار خالص وحی پر ہوتا ہے۔ سانس لینے اور کھانا پانی نہ ملنے کی صورت میں زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ بدن کو موت آجائے گی اور روح جسم غصری سے نکل جائے گی جب کہ دوسری طرف شریعت نہ ہونے کی صورت میں روح اور قلب میں مکمل طور سے فساد و بربادی ہو جائے گا، اور خود بدن کو بھی ہلاکت نصیب ہوگی۔ اس لیے انسانوں کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے جوئے احکام کی معرفت، اس کی انجام دہی، اس کی طرف رجوع، اس پر صبر اور اس سے خروج کرنے والے سے جہاد سے بڑھ کر لوگوں کو کسی بات کی حاجت نہیں۔ (۵۸)

مختلف لطائف و معانی اور دقائق و اسرار پر مشتمل یہ کتاب سالکین کے لیے ایک ضروری مطالعے کی حیثیت رکھتی ہے۔

۱۱- زاد المعاد فی ہدی خیر العباد

یہ کتاب اسلامیات کا دائرۃ المعارف ہے۔ اس میں صحیح احادیث و آثار کی روشنی میں سیرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مختلف گوشوں کا احاطہ کیا گیا ہے۔ عبادات و اخلاق سے لے کر معاملات تک ہر پہلو سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کی روشنی میں گفتگو کی گئی ہے۔ جامعہ محدثانہ بحثیں بھی موجود ہیں۔ یہ کتاب پانچ جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں پہلے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نسب بیان کیا گیا ہے۔ اس کے آخر میں چند فصول کے تحت عبادات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسری جلد میں بھی عبادات سے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ تیسری جلد میں غزوات اور سرایا میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کو بیان کیا گیا ہے۔ چوتھی جلد میں طب نبوی پر گفتگو کی گئی ہے۔ پانچویں جلد میں سیرت رسول کی روشنی میں معاملات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ جلد اول کے آغاز میں ایک مقدمہ بھی ہے جس میں حمد و صلاۃ کے بعد سیرت رسول کی اہمیت اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی معرفت کا مقام و مرتبہ بیان کیا گیا ہے اور کتاب کن حالات میں لکھی گئی ہے، اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

پوری کتاب لائق مطالعہ ہے، بعض مقامات پر ان کی خاص آرا سے اختلاف کیا جاسکتا ہے، مثلاً زیارت قبور کے سلسلے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جب صحابہ کرام کی قبروں کی زیارت کرتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے لیے دعاے رحمت و مغفرت کرتے اور یہی زیارت امت کے لیے مسنون ہے۔

آگے چل کر لکھتے ہیں: لیکن مشرکین نے اس سے انکار کیا، وہ مردوں کو پکارتے ہیں، اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں، ان کی قسم کھاتے ہیں، ان سے حاجتیں مانگتے ہیں، ان سے مدد طلب کرتے ہیں اور ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ (۵۹)

مجموعی طور پر کتاب اسلامی علوم و معارف کا مجموعہ ہے جو طالبین و سالکین کے لیے کام کی چیز ہے۔ زبان کی صوفیانہ لطافت و چاشنی اس پر مستزاد ہے۔

۱۲- الروح فی الکلام علی ارواح الاموات والاحیاء بالدلائل من

الکتاب والسنة

روح اور اہل قبور کے احوال سے متعلق مختلف علمی مباحث پر مشتمل یہ کتاب اسلامیات کے ذخیرے میں قبیح اضافہ ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ روح اور اس سے متعلق جملہ مباحث پر قرآن و حدیث اور آثار صحابہ و تابعین و ائمہ مسلمین کی روشنی میں جس عمدہ علمی انداز

میں اس کتاب میں گفتگو کی گئی ہے وہ شاید ہی کہیں اور مل سکے۔

بنیادی طور پر کتاب کو انہیں مسائل پر منقسم کیا گیا ہے۔ ہر مسئلہ کو ہم ایک مستقل باب کی منزل میں قرار دے سکتے ہیں۔ پھر ان مسائل کے تحت متعدد تفصیلیں ہیں۔ اخیر میں ایک خاتمہ ہے اور اس کے تحت بھی کئی تفصیلیں ہیں۔ اس پوری کتاب کے مطالعے سے بہت سے وہ اعتقادات سامنے آتے ہیں جن کی، حافظ ابن قیم کے نام لیواؤں کے یہاں کوئی گنجائش نہیں، مثلاً وہ اس بات کے قائل نظر آتے ہیں کہ مردے اپنی قبروں کی زیارت کرنے والوں کو پہچانتے ہیں اور ان کے سلام کا جواب بھی دیتے ہیں۔ (۶۰) مردوں کی روئیں باہم زیارت اور ملاقات کرتی ہیں۔ (۶۱) خود مردوں کی روئیں زندوں سے ملاقات کرتی ہیں۔ (۶۲) اور زندوں کی جو شفقت ہوتی ہیں وہ موت کے بعد بھی روحوں سے جدا نہیں ہوتیں اور روئیں بے جان پتھر کی طرح نہیں ہوتیں۔ (۶۳) وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ مردوں کو عبادات مالیہ اور دینیہ میں سے کچھ بھی اگر ایصالِ ثواب کیا جاتا ہے تو اس کا ثواب پہنچتا ہے۔ (۶۴)

عبادات دینیہ کے ایصالِ ثواب پر اپنی رائے دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

عبادات دینیہ مثلاً نماز، روزہ، قرآن کی تلاوت اور ذکر کے سلسلے میں اختلاف ہے، چنانچہ امام احمد اور جہور سلف کا یہی مذہب ہے کہ اگر ان عبادتوں کا ثواب مردوں کو پہنچایا جائے تو پہنچتا ہے۔ یہی قول امام ابو حنیفہ کے بعض اصحاب کا ہے محمد بن یحییٰ کمال سے منقول امام احمد کی روایت میں اس کی صراحت موجود ہے محمد بن یحییٰ کمال فرماتے ہیں کہ ابو عبد اللہ (امام احمد) سے کہا گیا کہ ایک آدمی نماز، صدقہ وغیرہ کرتا ہے اور پھر اس کا آدھا ثواب اپنے والد یا اپنی والدہ کو ہبہ کر دیتا ہے، اس سلسلے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ آپ نے فرمایا: مجھے ثواب پہنچنے کی امید ہے یا آپ نے یہ فرمایا: صدقہ وغیرہ کا ثواب پہنچے گا اور آپ نے یہ بھی فرمایا: تین مرتبہ آیت الکرسی پڑھو، قل ہو اللہ احد پڑھو اور یہ کہو اللہ! اس کا ثواب قبرستان والوں کو پہنچے۔ (۶۵)

ایک مقام پر الہامِ ملکی اور القا سے شیطانی کے مابین فرق بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

الہامِ ملکی اور القا سے شیطانی کے مابین کئی فرق ہے۔ ایک یہ ہے کہ جو الہام اللہ کے لیے اور اس کی رضا و خوش نودی کے موافق ہو وہ الہامِ ملکی ہے اور جو اس کی خوش نودی کے مطابق نہ ہو وہ شیطانی ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ جس الہام کا نتیجہ اللہ کی طرف توجہ و مابہت اور اس کے ذکر کی صورت میں ہو وہ الہامِ ملکی ہے اور جو اس کے برعکس ہو وہ شیطانی ہے اور جس الہام سے انس اور قلب و سیئہ میں نور و انشراح پیدا ہو وہ الہامِ ملکی اور جو اس کے برعکس ہو وہ شیطانی ہے۔ جس الہام سے سکینہ و طمانیت حاصل ہو وہ ملکی ہے اور جس سے قلق و اضطراب پیدا ہو وہ شیطانی ہے۔ (۶۶)

۱۴۔ مدارج السالکین بین منازل ایاک نعبد و ایاک نستعین

تصوف کے مسائل و مقامات، ارشادات و اقوال، احوال و مقامات اور حقائق و معارف پر مشتمل یہ کتاب تین جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد ۵۳۴ صفحات کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ دوسری جلد میں ۵۲۰ صفحات ہیں جب کہ تیسری جلد ۵۲۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب دراصل شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبد اللہ انصاری ہروی حنبلی قدس سرہ (۷۸۱ھ) کی کتاب منازل السائرین کی شرح ہے۔ عام طور سے حافظ ابن قیم کے سوانح نگاروں نے اس کتاب کا نام مراحل السائرین ذکر کیا ہے۔ (۶۷)

اس کتاب میں مؤلف نے سورۃ فاتحہ کے معانی و مطالب اور حقائق و معارف پر گفتگو کی ہے، اہل بدعت اور اہل ضلال کا رد کیا ہے اور سائرین و سالکین کے منازل اور عارفان راہ طریقت کے مقامات کو بیان کیا ہے۔ (۶۸) اور اسی ضمن میں انہوں نے کثرت کے ساتھ شیخ الاسلام ابو اسماعیل عبد اللہ انصاری ہروی کی کتاب منازل السائرین سے نقل کیا ہے اور اس طرح پوری کتاب کی شرح کر دی ہے۔ ”قال صاحب المنازل“ کہہ کر وہ شیخ الاسلام کی بات نقل کرتے ہیں اور پھر اس کے بعد کلام کرتے ہوئے اس پر اپنی رائے نقل کرتے ہیں۔

ایک مقام پر صرف تصوف کے رسوم و رواج پر اکتفا کرنے والے قرآن و سنت سے دور متصوفین پر نقد کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے اسی بات پر قسم یا فرمائی ہے کہ ہر شخص گھائے میں ہے اور عرف وہی کامیاب ہے جس کی قوت علیہ اور قوت عملیہ ایمان اور عمل صالح کے ذریعے کامل ہے اور جو حق بات اور اس پر صبر کی وصیت کر کے دوسرے کو کمال عطا کرنے والا ہے، اور ایمان و عمل کو کمال اسی وقت حاصل ہوگا جب کہ ایمان و عمل پر صبر کیا جائے اور ایمان و عمل کی وصیت کی جائے۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی زندگی کے لحاظ بلکہ وہ زندگی کی ہر ایک سانس عالی مطالب کے حصول میں صرف کرے اور اس طرح وہ مکمل خسارے سے نجات پائے۔ اور یہ اسی صورت میں حاصل ہوگا جب کہ قرآن کی طرف کامل توجہ کی جائے اور قرآن کے معانی و مفہیم میں غور و فکر سے قلبی تعلق قائم کیا جائے، اس کے خزانوں کو نکالا جائے، اس کے دینیوں کو کرید کر سامنے لایا جائے، اس کی طرف توجہ کی جائے اور اس کی طرف پورا لو لگایا جائے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہی معاش و معاد میں اپنے بندوں کے مصارع کا ذمہ دار ہے اور وہی اپنے بندوں کو رشد و ہدایت پر گام زن کرنے والا ہے۔ لہذا حقیقت، طریقت، ذوق اور صحیح مواجہہ ساری چیزیں مشکاک الہی سے منتخبتیں ہوں گی اور اس کے ثمرات اس کے شجر سے ہی برآمد ہوں گے۔ (۶۹)

سالک کے منازل میں ایک منزل خشوع بھی ہے۔ خشوع کی حقیقت اور پھر اس کے

درجات بیان کرنے کے بعد خشوع کا تیسرا درجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

”خشوع کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ رکاشتے کے وقت حرمت مقام کی حفاظت کی جائے اور ”وقت“ کو لوگوں کے ریا سے پاک و صاف رکھا جائے اور لگا ہیں محض اسی کے فضل و کرم پر لگی ہوں۔ رکاشتے کے وقت حرمت کی حفاظت کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو عاجزی اور انکساری کے ذریعے انبساط اور شوشی سے روکا جائے، اس لیے کہ کلغہ انبساط و شوشی کا سبب بنتا ہے اور ایسے مقام پر اگر خشوع حرمت مقام کا محافظ نہ ہو تو غلطیاں کا خدشہ ہے، اور لوگوں کے دکھاوے سے وقت کو پاک و صاف رکھنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے وقت کو ریا سے پاک رکھے کیوں کہ اس مقام پر فائز حضرات تو اس چیز سے بہت بلند ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح اس نے عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کیا ہے اسی طرح مقدر و بھرا اپنے اچھے احوال کو لوگوں سے چھپائے تاکہ لوگ اس پر مطلع نہ ہوں اور اس کے رکاشتے پر لوگوں کی اطلاع کی وجہ سے اس کے اندر رعب و غرور پیدا نہ ہو، اور گنہ ایسا نہ ہو کہ اس کی وجہ سے اس کا وقت، اس کا قلب اور اس کا حال فاسد ہو جائے۔ کتنے سالک اس بیابان سلوک میں لٹ گئے اور وہی شخص محفوظ رہ سکا جس کو اللہ تعالیٰ نے محفوظ رکھا۔ لہذا اس مقام پر سالک صابق کے لیے تواضع اور انکساری سے آراستہ ہونے سے زیادہ کوئی بھی چیز نفع بخش نہیں ہے۔ اور یہ اعتقاد رکھے کہ اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور وہ تو ان لوگوں میں سے ہے جس کا اسلام ہی ابھی درست نہیں ہوا ہے۔ پھر وہ اسلام میں شرف و منزلت کا دعویٰ کیسے کر سکتا ہے۔ (۷۰)

تو کل کے درجات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

تو کل کا چھٹا درجہ یہ ہے کہ قلب کو مکمل طور سے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا جائے اور سارے اسباب کو سمیٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کر دیا جائے اور اپنے تمام میلانات و خواہشات کو ختم کر دیا جائے اور اسی لیے اس کی تفسیر کرنے والوں نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ تو کل یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس طرح ہو جائے جس طرح مردہ غسل دینے والے کے سامنے ہوتا ہے، کہ وہ جس طرح چاہے تصرف کرے، اس کی اپنی کوئی حرکت اور کوئی تدبیر نہ ہو اور یہی مقصود ان لوگوں کا ہے جنہوں نے کہا ہے کہ تو کل یہ ہے کہ تدبیر چھوڑ دی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ کی تدبیر کے سامنے خود سپردگی کر دی جائے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ امر و نہی کو چھوڑ دیا جائے بلکہ رب تعالیٰ جو آپ کے ساتھ کرنا چاہتا ہے اس میں تدبیر چھوڑ دی جائے، وہاں نہیں جہاں اس نے بندے کو کسی کام کے کرنے کا حکم دیا ہے۔ (۷۱)

معرفت کے مضمین میں علم کے تعلق سے صوفیہ کا موقف واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
علم کے تعلق سے اہل حق صوفیہ کا موقف یہ ہے کہ صوفیہ کی جماعت معرفت کو صلیم پر ترجیح

دیتی ہے اور ان میں سے اکثر لوگ حصول علم کے لیے تیار نہیں ہوتے بلکہ اسے قاطع راہ طریقت اور حجاب قرار دیتے ہیں، جب کہ صوفیہ میں اہل استقامت حضرات اپنے مرہبہ بن کو حصول علم کا بہت تاکید دیتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ جب تک کوئی صاحب علم نہیں ہوتا اس وقت تک وہ اللہ کا کامل ولی نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے نہ کسی جاہل کو اپنا ولی بنایا اور نہ کسی جاہل کو اپنا کمال کا سرچشمہ ہے۔ (۷۲)

حافظ ابن قیم کی عملی زندگی میں تصوف

گزشتہ صفحات میں حافظ ابن قیم کی مختلف کتب تصوف کا تعارف پیش کیا گیا اور ان سے متعدد اقتباسات پیش کیے گئے، اب ہم مورخین کی تصریحات کی روشنی میں ان کی عملی زندگی میں تصوف معنوی اور حقیقی کے عناصر تلاش کریں گے جس سے قاری کے لیے یہ فیصلہ آسان ہو جائے گا کہ ان کو ذوق تصوف حاصل ہے یا نہیں۔ ہم پچھلے صفحات میں ذکر کر چکے ہیں کہ جو بھی عقیدے کی صحیح کے ساتھ تزکیہ باطن اور مقام احسان تک رسائی کے لیے کوشاں ہو، ہم صوفی اور متصوف کے نام کا اطلاق ایسے شخص پر کر سکتے ہیں اور ہم اسے راہ سلوک کا مسافر قرار دے سکتے ہیں۔ چنانچہ ابن قیم جوزی کی کثرت عبادت، محبت الہی، جوش و ولولہ اور مقام احسان تک رسائی کے لیے ان کے عبادات و عبادات کو بیان کرتے ہوئے حافظ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں :

وہ کثیر العبادات اور بڑے شب بیدار تھے۔ ان کی نماز بڑی دراز اور ہر سکون موقوت تھی۔ وہ ہر وقت ذکر و شغل میں مصروف رہتے، ان کے اندر حسب الہی کا ایک جوش اور تابیت و رجوع کی ایک خاص کیفیت تھی۔ ان کے چہرے پر بارگاہ خداوندی کی طرف فقر و احتیاج اور غر و انکساری کا نور معلوم ہوتا تھا۔ میں نے ان کو اس کیفیت میں بالکل منفرد اور ممتاز پایا۔ کئی مرتبہ سعادت حج سے سرفراز ہوئے اور ایک زمانے تک مکہ معظمہ میں اقامت پذیر رہے۔ اہل مکہ ان کی کثرت عبادت اور کثرت طواف کے ایسے حالات و واقعات سناتے ہیں جو باعث حیرت ہیں۔ (۷۳)

علامہ ابن کثیر البدریہ و التہامیہ میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

مجھے معلوم نہیں کہ ہمارے زمانے میں دنیا میں ان سے زیادہ کوئی عبادت گزار اور کثرت کے ساتھ نوافل ادا کرنے والا تھا۔ وہ نمازیں یزیدی پڑھتے اور رکوع و سجود بہت طویل کیا کرتے۔ بعض اوقات ان کے احباب ان کو ملا مت بھی کرتے لیکن اس کے باوجود وہ اس کثرت نہیں کرتے اور اپنا یہ عمل بند نہیں کرتے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ مجموعی حیثیت سے اپنے امور و احوال میں ان کی نظیر کم ہوگی۔ (۷۴)

حافظ ابن قیم کی زندگی کا ایک بڑا حصہ بعض اسباب کی بنا پر قید و بند کی صعوبتوں کو جھیلتے ہوئے گزرا۔ ان کی زندگی کا یہ حصہ تو بظاہر مشکلات و تکالیف سے گزر رہا لیکن دینی اور روحانی لحاظ سے یہ ان کے لیے بڑا نفع بخش اور عظیم فتوحات کے حصول کا ذریعہ ثابت ہوا۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے شاگرد حافظ ابن رجب حنبلی لکھتے ہیں:

اس پوری مدت میں وہ تلاوت قرآن اور اس کے معانی میں تدبر و تفکر میں مشغول رہے۔ اس سے ان کو بڑے فتوحات خیر حاصل ہوئے اور ان کو صحیح ذوق و وجد کا بڑا حصہ حاصل ہوا، جس کی وجہ سے اہل معارف کے علوم اور ان کے غوامض و دقائق کا سمجھنا، سمجھانا اور ان پر کلام کرنا ان کے لیے آسان ہو گیا۔ ان کی تصنیفات اس طرح کے مضامین سے بھری ہوئی ہیں۔ (۷۵)

ان کے شاگرد حافظ ابن رجب حنبلی اور ان کے دوست حافظ ابن کثیر کسان بیانات کے علاوہ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ حافظ ابن رجب نے ان کو ”عارف“ (۷۶) کے لقب سے یاد کیا ہے جو خاص صوفیہ کی اصطلاح ہے اور خود ان کی وہ تصنیفات جو موضوعات تصوف پر مشتمل ہیں، ان میں علمی اور عملی تصوف کے نمونے چاہے نظر آتے ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ ان کی عملی زندگی رنگ تصوف میں رنگی ہوئی ہے۔

جائزہ و خلاصہ بحث

اگر ہم پچھلے صفحات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ آغاز گفتگو میں ایک سوال اٹھایا گیا اور اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے پہلے تصوف اور صوفیہ کے تعلق سے ان کی رائے پیش کی گئی، پھر کسی کو معنوی طور پر صوفی یا متصوف کہہ جاسکتا ہے، اس کی کسوٹی بھی بیان کی گئی اور پھر اس کے بعد موضوعات تصوف پر مشتمل ان کی کتابوں کی فہرست دی گئی اور پھر ان کتابوں کو بنیاد بنا کر آگے کی گفتگو کی راہ ہموار کی گئی، بالترتیب ان کتابوں کا تفصیلی تعارف پیش کیا گیا اور ان کی ہر کتاب سے ذوق تصوف کی شہادت دینے والا کم از کم ایک اقتباس ”مشتے نمونہ از خروارے“ کے طور پر پیش کیا گیا، اور پھر عملی طور پر ان کے ذوق تصوف کی تائید میں ان کے ہم عصر دوسو شخصین کی تاریخی شہادت پیش کی گئی۔ چنانچہ تصوف اور صوفیہ سے متعلق حافظ ابن قیم کی رائے، ان کی کتابوں کے مطالعے اور ان سے دیے گئے اقتباسات اور مورخین کے تاریخی بیانات کی روشنی میں اس بحث کے مندرجہ ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

۱۔ وہ تصوف فلسفی کے منکر ہیں اور فلسفہ سے متاثر صوفیہ پر تنقید کرتے ہیں اور وحدت الوجود جیسے مسائل کو اس لیے قبول نہیں کرتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق اس کی وجہ سے حلول و اتحاد اور پوری کائنات کے خالق ہونے کا نظریہ سامنے آتا ہے۔ البتہ لاموجود والا اللہ جیسے کلمات

اگر صوفیہ عارفین سے منقول ملتے ہیں تو ان کی یہ تاویل پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے خارج میں وجود کی نفی نہیں کی ہے بلکہ سالک کے شہود و احساس میں ماسوا کے وجود کی نفی کی ہے۔

۲۔ وہ حنبلی صوفیہ پر تنقید کرتے ہیں کیوں کہ انہوں نے نظام شریعت کو مطلق کر کے یا پس پشت ڈال کر رسم و رواج کو یقین شریعت سمجھ رکھا ہے اور ان کی نظر خالق سے نیا وہ مخلوق کی طرف مرکوز ہے۔

۳۔ وہ تصوف شری کو قبول کرتے ہیں، اہل استقامت صوفیہ کی آرا نقل کرتے ہیں اور ان صوفیہ کو اہل حق جماعت میں شامل قرار دیتے ہیں، صوفیانہ اصطلاحات کو بھی قبول کرتے ہیں البتہ اس ضمن میں وہ محقق کی حیثیت سے بعض اصطلاحات اور فروعی مسائل سے کٹکے یا جزوی طور پر اختلاف کرتے ہیں، صوفیہ سے بعض مبہم اقوال کی شرح بھی کرتے ہیں اور اس کے صحیح معانی کی طرف اشارہ بھی کرتے ہیں۔

۴۔ ان کی فکری اور عملی زندگی بلاواسطہ حقیقت تصوف کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ تشریف تصوف اور رسومات تصوف سے خواہ انہیں جس قدر رعب ہو لیکن قرآن وحدیث کے گہرے مطالعے اور مشائخ صوفیہ کرام کی تالیفات اور ان کے اقوال پر وسیع معلومات کی وجہ سے ان کی تحریریں ذوق تصوف سے لبریز اور عملی زندگی پر حضرات صوفیہ کے گہرے اثرات معلوم ہوتے ہیں۔ بالجملہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں وہ حقیقت تصوف کو قبول کرنے والے اور تزکیہ و احسان کی راہ پر گام زن ہیں اور صوفیہ کی اصطلاح کے مطابق کم از کم وہ متصوف ضرور ہیں اور اس نتیجے سے ان لوگوں کی تردید ضرور ہوتی ہے جو علامہ ابن جوزی، شیخ ابن تیمیہ اور حافظ ابن قیم وغیرہم جیسے دوسرے علما کی آڑ میں تصوف پر تنقید کی بجائے تصوف کی تردید کرتے ہیں، تصوف کے نام پر رائج غلط عناصر پر قدغن لگانے کے بجائے سرے سے تصوف کو مسترد کرتے ہیں اور یہ تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ مذکورہ بالا شخصیات کے نزدیک تصوف بالکلیہ گم راہی کا نام ہے اور صوفیہ کی ساری جماعتیں گم راہ ہیں۔ جو لوگ اس نتیجے تک پہنچے ہیں یقیناً ان کی بحث میں کہیں نہ کہیں کوئی حتم ہے یا پھر وہ خود ساختہ نتائج لوگوں کے سامنے پیش کر رہے ہیں، جب کہ ناقدین تصوف کے مختلف اقوال کو ایک خاص زاویے سے پیش کرتا اور ان سے مزعمہ نتائج اخذ کرنا ان محققین کا شیوہ نہیں جو حق کی تلاش میں روز و شب سرگرداں ہیں اور اپنا کرنے والے تحقیق کی اخلاقیات کے لحاظ سے مجرم تو ہیں ہی وہ کل پر وزحشر بھی احکم الحاکمین کی بارگاہ میں مجرموں کی صف میں کھڑے نظر آئیں گے۔

لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ قبول حق اور شاعت حق کی کوشش کی جائے، خواہ وہ ہمارے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور صوفیہ اور تصوف کے حوالے سے ہمارے اسلاف اور جمہور علمائے دین کا جو موقف ہے اسے پیش کیا جائے اور کسی جماعت کو بھی گم راہ قرار دیتے وقت رب تعالیٰ کا یہ فرمان پیش نظر رہے کہ بے شک تمہارا رب نیا وہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے منحرف اور کون راہ ہدایت پر

ہے۔ (۷۷) یونہی صوفیہ کے متعلقین و متبیین کو بھی چاہیے کہ وہ بھی جاوہ حق سے منحرف نہ ہوں، رسوم و رواج کے بجائے حقیقت تصوف کی ترویج و اشاعت کے لیے جہد مسلسل کریں اور کسی بھی بات کو صرف اس بنا پر ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کی کوشش نہ کریں کہ اس کا قائل ان پر تنقید کر رہا ہے اور ان کی ہر بات من و عن قبول نہیں کرتا ہے۔ ایسے موقع پر ”مثالاً کہ پنگل خفتہ باثر“ پیش نظر رہے اور حق کو قبول کیا جائے خواہ وہ کہیں سے بھی آئے اور ہمیشہ ہماری توجہ اپنی اصلاح اور غیروں کے لیے تمنائے ہدایت پر مرکوز رہے۔ کون شاہ راہ ہدایت پر ہے اور کون اس سے منحرف، اس کی حقیقت اللہ جانتا ہے، یہ عقیدہ بھی پیش نظر ہے۔ یہی صوفیہ توحید ہے اور یہی صوفیہ کا طریقہ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق سننے، حق دیکھنے، حق سمجھنے، اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

حوالہ جات

۱۔ ذیل طبقات اچھا بلہ، ص: ۳۶۱، مصدر الکتاب: <http://www.alwarraq.com>

۲۔ نفس مصدر ص: ۳۶۱-۳۶۲

۳۔ البدایہ والنہایہ، ج: ۱۲، ص: ۷۷۰، مصدر الکتاب: موقع یعسوب

۴۔ ذیل طبقات اچھا بلہ ص: ۳۶۲

۵۔ نفس مصدر

۶۔ تاریخ دعوت و عزیمت، ۳۲۸/۲، مجلس تحقیقات و نشریات اسلام، لکھنؤ ۲۰۰۵ء

۷۔ ذیل طبقات اچھا بلہ ص: ۳۶۲، البدایہ والنہایہ، ج: ۱۲، ص: ۷۷۰

۸۔ دیکھئے: مدارج السالکین اور ان کی دوسری کتابیں

۹۔ القرآن، والشمس: ۹

۱۰۔ دیکھئے: مدارج السالکین میں مذکور مختلف مباحث اور ان کی دیگر تالیفات تصوف؛

خصوصیت کے ساتھ مدارج السالکین، ج: ۱، ص: ۳۹، ۱۷۱، ۱۵۵، ج: ۳، ص: ۱۵۱،

۱۱۔ دیکھئے: www.attaweel.com اور التصوف والصوفیہ فی ضوء الکتاب و

السنۃ للسید یوسف باشم الرفاعی۔ یہ عبارت ان حوالوں میں موجود ہے لیکن جب میں نے اصل

ماخذ یعنی مدارج السالکین شرح منازل السائرین، جو اکتیتہ الشاملہ میں موجود ہے، سے رجوع

کیا تو مجھے یہ عبارت تلاش ہیا رکے باوجود نہیں مل سکی، حالانکہ جنہوں نے یہ عبارت ذکر کی ہے

ان کا نام علمی دنیا میں ایک معتبر حوالہ ہے۔ لہذا اس عبارت کا امین قلم کی مذکورہ کتاب میں نہ ملنا ان

کی کتابوں میں تحریف کا غماز ہے۔

۱۲۔ نفس مصدر ج: ۲، ص: ۳۳۰

۱۳۔ نفس مصدر، ج: ۱، ص: ۱۳۵

۱۴۔ نفس مصدر، ج: ۲، ص: ۳۰۷

۱۵۔ طریق البحر تین، ص: ۲۶۱، ۲۶۰

۱۶۔ مدارج السالکین، ج: ۲، ص: ۶۳۹

۱۷۔ نفس مصدر، ج: ۱، ص: ۳۹

۱۸۔ نفس مصدر، ج: ۳، ص: ۳۳۰

۱۹۔ نفس مصدر، ج: ۳، ص: ۱۵۱

۲۰۔ نفس مصدر، ج: ۳، ص: ۱۲۸

۲۱۔ دیکھئے مدارج السالکین میں مختلف مقامات پر سماع کی بحث

۲۲۔ نفس مصدر، ج: ۳، ص: ۳۳۳

۲۳۔ نفس مصدر، ج: ۳، ص: ۳۳۵

۲۴۔ نفس مصدر

۲۵۔ نفس مصدر، ج: ۱، ص: ۱۳۹

۲۶۔ نفس مصدر، ج: ۱، ص: ۱۵۵

۲۷۔ نفس مصدر، ج: ۲، ص: ۲۵۷

۲۸۔ نفس مصدر

۲۹۔ ذیل طبقات اچھا بلہ، ص: ۳۶۲

۳۰۔ ج: ۱، ص: ۳، ماشرار المعرفۃ، طبع ثانی، تحقیق: محمد حامد الفتی

۳۱۔ نفس مصدر ص: ۶-۵ ملخصاً

۳۲۔ نفس مصدر ص: ۱۰۳-۱۰۴

۳۳۔ نفس مصدر ص: ۱۰۴ ملخصاً

۳۴۔ نفس مصدر، ج: ۲، ص: ۳۶۷

۳۵۔ ص: ۳، ماشرار اکتب العلمیہ، طبع ثانی ۱۳۹۳-۱۹۷۳

۳۶۔ نفس مصدر ص: ۱۱۱-۱۱۲

۳۷۔ ص: ۲۸، دار الکتاب العربی، بیروت، ۱۴۰۵-۱۹۸۵ء، تحقیق: عبدالرحمن عوض

۳۸۔ ص: ۱۹۶، ماشرار اکتب العلمیہ، بیروت

۳۹۔ نفس مصدر ص: ۲۱۵

- ۴۰- نفس مصدر ص: ۳۳۴
 ۴۱- نفس مصدر
 ۴۲- ص: ۳، ناشر دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۴۱۲ھ-۱۹۹۳ء
 ۴۳- نفس مصدر ص: ۲۵۹-۲۶۰
 ۴۴- ص: ۲۷۲، دارالعروبة، کویت، ۱۹۸۷ء، تحقیق شعیب الارناؤط، عبدالقادر الارناؤط
 ۴۵- نفس مصدر ص: ۴۳۴
 ۴۶- نفس مصدر: ۴۸۲
 ۴۷- ص: ۶، ناشر مکتبۃ المدنی، جدہ، تحقیق: محمد جمیل غازی
 ۴۸- نفس مصدر ص: ۷۳-۷۴
 ۴۹- نفس مصدر ص: ۵۹
 ۵۰- نفس مصدر: ۵۹-۶۱ ملخصاً
 ۵۱- ملخصاً ص: ۱۹-۲۱، دار ابن القیم، دمام، طبع ثانی، ۱۴۱۲ھ/۱۹۹۶ء، تحقیق: عمر بن محمود ابوعمر
 ۵۲- نفس مصدر ص: ۴۰
 ۵۳- ملخصاً ص: ۹، دارالکتب العلمیہ، بیروت، تحقیق: زکریا علی یوسف
 ۵۴- نفس مصدر: ۸۸
 ۵۵- نفس مصدر: ۲۲۲-۲۲۳
 ۵۶- ج: ۱، ص: ۳۰۵، ناشر دارالکتب العلمیہ، بیروت
 ۵۷- ج: ۱، نفس مصدر ص: ۲۹۸
 ۵۸- نفس مصدر ج: ۲، ص: ۲
 ۵۹- ج: ۱، ص: ۵۷۷، ناشر: مؤسسة الرسالة، بیروت، سال طباعت ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۴ء
 ۶۰- المسألة الأولى، ص: ۵-۱۶، دارالکتب العلمیہ، بیروت، ۱۳۹۵ھ/۱۹۷۵ء
 ۶۱- المسألة الثانية، نفس مصدر ص: ۷-۲۰
 ۶۲- نفس مصدر، المسألة الثالثة، ص: ۲۰-۳۳
 ۶۳- نفس مصدر، المسألة الخامسة، ص: ۳۸-۴۱
 ۶۴- المسألة الرابعة عشرة، ص: ۸۹، ۹۰، المسألة الخامسة عشرة، المسألة السادسة عشرة
 ۶۵- نفس مصدر، المسألة السابعة عشرة، ص: ۱۱
 ۶۶- نفس مصدر، المسألة الثامنة عشرة، ص: ۲۵۶-۲۵۷

- ۶۷- ذیل طبقات الخنابلة ص: ۳۶۲، شذرات الذهب فی اخبار من ذهب، ابن العماص: ۱۶۸
 ۶۸- ویکھئے: ج: ۱، ص: ۷، دارالکتب العربیہ، بیروت، ۱۹۷۳ء، تحقیق محمد عبدالقاسمی
 ۶۹- نفس مصدر ج: ۱، ص: ۷
 ۷۰- نفس مصدر ج: ۱، ص: ۵۲۲
 ۷۱- نفس مصدر ج: ۲، ص: ۱۲۱-۱۲۲
 ۷۲- نفس مصدر ج: ۳، ص: ۳۳۵
 ۷۳- ذیل طبقات الخنابلة ص: ۳۶۲
 ۷۴- ج: ۱، ص: ۲۷۰
 ۷۵- ذیل طبقات الخنابلة، ص: ۳۶۲
 ۷۶- نفس مصدر: ۳۶۱
 ۷۷- القرآن الکریم، الفحل: ۱۲۵

(نوٹ) اس مقالے کی تیاری میں تاریخ دعوت و عزیمت کو چھوڑ کر سارے مصادر و مراجع ”المکتبۃ الشاملۃ“ سے لیے گئے ہیں، لہذا اہل زار میں دستیاب مطبوعہ کتابوں سے مقالے میں دیے گئے حوالوں کے صفحات مختلف ہو سکتے ہیں۔

○○○

الغزالی بین مادحیہ و ناقدیہ - ایک تجزیاتی مطالعہ

حجتہ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی (۱۰۵۸ء/۱۰۵۹ھ - ۱۱۱۱ء/۱۱۱۱ھ) ایک ایسی عبقری شخصیت کا نام ہے جنہیں ان کے بے مثال کارناموں اور زریں خدمات کی وجہ سے شہرت دوام حاصل ہوئی۔ متقدمین و معاصرین نے انہیں حجتہ الاسلام اور حجتی علوم الدین کے لقب سے یاد کیا۔ عقائد و اعمال کی اصلاح، فرق باطلہ کے خلاف جہاد اور معاصر فلاسفہ کے گم راہ کن نظریات کے خلاف معرکہ آرائی اور ان جیسے متعدد و تجدیدی کارناموں نے انہیں پانچویں صدی کے مجددی حیثیت سے متعارف کر لیا۔ ان کی عہد ساز شخصیت اور ان کے شاندار کارناموں پر تحقیق و تنقید کا سلسلہ صدیوں سے جاری ہے۔ ان کے افکار و نظریات پر بحث و تحقیق اور جلیل القدر علما کا نقد و نظر، ان کی عظمت و رفعت کی دلیل ہے۔

امام غزالی اپنی گونا گوں خصوصیات اور فضائل و کمالات کے باوصف تاریخ کی دوسری عظیم المرتبت شخصیتوں کی طرح تعریف و توصیف کے ساتھ ایک دوسرے طبقے کی شدید تنقید کا بھی نشانہ رہے۔ ان کے افکار و نظریات پر طرح طرح سے اعتراضات کیے گئے۔ ان کی تصانیف پر نقد و نظر کی محفلیں سجائی گئیں۔ امام غزالی کے مآخذین کوئی عام یا معمولی افراد نہیں تھے بلکہ علوم و فنون میں گہری بصیرت رکھنے والے چوٹی کے وہ علمائے جن کی حیثیت اہل علم کے درمیان مسلم تھی۔ امام غزالی کے مآخذین میں خصوصی طور پر ابو بکر بن العربی، حافظ بن عبدین ابن الصلاح، ابو الفرج ابن جوزی، ابن تیمیہ، ابن قیم، ابن رشد اور ابو عبد اللہ مازری مالکی کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی

ڈاکٹر یوسف القرضاوی ۹ ستمبر ۱۹۲۶ء کو مصر میں پیدا ہوئے۔ ۹ برس کی عمر میں حفظ قرآن کریم کی تکمیل کی، پھر جامعہ ازہر میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک عرصے تک مصر کی وزارت

مذہبی امور میں کام کیا۔ ان کی بعض تصانیف سے مصری حکومت مشتعل ہو گئی اور انہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے جانا پڑا۔

ڈاکٹر قرضاوی یورپین کونسل فار قفاوی اینڈ ریسرچ سینٹر کے سربراہ ہیں۔ عرب و دنیا میں انہیں غیر معمولی مقبولیت حاصل ہے۔ وہ اسلام آن لائن ڈاٹ نیٹ (islamonline.net) پر بھی لوگوں کے سوالات کے جوابات اور قفاوی جاری کرتے ہیں۔ ڈاکٹر قرضاوی کا خیال ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کو گرین وٹج کے نام کے بجائے مکہ مکرمہ کے نام کو بد نظر رکھنا چاہیے۔ وہ تصویر کشی کو جائز قرار دیتے ہیں۔ اب تک ان کی پچاس سے زائد تصانیف شائع ہو چکی ہیں۔ (۱) ڈاکٹر قرضاوی بنیادی طور پر آزاد خیال سلفی ہیں۔ یعنی عام سلفیوں کی طرح سخت گیر اور متعصب نہیں ہیں، بلکہ اپنے مطالعے اور مشاہدے سے جوابات انہیں حق معلوم ہوتی ہے اس کے اظہار میں تامل نہیں کرتے، خواہ وہ سلفی نظریات کے خلاف کیوں نہ ہو۔ وہ ابن تیمیہ اور امام غزالی کو آئینڈیل قرار دیتے ہیں۔

الغزالی بین مادحیہ و ناقدیہ

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی گراں قدر تالیف ہے، جس میں انہوں نے علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں امام غزالی قدس سرہ کے نقد و نظر اور اصلاحات اور دین کی تجدید و احیاء میں ان کے شاندار کارناموں کو پیش کر کے ان کے مآخذین اور ناقدین کا جائزہ لیا ہے۔

اس کتاب کی تالیف کا سبب یہ ہوا کہ حجتہ الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی کی وفات کے نو سو سال مکمل ہونے پر، مسیسکو کی ایک اسلامی ثقافتی تنظیم کی جانب سے اسلامی ممالک کی یونیورسٹیز کو ایک مکتوب ارسال کیا گیا، جس میں اس عظیم اسلامی مفکر اور عبقری شخصیت کی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کانفرنس، سیمینار اور جشن کے اہتمام کی تجویز پیش کی گئی۔ اسلامی ممالک کی دوسری یونیورسٹیز کی طرح جامعہ قطر نے اس مبارک تجویز کو قبول کرتے ہوئے جشن کے اہتمام کا فیصلہ لیا۔ اس موقع پر سیمینار اور سیمپوزیم کے انعقاد کے ساتھ ساتھ غزالی کی حیات و خدمات پر ایک جامع کتاب کی اشاعت کا بھی ارادہ ہوا۔ مؤلف گرامی ڈاکٹر یوسف القرضاوی سے دس بارہ صفحات پر مشتمل مقدمے کی فرمائش کی گئی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا اہم قلم جب روائے دواں ہوا تو پھر صفحات کی تجدید بے معنی ہو گئی۔ وہ غزالی کے فضائل و کمالات اور ان پر کیے جانے والے نقد و نظر پر لکھتے گئے، یہاں تک کہ ان کا یہ مقدمہ ۱۹۶ صفحات پر مشتمل ایک کتاب کی صورت میں مکمل ہوا، جس کا ایک حصہ جامعہ قطر کے کلائیہ اشراعیہ کی جانب سے شائع ہونے والی کتاب میں بطور مقدمہ شامل کیا گیا۔ اسی موقع کی یہ تحریر بعد میں ”الغزالی بین مادحیہ و ناقلیہ“ کے

نام سے طبع ہو کر منظر عام پر آئی۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی اس کتاب کو بنیادی طور پر دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصے میں امام غزالی کا علمی و فکری مقام، مختلف علوم و فنون میں ان کے بے مثال کارنامے، احیائے دین کے لیے ان کی مخلصانہ جدوجہد اور جمہور مسلمین کے نزدیک ان کی بے پناہ مقبولیت کے اسباب بتائے ہیں، جب کہ کتاب کے دوسرے حصے میں امام غزالی کے ماحیثین و مآثر دین اور ان پر کیے جانے والے نقد و جرح کی حقیقت کا جائزہ لیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کہتے ہیں کہ غزالی اپنے زمانے میں علوم و فنون کا انسائیکلو پیڈیا تھے۔ فقہ، اصول فقہ، کلام، فلسفہ، منطق، تصوف، اخلاق اور ادیان وغیرہ فنون پر آپ کی تصانیف اس پر شاہد ہیں۔ شیخ الازہر الاستاذ شیخ محمد مصطفیٰ مراغی کے بقول:

”جب علما کا نام آتا ہے تو ذہن ان علوم کی طرف منتقل ہوتا ہے جن علوم میں انھیں اختصاص حاصل ہے۔ مثلاً جب ابن سینا یا فارابی کا ذکر آتا ہے تو فلسفے کا خیال آتا ہے، اس لیے کہ وہ عظیم فلسفی تھے۔ امام مسلم، بخاری اور احمد کا ذکر چھڑتا ہے تو علم حدیث میں ان کی معرفت، دیانت، صداقت اور امانت کا خیال آتا ہے۔ لیکن جب غزالی کا ذکر ہوتا ہے تو علوم و فنون کی متعدد ایسی شخصیتوں کا تصور پردہ ذہن پر ابھرتا ہے جن میں سے ہر ایک علم و فن کے بحرنا پیدا کن تھے۔ غزالی جہاں مابعد اصولی معلوم ہوتے ہیں وہیں عظیم فقیہ، بے مثال متکلم، ماہر فلسفی، مآخذ فلسفہ، امام السنۃ، احوال عالم کے راز و اس، قلبی کیفیات کے آشنا بھی۔ گویا ایک ہی شخص متعدد علوم و فنون کے انسائیکلو پیڈیا نظر آتے ہیں۔“ ۱

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی اس کتاب میں یہ سوال زور و شور سے اٹھایا ہے کہ غزالی کے عہد میں متعدد علما ایسے تھے، جنہیں مروجہ علوم پر گہری بصیرت حاصل تھی، پھر کیا وجہ ہے کہ جمہور مسلمین نے حجۃ الاسلام کا لقب امام غزالی ہی کے لیے منتخب کیا؟ وہ کون سے کارنامے ہیں جن کی وجہ سے انھیں پانچویں صدی ہجری کا مجدد کہا جاتا ہے؟ کیا غزالی حدیث نبوی ”ان السلف بیعت لہذہ الامۃ علیہا دس کملی مائۃ سنۃ من یجدد لہا دینہا“ (رواہ الحاکم و ابن ماجہ) کے صحیح معنوں میں مصداق تھے؟

ان سوالوں کے جواب کے لیے ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے غزالی کے عہد کے حالات کا سرسری جائزہ پیش کرنے کے بعد غزالی کے ان کارناموں کو ترتیب وار پیش کیا ہے جن کی وجہ سے وہ بجا طور پر حجۃ الاسلام اور پانچویں صدی کے مجدد کہے جانے کے مستحق نظر آتے ہیں۔ ذیل میں ڈاکٹر قرضاوی کی تفصیلی بحث کا اختصار پیش کیا جاتا ہے۔

فلاسفہ سے معرکہ آرائی

غزالی کے عہد میں دینی اصول میں فلسفیانہ افکار کی آمیزش نے دین کی بنیادوں کو کھوکھلا کرنا شروع کر دیا تھا۔ بے لگام فلسفیانہ موشگافیوں کی وجہ سے طرح طرح کی بد عقید گلیاں پیدا ہو رہی تھیں، جن کا دائرہ اثر دن بہ دن وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ عام لوگوں کے دلوں میں دین کے تعلق سے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے تھے۔ ان کا یقین متزلزل ہو رہا تھا۔ دینی شعائر کی عظمت و رفعت ان کے دلوں سے ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اس دور کے علما ان کی تردید و ابطال کے لیے جدوجہد بھی کر رہے تھے۔ لیکن ان کی دفاعی کوششیں ان کے پیہم حلوں کے مقابلے میں بے اثر تھیں۔ اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے کسی ایسے مرد حق آگاہ کی ضرورت تھی جو نہ صرف یہ کہ دین کے رموز و اسرار پر گہری بصیرت رکھتا ہو، بلکہ فلسفہ کے اصول و قوانین کی باریکیوں سے بھی پوری طرح واقف ہو۔ امام غزالی نے اسلامی اصول و قوانین، بنیادی عقائد اور اسلامی فلسفے کے تناظر میں مخالفین کے اعتراضات و تنقیدات کا زبردست تاقب و محاسبہ کیا اور اسلامی علوم و فنون کے ذریعے اس کی کڑی گرفت کی، جس کے بعد مخالفین کی قلبی کھل گئی اور حق آئینہ کی طرح نمایاں ہو گیا۔

امام غزالی کے زمانے میں علوم فلسفہ کی کئی شاخیں تھیں۔ چوں کہ وہ تمام شاخیں دین کے اصول سے متصادم نہیں تھیں۔ لہذا تردید و ابطال سے قبل امام غزالی نے علوم فلسفہ کو چھ قسموں میں تقسیم کیا۔ ۱۔ ریاضی (Mathematics)، منطق (Logic) ۲۔ طبیعیات (physics) ۳۔ الہیات (Metaphysics) ۴۔ سیاسیات (Political Science) ۵۔ اخلاقیات (Ethics) پھر علوم فلسفہ کی ان چھ قسموں کو شرعی احکام کے اعتبار سے تین قسموں میں تقسیم کیا۔

۱۔ ”قسم یجب بہ التکفیر“ (پہلی قسم: جس کے قائل کی تکفیر کی جائے گی)۔
۲۔ ”قسم یجب بہ التبدیع“ (دوسری قسم: جس کے قائل پر بدعتی ہونے کا حکم لگایا جائے گا)۔

۳۔ ”قسم لا یجب انکارہ اصلاً“ (تیسری قسم: جس کا انکار ضروری نہیں)۔
علوم فلسفہ کی مذکورہ بالا چھ قسموں میں سے ایک ہی قسم یعنی الہیات کے بعض اصول شرعی اصولوں سے متصادم ہیں جن میں فلاسفہ نے سخت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ الہیات میں فلاسفہ کی غلط فہمیوں کو مجموعی طور پر تین قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، جن میں سے تین امور ایسے ہیں جن کے قائل کی تکفیر کی جائے گی۔ باقی سترہ کے قائل کو بدعتی قرار دیا جائے گا۔ ان ہی میں مساکن میں مذہب فلاسفہ کی تردید کے لیے غزالی نے ”مہافت الفلاسفہ“ لکھی۔ فلاسفہ کی وہ تین غلط فہمیاں

جن کے قائل کی تکفیر کی جائے گی یہ ہیں:

۱- اجسام کا حشر نہیں ہوگا، بلکہ ثواب و عذاب کا تعلق روح سے ہوگا۔

۲- اللہ تعالیٰ کو صرف کمیات کا علم ہے، جزئیات کا نہیں۔

۳- کائنات ازلی اور قدیم ہے۔

النبیات کے علاوہ علوم فلسفہ کی باقی پانچ قسمیں ضروریات دین سے متصادم نہیں، اسی لیے غزالی نے ان سے تعرض نہیں کیا۔ ہاں! ریاضیات اور طبیعیات پر اقدان و یقین کے سبب بعض شرعی قباحیتیں لازم آتی ہیں۔ غزالی نے تنہافت الفلاسفہ اور المعتقد من الصوال میں ان قباحیتوں پر روشنی ڈالی ہے۔

غزالی اور باطنیہ

غزالی کے دور میں دینی و سیاسی منظر نامے میں اسلام کے لیے شدید خطرہ بن کر فرقتہ باطنیہ وجود میں آیا۔ اس فرقے کا خیال تھا کہ ادراک حقیقت اور ہم شریعت کے لیے صرف امام معصوم کا قول و جہت ہو سکتا ہے۔ کتاب و سنت کی جو تشریح وہ کریں وہ قائل جہت ہوگی۔ فرقتہ باطنیہ کے عقائد و اعمال بھی اسلام سے متصادم تھے۔ وہ تعطیل صانع، ابطال نبوت و عبادات کے قائل تھے۔ بعثت بعد الموت کا انکار کیا کرتے تھے۔

فرقتہ باطنیہ کا طریقہ تبلیغ یہ تھا کہ وہ ابتدائی مرحلے میں اپنے ان عقائد کو ظاہر نہیں کرتے۔ بلکہ وہ اللہ و رسول کی حقانیت کا اقرار کرتے اور ابتدا میں صرف یہ کہا کرتے تھے کہ دین کے باطنی اسرار ان ظاہری اسرار کے علاوہ ہیں، جنہیں عام لوگ جانتے ہیں۔ ان باطنی اسرار کے افشا کے لیے ہم امام معصوم کے محتاج ہیں۔

دھیرے دھیرے اس فرقے کی جمعیت بڑھتی گئی اور یہ فرقہ ولیر ہوتا گیا۔ اپنے پُر فریب اور شاطرانہ چالوں سے ایک بڑی تعداد کو انہوں نے اپنا ہم نوا بنا لیا۔ جوان کے اشارہ اور پرچان نچھا کر کرنے کے لیے تیار رہتی۔ اس فرقے نے اپنا سیاسی اثر و رسوخ بڑھانے کے لیے شدت پسندی کا راستہ اختیار کر لیا اور قتل و غارتگری شروع کر دی۔ وہ جس سیاسی یا علمی شخصیت کو اپنے مقصد کے حصول میں رکاوٹ سمجھتے انہیں بڑی مہارت سے قتل کر دیتے۔ ابن جوزی کے بقول: ”وہ انسانوں کا غوا کرتے تھے، پھر انہیں قتل کر کے کنویں میں ڈال دیتے تھے۔ ان کی دہشت گردی اس قدر عروج کو پہنچ گئی تھی کہ اگر کوئی آدمی عصر کے وقت تک اپنے گھر واپس نہیں آ جاتا تو اس کے گھر والے اس کی زندگی سے مایوس ہو جاتے تھے۔ یعنی انہیں یقین ہو جاتا کہ یہ بھی باطنیوں کے تھے چڑھ گیا۔“ (۳)

باطنیہ اپنے گم راہ کن نظریات پر جو دلائل پیش کر رہے تھے، ان کی تردید و ابطال کے لیے علوم عقلیہ و نقلیہ میں تبحر کے ساتھ ساتھ جدیدہ انداز کلام اور وسیع فکر و نظر کی ضرورت تھی۔ یہ اوصاف غزالی کے اندر بدرجہ اتم موجود تھے۔ چنانچہ غزالی نے بڑے موثر انداز میں ان کا رد و بلغ فرما کر ان کی غلط فہمیوں کو آشکارا کیا۔ آپ نے باطنیہ کی تردید میں درج ذیل کتابیں تصنیف فرمائیں۔

۱- فضائح الباطنیۃ ۲- حجة البیان ۳- حجة الحق ۴- مفصل الخلاف ۵- الدرر المرفوم بالجدول ۶- القسطاس المستقیم ۷- قاصم الباطنیۃ ۸- مواہم الباطنیۃ۔

باطنیہ کی دہشت گردی اور ان کی انتقامی کارروائیوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے غزالی ان کی تردید و ابطال میں لگے رہے؛ جب کہ انہیں معلوم تھا کہ یہ وہ جسارت ہے جس کے نتیجے میں اپنی جان سے بھی ہاتھ دھو پڑ سکتا ہے۔ لیکن انہوں نے کمال شجاعت سے باطنیوں کے ساتھ اپنا فکری جہاد جاری رکھا اور احقاق حق اور ابطال باطل کے فریضہ منصبی سے سبک دوش ہوئے۔ امام غزالی کا یہ وہ بڑا کارنامہ ہے جس میں بڑے بڑے اصحاب استقامت کے قدم اکھڑ جائیں، مگر امام غزالی نے باطنیہ کے اس دور میں تجدید اور احیاء دین کا جو فریضہ انجام دیا ہے وہ کسی مجدد ہی کا نامہ ہو سکتا ہے۔

غزالی اور مسئلہ تکفیر

غزالی کے عہد میں متعدد اسلامی فرقوں کا وجود ہو چکا تھا۔ ہر فرقہ اپنے مخالف فرقوں کی تکفیر کا قائل تھا اور انہیں مباح الدم اور خلوفی النار کا مستحق قرار دیتا تھا۔ غزالی اس غلو فی التکفیر کے مخالف تھے۔ انہوں نے بڑے زور و شور سے اس کے خلاف آواز اٹھائی اور اس موضوع پر دو اہم ترین کتابیں ”الاقتصاد فی الاعتقاد“ نیز ”فیصل التفرقة بین الاسلام والنزدة“ تحریر فرما کر مسئلہ تکفیر میں غلو سے بچنے اور اعتدال کی راہ اختیار کرنے کا مشورہ دیا۔

”الاقتصاد“ میں فرماتے ہیں:

”اگر تکفیر سے بچنے کی کوئی راہ نکل سکے تو تکفیر سے بچنا چاہیے۔ اس لیے کہ اہل قبلہ جو لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے قائل ہیں، ان کے جان و مال کو مباح قرار دینا خطا ہے؛ کہ ایک مسلمان کی خون ریزی کی غلطی ایک ہزار کافر کو زندہ چھوڑ دینے کی غلطی سے بڑھ کر ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ”اصرت ان اقاتل الناس حتى يقولوا لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ، فاذا قالوها فقد عصموا منی دماءهم و اموالهم الا بحقها۔“ (۴)

آگے مزید لکھتے ہیں:

”ہمارے نزدیک یہ بات پایہ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی کہ خطائی التواہل موجب تکفیر ہے، اس لیے کہ تکفیر کے لیے دلیل کی ضرورت ہے اور کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی وجہ سے عصمت جان و مال قطعی طور پر ثابت ہو چکی ہے۔ لہذا ان کے مباح ہونے کے لیے دلیل قطعی کی ضرورت ہے۔“ (۵)

”فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة“ میں تکفیر میں غلو کرنے والوں کو غزالی نے شدید تنقید کا نشانہ بنایا؛ کیوں کہ متکلمین کے ایک متعصب گروہ نے عام مسلمانوں کے لیے یہ لازم قرار دیا کہ وہ علما کی طرح عقائد مذہبیہ و دلائل کے ساتھ جائیں، اگر ایسا نہیں ہے تو وہ ان کی نظر میں کافر ہیں۔ اس پر غزالی کہتے ہیں:

”تکفیر میں غلو کرنے والوں میں متکلمین کا ایک گروہ بھی ہے جنہوں نے عام مسلمانوں کی تکفیر کی اور یہ کہا کہ جو ہماری طرح علم بکلام کی معرفت نہ رکھے اور عقائد شرعیہ کو ہمارے بیان کردہ دلائل کے ساتھ نہ جانے وہ کافر ہے۔ اس گروہ نے اللہ کے بندوں پر اس کی وسیع رحمت کو شک کر دیا اور جنت کو متکلمین کی ایک مشیت بھری جگہ کی جاگیر بنا ڈالا۔ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث سے ماواقت تھے؛ کیوں کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ میں بھی بادیہ نشین مسلمانوں کی ایسی جماعت موجود تھی جو پہلے بتوں کی پرستش کرتی تھی۔ اسلام لانے کے بعد دلائل کے علم سے زیادہ اہتمال نہ تھا اور اگر ہوتا بھی تو اس کی گہرائی سے واقفیت نہیں ہو سکتی تھی۔ بندے کے دل میں ایمان کا نور متکلمین کی دلائل سے نہیں پیدا ہوتا، یہ تو اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے ہوتا ہے۔“ (۶)

غزالی اور اصلاح سلاطین

غزالی کی اصلاحی تحریک کا دائرہ صرف عام مسلمان، متکلمین، فلاسفہ، علما سے ظاہر اور متصور عصر تک محدود نہیں تھا، بلکہ ان کے نقد و نظر اور اصلاح و موعظت کے حدود میں وزراء اور سلاطین زمانہ بھی شامل تھے۔ غزالی کا ماننا تھا کہ امت کی اصلاح، ارباب علم و فکر اور اصحاب سیاست و سلطنت کی اصلاح کے بغیر نہیں ہو سکتی۔ اذا صلحنا صلح الناس و اذا فسدنا فسد الناس۔ یعنی جب علما اور سلاطین سدھر جائیں گے تو عوام بھی سدھر جائیں گے اور جب یہ دونوں بگڑیں گے تو عوام بھی بگڑ جائیں گے۔

غزالی کہتے ہیں کہ لوگ سلاطین سے حق بات کہنے اور ان کو خیر کی نصیحت کرنے سے اس لیے باز رہتے ہیں کہ ان کے دل میں بادشاہ کا خوف اور اس کی عنایات و عطیات کی طمع پیدا ہو جاتی ہے، حالانکہ سلاطین کے پاس نہ کوئی ایسی قوت ہے جس کا خوف کیا جائے اور نہ ہی کوئی ایسا مال ہے جس کی طمع کی جائے۔ یہ لوگ یہ فراموش کر بیٹھے ہیں کہ دنیا مسافر کی شاہ راہ ہے، دائمی اقامت کی جگہ نہیں۔

خلیفہ نو شیروان کا ایک وزیر آپ کی عظمت و منزلت اور علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے آپ کی بارگاہ میں حاضر ہوا۔ امام غزالی نے اس سے فرمایا:

”تمہاری سلطنت کے بارے میں تم سے پوچھا جائے گا اور تم لوگوں کی پناہ گاہ ہو، لہذا تمہارا ان کی گہرائی کرنا میری زیارت سے بہتر ہے۔“ (۷)

غزالی نے احیاء العلوم میں ظالم امرا و حکام سے میل جول اور ان کے دربار میں آمد و رفت کو مذموم قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ ظالم امرا و حکام کی تین حالتیں ہیں:

۱۔ سب سے بری بات یہ ہے کہ ظالم امرا و حکام کے پاس جاؤ۔

۲۔ یہ بھی مذموم ہے کہ وہ تمہارے پاس آئیں۔

۳۔ سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ تم ان کے پاس جاؤ نہ وہ تمہارے پاس آئیں۔

غزالی نے جہاں اپنی تصانیف میں حکام عصر کی غیر شرعی سرگرمیوں اور رعایا پر ان کے ظلم و جبر کے خلاف آواز اٹھائی، وہیں اپنے مکتوبات کے ذریعے بلا واسطہ سلاطین کو ان کی کوتاہیوں کا احساس بھی دلایا۔

آپ نے سلجوقی سلطان شجر بن ملک شاہ جس کے زیر قلم پورا خراسان تھا، اس کو لکھا:

”افسوس! کہ امت مسلمہ مصائب و آلام کے سبب ہلاکت کے دہانے پر ہے اور تمہارے گھوڑے کی گردن سونے (کے زیورات) سے بوجھل ہے۔“ (۸)

وزیر فخر الملک کو نصیحت کرتے ہوئے لکھا:

”تنہائی میں دور کثرت نماز ادا کرو اور اپنے بھجوں میں اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعا کرو: اے وہ بادشاہ! جس کی بادشاہت لازوال ہے، میرے ملک پر رحم فرما جو ہلاکت کے دہانے پر ہے۔ اسے غفلت سے بیدار کرو اور رعایا کی اصلاح کی توفیق عطا فرما۔“ (۹)

وزیر مجیر الدین کو لکھا:

مخلوق کی معاونت سب پر واجب ہے۔ لیکن ظلم حد سے تجاوز کر گیا ہے۔ میرے اندر ظلم دیکھنے کی استطاعت نہیں، اس لیے میں نے طوس سے ہجرت کر لی، حتیٰ کہ میں ان ظالموں کو بھی نہیں دیکھ سکتا جو رحم و کرم سے نا آشنا ہیں اور مہرمات کی رعایت تک نہیں کرتے۔ پھر کسی ضرورت کے تحت ایک سال بعد طوس آنا ہوا تو ظلم کو بدستور باقی پایا۔“ (۱۰)

غزالی ظالم حکمرانوں کے یہاں علما کی آمد و رفت اور ان کے تحفے اور تحائف قبول کرنے کو دین میں رشوت قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں سلاطین کے اموال کا پورا یا اکثر حصہ حرام طریقے سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا ان سے احتراز لازم ہے۔

غزالی اور تصوف

غزالی: اصول، فقہ، کلام اور فلسفے میں کامل بصیرت کے حصول اور بعض علوم میں ضروری اصلاحات کے بعد تصوف کی طرف متوجہ ہوئے: کیوں کہ غزالی کے بقول صوفیہ ہی درحقیقت رہ روایہ خدا ہیں۔ ان کی سیرت سب سے اچھی، ان کا اخلاق سب سے اعلیٰ، ان کا طریقہ سب سے عمدہ ہے؛ بلکہ اگر دانش وروں کی دانش، حکما کی حکمت اور علمائے شریعت کے علم کو جمع کر دیا جائے اور ان سے صوفیہ اپنے اخلاق کو بدل کر بہتر کرنا چاہیں تو ایسا ان کے لیے ممکن نہ ہوگا۔ صوفیہ کے تمام ظاہری و باطنی حرکات و سکنات، مکلفات و ثبوت سے متعین ہیں اور ثبوت کے علاوہ روئے زمین پر کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے جس سے روشنی حاصل کیا جاسکے۔ اس طرح غزالی ایک محب اور عاشق کی حیثیت سے میدان تصوف میں وارد ہوئے، دیگر علوم و فنون کی طرح بحیثیت ناقد نہیں۔ اس لیے ابن جوزی نے غزالی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ: غزالی تصوف کو فقہ اور عقل کے معیار پر پرکھنے سے قبل ہی اس میدان میں کود پڑے، لہذا انہوں نے بہت سارے ایسے صوفیہ نہ افکار و اعمال کو قبول کر لیا جو قانون شرع کے خلاف اور کتاب و سنت سے منحرف ہیں۔

لیکن صحیح بات یہ ہے کہ غزالی تصوف کی جس راہ کے مسافر تھے، اس کی بنیاد کتاب و سنت پر ہی تھی۔ انہوں نے صوفیہ نہ افکار و خیالات کو اسلامی اصول سے ہم آہنگ کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ غزالی سے قبل صوفیہ کی ایک جماعت علم سے کنارہ کش بلکہ علم کی مخالف تھی۔ یہ جماعت علم کو اللہ اور بندے کے درمیان ایک طرح کا حجاب سمجھتی تھی۔ غزالی نے سالک طریقت کے لیے علم شرعی کو ضروری قرار دیا۔ متعدد مقامات پر ان الفاظ کے ذریعے حصول علم کی تاکید فرمائی: "السعادة لا تنال الا بالعلم والعمل" (سعادت کا حصول علم و عمل کے بغیر ممکن نہیں)۔

غزالی صوفیہ کے اس گروہ کے مخالف تھے جو اپنی شہوات کو شریعت، اپنے جھوٹے اویام کو "علم الہی"، نفسانی خواہشات، "کوحب الہی" اور شریعت مصطفیٰ کی عدم پیروی کو "طریقہ تصوف" کہتے ہیں۔ غزالی نے اپنی تصانیف میں چابجا ایسے صوفیہ سے بیزاری اور سخت برہمی کا اظہار کیا ہے۔ اصلاح تصوف میں غزالی کی خدمات کا اعتراف متقدمین و معاصرین سبھی نے کیا ہے، بلکہ مستشرقین بھی اس میدان میں آپ کے کارناموں سے متاثر نظر آتے ہیں۔ تفصیلی معلومات کے لیے ڈاکٹر یوسف قرضاوی کی اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی کہتے ہیں کہ تصوف کے باب میں غزالی کی اصلاحات اس شخص کے نزدیک زیادہ واضح ہوں گی جس نے غزالی سے قبل کے تصوف اور باب تصوف کے حالات کا مطالعہ کیا ہے۔

امام غزالی کے ناقدین پر ایک نظر

جیسا کہ گزشتہ سطور میں بیان کیا گیا کہ حجت الاسلام ابو حامد محمد بن محمد الغزالی نے اپنی علمی بصیرت، فکری گہرائی و گیرائی اور خدا وادوات کے ذریعے علوم و فنون کی مختلف شاخوں میں کئی جہتوں سے اصلاحات کیں۔ باطل اذکار و نظریات کا جائزہ لے کر ان کا قلع قمع کیا۔ باطل فرقوں کے غیر اسلامی عقائد کو طشت از باہم کر کے انھیں کیفر کروارنگ پہنچایا۔ احیائے دین کی ان گراں قدر خدمات نے آپ کو مرجع عوام و خواص بنا دیا اور علما کا ایک بڑا طبقہ آپ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہو گیا۔ اس طبقے کے بعض افراد نے مباخذہ آرائی میں غلو کیا اور فراطعیت میں یہاں تک کہہ دیا: "سکاد الاحیاء ان یحکون قراۃ" جب کہ دوسری طرف ایک گروہ نے آپ پر مسلسل طنز و تنقید کو اپنا تیرہ بنا لیا۔ یہ گروہ بھی جادہ اعتدال پر قائم نہ رہ سکا اور غزالی کی شان میں غیر مناسب کلمات استعمال کیے اور حقائق سے نظریں چھ کر تہمت تراشی کی انتہا کر دی۔ گویا کہ آپ کے مابین اور ناقدین دونوں ہی اعتدال کے راستے سے ہٹے ہوئے تھے۔ ہاں! اتنا مسلم ہے کہ غزالی کے مابین کی تعداد ان کے ناقدین سے زیادہ ہے۔ آپ کے مابین میں عبدالغافر فارسی، حافظ ابن کثیر، علامہ تاج الدین سبکی، ابن العما د حنبلی جیسی قدر آور شخصیتیں شامل ہیں۔ ہم یہاں غزالی کے مداحوں سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف ناقدین کا ایک نمونہ جاریہ ڈاکٹر قرضاوی کے حوالے سے پیش کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر یوسف قرضاوی کے بقول غزالی کے ناقدین کے کئی گروہ ہیں۔ بعض نے ان کی تصانیف اور رسائل کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا، بعض نے ان کے طریقہ و مذہب و سلوک پر کلام کیا، بعض نے ان کے اسلوب نقد و معارضہ کو اپنا موضوع بنایا۔ علامہ تاج الدین سبکی نے طبقات الشافعیہ میں غزالی کے ناقدین اور ان کے نقد و نظر کو تفصیل سے بیان کر کے ان کا جواب بھی قلم بند کیا ہے۔ ڈاکٹر قرضاوی نے اپنی اس کتاب میں چند معروف ناقدین کا تذکرہ طبقات الشافعیہ کے حوالے سے کیا ہے۔ ذیل میں ہم اس کا حاصل مطالعہ قلم بند کرتے ہیں۔

محمد بن محمد طروش مالکی

ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے غزالی کے ناقدین میں سب سے پہلا نام طروش مالکی (۵۲۰ھ) کا ذکر کیا ہے جنہوں نے غزالی پر یہ تہمت لگائی کہ غزالی علم کو چھوڑ کر عمل میں مشغول ہو گئے۔ پہلے باطنی علوم اور شیطانی وسوسوں میں داخل ہوئے، پھر فلسفیانہ نظریات اور منہور رجحان کے رموز و امرا کو پروان چڑھایا۔ دھڑلے دھڑلے غزالی فقہاء و متکلمین پر طعن و تشنیع کرنے لگے۔ طروش نے یہاں تک کہہ دیا کہ غزالی صوفیہ کے علوم سے مذہب مانوس تھے ورنہ ہی انھیں اس کی کچھ آگئی تھی۔

امام ابو عبد اللہ مازری مالکی

غزالی کے ناقدین میں طرطوشی کے بعد امام ابو عبد اللہ مازری (ت ۵۳۶ھ) کا نام آتا ہے۔ مازری نے غزالی پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ انھوں نے احیاء العلوم میں متعدد مقامات پر ضعیف حدیثیں نقل کیں اور اپنے بعض دعوؤں کی بنیاد ایسے امور پر رکھی جن کی کوئی حقیقت نہیں۔ انھوں نے غزالی کے قول: ”من مات بعد بلوغه ولم يعلم ان الباری قدیم مات مسلماً اجساماً“ یعنی ”جو شخص بلوغت کے بعد اس حال میں مرا کہ اسے باری تعالیٰ کے قدیم ہونے کا علم نہیں وہ اجماعاً مسلمان مرا۔“ کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور اس مسئلے میں غزالی کے دعوے اجماع کو غلط قرار دیا۔

امام غزالی کا نظریہ ہے کہ بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں کتابوں میں لکھنا مناسب نہیں۔ غزالی کے اس نظریے سے اختلاف کرتے ہوئے مازری کہتے ہیں کہ اگر یہ باتیں حق ہیں تو کتابوں میں ان کا ذکر کیوں نہیں کرنا چاہیے؟ کیا ان کے دقیق اور پیچیدہ ہونے کی وجہ سے؟ ان کی تقسیم سے کون سی چیز مانع ہے؟

مازری کے بقول غزالی علم اصول دین میں تبحر حاصل کرنے سے قبل ہی فلسفہ کی تحصیل میں لگ گئے جس کی وجہ سے ان سے بار بار الغرضیں ہونیں۔ علامہ تاج الدین سبکی نے ان اعتراضات کے جوابات دیے ہیں، اگرچہ ان کے بعض جوابات سے اختلاف کی گنجائش ہے۔

حافظ تقی الدین ابن الصلاح

امام غزالی کے ناقدین میں ایک نام حافظ تقی الدین ابن صلاح کا بھی آتا ہے۔ ابن صلاح کہتے ہیں کہ غزالی وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے علم اصول فقہ میں منطق کی آمیزش کی۔ ابن صلاح غزالی کی اس عبارت پر بھی برہم ہیں جسے انھوں نے منطق کی اہمیت بیان کرتے ہوئے اہم معنی کے آغاز میں رقم فرمایا ہے:

”هذه مقدمة العلوم كلها، من لا يحيط بها فلا ثقة في العلوم اصلاً“

یعنی علم منطق تمام علوم کا مقدمہ ہے، جو اس پر دست رس نہیں رکھتا اس کے علوم پر بالکل بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔

اس پر ابن صلاح کہتے ہیں:

”صحابہ کرام اور امت کے سلف صالحین علم منطق نہیں جانتے تھے تو کیا ان کے علوم پر بھی بھروسہ نہیں کیا جائے گا؟ حالانکہ یہی حضرات ہمارے لیے سرچشمہ علم ہیں اور ان ہی کے توسط سے علم وین ہم تک پہنچا۔“

ابو الفرج ابن جوزی

ابن جوزی کا شمار غزالی کے زبردست ناقدین میں ہوتا ہے۔ انھوں اپنی کتاب ”تلمیس البلیس“ میں متعدد مقامات پر غزالی پر تنقید کی ہے۔ لیکن ابن جوزی کی تنقید اکثر احیاء العلوم ہی کے ارد گرد گردش کرتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی نے احیاء العلوم پر ابن جوزی کی تنقید کے دو بنیادی مآخذ بتائے ہیں۔

(۱) ابن جوزی کہتے ہیں کہ غزالی نے احیاء العلوم کی بنیاد صوفیہ کے مذہب پر رکھی ہے اور فقہی قوانین کا لاپرواہی نہیں رکھ سکے ہیں۔ ابن جوزی نے احیاء العلوم میں غزالی سے منقول صوفیہ کے احوال، زہد و سلوک میں مبالغہ و نفس کشی کے لیے رات بھر سر کے مل قیام اور ریا سے بچنے کے لیے صدقہ کے بجائے مال کو دریا میں ڈال دینے جیسے امور پر تنقید کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا: فہما اخص باع ابو حامد الغزالی الفقہ بالنصوف، ”غزالی نے فقہی سستی قیمت پر فقہ کو تصوف کے ہاتھ بیچ دیا۔“

(۲) امام غزالی نے احیاء العلوم میں موضوع حدیثیں ذکر کی ہیں، ان کی نقل کردہ احادیث میں تھوڑی سی حدیثیں صحیح ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ غزالی علم حدیث میں دست رسی نہیں رکھتے تھے۔ کاش وہ ان احادیث کو نقل کرنے سے پہلے علم حدیث کی معرفت رکھنے والوں پر پیش کر دیتے تو ہر طرح کی احادیث نقل نہیں کرتے۔

شیخ ابن تیمیہ

غزالی کے شدید ترین ناقدین میں شیخ ابن تیمیہ بھی ہیں جو بقول ڈاکٹر قرضاوی علم حدیث و فقہ میں غزالی سے ممتاز ہیں، یہاں تک کہ ان کے بارے میں کہا گیا:

”کل حديث لا يعرفه ابن تيمية فليس بحديث“

جو حدیث ابن تیمیہ کے علم میں نہیں وہ حدیث نہیں۔

ابن تیمیہ نے اپنے رسالہ سبغیہ میں امام غزالی کی بعض تصانیف مثلاً معیار العلم، فیصل التفرقة، اور جواہر القرآن وغیرہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ ان کی تصانیف کے بعض اقوال اور تاویلات سلف صالحین کے طریقے سے متصادم اور فلاحیہ کے نظریات پر مبنی ہیں۔ ان کے کلام میں فلسفیانہ نظریات کی آمیزش ہو گئی ہے۔ بسا اوقات وہ جن امور کی بنا پر تکفیر کا قول کرتے ہیں بعض دوسرے مقامات میں وہی باتیں ان کے موافق ہوتی ہیں۔ ابن تیمیہ نے ایسے موقعوں پر خاص طور سے غزالی سے دعو کا کھانے سے بچنے کا مشورہ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے نزدیک غزالی کا ایک مقام اور مرتبہ ہے، گناہ اس مقام و مرتبے کی وجہ سے ان کی ہر بات پر یقین نہ کر بیٹھیں۔

ابن تیمیہ فتاویٰ کبریٰ میں کہتے ہیں کہ غزالی کا علم منطق کے حصول کو فرض کفایہ قرار دینا خطائے فاحش ہے؛ کیوں کہ منطق کا بعض حصہ حق ہے اور بعض حصہ باطل۔ منطق کے وہ اصول جو حق ہیں ان میں اکثر ایسے ہیں جن کی ضرورت ہی نہیں پڑتی اور ان میں سے جن کی ضرورت پڑتی ہے ان کے لیے عقل سلیم کافی ہے۔ ابن تیمیہ کہتے ہیں:

”انہ علم لا ینفع بہ البلید ولا یحتاج الیہ الذکی“

یعنی منطق ایسا علم ہے جس سے غبی فائدہ حاصل نہیں کر سکتا اور ذہین کو اس کی ضرورت نہیں۔ لہذا غزالی کا اسے فرض کفایہ قرار دینا لغو ہے۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے اپنی اس کتاب میں غزالی کے تعلق سے معاصر علماء کے نقد و نظر پر بھی تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ خصوصاً علم حدیث کے تعلق سے غزالی پر لگائے گئے الزامات کو شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

حاصل حکام

غزالی کی ہمہ جہت شخصیت کے تعارف اور ان کے تعلق سے علماء کی متضاد آرا کی تفہیم کے لیے ”الغزالی بین مادھیہ و ناقدیہ“ ایک بہترین تالیف ہے جس کے مطالعے سے امام غزالی کے ماضی اور تاقین کا منصفانہ جائزہ لینے کے بعد ڈاکٹر یوسف القرضاوی کا جو بیج بحث اور نظریہ سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ امام غزالی بلاشبہ عیسٰی فکراور گہری بصیرت کے مالک اور حقائق و معارف کے رمز شناس ہیں۔ ان کی آخری صورت سے یوسف قرضاوی صاحب کا ذاتی جھکاؤ امام غزالی کے ماضی کی طرف معلوم ہوتا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق علمائے اسلام نے امام غزالی کو جن القاب و آداب سے یاد کیا ہے وہ بلاشبہ ان کے مستحق تھے، البتہ امام غزالی اور تصوف کی ذیلی سرخی میں ان کی یہ بات بھی تنقیدی نگاہ سے دیکھے جانے کے لائق ہے، جس میں امام غزالی کے متعلق ان کے نظریے کا دوسرا رخ یہ سامنے آتا ہے کہ امام غزالی نے فلسفہ، حدیث، فقہ، اصول، عقائد، تفسیر اور کلام جیسے علوم میں نقد و تحقیق کا جو معیار اور منہاج قائم کیا ہے وہ تصوف کے ذیل میں نظر نہیں آتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ تصوف کے متعلق ان کا معاملہ حدودِ محبت اور رضا کا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے تصوف کی ساری چیزوں کو من و عن قبول کر لیا ہے، جو نقد و تحقیق کے معیار سے ہٹ کر ہے۔ کیوں کی جب کسی چیز کو محبت میں قبول کیا جائے تو پھر محبت اندھی اور بہری ہوتی ہے قرضاوی صاحب کے اس دوسرے نظریے پر اہل تحقیق کے لیے تفصیلی اور تحقیقی بحث کی بھر پور گنجائش ہے مگر موجودہ صفحات میں ہمیں مطالعے کا تجربہ اور خلاصہ لکھنا منظور ہے اس لیے اتنے ہی پر اکتفا کیا گیا۔

حوالہ جات

- ۱۔ آن لائن ویکیپیڈیا ڈاٹ کام
- ۲۔ الامام الغزالی بین مادھیہ و ناقدیہ، ڈاکٹر یوسف القرضاوی، ص: ۱۸۰
- مؤسسۃ الرسالہ، بیروت
- ۳۔ نفس مصدر، ص: ۹۶
- ۴۔ نفس مصدر، ص: ۷۱، ۷۲
- ۵۔ نفس مصدر، ص: ۷۲
- ۶۔ نفس مصدر، ص: ۷۳
- ۷۔ نفس مصدر، ص: ۹۴
- ۸۔ نفس مصدر، ص: ۱۰۰
- ۹۔ نفس مصدر، ص: ۱۰۱
- ۱۰۔ نفس مصدر، ص: ۱۰۲

امام غزالی اور مسئلہ تکفیر - ایک جائزہ

امام غزالی نے جس عہد اور ماحول میں آنکھیں کھولیں اس کی ایک اہم خصوصیت اسلامی فرقوں کی کثرت اور ان کے درمیان کش مکش اور جدال و مناظرے کی فضا تھی۔ خصوصیت کے ساتھ معتزلہ اور اشاعرہ نے علم اسلام کے قلب کو فکری معرکہ آرائیوں کا میدان کا رزار بنا دیا تھا۔ دوسری طرف فلاسفہ اور باطنیہ کی جماعت تھی جو اپنی عقلی اور باطنی تاویلات سے اسلامی عقائد و مسلمات کے بنیادی ڈھانچے کو مسمار کرنے میں مصروف تھی۔ فلسفے اور علم کلام کے علاوہ فقہ اور تصوف کے میدان میں بھی فکری انتشار کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ چنانچہ غزالی نے احیاء العلوم سمیت دوسری کتابوں میں دنیا پرست فقہاء اور خواہش پرست صوفیہ کی شدید مذمت کی ہے۔ خاص طور پر وہ اول الذکر طبقے میں پیدا ہو جانے والی مختلف اخلاقی خرابیوں: حسد و ریا، جاہ پسندی، سلاطین و وقت سے تعلق اور ان کی خوشامد و چاپوسی اور فتنہ کو حصول دنیا کا ذریعہ بنا لینا وغیرہ کا شدید روکیا ہے۔ حالانکہ وہ خود فقیہ بھی تھے اور بحر معرفت و تصوف کے شنار بھی، فقہاء کے تعلق سے ان کا انتقاض اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ وہ خود کو فقیہ کہنا بھی پسند نہیں فرماتے تھے۔ (۱) امام غزالی کے امتیازات میں ایک اہم امتیاز ان کی فکری اعتدال پسندی ہے۔ ایک ایسے دور اور ماحول میں جب باہم مختلف اسلامی جماعتیں ایک دوسرے کی تکفیر و تفسیق کو دین متین کی سب سے بڑی خدمت تصور کیے بیٹھی تھیں، فقہاء کا ایک بہت بڑا اور مؤثر طبقہ خشک فتنی بحثوں کو سرمایہ دین و ہنر سمجھ کر اس میں الجھا ہوا تھا، ایسے میں غزالی نے اسلامی فکر و عمل کے اخلاقی پہلوؤں کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا۔ فتنہ کے پہلو بہ پہلو مقاصد فقہ و شریعت کے خدو خال کو ابھارنے کی کوشش کی اور بین جماعتی کش مکش کے خاتمے کے لیے کفر و ایمان کے حدود و معیارات اس نظریاتی کش مکش کے تناظر میں متعین کرنے کی کوشش کی۔ ان کوششوں کا ہدف اس بات کا اثبات تھا کہ مختلف اسلامی جماعتوں کے درمیان اختلافات کی حیثیت فروعی ہے، اصولی نہیں ہے، اس لیے ان کی بنیاد پر ایک دوسرے کی تکفیر نہیں کی جاسکتی۔

اس حوالے سے ان کی دو کتابیں نہایت اہم ہیں: فیصل الشرفۃ بین الاسلام والزندقة اور الاقتصاد فی الاعتقاد۔ خاص طور پر پہلی کتاب اور دوسری کتاب کا چوتھا باب اس موضوع کے تمام اہم اور ضروری نکات اور پہلوؤں پر حاوی ہے۔ غزالی نے ان کے حوالے سے اسلامی شریعت کی رواداری اور توسع پسندی کی روشنی میں جو اصول طے کیے ہیں ان سے تکفیر مسلم کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا ہے۔ غزالی کی شخصیت پر لکھنے والوں نے اس کو ان کے نہایت اہم کاموں میں شمار کیا ہے، تاہم اسی کے ساتھ ان پر تنقید کرتے ہوئے انہیں تکفیر کے باب میں حد سے زیادہ رواداری دہننے والا بھی قرار دیا ہے۔ (۲) الاقتصاد فی الاعتقاد میں لکھتے ہیں: والصدی ينبغي ان يميل المحصل اليه الاحتراز من التكفير ما وجد اليه سبباً لان استباحة الممء والاموال من المصلين الى القبلة المصريحين بقول لا اله الا الله محمد رسول الله، خطأ والخطأ في ترك الف كافر في الحياة اهنون من الخطأ في سفك محجمة من دم مسلم. (۳) ”حق و باطل میں تمیز کرنے والے کے لیے مناسب ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو تکفیر سے احتراز کرے، اس لیے کہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز ادا کرنے والوں اور کلمہ شہادت کا اقرار کرنے والوں کے جان و مال کو مباح قرار دینا خطا ہے اور ایک ہزار کفار کو زندہ چھوڑنے میں غلطی کرنا اس کی بہ نسبت آسان ہے کہ کسی فرد مسلم کے خون بہانے میں غلطی کی جائے۔“

فیصل التفرقة میں دوسری جگہ تقریباً ایسی ہی بات انہوں نے اپنی وصیت کے عنوان سے درج کی ہے اور لکھا ہے کہ: ”تکفیر میں بہر حال خطرہ ہے جب کہ اس میں خاموشی کا رویہ اختیار کرنے میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ طمان التکفیر فیہ خطر والسکوت لا خطر فیہ. (۴) اس سے اس مسئلے میں ان کی حساس ذہنیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

کفر و ایمان کی اصولی بحث

امام غزالی نے فیصل التفرقة میں کفر و ایمان کی حقیقت کی توضیح میں نہایت دقیق اصولی بحث کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ انہی جیسے علما سے روزگار کا خاصہ تھا، جن کی فکر علوم شریعت سے روشن اور جن کا قلب روحانیت کی لذتوں سے سرشار تھا۔ امام غزالی خود لکھتے ہیں کہ کفر و ایمان کی حقیقت ایسے لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی جن کے دل جاہ و مال کی طلب اور ان کی محبت کی گندگی میں ملوث ہوں بلکہ وہ ایسے لوگوں پر ظاہر ہوتی ہے، جن کے دل دنیا کے خس و خاشاک سے پاک ہوں، کامل ریاخت سے صیقل ہو چکے ہوں، ذکر الہی سے روشن ہوں، فکر صاحب سے معمور اور حد و شرع کی پابندی سے مزین ہوں۔ (۵) ان کی نظر میں وہ فقہاء جن کے علم کا سرمایہ نجاست اور

آب زعفران کے مسائل میں سمٹا ہوا ہے، وہ اصحاب جنہوں نے سلاطین کی چوکنٹوں کو سجدہ گاہ بنا لیا ہے اور جو درہم و دینار کے پجاری بن گئے ہیں، ان پر اس طرح کے حقائق و معارف کا انکشاف ممکن نہیں ہے۔ (۶)

غزالی کے نزدیک کفر و ایمان کے حوالے سے سب سے بیا دی بات کفر کی ایسی جامع و مانع تعریف ہے، جو اپنے مشتملات و متعلقات پر پوری طرح حاوی ہو اور اس کا رخ کسی متعین فرقے اور جماعت کی طرف نہ ہو۔ فیصل التفرقہ میں وہ لکھتے ہیں: ”مگر کوئی کفر کی وہ تعریف کرے جو شاعرہ، معتزلہ یا حنابلہ کے خلاف ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ ایسا شخص سادہ لوح اور احمق ہے اور تقلید کے پھندے میں گرفتار ہو چکا ہے۔“ (۷) اسی طرح ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اگر تم انصاف سے کام لو تو تمہیں یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ جو شخص حق کو کسی ایک صاحب فکر و نظر پر موقوف رکھتا ہے تو ایسا شخص کفر اور تنافس سے زیادہ قریب ہے۔

ان انصفت علمت ان من جعل المحق وقفا علی واحد من النظار بعینه فهو الی الکفر والتنافض اقرب۔ (۸)

اہم بات یہ ہے کہ غزالی خود اشعری تھے، البتہ ابوالحسن اشعری کے مقلد نہ تھے، نہ ہی اشاعرہ کے تمام اصول و تفریعات سے اتفاق کرتے تھے۔ فیصل التفرقہ کی تالیف کا پس منظر یہی ہے کہ اشاعرہ کے ساتھ بعض نظریاتی اختلافات کی بنا پر ان کی تکفیر کی جانے لگی تو انہوں نے ایک دوست کے اس تعلق کے خط لکھنے پر یہ کتاب تالیف کی۔

امام غزالی نے کفر کی دو قسمیں کی ہیں: کفر عملی اور کفر اعتقادی۔ کفر عملی ان کی نظر میں وہ ہے جسے فسق اور بدعت و ضلالت سے تعبیر کیا جاتا ہے اور کفر اعتقادی یا ضابطہ کسی اصل دین کا عقیدے کی سطح پر انکار ہے، جیسے حشر و نشر، قیامت یا نماز روزے کا انکار۔ کفر اعتقادی میں طوط لوگوں کی انہوں نے کھل کر تکفیر کی ہے اور اس میں کسی رعایت اور کھل پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے۔ تکفیر کے تعلق سے غزالی نے یہ اہم اصول بیان کیا ہے کہ تکفیر کا ماخذ (ماخذ الکفیر) عقل نہیں بلکہ شرع ہے۔ اگر کوئی شخص ضروریات عقلی کا انکار کرتا ہے، مثال کے طور پر اندائے کے کڑوے پھل کو چٹھا کہتا ہے تو یہ کہا جائے گا کہ اس نے مخالف عقل بات کہی، لیکن اس بنیاد پر اس کی تکفیر و تہدیب نہیں کی جاسکتی۔ غزالی کی یہ بات بظاہر سادہ لیکن نہایت دقیق اور اہم ہے۔ وراصل اس اصول کے ذریعے وہ یونانی فلسفے اور علم کلام کی بنیاد پر کفر و ایمان کے باب میں اٹھائے گئے سوالات اور مباحث کا رد کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نظر میں معتزلہ و اشاعرہ اسی طرح دیگر کلامی فرقوں کا کلامی اصول و نظریات کی بنیاد پر ثابت ہونے والے عقیداتی حقائق کے منکرین یا ناواقف افراد کی تکفیر و تصدیق کرنا اصولی

طور پر غلط ہے اور شریعت سے اس کے حق میں کوئی دلیل فراہم نہیں کی جاسکتی؛ کیوں کہ عہد نبوی و عہد صحابہ میں وائزہ ایمان میں داخل ہونے والوں کا ذہن اس طرح کی عقلی موشگافیوں سے بالکل خالی تھا۔ بھلا رسول ﷺ اصحاب رسول ﷺ سے یہ کہاں ثابت ہے کہ انہوں نے، مثال کے طور پر، مسلمان ہونے والے اعرابی کو بلا کر یہ سوال کیا ہو کہ عالم حادث ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے علم اور ایسی قدرت کی صفت کے ساتھ عالم و قادر ہے جو اس کی ذات پر زائد ہے۔ (۹)

غزالی کفر کی تعریف اس طرح کرتے ہیں: الکفر هو تکذیب الرسول علیہ الصلاۃ والسلام فی شئی مما جاء به والايمان تصدیقه فی جمیع ما جاء به۔ (۱۰) والاصل المقطوع به ان کل من کذب محمداً ﷺ فهو کافر مخلص فی النار بعد الموت۔ (۱۱) ”رسول اللہ جن احکام دین و شریعت کے ساتھ مبعوث کیے گئے ہیں ان میں آپ کی تکذیب کا نام کفر ہے اور ایمان یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی تمام باتوں کی تصدیق کی جائے۔“ اور اصول قطعی یہ ہے کہ جس نے محمد ﷺ کی تکذیب کی وہ کافر ہے اور موت کے بعد وہ جہنم کے دائمی عذاب کا مستحق ہوگا۔“

انہوں نے شریعت کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے: اصول، فروع، متواتر اور آحاد۔ اور ایمان کے تین بنیادی اصول بیان کیے ہیں: ۱۔ اللہ پر ایمان، ۲۔ رسول پر ایمان، ۳۔ یوم آخر یعنی حشر و نشر پر ایمان۔ ان کے علاوہ ان کے نزدیک دوسری چیزیں فروعات کی قبیل سے ہیں اور ان کے انکار سے تکفیر لازم نہیں آتی، الا یہ کہ اصول دین میں سے کسی ایسی اصل کا انکار کیا جائے جو رسول اللہ ﷺ سے متواتر کے ساتھ ثابت ہو۔ یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ملاحظہ ہے کہ غزالی نے ایمان کی اصل صرف تین قرار دی ہے، حالانکہ عقائد کے ذیل میں ۶ اصولوں کا ذکر کیا جاتا ہے یعنی مذکورہ جنوں کے علاوہ فرشتوں، کتابوں اور تقدیر پر ایمان۔ بعض لوگ تقدیر کو اس میں شمار نہیں کرتے اور اس کو ذات باری پر ایمان لانے سے ہی متعلق کر دیتے ہیں، لیکن بقیہ دو اصولوں کا ذکر عقائد پر لکھی گئی اکثر کتابوں میں موجود ہے اور یہی عوام کی زبان پر بھی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ اس تعلق سے کسی بھی غلط فہمی کو راہ دینے کی ضرورت نہیں۔ دیکھا جائے تو ملائم اور کتابوں پر ایمان رسولوں کی تصدیق کے ضمن میں آجاتا ہے یا پھر یہ کہنا چاہیے کہ عدد و مراء نہیں ہے بلکہ مراد یہ ہے کہ اصول دین و ایمان وہ ہیں جو قطعی عقل میں متواتر کے ساتھ ثابت ہوں، جو امور آحاد سے ثابت ہوں ان کے انکار پر کفر کا ترتیب نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ آحاد کے ذریعے حکم قطعی ثابت نہیں ہوتا۔ وہ اجماع کے انکار کو بھی کفر کے لیے مستزم قرار نہیں دیتے کیوں کہ اجماع کے حجت قاطعہ ہونے میں غموض و ابہام ہے اور اس لیے وہ مختلف فیہ ہونے کے درجے میں ہے۔ (۱۲) اس ضمن میں اہم

بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ جس بہان یا دلیل قطعی کی بنیاد پر کوئی شخص کسی کی تکفیر کرتا ہے، اس بہان کی معرفت بھی آسان نہیں ہے، اس لیے ضروری ہے کہ بہان کو بھی مضبوط کرنے والا کوئی ضابطہ ہو جو متفق علیہ ہو اور تمام لوگ اس کے معترف ہوں۔ (۱۳)

تکذیب و تصدیق کے تعلق سے ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہر فرقہ دوسرے فرقے کے تعلق سے اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ اس نے رسول کی تکذیب کی ہے اور اس لیے وہ کافر ہے، وہ اس ضمن میں فریق مخالف کی باتوں کی حسب منشا تاویل و ترجیحات کرتا ہے۔ غزالی لکھتے ہیں:

”مشرقی معترض کی تکذیب کرتا ہے اور یہ گمان کرتا ہے کہ اس نے رؤیت باری کے جواز کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اور خدا کے لیے علم و قدرت جیسی صفات کو ثابت نہ مانتے ہوئے رسول اللہ کی تکذیب کی ہے اور معترضی اشعری کو تکذیب کرنے والا گردانتا ہے کہ خدا کے لیے صفات کے اثبات سے قدام کی کثرت لازم آتی ہے۔“ (۱۴) استوی علی العرش کے مسئلے میں حنا بلہ اشاعرہ کو استوا کا منکر اور مکذیب گردانتے ہیں جب کہ اشاعرہ کا دعویٰ ہے کہ استوا کا جو مفہوم حنا بلہ نے متعین کیا ہے اس سے خدا کی تشبیہ لازم آتی ہے۔ اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ہر زمانے میں اور اس زمانے میں بھی مسلکی اختلاف و تنازع میں یہی صورت حال قائم ہے۔ تقریباً یہی ذہنیت اور نظریاتی تضاد کی یہی نوعیت مختلف مکاتب فکر کے مابین پائی جاتی ہے، خواہ یہ جماعتیں باہم ایک دوسرے کی تکفیر میں مبتلا ہوں یا تصدیق و تہدیل یعنی بدعتی ٹھہرانے میں۔ غزالی کے بقول اس گرواب شر (Vicious Circle) سے نکلنے کے لیے تصدیق و تکذیب کی حقیقت کا معلوم ہونا از بس ضروری ہے۔ تصدیق کی حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے جس چیز کے وجود کی خبر دی ہے اس کو تسلیم کیا جائے۔ اس وجود کے ان کی نظر میں پانچ مراتب ہیں: وجود ذاتی، وجود حسی، وجود خیالی، وجود عقلی اور وجود شہی۔ وجود ذاتی وجود خارجی یا بدیہی وجود ہے جس کے اثبات کے لیے حس اور عقل کی ضرورت نہیں ہے؛ جیسے زمین و آسمان اور چرند و پرند کا وجود، وجود حسی جس کا تعلق صرف حاسے سے ہو جیسے خواب میں دیکھی جانے والی چیز کہ خواب سے الگ اس کا کوئی وجود نہیں ہوتا یا جیسے شعلہ گوگردش دینے پر اس کے دائرے کی صورت جو اصلاً دائرہ نہیں ہوتی لیکن ہمیں دائرے کی صورت میں نظر آتی ہے۔ وجود خیالی کسی بھی محسوس چیز کی تصور اور خیال میں پائی جانے والی شکل ہے۔ وجود عقلی کسی شے کے ظاہر کی بجائے اس کی اصل حقیقت جیسے کسی چیز کا ہاتھ میں ہونا دراصل قوت اختیار میں ہونے کا معنی رکھتا ہے۔ اس صورت میں قدرت و اختیار ہاتھ کا وجود عقلی ہے۔ وجود شہی سرے سے اپنا کوئی وجود نہیں رکھتا بلکہ ایک دوسرا وجود اس کے مشابہ ہوتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے کسی امر حقیقی کے وجود کی جو خبر دی ہے اگر کوئی شخص اس کے وجود کی ان انواع غمہ میں سے

کسی بھی نوع کے تحت اعتراف کر رہا ہو تو اسے رسول کی تکذیب کرنے والا قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ اسے تصدیق کرنے والا شمار کیا جائے گا۔ ان کے بقول مکذیب وہ ہے جو ان تمام معانی کی نفی کر دے اور یہ خیال کرے کہ رسول نے جو کچھ بھی کہا وہ کذب محض ہے۔“ (۱۵)

غزالی نے تکذیب کے ۶ مراتب کا ذکر کیا ہے اور محسوس مثالوں کے ذریعے اس کے اطلاق سے بھی بحث کی ہے۔ (۱) یہود و نصاریٰ، مجوس اور بت پرست: ان کی تکذیب اور اس بنیاد پر ان کی تکفیر منصوص ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے۔ (۲) دوسری قسم بدامہ اور دہریہ کی ہے۔ بدامہ اصل نبوت کے اور دہریہ صانع عالم کے منکر ہیں۔ (۳) تیسرے فلاسفہ ہیں جو صانع عالم کے وجود اور نبی کی نبوت کے قائل ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ نبی نے بہت سی باتیں چھپالیں اور انہیں صراحت کے ساتھ عوام کو نہیں بتایا؛ کیوں کہ وہ ان کی حقیقت کے ادراک سے قاصر تھے۔ (۴) چوتھے معتزلہ اور مشبہہ اور ان کی طرح کے بعض دوسرے فرقے ہیں جو بدامہ راست رسول کی تکذیب نہیں کرتے البتہ تاویل کے ذریعے وہ رسول کی تکذیب کو درست رکھتے ہیں۔ غزالی کے نزدیک یہ طبقہ محل اجتہاد میں ہے تاہم احتیاط اسی میں ہے کہ ان کی تکفیر نہ کی جائے۔ (۵) پانچواں طبقہ وہ ہے جو کسی اصول دین کا انکار کرے جیسے بیچ و قرض نماز کے فرض ہونے کا تو اس کی بھی تکفیر کی جائے گی۔ (۶) چھٹا طبقہ وہ ہے جو کسی ایسے امر دین کا صراحت کے ساتھ انکار نہ کرے جو تو اتر کے ساتھ قطعی طور پر ثابت ہو، یہ بھی محل اجتہاد میں ہے تاہم وہ کہتے ہیں کہ اس سے بڑے مفاسد کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہے، مثلاً اگر کوئی شخص محمد ﷺ کے بعد کسی نبی کی آمد کا قائل ہو تو اس کی تکفیر میں توقف کرنا صحیح نہیں ہوگا۔ (۱۶)

ان امور کا خلاصہ غزالی کی اپنی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ امور منکرہ تین ہیں: ۱۔ صانع عالم کے وجود و صفات اور نبوت کے انکار کا اعتقاد رکھنا، ۲۔ وہ چیز جو ایک شخص کو خدا کی ذات و صفات کے اقرار سے روک دے اور اس سے ایسا تعلق لازم آتا ہو جو ان کے انکار کو ہی مستلزم ہو، ۳۔ تیسرے ایسا عمل جو کسی کافر سے ہی صادر ہو، جیسے آگ کی پرستش یا بت کو سجدہ کرنا یا بعض رسولوں کا انکار یا زنا اور شراب کو حلال سمجھنا یعنی تو اتر سے ثابت شدہ ضروریات کا انکار کرنا۔

تاویل کا مسئلہ اور اس کی حقیقت

تکفیر کے مسئلے میں سب سے اہم معاملہ تاویل کا ہے یعنی امور دین اور معاملات شرع میں کس قسم کی تاویل قائل قبول اور کون سی تاویل قائل رد ہے۔ ان کی نظر میں یہ اصول طے شدہ ہے کہ تاویل کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جائے گی، اس لیے کہ تاویل سے کسی کو بھی مفر نہیں ہے۔ سب سے کم تاویل کرنے والے امام احمد بن حنبل ہیں۔ تین مسائل میں انہوں نے بھی تاویل سے کام لیا ہے۔ (۱۷)

امام غزالی کی نگاہ میں تاویل کی دو قسمیں ہیں: وہ تاویل جو غلبہ ظن پر قائم ہو، دوسری وہ جو بہانہ قاطع یا قطعی دلیل پر قائم ہو۔ انہوں نے لکھا ہے کہ کچھ لوگ بغیر کسی واضح و روشن دلیل کے غلبہ ظن کی بنیاد پر تاویل کرتے ہیں، ان کی تاویل کے تعلق سے دیکھا جائے گا کہ اس کا تعلق اصول عقائد سے ہے یا نہیں اور جیسا کہ اوپر گزرا غزالی کی نظر میں اصول عقائد تین ہیں: اللہ، رسول اور یوم آخرت پر ایمان (ان کے علاوہ باقی سب فروغ ہیں)۔ چنانچہ اگر تاویل کا تعلق اصول عقائد سے نہیں ہے تو پھر تاویل کرنے والے کی تکفیر نہیں کی جائے گی، جیسے صوفیہ کا کہنا کہ حضرت امراہیم علیہ السلام نے آفتاب و مانتاب کو "ہذا رسی" نہیں کہا تھا، کیوں کہ یہ ان کی شان سے فروز تھا، بلکہ غیر محسوس ثورانی جواہر کو کہا تھا۔ اسی طرح بعض حضرات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا (طہ: 69) اور نعلین (طہ: 12) کی تاویل کرتے ہیں: ایسی تاویل کرنے والوں کو کافر تو کجا بدعتی بھی اس لیے قرار نہیں دیا جاسکتا کہ ان کے بقول اس صورت میں یہ اندیشہ ہے کہ عوام ہر اس چیز کو جو اسلاف سے ثابت نہ ہو، بدعت تصور کرنے لگیں۔ ہاں! اگر تاویل کا تعلق بنیاد و عقائد سے ہو جیسے حشر و فشر یا آخرت کا عذاب محسوس تو ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی کیوں کہ حشر و فشر کے ممکن نہ ہونے پر سرے سے کوئی دلیل نہیں ہے۔

فروغ وین کے تعلق سے ان کا نقطہ نظر یہ ہے کہ فروغ میں تکفیر نہیں کی جائے گی سوائے اس صورت کے جب کہ رسول سے ثابت شدہ کسی اصل و بیانی کام کا انکار کر دیا جائے، لیکن ان کی نظر میں اس معاملے کی بھی بعض صورتوں سے متعلق شخص کو خطا کا ریا بدعتی تصور کیا جائے گا کافر نہیں۔ چنانچہ اہل تشیع کا امامت کے تعلق سے نظریہ اسی قبیل سے ہے: البتہ اگر اس صورت میں تکذیب پائی جائے جیسے کوئی شخص مکہ میں موجود کیجے کا انکار کر دے یا وہ حضرت عائشہ پر تہمت طرازی کرے جب کہ ان کی برأت قرآن سے ثابت ہو چکی ہے تو ایسے شخص کی تکفیر کی جائے گی؛ اس لیے کہ اس صورت میں تکذیب رسول اور انکار تواثر دونوں پایا جاتا ہے، تاہم اس صورت میں بھی وہ ان لوگوں کا استثنا کرتے ہیں جو ابھی حال ہی میں دائرہ اسلام میں داخل ہوئے ہوں اور ضروریات و حقائق دین سے ابھی پوری طرح واقف نہ ہو سکے ہوں۔

فلاسفہ اور باطنیہ کی تکفیر

فیصل التفرقہ میں امام غزالی کا نقطہ نظر تکفیر کے باب میں اس قدر نرمی اور لچک رکھتا ہے کہ بعض لوگوں کو محسوس ہوا ہے کہ وہ اس معاملے میں افراط و تفریط یا مبالغہ امت کا شکار ہو گئے ہوں، لیکن ایسا ہرگز نہیں ہے۔ فلاسفہ، باطنیہ اور اعتقادوی سطح پر شریعت سے متغیر صوفیہ کے ایک گروہ کی کھل کر تکفیر کرتے ہیں اور ایسے صوفیہ سے متعلق جو اس بات کے مدعی ہیں کہ روحانی ریا متوں کے بعد

ان سے تکلیف شرعی ساقط ہو چکی ہے غزالی لکھتے ہیں کہ ان کا قتل واجب ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان کے بقول ان میں سے ایک کو قتل کرنا سو کفار کو قتل کرنے سے بہتر ہے۔ اس لیے کہ اس طرح کے اعتقاد رکھنے کی شاعت اور اس کا ضرر کفر سے بڑھا ہوا ہے۔ اس سے ابا حنیف کا دروازہ کھلتا ہے اور یہ ابا حنیف عام ابا حنیف سے بہت زیادہ خطرناک ہے؛ کیوں کہ دین یزید لوگوں کی ابا حنیف کی خرابیاں ہر صاحب عقل و ہوش پر واضح ہو جاتی ہیں لیکن دین کے پردے میں چھپی ہوئی اس طرح کی ابا حنیف بہت سے لوگوں کے لیے غارت گردین و ایمان بن جاتی ہے۔ تاہم کیا ایسے صوفیہ سو کے تعلق سے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ ہمیشہ ہمیش جہنم میں رہیں گے؟ غزالی کے نزدیک یہ بات محل نظر ہے۔

فلاسفہ کی تکفیر کی وجہ ان کی نظر میں ان کے تین نظریات ہیں: ۱۔ عالم قدیم ہے، ۲۔ خدا کو کلیات کا علم حاصل ہے، جزئیات کا علم حاصل نہیں ہے، ۳۔ قیامت کے دن حشر و فشر جسمانی نہیں ہوگا اور نہ گناہ گاروں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے محسوس عذاب دیا جائے گا۔

باطنیہ کی تکفیر وہ اس لیے کرتے ہیں کہ باطنی بھی فلاسفہ کی طرح حشر و فشر کی غلط تاویل کرتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے اس عقیدے کی بنیاد پر کہ شریعت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، وہ عقائد و امور شریعت سے تعلق رکھنے والے اکثر امور کی تاویل کرتے ہیں اور انہیں ظاہر نفس سے سمجھ میں آنے والی حقیقت کی بجائے انہیں اصل حقیقت کا رمز اور علامت قرار دیتے ہیں۔

خدا کی رحمت و اسدہ کا تصور

خدا کی وسیع رحمت کا جو تصور امام غزالی کے یہاں نظر آتا ہے، علمائے اسلاف میں اس کی زیادہ نظیریں نہیں ملتیں۔ اس کی ایک وجہ غالباً صوفیہ کے افکار کا ان پر اثر بھی ہے۔ صوفیہ کرام کی جماعت کا ایک اہم امتیاز ان کی شمولیت پسندانہ (Inclusive) فکر ہے۔ انہوں نے دنیا و آخرت دونوں کے تعلق سے بندگان خدا کے لیے خدا کی رحمت کو زیادہ وسیع تناظر میں دیکھنے اور اس کے اطلاقات کو عام کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے خشک فقہاء و متکلمین کی ایک جماعت ان سے بالکل الگ رہی قرآن میں خدا کی رحمت و اسدہ کا ذکر کئی آیات میں آیا ہے: "قال عذابی اصیب بہ من اشاء و رحمتی وسعت کل شئ" "اللہ نے فرمایا کہ میں اپنا عذاب اسی پر واقع کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تمام اشیاء پر محیط ہے۔" (الاعراف: ۱۵۶)

قرطبی نے اس آیت کے ذیل میں لکھا ہے: بعض مفسرین کا قول ہے کہ اس آیت کے تحت ہر چیز کو خدا کی رحمت کی توقع ہوئی یہاں تک کہ ابلیس کو بھی۔ چنانچہ ابلیس نے کہا کہ میں بھی تو شے ہوں۔ (۱۹) ایک ضعیف حدیث سے بھی، جس کا ذکر ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں کیا ہے، ابلیس کے اس قول اور اظہار امید کا ثبوت ملتا ہے۔ (۱۹)

امام غزالی کہتے ہیں کہ اللہ کی رحمت ہمارے تصور سے بہت زیادہ وسیع ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”اللہ کی وسیع ترین رحمت کا تصور کرو اور امور الہیہ کو اپنے مختصر اور رسمی پیمانے سے مت مایوس۔“ فاستوسع رحمۃ اللہ تعالیٰ ولا تزن الامور الالہیۃ بالموازين المختصرة الرسمية۔ (۲۰)

فیصل التفرقة میں ایک جگہ انہوں نے بڑی بلند آہنگی کے ساتھ یہ بات کہی ہے کہ: انا اقول ان الرحمة تشمل كثير من الامم السالفة..... بل اقول ان اكثر نصابی الروم والترك في هذا الزمان تشملهم الرحمة ان شاء الله تعالى. اعني الذين هم في افاصی الروم والترك ولم تبلغهم الدعوة (۲۱) یعنی میں کہتا ہوں کہ اللہ کی رحمت سابق امتوں میں سے بھی بہتوں کے شامل حال ہوگی..... بلکہ میں کہتا ہوں کہ آج کے زمانے کے روم و ترک کے اکثر عیسائی اللہ کی رحمت سے فیض یاب ہوں گے۔ ان عیسائیوں سے میری مراد وہ ہیں جو ممالک روم و ترک کے دور دراز حصوں میں رہتے ہیں اور ان تک اسلام کی دعوت نہیں پہنچی ہے۔ ایسے لوگوں کی انہوں نے تین قسمیں کی ہیں: پہلی قسم میں وہ لوگ شامل ہیں جن تک رسول اللہ ﷺ کا نام ہی نہیں پہنچایا دوسرے لفظوں میں آپ ﷺ کی بعثت کی ان کو خبر ہی نہ ہوگی، یہ معذور ہیں۔ دوسری قسم میں وہ لوگ داخل ہیں جو اسلامی ممالک کے پڑوسی میں رہتے ہیں۔ انہیں مسلمانوں کے ساتھ ملے جلنے کے مواقع حاصل ہیں اور ان تک اللہ کے رسول کا نام اور آپ کی سیرت و صفات کے بارے میں معلومات پہنچیں، لیکن وہ اپنے انکار پر مصر رہے۔ یہ لوگ کفار و کڈہ بن میں سے ہیں۔ تیسری قسم ان لوگوں پر مشتمل ہے جن تک آپ کا نام تو پہنچایا نام کی خبر تو ہوئی لیکن سیرت و صفات کا ان کو علم نہ ہو سکا، بلکہ آپ کے بارے میں انہیں اس طرح اطلاع ملی کہ جیسے ہمارے محلے کے بچے سن لیتے ہیں کہ ابن مقفع نام کے ایک شخص نے نبوت کا دعوا کیا تھا تو چوں کہ انہوں نے آپ ﷺ کی اصل صفات کی بجائے اس کا برعکس سنا، اس لیے صرف اتنی بات ایسے لوگوں کے اندر طلب و جستجو کے داعیے کو ابھارنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ اس لیے یہ لوگ بھی پہلی ہی قسم میں داخل ہیں۔ (۲۲)

اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ کسی مذہب کا وہ شخص جو خدا اور آخرت پر یقین رکھتا ہو، حقیقت یہ ہے کہ تلاش حق سے دور نہیں رہ سکتا تو ایسا جو شخص تلاش حق کے راستے میں ہو اور اس میں پوری طرح کوشاں ہو لیکن حق کی دریافت سے قبل اس کی موت واقع ہو جائے تو خدا کی رحمت و مغفرت اس کے بھی شامل حال ہوگی۔ (۲۳)

اسی طرح ان کا یہ نقطہ نظر بھی نہایت اہم اور قابل غور ہے کہ حدیث میں ہر مسلم فرقوں میں سے صرف ایک مسلم فرقے کی نجات کی جو بات کہی گئی ہے، اس کا تعلق ان لوگوں سے ہے

جن سے کوئی حساب و کتاب نہیں لیا جائے گا اور ان کو اس کے بغیر جنت میں بھیج دیا جائے گا۔ اسی طرح جس حدیث میں ہزار میں سے ۹۹۹ افراد کے جہنم میں ڈالے جانے کی خبر دی گئی ہے، اس سے متعلق بھی امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ ہزار میں سے صرف ایک شخص معصوم عن المعاصی ہوگا، باقی لوگ گناہگار ہوں گے، جنہیں شفاعت کے بعد اور معمولی مزاکات کر جہنم سے نکال کر بالآخر جنت میں پہنچایا جائے گا۔ (۲۴)

خلاصہ یہ ہے کہ امام غزالی نے تکفیر کے باب کو حتی الامکان بند کرنے اور شریعت کی وسعت اور خدا کی رحمت شاملہ کو سامنے لانے کی سعی کی ہے۔ موجودہ دور میں اگر غزالی کے اصول و نظریات کو برتنے کی کوشش کی جائے تو بین مسلکی و جماعتی کش مکش اور تصادم کو کم کرنے میں اس سے مدد مل سکتی ہے۔ غزالی کی شخصیت فقہ اور تصوف دونوں کی جامع تھی۔ وہ صاحب نظر ہونے کے ساتھ صاحب دل بھی تھے۔ فکر و نظر کے افراط و تفریط کو کم کرنے اور بین جماعتی ہم آہنگی کے قیام کے لیے فقیہ کی گہری نظر کے ساتھ صوفی کے وسیع دل کی بھی ضرورت ہے۔ غور و فکر کا ایک اہم پہلو جو غزالی کے خدا کی رحمت و وسعہ کے تصور کے سیاق میں سامنے آتا ہے، وہ موجودہ دور میں اسلام کی دعوت کو اقوام عالم تک پہنچانے کی ذمہ داری ہے۔ یہ ذمہ داری عمومی سطح پر تمام مسلمانوں اور خصوصی سطح پر تمام اسلامی جماعتوں اور علماء و عاقلہ پر عائد ہوتی ہے۔ یہ اہم سوال ہے کہ کیا ہم نے اسلام کی بے گم و کامست دعوت کو دوسروں تک پہنچانے کی ذمہ داری پوری کر دی ہے تاکہ کل یہ نہ کہا جاسکے کہ وہ انہی معذورین میں سے ہیں جن کا ذکر غزالی نے کیا ہے؟

حوالہ جات

- ۱۔ الدکتور حسن الفلاح قریب اللہ: دور الغزالی فی الفکر، الامامۃ، مصر، ۱۹۸۰ء، ص: ۱۵۸، ۱۵۷
- ۲۔ یوسف القرضاوی: الغزالی بین مادحہ و ناقذ، الرسالة، بیروت، ص: ۷۱، ۷۰، ۷۷
- ۳۔ لاقتصادی الاعتقاد (مطبوعہ نقشبندیہ، تونس الفوزی الحمر)، ط: ۱۹۹۲ء، ص: ۳۱۱
- ۴۔ فیصل التفرقة بین الاسلام والزندقة، مکتبہ دار البیرونی، ط: ۱۹۹۲ء، ص: ۶۱
- ۵۔ ایضاً، ص: ۷۱
- ۶۔ ایضاً
- ۷۔ ایضاً، ۱۹
- ۸۔ ایضاً، ص: ۲۲
- ۹۔ ایضاً، ص: ۷۱
- ۱۰۔ ایضاً، ص: ۲۵

۱۱- الاقتصاف فی اصول الاعتقاد ص: ۲۰۹

۱۲- فیصل التفرقة ص: ۶۳، ۶۴

۱۳- ایضاً ص: ۴۹

۱۴- ایضاً ص: ۶۷

۱۵- ایضاً ص: ۳۱۲، ۳۱۳

۱۶- الاقتصاف فی الاعتقاد ص: ۲۱۳

۱۷- فیصل التفرقة ص: ۶۵، پہلی حدیث یہ ہے: الحجر الاسود یمین اللہ فی الارض. ”حجر اسود زمین میں اللہ تعالیٰ کا وابستہ ہوا ہے۔“ (الدیلمی، مسند الفردوس، حدیث نمبر: ۲۶۳۰) دوسری حدیث ہے: قلب المؤمن بین اصبعین من اصابع الرحمن. ”مؤمن کا دل اللہ کی دو انگلیوں کے درمیان ہے۔“ (مسلم، حدیث نمبر: ۲۶۵۳، ترمذی، حدیث نمبر: ۲۲۳۰) تیسری حدیث ہے: انی لا جلد نفس الرحمن من قبل یمین. ”میں کی طرف سے نفس الرحمن کا اور اک کرتا ہوں۔“

۱۸- الجامع لاحکام القرآن، دار الکتب العلمیہ، بیروت، ط: ۱، ۱۹۸۸ء، ج: ۷، ص: ۱۸۹

۱۹- ابن کثیر: (المجلد الثانی) دار عالم الکتب للطباعة والنشر والتوزیع، ۱۹۹۷ء، ص: ۳۱۷

۲۰- فیصل التفرقة ص: ۸۷

۲۱- ایضاً ص: ۸۴

۲۲- ایضاً

۲۳- ص: ۸۷

۲۴- ایضاً ص: ۸۱، ۸۳



شاہ صفی اکیڈمی کی فخریہ پیش کش

داعی اسلام عارف باللہ شیخ ابو سعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی عمر ظلمہ (العالی

کی قلبی واردات، گنجینہ معانی، بحر حقائق و معارف، مثنوی

نغمات الاسرار فی مقامات الابرار

جو

سلیس اردو زبان میں شریعت و معرفت کا انمول خزانہ ہے

تیسرا ایڈیشن

اپنے نئے رنگ و آہنگ اور ضروری توضیحی حواشی کے ساتھ

منظر عام پر آچکا ہے۔

حواشی نگار

ذیشان احمد مصباحی

زیر اہتمام

شاہ صفی اکیڈمی، خانقاہ عارفیہ جامعہ عارفیہ سیراواں، کوٹا مٹی، الدہ آباد

مدارس میں طریقت اور خانقاہوں میں شریعت کا نفاذ ہو

”مدارس کو چاہیے کہ اپنے نصاب میں تصوف کی کتابیں بھی شامل کریں اور ساتھ ہی طلبہ کی عملی تربیت بھی ہو اور خانقاہوں کو چاہیے کہ مکمل طور پر اپنی اصلاح کریں، خود علم شریعت سے آراستہ ہوں اور وابستگی کو علم شریعت دیں۔“

مفتی محمد نظام الدین رضوی

تصوف اسلامی جس نے ارواح کو پاکیزگی اور قلوب کو معافی و تابہدگی بخشی تھی، آج کتابوں کی زینت تو رہ گئی ہے مگر ہماری عملی زندگی کا حصہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری کائنات دل کی بستیاں ویران اور محض سونی سونی نظر آتی ہیں۔ تصوف کی جیا دین باتوں پر تھی:

علم شریعت، اس پر عمل و استقامت، اخلاص و اللہیت

علم شریعت کے عموم میں کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے علم کو بنیادی حیثیت حاصل ہے کہ یہ دونوں شریعت کا سرچشمہ ہیں۔ فقہ اور عقاید کے سوتے بھی انھیں سے جاری ہوئے۔ اعلیٰ حضرت علیہ الرحمہ فرماتے ہیں:

شریعت کی حاجت ہر مسلمان کو ایک ایک سانس، ایک ایک لب، ایک ایک لہجہ مرتے دم تک ہے اور طریقت میں قدم رکھنے والوں کو اور زیادہ کہ راہ جس قدر باریک اسی قدر بادی کی زیادہ حاجت، لہذا حدیث میں آیا کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے فرمایا: المستعبد بغیر فقہ کالحمار فی الصحون بغیر ثقتہ کے عبادت کرنے والا ایسا ہے جیسے چکی کھینچنے والا گدھا کہ مشقت جھیلے اور نفع کچھ نہیں۔ رواہ ابو نعیم فی الحلیۃ عن واثلہ بن الاسقع رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ (مقال عرفان: ۹)

نیز فرماتے ہیں:

حق سبحانہ و تعالیٰ کے متعلق بندوں کے لیے پانچ علم ہیں: (۱) علم ذات (۲) علم صفات (۳) علم اسماء (۴) علم افعال (۵) علم احکام۔ ان میں ہر پہلا دوسرے سے مشکل تر ہے، جو سب سے آسان علم احکام میں عاجز ہوگا، سب سے مشکل علم ذات کیوں کر پاسکے گا۔ (مقال عرفان: ص ۱۲، ۱۳) شریعت پر عمل و استقامت کے ذریعے اللہ عز و جل کا قرب حاصل ہو سکتا ہے۔ رسالہ تشریح میں ہے: جو اپنے اوپر آداب شریعت لازم کر لے، اللہ تعالیٰ اس کے دل کو نور معرفت سے روشن کر دے گا اور کوئی مقام اس سے بڑھ کر معظم نہیں کہ نبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے احکام۔“

بحث و نظر

عصر حاضر میں احیائے تصوف کا کام کن اصولوں کے تحت ممکن ہے؟

افعال، عادات سب میں حضور کی پیروی کی جائے۔ (مقالہ عرفاء ص: ۲۵)

اخلاص والذہبیت کا مطلب یہ ہے کہ علم و عمل سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوا اور اس کے لیے ضروری ہے کہ دل حب الہی و حب رسول سے معمور ہو، برے خصائل مثل حرص، حسد، بغض وغیرہ سے پاک اور اچھے خصائل و اوصاف سے مزین ہو۔ تصوف اسلامی کا احیان تینوں عناصر کی اساس مستحکم کر کے ہی ممکن ہے اور یہ تینوں دین کے اہم اجزاء ہیں۔

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں:

تصوف کا مطلب ہے: ☆ اخلاق کی اصلاح ☆ باطن کی صفائی ☆ صفات کاملہ سے موصوف ہونا ☆ اللہ تعالیٰ کے اخلاق سے موصوف ہونا ☆ راہ حق پر قائم رہنا ☆ حقوق ادا کرنا ☆ دل کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے لیے مختص کر دینا ☆ اس کے ماسوا سے بے رغبت ہونا ☆ (مذہب) انسانی اوصاف کا فنا ہو جانا ☆ دین کے بارے میں یقین حاصل کرنا ☆ دنیا کا ترک کرنا ☆ بے فائدہ کاموں سے گریز کرنا ☆ تقویٰ کی پابندی اور مولائے کریم جل شانہ کی محبت۔

حضرت جنید بغدادی سے تصوف کے بارے میں پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا:

☆ مخلوقات کی موافقت سے دل صاف کرنا ☆ طبعی (نفسانی) اوصاف سے جدا ہونا ☆ بشری صفات کا فنا کرنا ☆ نفسانی خواہشات سے گریز کرنا ☆ روحانی صفات کا طلب گار ہونا ☆ حقیقی علوم سے متعلق ہونا ☆ دائمی اچھے کاموں کا اختیار کرنا ☆ تمام امت کا خیر خواہ ہونا ☆ حقیقی طور پر اللہ تعالیٰ کا وفا دار ہونا ☆ شریعت میں رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا پیرو کار ہونا اور ایسی ہی دیگر صفات اور برکات کا حامل ہونا۔

عارف باللہ، سیدی علامہ احمد برہنہ معروف بہ شیخ زروق رحمہ اللہ تعالیٰ ”مکاسب الحجاج بین المشربعة والحقیقة“ میں فرماتے ہیں: کہ تصوف کی تقریباً ہزار تعریفیں اور تفسیریں کی گئی ہیں۔ ان سب کا حاصل اللہ تعالیٰ کی طرف مچی توجہ ہے۔ تصوف کے بارے میں یہ مختلف تعبیریں ہیں اور اس کی تفصیل بیان کرنے والے مختلف اقوال ہیں، جن میں ہر شخص کے علم و عمل اور حال و ذوق کا اعتبار کیا گیا ہے۔ جس شخص کو مولائے کریم کی طرف مچی توجہ کا حصہ حاصل ہے اسے تصوف کا ایک حصہ حاصل ہے، پس ہر شخص کا تصوف اس کی مچی توجہ ہے اور مچی توجہ کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ اس طرح ہو کہ اللہ کریم جل شانہ اس سے راضی ہو اور یہی ایمان ہے اور ایسے طریقے پر جو جسے وہ پسند کرے اور یہی اطاعت ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی مشروط بغیر شرط کے صحیح نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے کفر کو پسند نہیں کرتا اور اگر تم شکر کرو تو وہ تمہارے لیے اسے پسند فرمائے گا، لہذا اسلام پر عمل ضروری ہے۔ اور تصوف بغیر فقہ کے نہیں ہو سکتا کیوں کہ اللہ تعالیٰ کے ظاہری احکام فقہ ہی سے

حاصل ہوتے ہیں اور فقہ بغیر تصوف کے نہیں، کیوں کہ عمل بغیر مچی توجہ کے نہیں ہو سکتا۔ عمل اور مچی توجہ ایمان کے بغیر نہیں پائے جاتے، کیوں کہ ایمان کے بغیر ان دونوں میں سے کوئی بھی نہیں پایا جاتا، ان تینوں امور (ایمان، عمل اور صدق توجہ) کا جمع کرنا ضروری ہے۔ ان میں باہمی ربط و تعلق وہی ہے جو جسم و جان میں ہے پس فقہ ”مقام اسلام“ ہے، علم عقاید کے اصول ”مقام ایمان“ اور تصوف ”مقام احسان“ ہے جس کی تفسیر نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یوں کی ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ یقیناً تمہیں دیکھ رہا ہے۔ لہذا تصوف دین کا ایک جز ہے جس کے بارے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے صرف اس لیے سوال کیا کہ امت اس کا علم حاصل کرے۔

آج ہماری خانقاہوں کا جو حال ہے وہ تو ناگفتہ بہ ہے ہی، مدارس کا حال بھی کوئی بہت اچھا اور لائق ستائش نہیں ہے۔ مدارس میں ان عناصر میں سے ہر آخری عنصر پہلے سے زیادہ کم زور ہے کیوں کہ ان پر توجہ بھی اسی اعتبار سے ہوتی ہے۔

مدارس کو چاہیے کہ اپنے نصاب میں تصوف کی کتابیں بھی شامل کریں اور ساتھ ہی ان کی عملی تربیت بھی ہو اور خانقاہوں کو چاہیے کہ مکمل طور پر اپنی اصلاح کریں، خود علم شریعت سے آراستہ ہوں اور وابستگان و اہل اسلام کو علم شریعت دیں، ساتھ ہی اس پر عمل و استقامت کا سچا نمونہ بنیں اور بنائیں پھر ترقی کیے قلوب و اصلاح احوال میں ذکر و فکر کے ساتھ توجہ ہوں۔ خود ستائی، تفوق، پروپیگنڈا اور مبہم جوتی سے باز آ کر عجز و نیاز کے شوگر بنیں اور یاد رکھیں کہ منہک وہ ہے جو خود منہکے نہ کہ عطار کو بتانا پڑے، پھل دار شجر سے عبرت حاصل کریں، اگر ایسا ہو گیا تو ان شاء اللہ تعالیٰ تصوف کا احیا ہو گا اور مدارس، مساجد، خانقاہیں ہر جگہ تصوف کے جلوے نظر آئیں گے۔

○○○

اکابر صوفیہ کے طرز عمل کو اپنے رویے کا حصہ بنائیں!

”خانقاہ نہ بنیے کی دوکان تھی اور نہ علمائے سوکی حویلی، یہاں جبر نہیں، صبر سے کلم لیا جملہ مایوسی ان کے یہاں کفر تھی، آج بھی یہی وہ سوچ، طریقہ اور عمل ہے جو ختلفوں سے لوگوں کو جوڑ سکتا ہے۔“

پروہیسر اختر الواسع

پہلی بات یہ کہ تصوف مرغبا دنیا نہیں ہے کہ اس کا رخ ادھر ہی پھر جائے جدھر کی ہوا چلے۔ دوسری بات یہ کہ احیاء کا ہونا ہے جو ناپید ہو جائے یا بہت احتیاط سے کہیں تو خاتمہ کے قریب ہونا ہے لیکن تصوف اور اصحاب تصوف پر کتنا ہی خراب وقت آیا ہو مگر ایسا کبھی نہیں ہو سکا کہ زمانہ تصوف کو مٹانے میں کامیاب ہو پایا ہو اور ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا؛ کیوں کہ تصوف مبنی برحق ہے اور حق کو نہ زوال آتا ہے اور نہ اسے مٹایا جاسکتا ہے۔ زوال اور مٹنا قرآن کے لفظوں میں صرف باطل کا مقدر ہے۔

ہاں! اسی سوال کو اگر یوں بیان کیا جائے کہ تصوف کو کس طرح عام لوگوں تک پہنچایا جائے تو بات سمجھ میں آتی ہے۔ تصوف کی رسانی اور آشنائی کا رشتہ عام انسانوں سے اسی آزمودہ طریقے سے قائم ہوگا جیسا کہ اکابر صوفیہ نے قائم کر کے دکھایا ہے۔ اکابر صوفیہ ہر انسان سے من و تو کے ہر فرق سے بالاتر ہو کر ملتے، لوگوں کو لگتے لگاتے، جن کی کوئی سننے والا نہیں تھا، ان کے دکھ درد کو نہ صرف سنتے بلکہ اپنے وجود میں اتار لیتے، وہ سب کے کام آتے، مگر اپنی حاجت روائی کے لیے خدا کے علاوہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔

عہد و مطلق العنانی کا راج تھا، ایسے وقت میں غریب اور مظلوم عوام کے لیے صوفیہ کی خانقاہیں ایسی ہی پناہ گاہیں تھیں۔ ان سے حال دل کہہ کر ان کے کندھوں پر سر رکھ کر اور ان کے دامن کو اپنی آنکھوں سے نکلے ہوئے آنسوؤں سے تر کر کے دکھیا رے لوگ اپنے دلوں کو کچھ آرام دے دیتے تھے، غموں کا بوجھ کم کر لیا کرتے تھے اور جہاں تک ممکن ہو پاتا کچھ نہ کچھ مادی امداد بھی پا جاتے تھے۔ ان خانقاہوں میں عام سماجی زندگی کی طرح کوئی پییدہ نہ ہوتا تھا۔ صوفی کی خانقاہ میں صرف دو منتر کام کرتے تھے، تخلصوا باخلاق اللہ اللہ جیسا اخلاق پیدا کرو اور الخلق عیال اللہ تمام مخلوق اللہ کا کنبہ ہے، اور یہ دونوں منتر ان کے یہاں نعرہ نہیں ایک جیتی جاگتی حقیقت کا مظہر ہوتے تھے۔ غرض عام انسان کی خوشی اور غم دونوں میں اسی طرح سے شریک ہوتے جیسے کہ یہ انہیں کا غم ہو یا ان کی ہی خوشی ہو۔

خانقاہ نہ بنیے کی دوکان تھی اور نہ علمائے سوکی حویلی، یہاں حکم رانوں کی طرح جبر نہیں، بلکہ مہربانوں کی طرح صبر سے کام لیا جاتا۔ اور اسی کی تربیت بھی دی جاتی تھی۔ یہاں حکم نہیں مشورے کا طریقہ تھا۔ یہاں لوگوں کو پابند نہیں بنایا جاتا تھا بلکہ آزاد چھوڑ کر ساتھ لیتے تھے۔ مایوسی ان کے یہاں کفر تھی۔ آج بھی یہی وہ سوچ، طریقہ اور عمل ہے جو خانقاہوں سے لوگوں کو جوڑ سکتا ہے۔ خاک ساری لیکن حرف خاک ساروں کے ساتھ اور سر بلندوں کے ساتھ کوئی انکسار نہیں۔ عزت نفس کی پامالی نہ ہو اس کی تلقین، یہی خانقاہوں کا منشور تھا۔ آج بھی اگر ہم ان تمام اوصاف کو اپنائیں تو دنیا ایک بار پھر آپ کی طرف جوق در جوق چلی آئے گی اور جسے یقین نہ ہو وہ اجمیر سے دلی اور اسی ملک کے طول و عرض میں محض دو گز زمین میں جو خواب صوفیہ کے مزاروں پر چلے جائیں وہاں موجود لوگوں کا ازدحام آپ کو اس کا زندہ ثبوت دے دے گا کہ اگر ان کے پردہ کر لینے کے بعد صدیوں سے ان کے پاس آنے والوں کا سلسلہ ٹوٹا نہیں ہے تو پھر ان کے طریقے اور حکمت کو اپنا کر ہم بھی نہ صرف ان کو اپنا بنا سکتے ہیں بلکہ ایک نئے انقلاب کی داغ بیل پڑ سکتی ہے۔

○○○

تصوف کا احیا صرف متقدمین کے اصولوں پر ہی ممکن ہے

”جن اصول و صفات سے آراستہ ہونے کی وجہ سے متقدمین حضرات ”صوفی“ کہلائے اور پوری دنیا میں ایک روحانی انقلاب برپا کیا، انہی اصول و صفات کو اپنا کر ہم عصر حاضر میں بھی تصوف کا احیا کر سکتے ہیں۔“

ڈاکٹر نوشاد عالم چشتی

تصوف نظریے سے زیادہ عمل کا نام ہے۔ جب تک عمل نہیں ہوگا نظریے سے کوئی فائدہ نہیں۔ عمل کے بعد یہ ایک حال بن جائے، یہی تصوف کا مقصود ہے۔ جہاں تک تصوف کے احیا کی بات ہے تو اس سلسلے میں یہ دیکھنا ہوگا کہ آخر تصوف کی بنیاد کن اصولوں پر قائم ہے اور متقدمین صوفیہ کن اصول و صفات سے متصف ہونے کی بنیاد پر ”صوفی“ کہلائے۔ جن اصول و صفات سے آراستہ ہونے کی وجہ سے متقدمین حضرات ”صوفی“ کہلائے اور پوری دنیا میں ایک روحانی انقلاب برپا کیا، انہی اصول و صفات کو اپنا کر ہم عصر حاضر میں بھی تصوف کا احیا کر سکتے ہیں۔ یہاں پر عرب کے ایک بے مثال خطیب زید بن ابیہ کی ایک بات پوری طرح فٹ بیٹھتی ہے جو اس نے اسلام کے سلسلے میں کہی تھی: ”لا یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح اوله“ اس امت کے متاخرین کی اصلاح انہی اصول و صفات سے ہوگی جن کو اپنا کر اس امت کے اولین حضرات صلاح و فلاح سے بہرہ ور ہوئے۔ یہی حال تصوف کا بھی ہے۔ متقدمین تصوف نے جن اصول اور اساس کو اختیار کر کے کامیابی حاصل کی انہی اصول کو اختیار کر کے آج بھی کامیابی حاصل کی جاسکتی ہے۔

اب رہی یہ بات کہ وہ اصول کیا ہیں جن پر تعلیمات تصوف کی بنیاد ہے اور وہ امتیازات کیا ہیں جن پر تصوف کی اساس ہے تو اس سلسلے میں میں یہ کہوں گا کہ تصوف کی اساس مندرجہ ذیل عناصر پر ہے:

- ۱- حب الہی، ۲- اتباع رسول، ۳- خوف آخرت، ۴- فکر امت، ۵- خدمت خلق، ۶- مساوات، ۷- آزادی اظہار خیال۔

یہ وہ عناصر ہیں جو صوفیہ کے امتیازات سے ہیں اور سارے جہان میں وہ ان اوصاف و خصائل سے مشہور و معروف رہے ہیں۔ اب ہمیں یہ معلوم کرنا ہوگا کہ مندرجہ بالا عناصر آج کے تصوف اور موجودہ صوفیہ میں موجود ہیں یا نہیں؟ ہر شخص جانتا ہے کہ عموماً آج صورت حال ایسی

نہیں ہے۔ اس طرح کا تصوف مفقود نہیں تو کم یا ب ضرور ہے، اور ایسے صوفیہ عام طور سے پائے نہیں جاتے۔ لہذا اگر ہم تصوف کا احیا چاہتے ہیں تو ضرورت ہے کہ ہم اپنے دلوں میں حب الہی کا جذبہ موج زن کریں، اپنے تمام اعمال و افعال کی بنیاد پر تعالیٰ اور اس کے رسول کی محبت اور ان کی پیروی پر رکھیں اور صرف اس کی رضا اور خوشنودی کے لیے اپنا کوئی بھی کام انجام دیں، غیر کی آلائشوں سے اس کو پاک و صاف کر دیں اور صرف زبانی طور پر محبت الہی کا دعویٰ نہ کریں اور اپنے دلوں میں آخرت کا خوف پیدا کریں۔ آج صورت حال یہ ہے کہ ہمارے دلوں سے آخرت کا خوف نکل چکا ہے۔ ہمارے قلوب سے آخرت کا یقین رخصت ہو چکا ہے۔ موجودہ دور کے علماء عموماً باہمی بغض و حسد، کبر و نخوت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ افتراق و انتشار، تکبر و تفسیق میں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہیں۔ علم نافع کی ترویج و اشاعت کے بجائے دینی علوم کی اشاعت بھی اس طرح کر رہے ہیں کہ مدارس کے فارغین اللہ کا بندہ بن کر نکلنے کے بجائے دنیا کا بندہ بن کر نکل رہے ہیں اور یہ احساس بھی نہیں ہے کہ ایک روز اپنا بھی آئے گا جو جزا اور سزا کا ہوگا اور رب العالمین کی بارگاہ میں حساب و کتاب دینا ہوگا۔

یہی حال آج ان لوگوں کا بھی ہے جو اپنے آپ کو صوفیہ کے گردہ سے قرار دیتے ہیں۔ وہ علم و عمل سے دور اور اپنے مشن سے غافل ہیں۔ اپنے امتیازات سے نا بلد ہیں۔ صرف لوٹ کھسوٹ اور خلق خدا کو اپنے زیر نگین رکھنے کے حیلوں کی تلاش میں لگے ہوئے ہیں اور آخرت کا ذرہ برابر کوئی خوف نہیں ہے۔ امت اسلامیہ کی صلاح و فلاح کی فکر اور ان کی سعادت و سرفرازی کی کوشش جو صوفیہ کی خاص چیز تھی، اس سے صوفیہ کی جانب امتساب کرنے والے دونوں گردہ۔ مدارس کے علما اور خانقاہوں کے سجادہ نشینان عموماً مجرمانہ حد تک لاپرواہ ہیں؛ بلکہ پوری امت اسلامیہ کی صلاح و فلاح کی باتیں کرنے والے مشکوک نگاہوں سے دیکھے جاتے ہیں۔ اسلام کی وسعت و رحمت شاملتہ کا تصور جیسے جو سا ہو گیا ہے۔ یوں ہی تصوف کی ایک مضبوط بنیاد و خدمت خلق تھی۔ ”الصلح کلہ عبال اللہ“ صوفیہ کی پیشانی کا ٹیکہ اور ان کے رخِ تاباں کا غارہ تھا۔ اسی نظریے کے تحت اور حاجت مندوں کی حاجت روائی کے ذیل میں لشکر کی روایت شروع ہوئی اور اس طرح خلق خدا کی دل جوئی، ان سے محبت و شفقت اور رافت و رحمت کا مظاہرہ کیا گیا۔ صوفیہ کے دروازے سب کے لیے بلا تفریق کھلے ہوتے تھے۔ وہاں کوئی چھوٹ چھامت، اونچ نیچ، بھید بھاؤ نہیں تھا۔ ہر طرح کے لوگ صوفیہ کی خانقاہوں میں آتے، اپنا دکھ درد سناتے اور اپنے خیالات کا آزادی کے ساتھ اظہار کرتے۔ وہاں مساوات (Equality) اور آزادی اظہار رائے (Freedom of Speech) کے عملی نمونے اور زندہ مظاہر ملتے تھے۔ انہوں نے اسلام و

شریعت کے دائرے میں رہتے ہوئے ان مقامی رسوم و رواج کو اختیار کیا جو شریعت سے متصادم نہیں تھے اور صوفیہ کی انہی خصوصیات کی وجہ سے خلق خدا کا ان کی طرف رجوع ہوتا۔ لوگ ان سے محبت کرنے لگتے اور پھر آہستہ آہستہ اسلامی تعلیمات کو اپنے اندر جاذب کر کے دائرہ اسلام میں داخل ہو کر اس کے ماحر و مدوگ رہو جاتے۔ اس طرح صوفیہ نے کام کیا ہے۔ انہی اصولوں سے تصوف پھیلا ہے اور انہی اصولوں کو کھودینے کی وجہ سے تصوف کا دائرہ اثر سمٹا ہے۔ بعض مقلدین تصوف نے خانقاہی نظام کی تنقید و تردید تو کی لیکن اس نظام کا کوئی متبادل نہیں پیش کر سکے، جب کہ تنقید و تردید کے لیے ضروری ہے کہ اگر کسی نظام میں کوئی عیب ہے تو اس سے بہتر اس کا متبادل پیش کیا جائے۔ اس سے بھی تصوف کا نقصان ہوا۔ بہر حال اگر پھر سے انہی اصولوں کو اپنا لیا جائے، ایسے ہی صوفیہ کے نقوش قدم کو نشان منزل بنا لیا جائے تو آج بھی تصوف کا احیا ہو سکتا ہے اور پھر سے تصوف کی با دہاری چل سکتی ہے، لیکن یہ بات یاد رکھی جائے کہ ان اصولوں سے ہٹ کر اگر تصوف کی بنیاد خلق خدا سے گریز، دنیا سے فرار، سماج اور سوسائٹی سے لاقلمی اور خالص تشنگی پر رکھی گئی تو پھر ایسے تصوف کا انجام رہبانیت ہوگا جو اسلام کا مطلوب اور مقصود نہیں ہے۔ لہذا محضر حاضر میں احیائے تصوف کی جو بھی آواز اٹھے اور اس سلسلے میں جو بھی کوششیں ہوں وہ مذکور بالا اصولوں کے تحت ہوں۔ اگر ایسا ہو جاتا ہے تو یقیناً انسانیت کی یہ عظیم خدمت ہوگی اور بھٹکے ہوئے مسافر اپنی منزل شوق کی طرف پھر سے تیز گام ہو جائیں گے۔

○○○

تصوف و سلوک پر شاہ صفی اکیڈمی

کی ایک نادر اور دستاویزی پیش کش

دسویں صدی ہجری کی جامع شریعت و طریقت شخصیت

حضرت مخدوم شیخ سعد خیر آبادی قدس سرہ (۹۲۲ھ)

کے قلم سے آٹھویں صدی ہجری کے بلند پایہ صوفی عالم

علامہ قطب الدین دمشقی قدس سرہ کی مشہور مقنن تصوف

الرسالة المکیة

کی عالمانہ و عارفانہ شرح

مجمع السلوک

جو شریعت و طریقت کا انسائیکلو پیڈیا اور سالکین و طالبین کے لیے دستور العمل ہے۔

مولانا ضیاء الرحمن عظیمی نے اس کا سلیس و جامع ترجمہ مکمل کر لیا ہے۔

تحقیق و تخریق کا کام تیزی کے ساتھ جاری ہے۔ بہت جلد اشاعت پذیر ہو رہی ہے۔

شاہ صفی اکیڈمی

خانقاہ عالیہ عارفیہ سید سراواں، الہ آباد، یوپی

شناسائی

مفتی عبید الرحمن رشیدی صاحب سے گفتگو

حضرت علامہ مفتی عبید الرحمن رشیدی دامت برکاتہم اللہ سیہ عمر حاضر کے ایک بلند پایہ محقق، وسیع نظر مفتی، عالم شریعت اور عارف طریقت ہیں۔ آپ جامعہ اشرفیہ مبارک پور کے قائل فخر فرزند اور قدیم تاریخی آستانہ خانقاہ رشیدیہ کے موجودہ سجادہ نشین ہیں۔ ۱۳۶۲ھ میں پورنیہ بہار کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے، متوسطات تک کی تعلیم دارالعلوم مہدطفہ سیہ، چمتی بازار، پورنیہ سے حاصل کی، پھر مدرسہ حمیدیہ رضویہ بنارس اور مدرسہ مظہر اسلام بریلی سے تعلیم حاصل کرتے ہوئے ۱۹۶۷ء میں جامعہ اشرفیہ مبارک پور سے فراغت حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں حافظ ملت شاہ عبدالعزیز محدث مراد آبادی، مولانا شمس الدین جعفری، مولانا عبدالرؤف بلیاوی، مولانا متین الدین امرہوی اور مولانا سید حامد اشرف کچھوچھوی جیسے نام ور علمائے نام شامل ہیں۔ جامعہ اشرفیہ سے فراغت کے بعد فیض العلوم جشید پور سمیت ملک کے کئی بڑے مدارس میں آپ نے مدرسہ خدمات انجام دیں۔ ادارہ شرعیہ بہار وائرس کے دارالتفصا کے مفتی و قاضی بھی رہے۔ اختیار نبوت، بیان حقیقت اور جواہر الحدیث کے نام سے کئی علمی اور تحقیقی کتابیں بھی آپ نے مرتب کیں اور بدھتہ ہوں سے کئی مناظرے بھی کیے۔ جدید فقہی مسائل میں اپنا محققانہ موقف رکھتے ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں خانقاہ رشیدیہ کے ۱۰ویں سجادہ نشین منتخب ہوئے اور اس وقت سے اس سلسلے کی اشاعت، مریدین و متوسلین کی تربیت و تزکیہ اور سلسلے کے تحت قائم مختلف مدارس اور خانقاہوں کی توسیع و تعمیر میں آپ کے شب و روز گزر رہے ہیں۔ مفتی صاحب کا یہ انہماک و یگانگی کی شخصیت اور خانقاہ رشیدیہ کا مستند و متاویز ہے۔ مہر معبود صفا

سوال (۱) اپنی شخصیت اور حالات زندگی کے بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: میری پیدائش ماہ رجب المرجب بروز جمعہ ۲۶ ۱۳۲۷ھ میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم سے لے کر شرح ملا جانی تک میری تعلیم دارالعلوم مصطفیٰ ورگاہ شریف چچنی بازار پورنیہ میں ہوئی۔ یہ جگہ حضرت قطب الاولیاء بندگی شیخ مصطفیٰ جمال الحق عثمانی قدس سرہ کی آخری آرام گاہ ہے۔ آپ حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید مصطفیٰ جون پوری قدس سرہ کے والد ماجد اور پیر طریقت ہیں۔ ابتدائی کتابیں میزان و مشعوب تک خود اپنے والد بزرگوار سے ہی پڑھیں۔ پھر اس کے بعد شرح ملا جانی تک حضرت استاذی مولانا غلام محمد سلیمان صاحب سے، جو ضلع پورنیہ بہار کے کام و رعالم اور حضرت صدر الشریعہ مصنف بہار شریعت کے علامہ سے تھے۔

میری خواہش ہوئی کہ اب باہر کے کسی مدرسے میں تعلیم حاصل کروں مگر حضرت استاذی مولانا شاہ غلام محمد سلیمان قدس سرہ کو یہ پسند نہیں ہوا اور انہوں نے یہاں اپنے مدرسے میں ایک لائق و فائق استاد حضرت مولانا معین الدین خاں اعظمی کو بلا لیا مگر یہ ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد یہاں سے چلے گئے۔ بالآخر حضرت موصوف نے مجھے اثنائے سال ہی میں مدرسہ حمید یہ رضویہ بنارس بھیج دیا۔ یہاں اس وقت حضرت مولانا شمس الدین جعفری جون پوری اور حضرت مولانا سلیمان احمد بھگل پوری قدس سرہما العزیز منصب مدرسہ پر فائز تھے۔ میری کتابیں انھیں دونوں حضرات کے پاس تھیں۔

پھر میں بریلی شریف مدرسہ مظہر اسلام مسجد نبی بی جی چلا گیا۔ یہاں ایک سال رہا۔ میرے اساتذہ میں یہاں حضرت مولانا بنین الدین امرہوی و حضرت مولانا تحسین رضا خاں وغیرہ تھے۔ شرح جامی، شرح وقایہ، شرح تہذیب، قطبی وغیرہ کی تعلیم یہیں ہوئی اور مجھے معقولات کا شوق بھی نہیں پیدا ہوا جب کہ ابتدا میں مجھے علم نحو سے خاصی دل چسپی تھی۔

پھر اس کے بعد ۱۹۶۲ء میں دارالعلوم اشرفیہ مبارک پور کا رخ کیا۔ الحمد للہ یہاں کا تعلیمی ماحول کافی عمدہ پایا اور ملاحسن وغیرہ کی جماعت میں میرا داخلہ ہوا۔ اساتذہ کرام کی شفقت و نوازش نے مجھے کافی حوصلہ بخشا اور سیکس سے فراغت حاصل کی۔ یہاں معقولات میں میری پیش تر کتابیں حضرت استاذی حافظ عبدالرؤف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس رہیں۔ ملاحسن، ملاجلال، رسالہ میر زاہد مع حاشیہ غلام تھکی، حمد اللہ، قاضی مبارک، صدر، شمس با نغہ، امور عامہ مع حاشیہ میر زاہد، یہ سب کتابیں انھیں سے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت استاذ موصوف ہمارے نزدیک جان اشرفیہ تھے۔ ان کی منکسر المزاجی و مادی دلوچی اپنی مثال آپ تھی۔ آپ ایک زبردست جامع علوم و فنون تو تھے ہی، اپنے معاصرین میں بھی ایک نمایاں اور امتیازی مقام رکھتے تھے۔ ان کی تفسیر کی جس قدر

تحریر کی جائے کم ہے۔ ادق سے ادق مضامین کو وہ اس طرح سمجھاتے تھے جیسے یہ کوئی ادق اور مشکل مضمون ہی نہیں۔ کتابوں کی تکرار میرا محبوب مشغلہ تھا اور میں یہاں ایک طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ معین المدرسین بھی تھا اور مختلف جماعت کی کتابیں میرے زیر تدريس رہیں۔ شرح مآقا عامل ایک جماعت کو پڑھاتے ہوئے مجھے ترکیب نحوی میں کچھ غلطیاں ہوا۔ وہ عبارت جس کی ترکیب میں مجھے غلطیاں ہوا یہ تھی وھذہ الحروف الخمسة تنصب الاسم۔ اس میں مجھے یہ غلطیاں پیدا ہوا کہ معنوی حیثیت سے تو ”خمریہ“ حروف کی صفت ہے، مگر ظاہری طور پر وہ ”ہذہ“ کی صفت ثانیہ ہے، جب کہ کسی موصوف کی چند صفات ہوں تو حسب قاعدہ کسی بھی صفت کو کسی کی جگہ رکھنے میں کوئی معنوی خرابی پیدا نہ ہو اور یہاں ”الخمریہ“ کو اگر ”الحروف“ کی جگہ رکھیں اور ”الحروف“ کو ”الخمریہ“ کی جگہ تو اس میں معنوی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ یہ ”ھذہ“ کی صفت بننے کے قائل نہیں۔ اس لیے کہ درحقیقت معنوی طور پر ”الخمریہ“ ”الحروف“ ہی کی صفت ہے۔ یہ تو میرا اصل غلطیاں تھا مگر جب ”بشیر الکامل“ دیکھی تو دوسرا غلطیاں بشیر الکامل نے یہ پیدا کر دیا کہ اس نے ”الخمریہ“ کی ناکو بجائے نائیت کے تذکیر کا لکھ دیا جب کہ حسب قاعدہ موصوف صفت میں تذکیر و نائیت میں مطابقت ضروری ہوا کرتی ہے اور ناکو تذکیر کے لیے ماننے کی صورت میں موصوف صفت میں مطابقت نہیں پائی جاتی۔ چنانچہ میں نے صاحب بشیر الکامل حضرت علامہ سید غلام جیلانی میرٹھی کی خدمت میں یہ سوال لکھ بھیجا۔ انھوں نے میرے سوال پر میری تحسین فرمائی اور یہ فرمایا کہ اب ایسے دور میں جب کہ علم نحو کی دل چسپی طلبہ میں کم ہو گئی ہے، آپ کا یہ سوال علم نحو میں دل چسپی کو ظاہر کرتا ہے۔ انہوں نے جواب میں یہ فرمایا: عام علمائے نحو اعداد کی ناکو نائیت کا ہی ماننے ہیں مگر میں نے اپنے نحو کے استاذ علامہ گل علیہ الرحمۃ کے اتباع میں اس کو تذکیر کا لکھ دیا۔ پھر انھوں نے یہ فرمایا کہ موصوف و صفت کے درمیان مطابقت کی جہاں تک بات ہے تو یہ کوئی قاعدہ کلیہ نہیں بلکہ عمومی ہے۔ اس پر انھوں نے یہ دلیل دی کہ قرآن مجید کی آیت ”والفجر ولیل عشر“ میں لفظ عشر مذکر ہے جبکہ اس کا موصوف مونث اس لیے کہ ”لیال“ ”لیلۃ“ کی جمع ہے، نہ کہ ”لیل“ کی۔ لہذا یہاں موصوف و صفت کے درمیان مطابقت نہیں پائی جاتی۔ پھر حضرت میرٹھی صاحب سے پوچھ چکھا سلسلہ کافی دنوں تک جاری رہا اور میری دل چسپی اس فن میں کافی بڑھ گئی۔

الحاصل ۱۹۶۷ء میں میری فراغت ہوئی اور میں نے مختلف مدارس میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ سب سے پہلے مدرسہ فیض العلوم جمشید پور گیا، پھر بنارس جامعہ حمید یہ رضویہ، پھر بمبئی دارالعلوم محمدیہ، پھر بریلی مدرسہ مظہر اسلام، پھر ناگ پور دارالعلوم امجدیہ، پھر مدرسہ ندائے حق جلال پور فیض آباد، پھر گھوٹی مدرسہ شمس العلوم۔ طالب علمی کے دور میں مجھے علوم دینیہ، فقہ، حدیث، تفسیر

سے کوئی خاص دل پنچھی نہیں تھی مگر جب فراغت کے بعد سب سے پہلے جمشید پور پہنچا تو علامہ ارشد القادری صاحب نے میرا سخت امتحان لیا اور دارالافتا کا پورا قلم دان میرے حوالے کر دیا جب کہ فتویٰ نویسی تو دور کی بات ہے میں فتویٰ نویسی کی ایجاد سے بھی واقف نہ تھا مگر پیران کرام کی مدد ہوئی کہ میں نے اس پر کافی محنت اور عرق ریزی کی اور الحمد للہ! میں اس امتحان میں کامیاب رہا۔ اسی سال علامہ ارشد القادری صاحب نے سیوان میں ایک کانفرنس کرائی تھی جس میں انھوں نے اکابر علماء کی رائے سے یہ تجویز پاس کرائی کہ ہمارا پنا ایک دارالتقنا ہونا چاہیے اور یہ دارالتقنا سر دست بہار، بنگال اور آڑیسہ کے لیے قائم کیا جائے اور اس کا ہیڈ کوارٹر پٹنہ ہو۔ چنانچہ دست سبزی باغ پٹنہ میں گرایہ کا ایک روم لے کر دارالتقنا قائم کر دیا گیا اور دارالتقنا سے متعلق جتنے مسائل تھے ان سب کا دستور العمل مرتب کرنے کی ساری ذمہ داری اور ساتھ ہی آئے ہوئے استغوثوں کے جوابات دینے کی بھی ذمہ داری میرے سپرد کر دی گئی۔

اب آپ سوچئے کہ ایک ایسا طالب علم جو ابھی فارغ ہوا اور فتویٰ نویسی کے ایجاد سے بھی واقف نہ ہوا اور نہ کسی مفتی سے مشق استنفا کرنے کا موقع ہو تو اس کے لیے یہ کام کتنا مشکل ہے مگر میں نے ہمت نہیں ہاری اور کتب فقہ کی ورثہ گردانی بالخصوص فتاویٰ رضویہ کے غائر مطالعے سے میں نے یہ سارے کام مجھہ تعالیٰ انجام دیے۔ پھر میں بنارس جامعہ حمید یہ رضویہ چلا آیا۔ اس وقت وہاں حضرت شمس العلماء مولانا شمس الدین صاحب جعفری رضوی صدر المذہبین تھے اور میں ان سے پڑھ چکا تھا۔ ان کی نوازشیں شامل حال رہیں۔ کچھ دن گزرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ عبید الرحمن فتویٰ کے کام میں تم میرا ہاتھ بناؤ! میں نے بطیب خاطر اس کو منظور کر لیا۔ ان کی ہدایت تھی کہ پہلے تم کاغذ میں اس کا جواب لکھو اور مجھے دکھا دو، تب استنفا کے کاغذ میں جواب لکھنا۔ چنانچہ میں نے ویسا ہی کیا۔ چند دنوں کے بعد فرمایا کہ ماشاء اللہ تم صحیح لکھتے ہو، اب مجھے دکھانے کی ضرورت نہیں، تم فتویٰ دیا کرو۔ الحمد للہ کہ وقت کے مانے ہوئے ایک بلند پایہ عالم و فقیہ نے مجھے فتویٰ نویسی کی سند عطا فرمائی۔ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ بنارس میں ایک محکم صاحب رہتے تھے جن کا نام جلال الدین تھا۔ وہ شمس العلماء کے خاص دوستوں میں تھے اور برادران سے ملنے آیا کرتے تھے۔ ایک ایسا استنفا میرے پاس لے کر آئے اور کہا کہ حضرت شمس العلماء نے آپ کو اس کا جواب لکھنے کو فرمایا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ تو حضرت کے مخلص دوستوں میں ہیں۔ اس کا جواب آپ نے ان سے کیوں نہیں لے لیا؟ انہوں نے کہا کہ میں نے ان سے پر زور گزارش کی کہ اس کا جواب آپ ہی دیں تو انھوں نے فرمایا عبید الرحمن اچھا لکھتے ہیں۔ مجھے ان کے فتویٰ پر پورا اعتماد ہے۔ یہ سن کر میرا حوصلہ کافی بلند ہوا اور پچھو لے نہیں سکیا۔ بالتحفہ یہ کہ میرا ذوق معقولات سے ہٹ کر اب منقولات کی طرف

پڑھ گیا۔ اہلہ منقولات بالخصوص فتویٰ نویسی میں معقولات کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ جامعہ حمید یہ رضویہ بنارس میں کئی سال رہنے کے بعد میں ممبئی چلا گیا۔ وہاں صرف ایک سال رہنے کا اتفاق ہوا۔ وہاں حضرت استاذی حامدا شرف کچھو چھو صاحب نے ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ انھوں نے مجھے دورہ حدیث کے طلبہ کو پڑھانے کے لیے بلا لیا۔ وہاں کی دنیا عجیب و غریب تھی۔ دروہیو اور سے دنیا کی بو آ رہی تھی۔ زرطبی کی موس ہر چہار جانب چھائی ہوئی تھی۔ میرا مزاج اس سے ہم آہنگ نہیں ہو سکا۔ میں وہاں سے چلا آیا۔ پھر محکم حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ بریلی شریف مدرسہ مظہر اسلام مسجد نبی جی چلا گیا۔ وہاں بھی زیادہ دنوں تک نہیں رہ سکا اور دارالعلوم امجدیہ ناگ پور پہنچا۔ وہاں کئی سال رہا۔ پھر دارالعلوم ہند اے حق قصبہ جلال پور فیض آباد میں پڑھایا۔ اس وقت جناب مفتی شریف الحق صاحب امجدی اس کے صدر المذہبین اور شیخ الحدیث تھے۔

اسی سال حضور حافظ ملت علیہ الرحمہ کا وصال ہو گیا اور حضرت مفتی صاحب وہاں چھوڑ کر اشرافہ مبارک پور چلے آئے اور مجھے ان کا عہدہ سنبھالنا پڑا۔ کئی سال کے بعد میں گھوبی مدرسہ شمس العلوم چلا آیا اور یہاں پانچ سال تک طلبہ کو پڑھایا اور افتا کا کام بھی انجام دیا۔ یہاں میں نے ایک کتاب بنام ”اختیار ربوت“ لکھی جو ایک غیر مقلد صنفی الرحمن اعظمی کی کتاب ”رزم حق و باطل“ کے جواب میں تھی۔ جب بنارس میں تھا تو وہاں ایک کتاب ”بیان حقیقت“ کے نام سے لکھی جو ایک شریمند دیوبندی مولوی کی کتاب ”نور حق“ کے جواب میں تھی۔ جب ممبئی میں تھا وہاں ایک چند ورثی کتاب ”جواہر الحدیث“ لکھی جس میں مسئلہ تقلید پر روشنی ڈالی۔ یوں جدا جدا اخباریں وقتاً فوقتاً میرے مضامین شائع ہوئے۔ جب جمشید پور تھا تو علامہ ارشد القادری صاحب کی ادارت میں شائع ہونے والا ماہنامہ ”جام نور“ کے ”خورشید رسالت نمبر“ میں میرا ایک مضمون ”نبی خاتم“ شائع ہوا جس کو علامہ نے کافی پسند فرمایا۔ پھر اس میں میرے فتوے بھی شائع ہوتے رہے۔ ان ہی مددیں ایام میں مجھہ تعالیٰ میں نے کئی باطل شکن مناظرے بھی کیے۔ پہلا مناظرہ جب میں جلال پور فیض آباد میں تھا تو اس وقت ہمارے دیوبند میں کچھ فتنہ پرو دیوبندی مولویوں نے ”ہل من مبارز“ کی صدا بلند کی اور مناظرہ کا چیلنج کر دیا۔ الحمد للہ کہ اس مناظرہ میں چار گھنٹے کے اندر انھیں شکست فاش ہوئی اور اقرار شکست کرنا پڑا۔ جب اس کا علم علامہ ارشد القادری صاحب کو ہوا تو وہ حیرت میں پڑ گئے۔ پھر دوسرا مناظرہ بنگال کی سرزمین آسا پور میں کیا اور تیسرا مناظرہ مددوان کے قریب گلشنی کی ناز میں۔ الحمد للہ کہ یہ سارے مناظرے بہت کامیاب رہے۔ یہاں ممکن ہے کہ لوگ اسے خود ستائی پر محمول کریں مگر میں نے یہ باتیں تجدید نعت کے طور پر کہیں، ورنہ میں کیا اور میری بساط کیا۔ تیریہ تو ایام مددیں کی باتیں تھیں جنہیں میں نے اختصار سے ذکر کیا کہ بعض جگہ کچھ طویل بھی ہو گئیں۔

سوال (۲): خانقاہ رشیدیہ کی سجادگی کے منصب تک کیسے پہنچے، اس بارے میں کچھ بتائیں؟

جواب: میری ابتدائی تعلیم ایک خانقاہ کے مدرسے میں ہوئی اور یہ خانقاہ، خانقاہ رشیدیہ سے منسلک ہے اور میرے والد بزرگوار اس خانقاہ کے خلفائے تھے اور میری تعلیم و تربیت پر ان کی خاص توجہ تھی۔ انھوں نے مجھے خلافت و اجازت سے بھی سرفراز فرمایا تھا مگر میری طبیعت کا میلان اس جانب نہ تھا چوں کہ میرا محبوب مشغلہ درس و تدریس کا تھا۔ اچانک ۱۹۸۶ء میں ہمارے مریضوں اور مرشدوں نے یہ بارگراں میرے دوش ناتواں پر ڈال دیا۔ ناچاران کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے یہ بارگراں یہ سمجھ کر اٹھائے گئے۔

خیر تیری طرف سے جو کچھ ہو

میری سعی اور میری ہمت کیا

اس خانقاہ کی سجادگی کوئی آسان چیز نہیں۔ یہ ایسی خانقاہ ہے، جہاں نام و نمود، حرص و طمع اور جاہ پسندی انتہائی مذموم و قبیح ہے۔ مرید ہی اور دعا تو عہد کو پیشہ بنا نا سخت ممنوع و ناپسندیدہ ہے۔ اس لیے میرا اپنے کو اس قائل نہیں سمجھتا تھا۔

سوال (۳): آپ اتنی بڑی خانقاہ کو جس کے تحت کئی شاخیں ہیں، کیسے سنبھالتے ہیں؟

جواب: دیکھیے اللہ تبارک و تعالیٰ ہی کار ساز اور ہر کام میں ناصر و مددگار ہے، ورنہ اتنی بڑی خانقاہ کے تمام مراکز کی خدمات کو انجام دینا میرے بس کی بات نہیں اور خاص بات یہ بھی ہے کہ پیران کرام اور بزرگان دین کی خصوصی توجہات اور دعائیں شامل حال رہتی ہیں۔ ہر کام بڑی آسانی سے انجام پاتا ہے۔ ہر جگہ ہمارے کارندے موجود و مقرر ہیں جو ہدایت کے مطابق اپنی اپنی جگہ بڑی خوش اسلوبی اور دیانت داری کے ساتھ اپنی ذمہ داریوں کو انجام دیتے ہیں اور یہ حضرات ہر چھوٹے بڑے معاملے میں مجھ سے رائے اور مشورہ لیتے ہیں اور میں خود بھی ان کی سرگرمیوں اور ذمہ داریوں کا معائنہ اور جائزہ لیتا رہتا ہوں۔

سوال (۴): آپ کے بعض شاگردوں کا خیال ہے کہ خانقاہ میں آنے کی وجہ سے آپ جیسی علمی

شخصیت علمی دنیا سے کٹ گئی جو فتنہ و افتاء کے لیے بہت بڑا نقصان ہے۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: یہ ان حضرات کا اپنا خیال ہے، ویسے میں کوئی بھاری بھر کم شخصیت بھی نہیں کہ فتنہ و افتاء کی لائن سے الگ ہو جائے پر کوئی نقصان یا غلا پیدا ہو۔ ہماری جماعت میں ایک سے ایک عالم دین ہیں جو اس خدمت کو پوری ذمہ داری سے انجام دیتے ہیں اور علمی دنیا سے کٹ جانے کی جہاں تک بات ہے تو ابھی نہیں ہے۔ میں آج بھی علمی دنیا سے وابستہ ہوں، البتہ اتنا ضرور ہے کہ فنی نوئی کا کام نہیں کرتا۔ اس کی وجہ میری دیگر مصروفیات ہیں اور فنی نوئی کی خاصی مصروفیت

کا کام ہے جس کا میں متحمل نہیں۔

سوال (۵): سلسلہ رشیدیہ کی تاریخ پر مختصر روشنی ڈالیں؟

جواب: حضرت شیخ محمد رشید جون پوری سلسلہ رشیدیہ کے بانی ہیں۔ آپ اپنے عہد کے ایک زبردست عالم اور درویش کامل تھے۔ آپ اپنے والد بزرگوار حضرت بندگی شیخ مصطفیٰ جمال الحق سے کم سنی میں مرید ہوئے تھے اور آپ سے مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت بھی حاصل تھی، مگر آپ کو اپنے والد بزرگوار سے کسب فیض کا موقع نہیں ملا۔ ظاہری تعلیم کے بعد جب آپ کی توجہ باطنی تعلیم کی طرف ہوئی تو آپ نے مختلف مشائخ سے کسب فیض فرمایا۔ ان میں چند بزرگوں کے اسماء گرامی یہ ہیں: حضرت شاہ طیب بناری، حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ علیم اللہ مائیک پوری، حضرت سید شمس الدین کالپی بخاری۔

آپ کے بعد آپ کے منجھلے صاحب زادے حضرت شیخ محمد ارشد اپنے والد گرامی کے جانشین ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے پوتے حضرت قمر الحق شیخ غلام رشید منصب سجادگی پر فائز ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے نواسے حضرت حیدر بخش امام الدین سجادہ نشین ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے صاحب زادے حضرت شاہ امیر الدین صاحب سجادہ ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے صاحب زادے حضرت شاہ غلام معین الدین سجادہ نشین ہوئے، پھر حضرت شاہ سراج الدین ہوئے، ان کے بعد حضرت آسی غازی پوری سجادگی کے منصب پر فائز ہوئے، ان کے بعد حضرت سید شاہ علی سبزوئی گورکھ پوری سجادہ نشین ہوئے، پھر ان کے بعد ان کے صاحب زادے حضرت سید شاہ مصطفیٰ علی سبزوئی سجادہ نشین ہوئے۔ وہ ہمارے پیرا راہت بھی ہیں۔

سوال (۶): خانقاہ اور بانی خانقاہ کے حالات پر کچھ روشنی ڈالیں؟

جواب: بانی خانقاہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری ہیں اور ان ہی سے منسوب اس خانقاہ کا نام خانقاہ رشیدیہ ہے۔ آپ موضع بروٹھ ضلع جون پور میں پیدا ہوئے اور وہیں پرورش پائی۔ آپ کے بچپن کے زمانے میں ایک بزرگ شیخ عبدالجلیل لکھنوی نے آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ لڑکا عالم عامل اور عارف کامل ہوگا اور گناہ بہت کھائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ظہور میں آیا۔ آپ کی ولادت سے بہت پہلے ایک بزرگ حضرت شیخ عبدالعزیز جون پوری نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ایک درویش کی ولادت ہونے والی ہے جس کا نام نامی محمد رشید ہوگا۔ یہ شیخ عبدالعزیز جون پوری جون پور میں پیدا ہوئے اور دہلی میں رہا کرتے تھے۔ قاضی خاں نظر آبادی کے مرید تھے۔ سماع کا شوق رکھتے تھے مگر قرآن مجید کی آیت **تَحْسِبُ عَلَنَ الَّذِي يَدْعُو مَلِكُوتَ كُلِّ شَيْءٍ وَالْيَهُ تَرْجِعُونَ** جب سنی تو حاصل کچھ ہوئے۔ حضرت شیخ محمد رشید نے متوسلات سے لے کر اوپر کی ساری کتابیں حضرت ملا افضل

جون پوری اور حضرت مولانا شمس الدین سے پڑھیں۔ پھر واپس جا کر حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے صاحب زادے حضرت شیخ نورالحق سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور سند حدیث سے سرفراز ہوئے۔ حضرت محمد رشید قاسم حدیث کی تعلیم کے لیے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے پاس پہنچے مگر وہ اپنی پیرانہ سالی کی وجہ سے درس دینا بند کر چکے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ تم نورالحق سے میری موجودگی میں پڑھا کرو، چنانچہ اس طرح آپ نے ان دو بزرگوں سے علم حدیث کی تکمیل کی۔ صاحب شمس بازمعالم محمود علی جون پوری آپ کے ہم سبق رہا کیے۔ پڑھنے کے زمانے میں یا بعد کو جب کسی مسئلے پر بحث ہوتی تو ملا محمود پر آپ بھاری پڑتے۔

ایک روز آپ حسب معمول استاذ العلماء حضرت ملا افضل جون پوری کی خدمت میں حاضر ہوئے تو وہ فن مناظرہ کی کتاب شریفیہ پڑھا رہے تھے۔ آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ متن تو خوب ہے، مگر کوئی اس کی شرح لکھتا تو بہت اچھا ہوتا۔ اس کے ایک ہفتے کے بعد آپ نے شرح شریفیہ لکھ کر پیش کر دی، دیکھ کر بہت پسند فرمایا۔ یہی شرح شریفیہ آج مناظرہ رشیدیہ کے نام سے معروف و مشہور ہے اور درس گاہوں میں آج بھی داخل نصاب ہے۔ آپ کے شیخ طیب بناری کا حکم تھا کہ تم وظیفہ صبح کے بدلے طلبہ کو سبق پڑھایا کرو کہ یہ بھی عبادت ہے۔ انہوں نے آپ کو جون پور رخصت کیا، چنانچہ آپ آخر عمر تک اس حکم پر عمل پیرا رہے۔ آپ کی وصیت تھی کہ جب میں مر جاؤں تو ان پتھروں کو جن پر طلبہ اپنی جوتیاں اتارا کرتے رہے، میری قبر میں ان کا تختہ دیا جائے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ پہلے پیر کے تختے دیے گئے پھر ان پتھروں کا تختہ دیا گیا۔

ایک واقعہ رمضان شریف کے مہینے میں جب آپ اپنے شیخ سے ملنے گئے تو انہوں نے اعتکاف کا حکم دیا۔ اس اعتکاف میں آپ پر بہت سے عجائب و غرائب منکشف ہوئے۔ عین عید کے دن مجمع عام میں حضرت مخدوم نے حضرات چشت کی طرف سے پیرا بن پہنایا اور اجازت و خلافت سے سرفراز فرمایا۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا سلسلہ قادریہ بھی عطا فرمایا۔ میرے خیال میں یہ سلسلہ قادریہ کہیں اور کسی خانقاہ میں نہیں ہے۔ آپ نے اپنے مرشد گرامی حضرت راجی سید احمد ابن مجتبیٰ حلیم اللہ ماکہ پوری کے حکم سے جون پور میں خانقاہ کی بنیاد ڈالی اور رشود و ہدایت کا سلسلہ جاری فرمایا۔ غالباً یہ شاہ جہاں کا دور تھا۔ اس خانقاہ کو قائم ہوئے ساڑھے تین سو برس سے زیادہ کا عرصہ ہو رہا ہے۔ اس خانقاہ کے ماتحت کئی خانقاہ ہیں جو مختلف جگہوں پر ہیں۔ (۱) خانقاہ عالیہ طیبیہ، منڈواڑیہ، بنارس (۲) خانقاہ عالیہ مصطفائیہ، چشتی بازار، پورنیہ بہار (۳) خانقاہ عالیہ حیدریہ معینیہ، سیوان بہار (۴) خانقاہ عالیہ علمییہ، غازی پور جہاں حضرت آسی کا آستانہ مبارک ہے۔ اس خانقاہ کے سلاسل مجاریہ یہ ہیں: چشتیہ مصطفائیہ، چشتیہ احمدیہ، چشتیہ طیبیہ، چشتیہ

اشرفیہ، قادریہ مصطفائیہ، قادریہ احمدیہ، قادریہ شمس، قادریہ طیبیہ، سہروردیہ، فردوسیہ، مداریہ، جنیدیہ، طیبیہ، زاہدیہ، ان کے علاوہ اور بھی سلاسل ہیں جو اب رائج نہیں ہیں۔

حضرت شیخ محمد رشید جونپوری ۱۰۰۰ھ میں پیدا ہوئے اور آپ کی وفات ۱۰۸۳ھ میں ہوئی۔ تاریخ وصال ۹ رمضان المبارک اور وقت وصال عین حالت نماز فجر اور روز جمعہ مبارک ہے۔ آپ مرتبہ قطبیت پر فائز تھے اور دیوان جی کے لقب سے ملقب، آپ ولایت و بزرگی اور فغل و کمال میں یگانہ روزگار تھے۔ تجدید نعت کے طور پر آپ کا ارشاد ہے:

من بیک دم سیر عالم می کنم
روح را دستے و پائے دیگر است

اپنے مریدین سے فرماتے ہیں:

راہ را غم کردہ حیرانی چرا
شمس حق را یاد کن گو یا رشید

چوں کہ آپ کا لقب شمس الحق بھی تھا، اس لیے فرماتے ہیں تم ادھر ادھر بھٹکتے کیوں ہو اور حیران و پریشان کیوں ہو، شمس الحق کو یاد کرو اور یا رشید کہو! چنانچہ یا رشید کا وظیفہ ہماری خانقاہ کے مریدین میں اکثر رائج ہے۔

سوال (۷) خانقاہ رشیدیہ کا میدان دعوت و تبلیغ میں کیا کردار رہا ہے؟

جواب: خانقاہ رشیدیہ اپنے اصول کی پابندی کرتے ہوئے دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیتی چلی آئی اور آج بھی انجام دے رہی ہے۔ خاک ساری اور تواضع پر یہاں زیادہ زور دیا جاتا ہے۔ نفسانیت اور خود غرضی کی مذمت بیان کر کے اس سے اجتناب کا حکم دیا جاتا ہے۔ محب و خود بینی و خود نمائی سے بچنے کی زیادہ تاکید کی جاتی ہے۔ غرض کہ طریقت کے تقاضے اور لوازمات حقیقی الامکان پورا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ طریقت محض گدڑی بہن لینے کا نام نہیں بلکہ اوصاف و ذمہ کو دور کرنے اور اوصاف حمیدہ سے اپنے آپ کو متصف کرنے کا نام ہے۔ شیخ سعدی شیرازی گلستان میں فرماتے ہیں:

وقت بچہ کار آید و تبیج و مرقع

خود را ز عملہائے بگوہیدہ بری وار

تمہاری یہ گدڑی اور بیوند لگے کپڑے اور تبیج کس کام آئیں گے، جب تک کہ تو اپنے کو اوصاف ذمہ سے پاک نہ کرے۔

چنانچہ یہ خانقاہ حقیقی المقدور اس کے مطابق دعوت و تبلیغ کا کام انجام دیتی چلی آ رہی ہے۔

سوال (۸) خانقاہ رشیدیہ کے علمی کارناموں کے بارے میں بتائیں؟

جواب: اس کے علمی کارنامے بہت ہیں جن پر اس خانقاہ کے بزرگوں کی تعقیقات شاہد عدل ہیں، مگر اس کے علمی ذخائر منظر عام پر نہیں آسکے؟ میری کوشش ہوگی کہ انھیں منظر عام پر لاؤں؟

سوال (۹) اس قدیم خانقاہ کے معمولات، رسومات اور امتیازات کیا رہے ہیں؟

جواب: اس خانقاہ میں جتنے بھی سجادہ نشین ہوتے آئے سب کی حالت عموماً یہ تھی کہ کبھی ملازمت نہ کی نہ دولت و حشمیت کی طمع رکھی، ریا و حب جاہ سے سخت متنفر رہے، کشف و کرامات کے اظہار کو ہمیشہ برا سمجھتے رہے، کیوں کہ بزرگوں کے نزدیک ان کا اظہار تین موقعوں کے سوا کبھی جائز نہیں۔ حضرت مخدوم جہاں شرف الدین مکی منیری کے ایک مکتوب میں ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اظہار کرامت جائز نہیں، اگر گرمی وقت ہو، یا حالت سکر ہو، یا مریدین کی ترغیب مقصود ہو تو جائز ہے۔ یہاں کے مشائخ نے دنیا طلبی کے واسطے خانقاہ سے کبھی قدم باہر نہیں نکالا۔ بزرگان سلاسل کی زیارت اور کسب فیض کے لیے اکثر دور دراز کے مقامات کا سفر کیا اور اس سفر میں ہنگام خدا کی ہدایت بھی فرماتے رہے۔ اگر چہ بانی خانقاہ اور ان کے بعد اکثر سجادگان سلسلہ چشتیہ میں مرید ہوئے، آگے چل کر ان کو سماع میں غلو تھا نہ اس سے انکار۔ مریدوں کے گھر کبھی بے ہلائے نہ گئے اور غیر مرید کی دعوت قبول نہیں کرتے تھے۔ ملکیت کی طرف کبھی راغب نہ ہوئے۔ فقر و قناعت کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ غیر مریدین کی مذہب قبول نہیں کرتے اور مریدین سے طلب و سوال نہیں کرتے۔ بے طلب اگر کسی مرید نے کچھ دے دیا تو قبول کر لیتے۔ عام حالات میں امر اور انہی کے یہاں نہیں جاتے۔

اس خانقاہ کے کسی بزرگ کا اگر رات میں عرس وقل ہوتا ہے تو سجادہ نشین اس رات کو کھانا نہیں کھاتے، کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ زائرین میں کوئی بھوکا رہ گیا ہو۔

عموماً قل شریف ٹھیک وصال کے وقت ہی ہوتا ہے، اس میں قوالی وغیرہ نہیں ہوتی، کبھی کبھی قل شریف سے پہلے نعت خوانی و منقبت خوانی بھی ہو جاتی ہے۔ فاتحہ قل کے بعد چادر پوشی سے پہلے گلاب، صندل، عطر، مزار شریف پر چھڑکے جاتے ہیں، تب سفید چادر مزار شریف پر چڑھائی جاتی ہے۔ پھر مریدین و معتقدین اپنی اپنی طرف سے چادریں چڑھاتے اور عطر و گلاب چھڑکتے ہیں، پھر اخیر میں پھولوں کے ہار بھی ڈالے جاتے ہیں۔ فاتحہ قل میں چھوہارے کو خانقاہ کی طرف سے لازم سمجھا جاتا ہے۔ مریدین و معتقدین بھی اپنی اپنی جانب سے قل میں شیرینی و مٹھائی رکھتے ہیں۔ عام طور پر مزار شریف پر قل ختم ہو جانے کے بعد قبولی پر فاتحہ ہوتی ہے اور یہی قبولی زائرین کو کھلائی جاتی ہے۔ کبھی کبھی بعض اعراس میں شربت اور چھوہارا دونوں ہوتے ہیں۔ چھوہارے کو پہلے دھوکریاں ک کر لیا جاتا ہے، پھر اس کی گھٹلی نکال دی جاتی ہے، تب اس کو قل شریف میں فاتحہ کے لیے رکھا جاتا ہے۔ ڈالی کو صاحب سجادہ یا سلسلہ کے خلیفہ اپنے مرید لے کے مزار شریف پر جاتے ہیں اور ان کے

ساتھ زائرین کی جماعت ہوتی ہے۔ قل شریف میں پہلے حضور اکرم سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم صحابہ تابعین، تبع تابعین اور شہداء کے بلا کے نام سے فاتحہ پڑھی جاتی ہے، پھر صاحب عرس کے مشائخ کے نام سے، اس کے بعد صاحب عرس کے لیے مخصوص فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ صاحب سجادہ اور خلفاء عام طور پر مریدین کو وظیفہ پنج گنج رشیدی پڑھنے کو دیتے ہیں اور ذکر واذکار کے جولاکن ہوتے ہیں ان کی لیاقت کو مد نظر رکھتے ہوئے ذکر واذکار کی تعلیم دیتے ہیں۔ مریدین کو حلقہ ذکر میں نہیں بٹھاتے، بلکہ جس کو ذکر واذکار کی تعلیم دینی ہوتی ہے اسے الگ سے ذکر کی تعلیم دیتے ہیں۔ بیعت کے وقت مرید کو شیرینی لے کر حاضر ہونا ہوتا ہے۔ اگر مرید ہونے والا مرد ہوتا ہے تو اس کو مرید کرنے کے بعد کلاہ چہارت کی پہنائے ہیں جس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ کلاہ چہارت کی پہنائے سے پہلے قراض رانی کرتے ہیں۔ پہلے پیٹائی کے چند بال کاٹتے پھر بائیں جانب کے کچھ بال پھر بائیں جانب کے بال۔ اگر مرید کے سر پر بال نہ ہو تو صرف قراض رانی کر دیتے ہیں اور اگر عورت کو مرید کرنا ہوتا ہے تو اس کے سر پر قراض رانی نہیں کرتے، صرف داہنی اوڑھاتے ہیں، پھر ہدایتیں کرتے۔ یہ ہدایتیں کچھ طویل ہوتی ہیں۔ پھر دو گنا شکرانہ بیعت کی نماز پڑھنے کو کہا جاتا ہے۔

راحت رسائی خلافت پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ کوئی اگر کسی کی برائی بیان کرے تو اس کو سننا پسند نہیں کرتے، ممکن ہوتا تو اس کی کوئی اچھی تاویل کرتے۔ مخالفین و معاندین کے حق میں بھی نرم گوشہ رکھتے اور انہیں بھی اچھائی سے یاد کرتے۔ مشکل کشائی و حاجت روائی میں کوتاہی نہیں کرتے۔ خانقاہ میں آنے جانے والوں کو بغیر کچھ کھلائے رخصت نہیں کرتے۔ ان کے علاوہ اور بھی معمولات و رسومات ہیں جن کے بیان کا موقع نہیں۔

سوال (۱۰) خانقاہ رشیدیہ کے دوسری خانقاہوں اور علمی مراکز سے روابط کیسے رہے ہیں؟

جواب: خانقاہ رشیدیہ ایسی خانقاہ ہے جس کا ہر خانقاہ سے ربط رہا ہے۔ اس کے بانی حضرت شیخ محمد رشید کا قول ہے ”الفسحاء کلہم کففس واحمدہ“ جتنے اللہ والے ہیں وہ مثل ایک جان کے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بانی خانقاہ حضرت محمد رشید نے باوجودیکہ وہ اپنے والد بزرگوار کے مرید و خلیفہ تھے، دوسری خانقاہوں کے بزرگوں سے بھی اکتساب فیض کیا۔ خانقاہ شہبازیہ بھاگل پور کے بانی حضرت مولانا شہباز بھاگل پوری سے بھی آپ نے اکتساب فیض فرمایا۔ خانقاہ حمایہ ماہک پور کے شیخ حضرت احمد ابن یحییٰ حلیم اللہ سے بھی خلافت و اجازت سے سرفراز ہوئے اور فیوض و بہکات حاصل کیے۔ اسی طرح حضرت مخدوم شاہ طیب بناری سے بھی نعمتیں حاصل کیں۔ الغرض جہاں کہیں بھی موقع ملا آپ نے وہاں کے بزرگوں سے اکتساب فیض فرمایا۔ تعصب اور تنگ نظری کو اس راہ میں حاصل ہونے نہیں دیا، جیسا کہ آج کل عموماً دیکھا جاتا ہے۔

سوال (۱۱) ہندو پیروں ہند کے ان مشائخ و محققین کے بارے میں کچھ بتائیں جو اس قدیم خانقاہ سے روابط رکھتے ہیں؟

جواب: ہندوستان میں ایسے مشائخ و محققین بہت ہیں جن کے اس خانقاہ سے روابط رہے ہیں، مثلاً حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی، حضرت ملک العلماء مولانا ظفر الدین بہاری اور حضرت محدث اعظم ہند کچھوچھوی وغیرہم۔ ان سے پہلے حضرت سید مراد شاہ جو کہ حضرت شاہ سلیمان تونسوی کے مرید تھے ان کو ان کے پیر نے حضرت آسی غازی پوری کے پیر و مرشد حضرت شاہ غلام معین الدین قدس سرہ کی خدمت میں بھیجا تا کہ ان سے ذکر و افکار وغیرہ کی تعلیم حاصل کریں چنانچہ ان کی تعلیم مکمل ہونے کے بعد حضرت شاہ غلام معین الدین نے انہیں بنگال کی طرف رشد و ہدایت کے لیے مامور فرمایا۔ یہاں یہ بھی ذکر کر دینا مناسب نہ ہوگا کہ حضرت ملک العلماء کو ہماری خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ شاہد علی کے خلیفہ حضرت مولانا شاہ ایوب اہلانی نے خلافت و اجازت سے بھی سرفراز فرمایا ہے۔

پھر یہاں یہ بات بھی بتانا چاہوں کہ جب ۱۹۲۶ء میں بنارس کی سر زمین پر چار روزہ سنی کانفرنس کا انعقاد ہوا تو حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین صاحب مراد آبادی ہماری خانقاہ کے سجادہ نشین حضرت سید شاہ شاہد علی سبزویش سے ملے اور ان سے اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد کو بیان فرمایا تو آپ نے ایک اشتہار شائع کر لیا جس میں یہ مضمون تھا:

آج تمام اہل باطل مظلم ہیں اور ان کی تنظیم حق اور اہل حق کے مٹانے کے لیے ہے۔ وہ اسی دھن میں ہیں۔ وہ جس قدر منظم ہیں اہل حق اسی قدر منتشر ہیں۔ ہمارے اعتبار سے اعدا فائدہ اٹھا رہے ہیں اور اگر ہم انفرادی طور پر کچھ کام بھی کریں تو وہ چنداں مفید نہیں ہوگا، اس لیے سخت ضرورت ہے کہ اہل حق جو اہل سنت میں منحصر ہیں خواہ وہ حق، شافعی، مالکی، حنبلی، یا چشتی، قادری، سہروردی، رفاہی، شاذلی وغیرہ سب مجتمع ہو جائیں اور ایک نظام پر متحد ہو کر کام کریں۔ اس مقصد کے لیے جمہوریت اسلامیہ (آل انڈیائی سنی کانفرنس) قائم کی گئی ہے، میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔

سوال (۱۲) یہ قدیم خانقاہ مخطوطات و مکتوبات کے حوالے سے بھی جانی جاتی ہے۔ یہاں کے اہم مخطوطات و مکتوبات اور علمی ذخائر کے بارے میں بتائیں؟

جواب: اس میں شک نہیں کہ یہ خانقاہ مخطوطات و مکتوبات اور علمی ذخائر کے اعتبار سے کافی اہمیت رکھتی ہے مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان کی حفاظت کما حقہ نہیں ہوئی۔ بہت سارے مخطوطات وغیرہ ضائع ہو گئے، مگر اس کے باوجود اب بھی مجاہدہ تعالیٰ بہت کچھ محفوظ ہیں۔ ذیل میں ہم کچھ کا ذکر کر رہے ہیں:

شرح رشیدیہ: یہ کتاب آداب باقیہ کے جواب میں ہے جس میں ملاحمد جون پوری صاحب شمس با زعم کے ایک شاگرد ملا عبد الباقی نے ”مناظرہ رشیدیہ“ پر اعتراضات کیے تھے۔

منج رشیدی: یہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری بانی خانقاہ رشیدیہ کے ملفوظات و ارشادات کا مجموعہ ہے جو کئی حصوں پر مشتمل ہے مگر یہ غیر مطلوبہ مواد قلمی ہے۔

ملفوظات قطب الاقطاب: یہ بھی حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید جون پوری کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، جو مطلوبہ ہے۔

مکتوبات رشیدیہ: یہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جنہیں آپ نے وقتاً فوقتاً اپنے خلفاء و مریدین کے نام سے تحریر فرمایا ہے۔

مکتوبات ارشدیہ: یہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری کے صاحب زادے اور چائشین حضرت شیخ محمد ارشد کے خطوط کا مجموعہ ہے جنہیں آپ نے اپنے مرید کے نام سے تحریر فرمایا ہے۔

مکتوبات بحالیہ: یہ حضرت شیخ محمد رشید جون پوری کے والد بزرگوار و مرید و مرشد حضرت ہندگی شیخ مصطفیٰ جمال الحق کے خطوط کا مجموعہ ہے۔

منج ارشدیہ: یہ حضرت شیخ محمد ارشد رشید مصطفیٰ کے ملفوظات و ارشادات کا مجموعہ ہے اور کئی جلدوں میں ہے۔ اس کی بڑی شہرت ہے۔

منج فیاضی: یہ صاحب منج ارشدی کے پوتے اور چائشین حضرت ابوالفیاض غلام رشید قمر الحق کے ملفوظات کا مجموعہ ہے۔

ژاد السالکین، کرامات فیاضی، ہدایہ الخو، ترجمہ معینیہ، دیوان شمس، مناقب العارفین، مقصود الظالمین، عین المعارف، دیوان فانی: یہ سب کتابیں بزرگان رشیدیہ کی تصانیف ہیں۔ حضرت شیخ محمد رشید نے شیخ اکبر علی الدین ابن عربی کی مشہور تصنیف فتوحات مکیہ پر جا بجا حاشیہ تحریر فرمایا ہے، جسے شرح بھی کہہ سکتے ہیں۔ شیخ اکبر کی ایک دوسری کتاب اسرار المخلوقات پر بھی بیسٹ شرح تحریر فرمائی ہے۔

سوال (۱۳) شریعت و طریقت کے باہمی رشتے کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں؟

جواب: طریقت، شریعت سے علاحدہ کوئی چیز نہیں۔ حضرت مولانا رومی کا یہ مقولہ مشہور ہے: ”طریقت از شریعت نیست، بیرواں“ طریقت شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں۔ طریقت تقویٰ اور صلاح باطنی سے عبارت ہے۔ لہذا یہ شریعت سے علاحدہ نہیں۔ مختصر لفظوں میں یوں سمجھ لیجئے کہ طریقت، شریعت کا اعلیٰ درجہ ہے۔ مثلاً وہ نماز جو خشوع و خضوع سے خالی ہو تو از روئے شرع اس کے صحیح ہو جانے کا حکم ہوگا مگر از روئے طریقت یہ نماز نامکمل ہوگی، مگر یہ حکم شریعت کے خلاف نہیں۔ پس جہاں طریقت، شریعت کے خلاف نظر آتی ہے تو یہ صرف باوی النظر کے اعتبار سے ہے، نہ کہ

غائر نظر کے اعتبار سے۔ حضرت علامہ عبد الغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ جو جامع شریعت و طریقت تھے، انھوں نے اپنی کتاب 'مستطاب السبیل فی التذیقۃ الذہبیۃ فی شروح الطریقۃ المصمدیۃ' کی پہلی جلد میں اس مسئلے پر بحر پور روشنی ڈالی ہے۔ واضح رہے کہ شریعت کے دو پہلو ہیں: ایک ظاہر، دوسرے باطن۔ باطن کو طریقت کہتے ہیں اور ظاہر کو عام اطلاقات میں شرع، ورنہ ظاہر و باطن دونوں ہی کا تعلق شرع سے ہے۔ یہ بحث تفصیل طلب ہے مگر مجھے اس وقت اس کا موقع نہیں۔

سوال (۱۴) فلسفہ تصوف کا تعلق حقیقت تصوف سے کتنا ہے؟

جواب: فلسفہ تصوف قال ہے اور حقیقت تصوف حال، قال اگر حال کے مطابق ہو تو محمود و رند غیر محمود کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

زبان سے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل

دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

سوال (۱۵) آپ کے خیال میں مرشد اور خاتما کی ضرورت کیوں ہے؟

جواب: یہ سوال کافی معنویت رکھتا ہے۔ مرشد کی ضرورت راہ سلوک طے کرنے کے لیے ہے اور یہ عام طور پر شیخ کامل کے بغیر ممکن نہیں۔ فرصت کی کمی کی بنا پر اسی پر اکتفا کرتا ہوں ورنہ اس سوال کا جواب تفصیل چاہتا ہے۔

سوال (۱۶) آج عالمی سطح پر تصوف موضوع بحث ہے تصوف کا مستقبل کیسا ہے؟

جواب: عربی کا مقولہ ہے "الناس اعداء لما جہلوا" لوگ جس چیز کو نہیں جانتے اس کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ محدث ابن جوزی کو تصوف سے جڑھ تھی، اسی لیے انھوں نے تصوف کے خلاف "تذکیر السالکین" نامی کتاب لکھ ڈالی۔ پھر ان کے بعد بھی کیے بعد دیگرے علمائے ظاہر نے تصوف کی مخالفت کی مگر بات وہی ہے کہ تصوف جن گمے پلے نہیں پڑا انہوں نے اس کی مخالفت کی یا پھر ان کی نظر میں اس سے فساد کا پہلو غالب نظر آیا تو انھوں نے دین کی مخالفت و صیانت کی غرض سے اس کی مخالفت کی۔ علاوہ ازیں جب متصوفین نے صوفیہ کی جگہ لینا شروع کر دیا تو چاروں چاروں تصوف کی مخالفت پر علماء میدان میں آ گئے تاکہ چہرہ مسخ نہ ہو۔ میرے خیال میں تصوف کا مستقبل چھا نظر نہیں آتا۔

سوال (۱۷) تصوف کے نام پر آج عالمی سطح پر جو فکری و عملی بے اعتدالی عام ہو رہی ہے، اس کا علاج آپ کی رائے میں کیا ہو سکتا ہے؟

جواب: جب دنیا طلبی غالب آ جائے تو اس کا علاج بہت مشکل ہے۔ یہ بے اعتدالی جو عام ہو رہی ہے اس میں یہی چیز کا فرما ہے۔ آپ وین برائے دنیا ہو کر رہ گیا ہے، جب کہ حدیث میں ہے "الدنیا جیفۃ و طالبھا کلاب" دنیا مرادار ہے اور اس کے طلب گار کتے ہیں۔ صوفی جو ام و نمودار

حب جاہ بلکہ حب دنیا سے متنفر ہو، درحقیقت وہی صوفی ہے، مگر آج یہ کبریت احمر ہے۔ شاید موجودہ خانقاہوں کے مشائخ منظم طور پر اس جانب توجہ فرمائیں تو اس کا کسی حد تک علاج ہو سکتا ہے۔

سوال (۱۸) آج اس دور میں تصوف اور صوفیہ کا انسانی معاشرے پر کتنا اثر ہے؟

جواب: کچھ تو اثر ضرور ہے، مگر یہ کافی نہیں۔

سوال (۱۹) کیا تصوف اور صوفیہ انسانوں کو بے عملی، تجرد اور جمود کا سبق دیتے ہیں؟

جواب: تصوف اور صوفیہ بے عملی اور جمود کا سبق نہیں دیتے، رہی بات تجرد کی تو یہ بعض حالات میں بعض صوفیہ نے اس کو اپنایا ہے، مگر جہاں تک سبق دینے کی بات ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایسا نہیں ہے۔

سوال (۲۰) رواداری و صلح جوئی کے تعلق سے تصوف اور صوفیہ کا مسلک کیا رہا ہے؟

جواب: رواداری و صلح جوئی تو صوفیہ کا خاص مسلک رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ آج کے علمائے ظاہر اس میں کافی تشدد برتتے ہیں اور صوفیہ کو ہدف ملامت کرنے میں دریغ نہیں کرتے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ حضرات غالباً تصوف کو دین و شریعت سے الگ غیر اسلامی نظریہ سمجھتے ہیں جب کہ امام اہل سنت اعلیٰ حضرت فاضل بدایونی کے والد بزرگوار حضرت مولانا تقی علی خاں اپنی کتاب "الکلام الاوضح فی تفسیر المذہب" میں فرماتے ہیں: فقیر کے مذہب میں کسی کو برا سمجھنا جائز نہیں۔ (ص: ۲۲۰) پھر فرماتے ہیں: جب سالک تمام ذرات عالم کو آئینہ جمال مطلق جانتا ہے، سب سے صلح کرتا ہے، کسی کو برا نہیں سمجھتا۔ جب مہربانہ فریق تمیز وغیرہ کہ عبارت اسلام طریقت سے ہے حاصل ہوتا ہے، اس وقت مسلمان کو مسلمان اور کافر کو کافر اور اچھے کو اچھا اور برے کو برا جانتا ہے۔ (ص: ۲۲۲)

حضرت میر عبد الوادہ بلگرامی صبح سناٹا میں فرماتے ہیں:

ہمہ عالم چوں منظر عشق اند

ہمہ را بہ کمال می بینم

جب تمام عالم عشق کا منظر ہے تو ہم ہر چیز میں کمال دیکھتے ہیں۔

قاضی عین التفتاۃ فرماتے ہیں: ارادت کی ابتدا یہ ہے کہ تو ایمان و کفر سے نڈرے اور ایک مذہب کو دوسرے مذہب پر ترجیح نہ دے اور بہتر ملتوں (فرقوں) میں کچھ فرق نہ کرے۔

(ترجمہ سنی سنائی، ص: ۳۲۱)

تصوف اور صوفیہ کا اس سلسلے میں جو مسلک ہے اسے میں نے بڑے اختصار کے ساتھ بیان کر دیا، ورنہ یہ مسئلہ تفصیل چاہتا ہے اور میری گونا گوں مہر و فیات مجھے فرصت نہیں دیتیں۔

سوال (۲۱) کیا یہ سمجھنا درست ہے کہ آج خانقاہوں میں صرف مجاہد یا گورکن رہ گئے ہیں؟

جواب: عام طور پر ایسا ہی ہے مگر دنیا اہل اللہ و اہل طریقت سے خالی نہیں، ابھی بھی کچھ خانقاہوں میں جان باقی ہے۔

سوال (۲۲) کیا عصر حاضر میں تحریک احیائے تصوف کی ضرورت ہے؟ اگر ہاں تو اس

کے خطوط کیا ہو سکتے ہیں؟

جواب: جب تصوف دین ہی کا ایک اہم اور اعلیٰ شعبہ ہے تو اس کی تو ہر حال میں ضرورت

ہے مگر اس کے لیے یہ موجودہ خانقاہی نظام و دستور سودمند نہیں، اگر اس کو سودمند بنانا ہو تو گزشتہ دور کے بزرگوں کی سیرت پر چلنا ضروری ہوگا۔

سوال (۲۳) تصوف کے موافقین اور مخالفین سے کچھ کہنا چاہیں گے؟

جواب: موافقین کو چاہیے کہ تصوف کو صحیح ڈھنگ سے سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی کوشش

کریں، صرف زبانی جمع خرچ کوئی معنی نہیں رکھتا اور مخالفین کو چاہیے کہ آیت قرآنی ”فاسئلوا اہل الذکر ان کنتم لاتعلمون“ کو سامنے رکھیں اور اہل ذکر سے تصوف کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ بے سمجھے انکار کر دینا حماقت و بے وقوفی ہے۔

سوال (۲۴) مجلہ الاحسان اور اس کے مدیر و مرتبین کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

جواب: علم تصوف پر ایک تحقیقی مجلہ الاحسان اللہ آباد کا نقش ثانی موصول ہوا لیکن میں اپنی گونا

گوں مصروفیت کی بنا پر اس کا مکمل طور پر مطالعہ نہ کر سکا، صرف بعض مقامات پر سرسری نظر ڈالنے کا موقع میسر ہوا۔ زبان و بیان میں مقامی و سادگی اور پاکیزگی غالب ہے۔ باتوں کو دلائل کی روشنی میں پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی ہے۔ حنا وین و مقالات کی ترتیب و تنظیم اس کے حسن کو دوبارہ کرتی ہے۔ اس سے ادارہ الاحسان کی علمی و عملی صلاحیتوں اور سرگرمیوں کا پتا چلتا ہے اور تصوف سے ان کے خاص لگاؤ اور شوق و ذوق کا اندازہ بھی۔ یہ نسل نو کے لیے بڑی خوش آئند اور حوصلہ افزا بات ہے۔

الغرض رسالہ اپنی جامعیت اور معنویت میں لا جواب ہے اور سلوک و تصوف پر مشتمل ایک

گراں قدر اور بیش بہا ذخیرہ ہے۔ ان شاء اللہ یہ طریقت و معرفت کے فروغ میں زبردست محرک ثابت ہوگا۔ میں خلوص دل سے دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس رسالے کی اہمیت اور مقبولیت کو عوام و

خواص میں عام کرے اور اس کو ان کی ہدایت اور روحانی تسکین کا ایک اہم وسیلہ بنائے اور اس کے کارکنوں اور مربیوں کو حاسدین کی نظر بد سے محفوظ و مامون رکھے اور ان کے دینی و علمی حوصلے و جذبے

کو سلامت رکھ کر قیادہ سے نیا و جہد مات وین تہن کی توفیق بخشے۔ آمین بجا حنیہ الکریم ﷺ!

○○○

مجیب الرحمن علیمی

خانقاہ عالیہ رشیدیہ، جون پور تاریخ اور کارنامے

آج سے تقریباً سات سو سال پہلے سلطان فخر الدین محمد تغلق عرف جونا شاہ نے دریاے گومتی کے کنارے ہموار زمین پر ایک شہر قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر ارادہ پایہ تکمیل کو پہنچتا کہ ۲۵ سال تک ہندوستان کی بادشاہت کی ذمہ داری ادا کر کے ۵۲ھ میں وہ اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا زاد بھائی سلطان فیروز شاہ تخت نشین ہوا اور ۷۱ھ میں جب وہ ملک بنگال کی بغاوت و سرکشی کو مٹا کر واپسی میں قصبہ مظفر آباد متحمل جون پور خیمہ زن ہوا تو بادشاہ کی نگاہ جانب مغرب لب دریاے گومتی ایک ہموار زمین پر پڑی، چاہا کہ یہاں شہر آباد کرے، اسی شب بادشاہ نے ملک جونا کو خواب میں دیکھا کہ وہ خواہش ظاہر کرتا ہے کہ یہ شہر میرے نام سے موسوم ہو۔ صبح کو سوار ہو کر موقع کے معائنے کے بعد ایک بلند مقام چھوڑ کر کے قلعہ بنانے اور اس کے اطراف میں شہر جون پور بسانے کا حکم دیا۔ سخن و ران شاہی نے شہر جون پور کے لفظ سے تاریخ بنا نکالی۔ اس میں بادشاہ نے ہر فن کے اہل کمال کو نزدیک و دور سے بلا کر آباد کرایا تھا، اسی وجہ سے ایک زمانے میں یہ شہر سلاطین شریقہ کا دارالسلطنت بن گیا جن کی وجہ سے اس شہر کی دن و دوئی رات چوگنی ترقی ہوتی گئی۔ علمائے عظام اور صوفیہ کرام کثرت سے یہاں پیدا ہوئے، جن کے ذکر سے تاریخ کی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ سر دست اس وقت اسی قدیم تاریخی شہر کا ایک قدیم روحانی مرکز، خانقاہ رشیدیہ کی تاریخ اور اس کی دعوتی و علمی خدمات پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔

بانی سلسلہ محمد رشید کا خانقاہی پس منظر

آپ کے آبا و اجداد میں ایک سے بڑھ کر ایک اولوالعزم اولیاء علمائے گزرے ہیں۔ آپ کے اجداد میں بارہویں پشت میں شیخ منشی رومی کا نام آتا ہے، جنہوں نے اس خاندان میں

ولایت کا چھٹا کاڑا، جن کے بعد اس خاندان میں برابر اہل علم و عرفان پیدا ہوتے رہے۔ حضرت شیخ بخششی رومی کے اجداد عرب سے آکر ملک روم میں کلہ نامی مقام کو چائے سکونت بنایا۔ اسی وجہ سے آپ رومی کہلاتے ہیں۔ روم میں تین پشت گزرنے کے بعد چوتھی پشت میں شیخ بخششی رومی نے روم سے دہلی کا سفر کیا۔ اس وقت دہلی میں سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیا کا مورچ نصف النہار پر تھا۔ آپ سلطان المشائخ کے مرید ہوئے اور بارہ ہجری میں امیشی پرگنہ میں قیام پذیر ہوئے۔ سلطان المشائخ کے وصال کے بعد روحانی نعمتیں آپ نے شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی سے حاصل کیں۔ شیخ بخششی رومی کے بعد سویں پشت میں شیخ عبدالحمید نامی ایک بزرگ ہوئے جو حضرت مخدوم سید اشرف جہانگیر سمنانی کے مرید، خلیفہ (۱) اور بابی خانقاہ رشیدیہ، شیخ محمد رشید کے حقیقی دادا تھے۔ آپ کے دوڑ کے ہوئے: مصطفیٰ اور عثمان۔ ان دونوں بزرگوں کی آخری آرام گاہ پورنیہ بہار میں ہے۔ شیخ عثمان کی اولاد امیشی میں ہی ہوئی ہے اور شیخ مصطفیٰ نے شیخ محمد رشید جیسا تبحر عالم اور عارف باللہ فرزند پایا جس نے اپنے علم و عرفان سے ایک جہاں کو روشن کر دیا۔

(سمات الاخیار، ص: ۳۲ تا ۳۴ ملخصاً)

بابی سلسلہ رشیدیہ کا نسبی شجرہ

شیخ محمد رشید بن شیخ مصطفیٰ جمال الحق بن شیخ عبدالحمید بن شیخ راجو بن شیخ سعدی بن شیخ عارف بن شیخ عبدالواسع بن شیخ مغلے بن شیخ یزید بن شیخ عبدالملک بن شیخ مٹھن بن شیخ نصیر الدین بن حضرت مخدوم شیخ بخششی رومی بن سلطان تول بن شیخ حسام الدین بن شیخ سلطان نظام الدین بن سلطان شہاب الدین بن شیخ عبدالمنان بن شیخ عبدالسیوح بن حضرت شیخ سمری سقطنی بن حضرت شیخ مفلس سقطنی بن شیخ ابان بن امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہم۔

(سمات الاخیار، ص: ۶۱)

ولادت، تعلیم و تربیت اور اجازت و خلافت

بابی سلسلہ رشیدیہ شیخ محمد رشید (۲) نے اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالمگیر چار بادشاہوں کا دور دیکھا۔ آپ کی پیدائش عہد اکبری میں ۱۰۰۰ھ میں ہوئی اور جب آپ چودہ سال کے ہوئے تو جہاں گیر تخت نشین ہوا اور جب آپ کی عمر ۲۷ سال کو پہنچی تو شاہ جہاں نے تخت شاہی کو سنبالا اور جب ۶۸ سال آپ کی عمر کا گزر گیا تو اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ ہوا۔ اس کی تخت نشینی کے پندرہویں یا سولہویں سال آپ نے ۸۳ سال کی عمر پر ۱۰۸۳ھ میں اس دار فانی کو خیر باد کہہ دیا۔ (سمات الاخیار، ص: ۴۳ ملخصاً)

آپ ذی قعدہ ۱۰۰۰ھ میں ضلع جون پور کے برونہ موضع میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو و نما

پائی۔ جون پور کے ایک بزرگ شیخ عبدالعزیز جون پوری ثم دہلوی نے فرمایا تھا کہ میرے بعد ایک فقیر پیدا ہوگا جس کا نام محمد رشید ہوگا۔ ان کے علاوہ ایک اور بزرگ شیخ عبدالجلیل کھنوی جو آپ کے بچپن میں برونہ میں تشریف لاتے تھے، آپ کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ لڑکا عالم، عارف اور عارف کامل ہوگا۔ (سمات الاخیار، ص: ۶۲ ملخصاً)

شیخ محمد رشید کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی، متوسلطات کی تعلیم بلکہ اعلیٰ تعلیم بھی آپ نے اپنے حقیقی ماموں مولانا شمس الدین اور استاذ العلماء شیخ محمد افضل جون پوری سے حاصل کی۔ علم حدیث حاصل کرنے کی غرض سے آپ نے دہلی کا سفر کیا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے علم حدیث حاصل کرنا چاہتے تھے مگر شیخ نے پیرانہ سالی کی وجہ سے فرمایا کہ تم میری موجودگی میں میرے لڑکے سے علم حدیث حاصل کرو، اس طرح شیخ محمد رشید نے شیخ نور الحق ابن شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے علم حدیث اور اس کی سندیں حاصل کیں۔ (سمات الاخیار، ص: ۶۳ تا ۶۴ ملخصاً)

شیخ محمد رشید کی عمر جب نو سال کی ہوئی تو آپ اپنے والد گرامی شیخ مصطفیٰ جمال الحق سے سلسلہ چشتیہ میں مرید ہوئے اور کلاہ ارادت و فرقہ خلافت آپ کو آپ کے والد نے پہنایا۔ اگرچہ کمسنی کی وجہ سے والد کی حیات میں طریقہ صوفیہ کی تحصیل کی طرف متوجہ نہیں ہو سکے لیکن فرقہ نے دل میں ایک جذبہ تو پیدا کر ہی دیا تھا۔ اس کے بعد ایک مدت تک تحصیل علوم میں مصروف رہے اور فراغت کے بعد درس و تدریس کی طرف مائل ہو گئے مگر تصوف کا ذوق غور و تھا اور کسی مرشد کامل کی تلاش بھی تھی۔ اسی زمانے میں حضرت قدوة السالکین مخدوم شیخ طیب بناری جون پور میں تشریف لاتے تھے۔ آپ نے حضرت مخدوم سے ملاقات کی مگر اس مرتبہ دل مائل نہیں ہوا۔ کچھ دنوں کے بعد ایک تقریب میں آپ منڈ واڈیہ بنارس تشریف لے گئے اور حضرت مخدوم سے ملے۔ بہتھارے کل امر سرھون باوقا تھا اس بار دل میں ایک محبت پیدا ہو گئی اور کچھ دنوں مخدوم کی خدمت میں رہ گئے اور اتنے دنوں میں سلوک کا ذوق و شوق ایسا پیدا ہوا کہ آپ نے درس و تدریس کا مشغلہ ترک کر کے خدمت میں رہنا چاہا۔ حضرت مخدوم نے اس بات کو پسند نہ کر کے فرمایا کہ تم وظیفہ صحیح کے بدلے طلبہ کو سبق پڑھایا کرو کہ یہ بھی عبادت ہے۔ اس کے بعد آپ کو جون پور رخصت کر دیا۔

حضرت شیخ محمد رشید تعمیل ارشاد میں براہ مصروف رہے۔ رفتہ رفتہ مخدوم کی محبت و عقیدت بڑھتی گئی۔ اس درمیان اکثر آپ منڈ واڈیہ جایا کرتے تھے اور دس پانچ دن رہ کر چلے آیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ آپ رمضان شریف میں وہاں گئے اور مخدوم کے حکم سے عشرہ آخر میں اعتکاف کیا۔ اس اعتکاف میں بہت سے عجائب و غرائب آپ پر منکشف ہوئے۔ عین عید کے دن ایک

حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ سے روحانی نعمتوں کو حاصل کرنے کے بعد مامک پور سے جب واپس ہوئے تو جون پور میں حضرت راجی کے حکم کے مطابق ایک خانقاہ قائم کی اور پھر رشد و ہدایت کا نغمہ ہونے والا سلسلہ چل پڑا جو آج تک جاری ہے۔ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس خانقاہ کے قیام کی تاریخ کیا تھی، مگر اندازہ لگایا جاتا ہے کہ اس وقت حضرت محمد رشید بانی خانقاہ کی عمر تقریباً ۴۰ سال کی تھی، گویا ۱۰۴۰ھ کے آس پاس ہی اس خانقاہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ خانقاہ رشیدیہ تقریباً چار سو سال قدیم خانقاہ ہے جہاں سے آج بھی علم و عرفان، رشد و ہدایت اور خدمت خلق کا کام اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ جاری و ساری ہے اور موجودہ صاحب سجادہ حضرت مفتی عبید الرحمن رشیدی کی لائق تعریف قیادت میں یہ خانقاہ اور اس سے متعلق چند دیگر خانقاہیں آج بھی کامیابی کے ساتھ اپنے مقصد کی طرف رواں دواں ہیں۔ صاحب سمات الاخیار تحریر فرماتے ہیں: اس کا پتہ نہیں چلتا کہ خانقاہ رشیدیہ کی بنیاد کس سال پڑی مگر میرا خیال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ کے عمر کی چالیسویں سال میں خانقاہ تعمیر ہوئی ہوگی اور یہ شاہ جہاں کا زمانہ تھا جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے تو تاہم تحریر اس کو کہتے ہوئے تین سو برس ہوتے ہیں۔ بہر حال حضرت شیخ محمد رشید قدس سرہ نے حضرت راجی سید مجتبیٰ سجادہ نشین خانقاہ مجددوم شیخ حسام الحق مامک پور کے حکم سے اور تمام قبائل آپ کے موضع بروندہ سے چلے آئے۔ آپ نے خانقاہ اور مسجد تعمیر فرمائی، کنواں کھدوایا، مسجد پہلے سطح تھی بعد کو گنبدی بنی اور خانقاہ پہلے پوشہ تھی اس پر چھپر پڑا تھا، چنانچہ اس نعل سے ظاہر ہے کہ حضرت قطب الاقطاب خانقاہ میں بیٹھے ہوئے تھے اور پانی برس رہا تھا چھپر چکا تو کسی نے عرض کیا کہ چھپر خوب نہیں بنا جس سے پانی رکتا، آپ نے فرمایا کہ چھپر پانی کو روکنے کے لیے نہیں بنا ہے بلکہ دھوپ کو روکنے کے لیے، کیوں کہ بارش کا زمانہ صرف چار مہینہ ہے، اس میں بھی اول آخر میں پانی کم برستا ہے۔ سمجھو دن، رات پانی نہیں برستا اگر حساب کیا جائے تو بارش کا زمانہ کل پندرہ سولہ روز ہی ہوگا پس عاقل کا کام نہیں کہ اتنے دن کے لیے گھربتاے، ہاں آفتاب ہمیشہ رہتا ہے، گھر اس کے لیے ہونا چاہیے۔

باقی سلسلہ رشیدیہ کی سیرت

شیخ محمد رشید آپ ایک متبحر عالم، عارف باللہ اور زبردست صاحبِ تعریف بزرگ تھے۔ آپ سے مدعا و دلِ خالص کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ انھیں پیچھے اللہ کا لفظ زبان پر جاری رکھتے۔ قناعت اور استغنا آپ کے مزاج میں ہی داخل تھا۔ مسلمانین اور امرا کے دروازے پر جانا پسند نہ

اسی طرح میر سید شمس الدین کا بی بی بخاری جون پور آیا کرتے تھے۔ ایک روز شیخ محمد رشید جب درس و تدریس میں مشغول تھے، میر صاحب آپ کے قریب تشریف لائے اور متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھ کو روحانی نعمت تمہارے حوالے کرنے کو بھیجا ہے، لہذا نے مفت دیا ہے، اور آپ نے سلسلہ قادریہ کی خلافت عطا فرمائی۔ حضرت شیخ محمد رشید کو جب اشغال قلندریہ کے اخذ کا شوق ہوا تو آپ شیخ عبدالقدوس قلندریہ جون پوری کی خدمت میں جانے لگے اور ایک سال کامل حاضری دی۔ اس مدت میں نہ کبھی شیخ نے پوچھا کہ کیوں آتے ہو، نہ آپ نے ظاہر کیا کہ اس لیے آتا ہوں۔ سال بھر کے بعد ایک مرتبہ شیخ نے فرمایا کہ اچھا آؤ گی رات کے بعد آیا کرو۔ آپ بہت خوب کہہ کر واپس آئے اور یہ نہ کہا کہ آؤ گی رات سے پہلے ہی لیٹ کا پچا تک بند ہو جانا ہے۔ اولاً تیر نے کافن سیکھا اور شب کو تیر کراس پا رہا تے، اور علم قلندریہ سیکھتے۔ چند روز میں آپ نے فراغت و اجازت حاصل کی۔ بعدہ سلسلہ مداریہ و درویشیہ بھی آپ سے حاصل کیا۔ اس کے بعد شیخ عبدالقدوس قلندریہ کے پاس جب کوئی طالب آتا تو یہی فرماتے کہ اب میں ضعیف ہوا، میاں محمد رشیدؒ کو خوب کرتے ہیں، ان کے پاس جاؤ۔ (سات الاخیار، ص: ۱۷۳ ملخصاً)

شیخ محمد رشید کو جب یہ شوق پیدا ہوا کہ وہ سلسلہ چشتیہ قادریہ حضرت شاہ حسام الحق مائیک پوری کے خاندان سے بھی حاصل کر لیں تو آپ تین بزرگوں کے ساتھ مائیک پور حضرت راجی سید احمد مجتبیٰ کے پاس حاضر ہوئے۔ اندر سے کھانا آیا جس میں شیر مرغہ بھی تھا۔ شیخ محمد رشید نے تو ہر قسم کے کھانے کھائے اور ایک نے کچھ نہ کھایا۔ حضرت راجی نے جب یہ سنا تو فرمایا کہ جس نے سب کچھ کھایا اس نے وین و دنیا سب کچھ پایا۔ جس نے شیر مرغہ کھایا وہ فقط عقیلی لے گیا، جس نے کچھ نہیں کھایا کچھ نہیں پایا۔ مختصر یہ کہ حضرت راجی کمال عنایت و شفقت پیش آئے اور چند روز رکھ کر اپنے سلسلے کی اجازت و خلافت عطا فرمائی۔ (مات الاخیار ص ۵۷ تا ۵۸ کے ملخصاً)

تھا۔ جس کام کو شروع کرتے اس کو پورا کرتے۔ کل کا لفظ بغیر ان شاء اللہ نہ فرماتے۔ تہذیب و ادب کا لحاظ رکھتے۔ ہر کام میں بزرگوں کی پیروی کرتے۔ مریدوں کو نماز اور عبادت کی تعلیم دیتے اور اس کی پابندی کا حکم فرماتے۔ بیمار ہوتے تو بہت کم دوا لیتے اور فرماتے کہ دوا میں تو کل اچھی چیز ہے اور دوا کرنے کا حکم بھی ہے۔ سماع سے آپ کو الکا زندہ تھا۔ آپ کسی کی غیبت نہیں سنتے تھے۔ اگر کوئی ماواقت غیبت کر بیٹھتا تو آپ بیزار ہوتے اور اس کی کسی اچھی بات سے تاویل فرماتے۔ مثلاً ایک مرتبہ حاجی جلال الدین نے سادات خان حاکم شہر کی شکایت کی، آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے کوئی کسی کی بددی ظاہر کرتا ہے تو مجھے اس کے جواب میں مشکل درپیش آتی ہے، کیوں کہ خدا نے بدی اور گمان بد سے منع فرمایا ہے اور اس کے رسول نے حسن ظن کا حکم دیا ہے۔ لامحالہ مجھے توجیہ کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً اگر کسی کو رمضان میں سر بار زار کھاتے ہوئے دیکھوں تو گمان کروں گا کہ مسافر یا بیمار ہے کہ بھوک کے غلبے سے الگ لے جا کر کھانے کی طاقت نہیں رکھتا ہے۔ اگر کسی کو ننگے بدن اس طور سے نماز پڑھتا ہوا دیکھوں کہ عورت تھیلے چھپا ہوا ہو، تو سمجھوں گا کہ مالکی المذہب ہے۔ اگر کسی کو دیکھوں کہ وضو کے بعد بلا تہجد وضو نماز پڑھ رہا ہے تو خیال کروں گا کہ شافعی المذہب ہے۔ اگر کسی کو چائوں کہ اس نے شراب پی ہے، کہوں گا تو بدکرلی ہوگی۔ ایک مرتبہ کسی نے کہا کہ حاکم شہر ظالم اور رافضی ہے مگر نماز عید اس نے جماعت سے پڑھی تھی آپ نے فرمایا کہ جب تم نے نماز جماعت سے پڑھتے ہوئے دیکھا پھر کیوں اس کے حق میں برا گمان کیا، انسان کو نیکی پر نظر کرنی چاہیے نہ کہ بدی پر۔ (سمات الاخیار ص: ۸۲-۸۳ ملخصاً)

اقوال دریں

مومنین نے آپ کی میرٹ پر بہت کچھ لکھا ہے اور آپ کے اقوال و عادات اور اطوار کو تفصیل سے تحریر کیا ہے۔ یہاں سب کی گنجائش تو نہیں، ذیل میں آپ کے چند اقوال قلم بند کیے جاتے ہیں:

(۱) سالک کو چاہیے کہ وہ صف نعال میں بیٹھے تاکہ اپنے کو پستی میں دیکھ کر بندگی کی طرف ترقی کرے اور شیخ کو چاہیے کہ صدر میں بیٹھے تاکہ نعال نشینوں کی طرف متوجہ ہو اور ان کی تعلیم اور ترقی کی کوشش کرے۔

(۲) طلب کامل وہی ہے جو اپنی زبان سے کہنے کی نوبت نہ آئے اور شیخ خود اس کی عرضی کی طرف توجہ کرے۔

(۳) اہل دنیا چاہتے ہیں کہ فقرا کو ایک دو ملاقات میں پہچان لیں، یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ فقیر کو غیر فقیر پہچان لے۔

(۴) کل مسر جاوڑا لائین شاع اس حدیث میں ائمین سے مراد دو آدمی نہیں ہیں بلکہ دولب ہیں۔ معنی یہ ہوئے کہ بھید جب دولب سے گزر جاتا ہے تو پھیل جاتا ہے۔ (سمات الاخیار ص: ۹۰ تا ۹۱ ملخصاً)

نکاح و اولاد

۳۲ھ میں حضرت حاجی ارزانی فاروقی کی نیک بخت صاحب زاوی سے آپ کا نکاح ہوا۔ اس وقت آپ کی عمر ۳۲ سال تھی، جن سے چار فرزند ہوئے: (۱) شیخ محمد حمید (۲) شیخ محمد ارشد (۳) شیخ غلام نعین الدین (۴) شیخ غلام قطب الدین۔ ان میں سے ہر ایک علوم ظاہر و باطن سے بہرہ مند تھے۔ ان میں سے حضرت شیخ محمد ارشد ملقب بہ بدرالحق، جن کو ہر امر میں ترجیح حاصل تھی، اکابر سلسلہ کے اتفاق سے والد کے بعد سجادہ نشین ہوئے۔ (سمات الاخیار ص: ۹۳ ملخصاً)

وصال بر ملا

آپ کو ماہ شعبان کے آخر سے بخارا نام شروع ہوا اور روز بروز مرض بڑھتا گیا، طاقت سختی گئی۔ اس کے باوجود معمولات میں کوئی فرق نہ آیا۔ نماز باجماعت ادا کرتے۔ رمضان کی آٹھویں تاریخ کو ظہر کے وقت آپ نے وضو کیا، تخت پر جماعت کے ساتھ نماز ادا کی، عصر کے وقت اتنی قوت نہ رہی کہ تخت پر جاتے، ماحار تمیم کر کے پٹنگ پر نماز پڑھی، مغرب و عشا بھی اسی پٹنگ پر ادا کی، رات کو حالت متغیر ہوتی رہی، کرب زائد تھا مگر آدھی رات کے بعد آپ نے تیمم کا طرف طلب کیا، تیمم فرمایا، تہجد اور ذکر و اذکار کیا، فجر کی نماز ادا کی پھر پٹنگ پر لیٹ گئے، جب لوگوں نے دیکھا تو اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ یہ جمعہ کا دن، رمضان کی نویں تاریخ، ۱۰۸۳ھ کا سال تھا۔ خاص باغ میں جو اس وقت درگاہ کا احاطہ ہے، مدفون ہوئے۔ شیخ محمد ماہ نے جنازہ کی نماز پڑھائی اور شیخ محمد ارشد ملا ملتان کے ساتھ قبر میں بھی اتارے۔ پہلے پیر کے تختے دیے گئے پھر وصیت کے مطابق ان پتھروں کا تختہ دیا گیا جن پر آپ کے طلبہ و تلامذہ کی جوتیاں اترتی تھیں۔

(سمات الاخیار ص: ۹۹-۱۰۰ ملخصاً)

آپ کے خلفاء ایک نظر میں

سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ یوں تو آپ کے خلفاء کثرت سے ہیں مگر ۳۴ آدمی ایسے کامل اور جید خلیفہ تھے کہ اگر ہر ایک کا تفصیلی ذکر کھوں تو اچھی خاصی ایک دوسری کتاب ہو جائے طوالت کے خیال سے محض ان کی فہرست دیتا ہوں:

(۱) حضرت شیخ عبدالحمید قدس سرہ

(۲) حضرت ملا عبدالحمید زنجیری قدس سرہ

(۳) حضرت شیخ مبارک مکی الدین قدس سرہ -

(۴) مولانا نور الدین مداری چون پوری قدس سرہ

(۵) حضرت شیخ آیت اللہ قدس سرہ

(۶) حضرت نصرت جمال ملتانجامی شیخ رشیدی قدس سرہ

(۷) حضرت شیخ محبت اللہ قدس سرہ

(۸) حضرت شیخ عبداللہ مٹھن پوری قدس سرہ

(۹) شیخ ہارون رشید قدس سرہ ساکن پوریہ

(۱۰) میر محمد صادق قدس سرہ جون پوری

(۱۱) سید مکی الدین قدس سرہ محمد آبادی

(۱۲) حاجی شیخ جلال الدین قدس سرہ جون پوری

(۱۳) ملا محمد نعیم قدس سرہ ساکن مدوسرائے

(۱۴) شیخ عبدالحی قدس سرہ ساکن فتح پور سوہ

(۱۵) شیخ مرتضیٰ ہاشمی شیخ عبدالحمید قدس سرہ

(۱۶) میر سید نور قدس سرہ پٹنوی

(۱۷) شیخ عبداللہ قدس سرہ بنگالی

(۱۸) شیخ عبدالواحد مشتاق قدس سرہ فتح پوری

(۱۹) شیخ حبیب اللہ قدس سرہ بہاری

(۲۰) میر سید سیف الدین قدس سرہ مدین پوری

(۲۱) شیخ ضیاء الدین قدس سرہ خوبہ شہری

(۲۲) میر سید نور قدس سرہ ساکن شہر پوریہ

(۲۳) میر محمد غوث قدس سرہ ساکن موضع مندول

(۲۴) قاضی محمد مودود قدس سرہ جون پوری مدبر قاضی محمد حسین قاضی شہر

(۲۵) حضرت راجی صدر الدین قدس سرہ خولیش

(۲۶) حضرت راجی خضر قدس سرہ ماکب پوری

(۲۷) شیخ غلام مکی الدین متوکل قدس سرہ جون پوری

(۲۸) شیخ محمد نصیب میثوی قدس سرہ

(۲۹) میر سید محمد اسماعیل قدس سرہ سیوانی

(۳۰) حضرت سید محمد ارشد رشید قدس سرہ

یہ سب بزرگ اہل کمال، عارف کامل اور ذاکر و متاغل تھے۔

(سات الاخیار ص: ۱۰ تا ۱۰۴)

ان کے علاوہ تین اور اولوالعزم خلفاء یہ ہیں:

(۳۱) حضرت میر سید قیام الدین قدس سرہ گورکھ پوری

(۳۲) حضرت میر سید محمد جعفر قدس سرہ پٹنوی

(۳۳) حضرت شیخ یحییٰ بن قدس سرہ جھنوسوی

ان میں سے بعض کا اہلی تذکرہ آئندہ صفحات میں قلم بند کیا جائے گا۔

بانی سلسلہ رشیدیہ کی دعوتی خدمات

سلسلہ رشیدیہ کو جاری ہوئے تقریباً چار سو سال کا طویل عرصہ گزر گیا، مگر آج بھی اپنے پورے آب و تاب کے ساتھ یہ سلسلہ جاری ہے۔ مخلوق خدا کی خدمت اور رشد و ہدایت کا کام بحسن و خوبی انجام پا رہا ہے۔ اس سلسلے کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں سجادگی میراثی نہیں ہے۔ پورے سلسلے میں جو اولوالعزم علماء و مشائخ اور صالحین ہوں گے وہ اتفاق رائے سے سلسلے کے کسی فرد کو جو اجازت اور خلافت یافتہ ہوگا اس کو سجادگی کے لیے منتخب کرتے ہیں۔ یہ طریقہ منہاج نبوت و خلفائے راشدین کے طریقے کے مطابق ہے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ جو اس سلسلے کا سجادہ ہوگا اس کے ذمے اس سلسلے کی فقط ایک خانقاہ کی ذمہ داری نہ ہوگی بلکہ اس کی چند خانقاہوں کی مکمل ذمہ داری ادا کرنا اس کا وحشی اور روحانی فریضہ قرار پاتا ہے۔ بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ اگر کوئی سجادہ خانقاہی فرائض اور وحشی اور روحانی ذمہ داریوں اور خدمت خلق سے لائقیت کا ثبوت دیتا ہے تو اس سلسلے کے اصحاب حل و عقد نے جس طرح ان کو منتخب کیا تھا اسی طرح ان کو معزول بھی کر سکتے ہیں اور کسی دوسرے کو اس عہدے کے لیے منتخب کرنے کا حق بھی رکھتے ہیں۔ آج جب کہ ہم زمانہ نبوت سے چودہ سو سال دور ہو چکے ہیں، یہ خانقاہ اپنی مثال آپ ہے۔ دوسری تمام خانقاہوں کو اس سے سبق لینا چاہیے۔

بانی سلسلہ شیخ محمد رشید قدس سرہ نے آج سے چار سو سال پہلے اللہ و رسول ﷺ کی رضا کے مطابق دعوت و تبلیغ اور علم و عرفان کا جو نظام قائم کیا تھا وہ آج بھی قائم ہے اور آپ کے خلفاء اور سلسلے کے افراد اپنے اسلاف کے طریقے کے مطابق دعوت و تبلیغ، رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دینے میں مصروف ہیں۔ بانی سلسلے نے جو دعوتی نظام برپا کیا تھا وہ اپنی پوری تابانی کے ساتھ آج بھی جاری ہے اور اس سلسلے کی مختلف خانقاہیں خدمت خلق میں آج بھی مصروف ہیں۔ ان خانقاہوں کے

ذریعہ مخلوق خدا کی علمی اور روحانی سیرانی کا سامان آج بھی فراہم کیا جا رہا ہے۔ بانی سلسلہ کے خلفاء اور پیران کے خلفاء کا جو ایک لمبا سلسلہ چلا اور چل رہا ہے، ان تمام کا سربراہ بانی سلسلہ شیخ محمد رشید قدس سرہ کے مرنے کا ہے۔

بانی سلسلہ رشیدیہ کی علمی خدمات

آپ کی ذات علمی دنیا میں نہ کل محتاج تعارف تھی اور نہ آج ہے۔ آپ اپنے دور کے بڑے بڑے عالموں اور محققین پر سبقت لے گئے۔ آپ کے ہم عصر علماء و مشائخ نے جہاں آپ کی روحانی حیثیت کو تسلیم کیا وہیں آپ کی علمی قدر و قیمت کو بھی سراہا ہے۔ (۳) آپ کے اساتذہ نے بھی آپ پر فخر کیا ہے۔ صاحب خمس باز غلام محمد و جون پوری جیسے عالم آپ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ ملا موہن بہاری آپ کے مداحوں میں شامل ہیں۔ آپ اپنے اساتذہ کا حد سے زیادہ احترام کرتے تھے، بلکہ ان کے گھر کے درو دیوار کا احترام بھی ضروری خیال کرتے تھے۔ آپ ہمیشہ طالبان علوم نبویہ کو درس دیا کرتے تھے اور ان کی قدر کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ آپ نے وصال کے وقت وصیت کی تھی کہ جس پتھر پہ طلبہ کی جوتیاں اترتی ہیں میری قبر میں اسی کا تختہ دیا جائے۔

(سمات الاخبار: ص ۶۵ ملخصاً)

ایک روز آپ حسب معمول استاذ العلماء شیخ محمد افضل کی خدمت میں تشریف لے گئے، وہ علم مناظرہ کی کتاب شریفہ کسی کو پڑھا رہے تھے، آپ کی طرف دیکھ کر فرمایا کہ متن خوب ہے اگر کوئی اس کی شرح لکھتے تو اچھی ہوگی۔ دوسرے ہفتے میں جب آپ ملنے گئے تو شریفہ کی شرح رشیدیہ لکھ کر لے گئے۔ استاذ العلماء نے دیکھ کر بہت پسند فرمایا۔ یہ شرح ایسی جامع و مانع اور سلیس واقع ہوئی ہے کہ فن مناظرہ میں رشیدیہ کے سوا اور کچھ پڑھنے کی حاجت نہیں ہوتی۔ (سمات الاخبار: ص ۶۵)

جس طرح آپ کی تصانیف کی کثرت ہے، اس سے کئی گنا زیادہ آپ کے جید تلامذہ کی تعداد ہے۔ آپ کے تلامذہ میں سے اکثر نے آپ ہی سے طریقت میں بھی اجازت و خلافت حاصل کی یا کم از کم آپ کے مرید ہوئے۔

تصانیف

صاحب سمات الاخبار لکھتے ہیں کہ آپ کی تصانیف بہت ہیں، چند کتابیں جو خانقاہ میں موجود ہیں ان کے نام درج ذیل ہیں:

(۱) رشیدیہ: یہ شریفہ کی شرح ہے، فن مناظرہ کی مشہور کتاب ہے، یہ کتاب چھپ گئی ہے اور درس میں داخل ہے۔

(۲) تذکرۃ الخو: شہو کے مسائل میں چند ورقوں کا رسالہ ہے جس کو آپ نے اپنے

صاحب زاوے حضرت شیخ محمد ارشد کے کے لیے لکھا تھا۔ اس کی ابتدا میں اعلم ارشد ک اللہ تعالیٰ لکھا ہے۔ اب خلاصۃ الخو کے سے نام مشہور ہے اور نحو میر کے آخر میں طبع ہے۔

(۳) زاوہ الساکین: یہ رسالہ تعارف سے متعلق ہے، جس کو آپ نے اپنے پہلے مرید حضرت شیخ عبدالجید کے لیے تحریر فرمایا ہے۔

(۴) مقصود الطالبین: یہ کتاب بھی تعارف میں ہے۔ اس میں معارف اور حقائق کی باتیں مرقوم ہیں حضرت نصرت جمال ملتان کے لیے لکھی گئی تھی۔

(۵) ترجمہ معینہ: یہ رسالہ تذکرۃ الخو کی شرح ہے۔ حضرت شیخ غلام معین الدین کے پڑھنے کے لیے تحریر فرمایا تھا۔

(۶) بریۃ الخو: یہ بھی نحو کا رسالہ ہے، جس کو اپنے بیٹے شیخ محمد حمید کے لیے لکھا تھا۔

(۷) کتبات: یہ ان خطوط کا مجموعہ ہے جو اکثر خلفاء کا مبطور جواب کے لکھے تھے۔

(۸) دیوان شمس: آپ کے فارسی و ہندی اشعار کا مجموعہ ہے۔ آپ شمس کا تخلص فرماتے تھے۔ صاحب خزینۃ الاصفیاء کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے شیخ اکبری تصنیف اسرار الخلوقات پر ایک بیضا شرح لکھی ہے۔ رشیدیہ اور تذکرۃ الخو کے سوا سب رسالے تقاضی ہیں، اب تک چھپے نہیں۔

سلسلہ رشیدیہ کے جادگان ایک نظر میں

(۱) شیخ محمد ارشد جون پوری

(۲) شیخ قمر الحق غلام رشید

(۳) حضرت حیدر بخش امام الدین

(۴) حضرت شاہ امیر الدین

(۵) حضرت شاہ غلام معین الدین

(۶) حضرت شاہ سراج الدین

(۷) حضرت محمد عبدالعلیم آسی غازی پوری

(۸) حضرت شاہ شاہ علی شہر پوش

(۹) حضرت شاہ مصطفیٰ علی سہر پوش

(۱۰) حضرت شاہ مفتی عبید الرحمن رشیدی

سلسلہ رشیدیہ کی جادوگی کے تحت آیا و خانقاہ ہیں

(۱) خانقاہ رشیدیہ، جون پور

(۲) خانقاہ عالیہ طیبیہ، منڈوا ڈیہہ بنارس

(۳) خانقاہ عالیہ مصطفائیہ، چشتیہ بازار پورنیہ، بہار

(۴) خانقاہ عالیہ حیدریہ معینیہ، سیوان، بہار

(۵) خانقاہ عالیہ علیمیہ، غازی پور

سلسلہ رشیدیہ کے چند ممتاز علماء و مشائخ

شیخ محمد رشید قدس سرہ جہاں علمی اعتبار سے مرجع خلافت تھے وہیں دوسری طرف طریقت، حقیقت اور معرفت کے لحاظ سے اپنے دور کے شیخ المثنیٰ تھے۔ بے شمار لوگوں نے آپ سے اپنی علمی اور روحانی ترقی و ترقی کا ذخیرہ اور خلفاء کی ایک بڑی جماعت آپ نے تیار کی۔ ۳۴۲ خلفاء کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ان کے علاوہ بھی آپ کے خلفاء تھے جن کا ذکر نہیں ملتا۔ ذیل میں اس سلسلے کے بعض اولوالعزم خلفاء اور مشائخ کا اجمالاً ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) میر سید قیام الدین کوکہ پوری قدس سرہ (م: ۸ صفر ۱۲۸۸ھ) آپ کا اصلی وطن سنگوی اعظم گڑھ تھا۔ بعد میں آپ نے گورکھ پور کو شرف بخشا۔ شیخ محمد رشید قدس سرہ سے آپ کو ارادت و خلافت دونوں حاصل تھی۔ آپ بڑے زاہد، صائم، دہر، قائم اللیل، درویش تھے۔ آپ کے بارے میں آپ کے مرشد گرامی نے فرمایا: ”تم اور سید محمد جعفر کل اس فقیر کی نجات کے سبب ہو گئے۔“ آپ کے خاندان میں سجادگی کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ شاہ شاہد علی ہنر پوش قدس سرہ کے آپ مورث اعلیٰ ہیں۔

(۲) حضرت شیخ محمد ارشد قدس سرہ (پ: ۱۰۲۱ھ) آپ کا نام محمد ارشد، کنیت ابو الکلیف اور لقب بدرالحق تھا۔ آپ قطب الاقطاب شیخ محمد رشید بانی سلسلہ رشیدیہ کے متعلق صاحب زادے اور سلسلہ رشیدیہ کے پہلے سجادہ تھے۔ آپ نے علوم شرعیہ متداولہ شیخ عبدالشکور منیری، مولانا الہداد جون پوری، ملا نور الدین مداری جون پوری اور اپنے حقیقی چچا شیخ محمد ولید اور استاذ العلماء شیخ محمد افضل جون پوری سے حاصل کی جب کہ کتب تصوف کا علم اپنے والد گرامی سے حاصل کیا۔ ۲۱ سال کی عمر میں ظاہری اور باطنی علوم سے آراستہ ہو چکے، پھر طالبان علوم نبویہ کی خدمت میں معروف ہو گئے۔ ۲۳ سال کی عمر میں اپنے والد کے دست مبارک پر سلسلہ چشتیہ احمدیہ میں بیعت ہوئے اور انہی سے اجازت و خلافت بھی حاصل کی۔ آپ اپنے والد کی طرح جواب مرد اور باہمت تھے۔ خاندانی نعمتوں کے حصول کے بعد مزید کوشش جاری رہی۔ شیخ عبداللطیف مصلح پوری جو سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہ کی اولاد سے تھے اور سلسلہ جنیدیہ اور سلسلہ چشتیہ اشرفیہ میں صاحب اجازت و خلافت تھے، آپ شیخ محمد ارشد کے شہر ہوئے۔ شاہ ولی کے بعد ان دونوں سلسلوں کی اجازت و خلافت بھی آپ نے حاصل کی۔ حضرت قطب الاقطاب کے آپ

قابل فخر فرزند اور جانشین تھے۔ ایک دفعہ پٹنہ میں کسی بزرگ نے حضرت قطب الاقطاب سے پوچھا کہ دوست جب دوست کے پاس جاتا ہے تو کچھ بدیہ لے کر جاتا ہے۔ آپ جب خدا کے سامنے جائیں گے مگر خدا نے پوچھا کہ میرے واسطے کیا بدیہ لائے ہو؟ تو کیا جواب دیں گے؟ اس پر آپ آب ویدہ ہوئے اور فرمایا ”دوست محمد ارشد گرفتہ پیش خواہم کرو کہ ہمیں راہد یہ آوردہ ام۔“

(سمات الاخیار ص: ۱۱۸/۱۱۹)

شیخ محمد ارشد بدرالحق ایک بار وہلی کے سفر پر تھے، لکھنؤ کے قریب سے گزر رہے تھے تو حضرت شاہ عبدالرزاق بانسوی نے حاضرین سے فرمایا کہ اس نواح میں ایک عاشق اللہ پہنچا ہے اور حضرت بدرالحق نے بھی اپنے ساتھیوں سے شاہ صاحب کے حق میں فرمایا کہ ان قصبات میں خدا کے دوست کی بو آ رہی ہے۔ (سمات الاخیار ص: ۱۲۲/بحوالہ بحر زخار)

آپ کی طبیعت میں موزونیت تھی۔ شاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ آپ کے چند کلام بھی ملتے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ شاعری میں بھی کمال رکھتے تھے۔ شاعری میں اپنا تخلص والہ کرتے تھے۔ یہ اشعار آپ کی قادراکلائی کی شہادت ہیں:

ربخ او بے نقاب باید دید
روز را آفتاب باید دید
لب لعل تو با بیالہ مدام
مست را با شراب باید دید
والہا غیر او ہمیں ہر گز
آب را با حباب باید دید

(سمات الاخیار ص: ۱۲۸/۱۲۹)

اولاد

شیخ محمد ارشد کی دو شاہدیاں ہوئیں۔ پہلی شادی ۱۰۶۲ھ میں شیخ مبارک محی الدین ابن نور اللہ انصاری ہروی کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے دو لڑکے ہوئے: ایک شیخ نور اللہ اور دوسرے شیخ ثناء اللہ۔ دوسری شادی شیخ عبداللطیف مصلح پوری کی صاحبزادی سے ہوئی۔ ان سے بھی دو لڑکے ہوئے۔ ایک شیخ محبت اللہ اور دوسرے شیخ محمد۔ (سمات الاخیار ص: ۱۳۰/ملخصاً)

خلفاء و مریدین

سمات الاخیار کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ ۲۹۷ افراد نے مختلف سطحوں میں آپ سے بیعت کی اور تیس نفوس قدسیہ نے آپ سے روحانی سطحوں کی اجازت و خلافت حاصل کی۔

ذیل میں بعض ممتاز خلفاء کا مختصر ذکر کیا جا رہا ہے۔

(۱) میر سید محمد باقر چٹوٹی (پ: ۱۷۰۷ھ / ۱۷۰۷ھ، م: ۱۷۸۸ھ / ۱۷۸۸ھ)

آپ میر سید جعفر چٹوٹی کے بڑے صاحب زادے ہیں۔ اپنے والد ہی سے علوم ظاہری کی تکمیل کی اور ان ہی کے دست حق پرست پر بیعت بھی ہوئے۔ بعد میں حضرت محمد ارشد کی بارگاہ میں سلوک کی تکمیل کی اور تمام عمر درس و تدریس، ہدایت خلق اور ارشاد و فرائض میں مشغول رہے۔ آپ اپنے شیخ اجازت و خلافت سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ان کے انتقال کے چند ہی سال بعد آپ کا بھی انتقال ہو گیا اور پڑنے محلہ شریعت آباد میں اپنے والد کے روضے میں مدفون ہوئے۔

(سمات الاخیار ص: ۳۸ تا ۳۹ ملاحظہ)

(۲) حضرت میر سید محمد اسلم چٹوٹی (م: ۱۲۸۸ھ / ۱۲۸۸ھ)

آپ کا لقب عبد القدوس تھا۔ میر سید محمد جعفر کے بھٹے بیٹے تھے۔ علوم متداولہ کے علاوہ اجازت و خلافت بھی اپنے والد ہی سے حاصل کی اور پھر شیخ محمد ارشد بدالحق سے مزید نعتیں میسر آئیں۔ آپ نے اپنی ساری عمر مخلوق خدا کی رشد و ہدایت اور طالبانِ علوم نبویہ کے درس و تدریس میں صرف کر دی۔ رسالہ عمدة النجاة فی حل التلوات آپ نے تحریر فرمایا۔

(سمات الاخیار ص: ۳۹ تا ۴۱ ملاحظہ)

(۳) حضرت میر سید سہا اللہ (م: ۱۲۰۷ھ / ۱۲۰۷ھ)

آپ بہار ضلع سارنگ کے رہنے والے اور بانی سلسلہ رشیدیہ شیخ محمد رشید کے مرید اور خادم خاص تھے۔ شیخ محمد ارشد سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔ آپ کا مزار لچھوڑ میں ہے۔

(سمات الاخیار ص: ۴۱ تا ۴۲ ملاحظہ)

مختصر یہ ہے کہ شیخ محمد ارشد بدالحق نے اپنے والد سے جن نعمتوں کو پایا تھا ان میں اضافہ بھی کیا اور دعوت و ارشاد کا جو سلسلہ قائم ہوا تھا اس کو مزید وسیع پیمانے پر جاری رکھتے ہوئے خدمت خلق و رتذ کیہ نفوس کی غرض سے مریدین اور خلفاء کی ایک بڑی جماعت تیار کی۔

(۴) حضرت سید محمد جعفر چٹوٹی قدس سرہ (م: ۱۲۰۵ھ / ۱۲۰۵ھ)

آپ کا نام محمد جعفر اور لقب بحر الحقائق نجم الحق تھا۔ سلسلہ نسب حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تک پہنچتا ہے۔ آپ جب آٹھ برس کے تھے تو آپ کے والد سید ابوالحسن نے وفات پائی۔ دادا نے پرورش کی اور سلسلہ چشتیہ میں مرید کر کے خرقہ خلافت دے کر اپنا جانشین بنایا۔ جب سن شعور کو پہنچے تو تحصیلِ علوم کے لیے جون پور آئے اور حضرت قطب الاقطاب (شیخ محمد رشید) کے مدرسہ میں مقیم ہوئے۔ تکمیلِ علوم کے بعد چون کہ پہلی بیعت صغریٰ کی وجہ سے ٹھیک یا د

نہ تھی، حضرت سے سلسلہ قادریہ میں مرید بھی ہو گئے اور چند دن خدمت میں رہ کر مرید کمالات کو پہنچے۔ اس کے علاوہ دیگر سلاسل مثلاً چشتیہ، سہروردیہ، مہروردیہ و داریہ کی بھی خلافت و اجازت حاصل کی اور انجم شیخ پڑنے میں قیام کیا۔ ایک مدت تک مجرور رہے اور ایک مسجد میں بسر کی۔ جب آپ کی عمر زیادہ گزر گئی تو آپ کی والدہ کی تحریک سے حضرت قطب الاقطاب نے آپ کو سنت نبوی کے اتباع پر مجبور کیا اور خود ہی میر سید نور الدین نمبرہ حضرت سید فضل اللہ عرف سید گوشائیں داماد حضرت قطب بیادول تلندری صاحب زادی سے نسبت مقرر کر کے شادی کراچی۔ پھر وہ ماہ در زاد ولی پیدا ہوئے۔ آپ عالم، عامل اور عارف کامل تھے۔ طریقہ نبوی ہر امر میں ملحوظ رہتا۔

کسی نے آپ سے پوچھا تھا کہ آپ کے پیر جماع بنتے ہیں، آپ کیوں نہیں بنتے؟ جواب دیا کہ پیر نے رخصت کے وقت فرمایا تھا کہ حضرت امام اعظم کی فقہ پر عمل کرنا، میں پیر کی اطاعت کو سعادت دارین جانتا ہوں۔ آپ کا قول مشہور ہے: ”میں نے رشید (خدا) کو رشید کے سب سے پیجا ہا۔ اگر رشید نہ ہوتے تو میں خدا کو نہ پیچتا۔“ آپ کا مرتبہ اسی سے روشن ہے کہ ایک بار حضرت قطب الاقطاب نے فرمایا تھا کہ ”قیامت کے دن مریدوں کو پیروں سے شفاعت کی امید ہوگی اور مجھ کو اپنے مرید میر سید جعفر چٹوٹی اور میر سید قیام الدین گورکھپوری سے۔“

آپ نے کل تہکات و خرقہ خلافت اپنے بیٹوں میر محمد باقر و میر محمد اسلم میں تقسیم کر دیا۔ عرف ایک رومال رکھ لیا اور وصیت کی کہ کفنائے وقت اس رومال کو میر سے پر باندھ دینا، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آپ نے رمضان المبارک ۱۱۰۵ھ کی تیسری تاریخ کو بیچ شنبہ کے روز وصال فرمایا اور شریعت آباد دہرون شہر پڑنے میں مدفون ہوئے۔ آپ کے گزراوقات کے لیے ایک مرید نے ایک موضع دینا چاہا تھا، مگر قبول نہ فرمایا۔ اس کے اصرار پر آپ نے چند یکاہ زمین لے لی اور اس کا نام شریعت آباد رکھا۔ (سمات الاخیار ص: ۱۰۹ تا ۱۰۷)

(۵) حضرت شیخ نسیم جعفر چٹوٹی قدس سرہ (تاریخ وصال معلوم نہیں، مزار چٹوٹی میں ہے۔) آپ شیخ احمد ابن شیخ محمد ابن شیخ عبدالرحیم ابن بندگی شیخ اوچتر صدیقی جون پوری کے بیٹے تھے۔ چون کہ آپ سعاد زلی تھے اس وجہ سے آپ کو بچپن ہی سے حضرت مخدوم طیب بناری کی صحبت نصیب ہوئی۔ حضرت مخدوم نے آپ کی پرورش اور تعلیم مریدانہ فرمائی۔ گیارہویں برس سلسلہ چشتیہ میں مرید کر کے اپنا خلیفہ بنایا۔ شہاب الدین دولت آبادی ثم جون پوری کا رسالہ نحو ارشاد پڑھایا، پھر جون پور بھیجا۔ استاذ العلماء شیخ افضل الہ آبادی اور حضرت قطب الاقطاب شیخ محمد رشید سے کتابیں پڑھیں۔ سات برس تک جون پور میں رہے۔ درمیان میں وقفہ وقتاً حضرت مخدوم کی زیارت کو کافریش یاب بھی ہوا کرتے تھے۔ بیسویں برس جمع سلاسل کے خرقے اور

خلافتیں حضرت مخدوم نے عطا کیے۔ حضرت مخدوم کے بعد جو کسر رہ گئی تھی حضرت دیوان جی شیخ محمد رشید نے پوری کر دی اور خلافت و اجازت بخشی۔ ان باتوں کے باوجود حضرت دیوان جی اپنے مرشد کے سجادہ نشین ہونے کی وجہ سے آپ کی بڑی تعظیم کرتے تھے، یہاں تک کہ جب وہ قدم بوس ہونا چاہتے تھے تو آپ بھی اپنا ہاتھ ان کے پاؤں تک غرور پہنچاتے تھے۔ آپ پر کشف کی حالت بہت طاری رہا کرتی تھی۔ آپ نے تعوف کے بہت سے مشکل مسائل بذریعہ تحریر پوچھے ہیں اور حضرت دیوان جی نے ان کے جواب میں مکتوب لکھے ہیں۔ اپنے پیران سلاسل کے حالات میں مناقب العارفین آپ کی عظیم تصنیف ہے۔

آپ کا سال وصال معلوم نہیں آپ کا مزار قصبہ جھونسی، الہ آباد میں شیخ نصیر الدین اسدا لعلما کے روئے کے اندر ہے۔ (سمات الاخیار ص: ۱۱۲/۱۱۱)

(۵) شیخ غلام رشید (پ: ۸ ربیع الاول ۱۰۹۶ھ، م: ۵ صفر ۱۱۶۷ھ)

آپ کا نام غلام رشید، کنیت ابو الفیاض اور لقب قمر الحق ہے۔ آپ شیخ محبت اللہ کے لڑکے اور شیخ محمد ارشد کے پوتے و جانشین اور سلسلہ رشیدیہ کے دوسرے سجادہ نشین تھے۔ آپ چودہ دن کے تھے کہ آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور ایک سال چار ماہ کے ہوئے کہ والد کا سایہ بھی اٹھ گیا۔ آپ کے دادا شیخ محمد ارشد نے آپ کی پرورش کی اور کامل و مکمل بنا دیا۔ علوم ظاہر و متداولہ آپ نے مختلف علمائے وقت سے حاصل کیا اور اس کی بھی تکمیل اپنے دادا شیخ محمد ارشد ہی سے کی اور دعوت و تبلیغ، درس و تدریس میں اپنی عمر صرف کر دی۔ شیخ حیدر بخش آپ کے نواسے تھے، جن کی تعلیم کے لیے آپ نے رسالہ ”ذریعہ النجوت“ کی نہایت بسیط شرح لکھی تھی۔ آپ تبحر عالم اور کامل درویش ہونے کے ساتھ زود گو شاعر بھی تھے۔ آپ کا فارسی کلام بھی ملتا ہے۔

پہننے کے سفر میں جب آپ خانقاہ جمعہ فیہ میں مقیم تھے تو آپ سے ملاقات کی غرض سے خانقاہ مجیبہ کے بانی حضرت مجیب اللہ پھلواری تشریف لائے اور اپنی خانقاہ میں حاضری کی دعوت دی۔ آپ تشریف لے گئے۔ پہننے سے پورنہ گئے اور پھر طبیعت خراب ہوئی۔ اسی سفر میں آپ کا انتقال بھی ہو گیا۔ آپ کی وصیت کے مطابق خانقاہ رشیدیہ جون پور میں دفن کیا گیا۔ کثرت سے آپ کی کرامتوں کا ذکر ملتا ہے۔ (سمات الاخیار ص: ۱۶۲ تا ۱۴۳) (ملخصاً)

خلق خدا نے کثرت سے آپ کے دست مبارک پر توبہ کیا مخلوق خدا کی اصلاح، تزکیہ قلوب اور تصفیہ نفوس کے لیے آپ نے چالیس سے زائد نفوس قدسیہ کو اپنی روحانی نعمتوں کی اجازت و خلافت سے سرفراز فرما کر رشد و ہدایت کا بہتر انتظام فرما دیا۔

(سمات الاخیار ص: ۱۶۳) (ملخصاً)

(۶) شاہ حیدر بخش (وصال: ۲۵ ریشوال ۱۲۲۲ھ)

آپ کا نام حیدر بخش اور لقب نور الحق اور قطب الدین ہے۔ آپ محبوب الحق شاہ فصیح الدین کے لڑکے اور حضرت قمر الحق غلام رشید کے نواسے و جانشین اور سلسلہ رشیدیہ کے تیسرے سجادہ نشین تھے۔ آپ کا نسبی سلسلہ حضرت ابو بکر صدیق سے جاملتا ہے۔ آپ پانچ بھائی تھے۔ ۱۱۶۳ھ میں آپ اپنے ماما کے دست مبارک پر سلسلہ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوئے۔ آپ کی تعلیم و تلقین اور تکمیل ماما کے ہاتھوں ہو چکی تھی۔ ماما کے بعد بھی آپ نے اپنے والد سے مزید فیض حاصل کیا۔ آپ کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی سے نجیب الدین اور دوسری سے شاہ امیر الدین پیدا ہوئے۔

آپ کو شعر و سخن کا بھی ذوق تھا۔ ۱۰ روز زبان میں آپ کے چند اشعار ملتے ہیں۔

آپ سیوان بہار کا اکثر سفر کرتے اور مہینوں قیام فرماتے۔ بہمن برہنامی گاؤں میں آپ نے خانقاہ اور مسجد بنوائی تھی۔ ساٹھ سال سے زائد عمر پا کر ۲۲۵ ریشوال ۱۲۲۲ھ کو سیوان ہی میں آپ وصال فرما گئے اور یہیں مدفون بھی ہوئے۔ اس مقام کو نکیہ حیدری کہا جاتا ہے۔

(سمات الاخیار ص: ۸ تا ۱۸۲) (ملخصاً)

آپ کے بعد آپ کے صاحب زادے شاہ امیر الدین سجادہ نشین ہوئے اور سلسلہ رشیدیہ کے دعوتی و علمی اور رفاہی کاموں کو بحسن و خوبی انجام دیا۔ شاہ امیر الدین کے علاوہ آپ کے ۱۲ ار خلفا کا ذکر کتابوں میں ملتا ہے۔ ۱۱۶۱ھ کے علاوہ بھی خلفا کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔

(۷) شیخ قیام الحق شاہ امیر الدین (وصال: ۹ محرم الحرام ۱۲۲۵ھ)

آپ کا نام امیر الدین اور لقب قیام الحق ہے۔ آپ شاہ حیدر بخش کے چھوٹے لڑکے و جانشین اور سلسلہ رشیدیہ کے چوتھے سجادہ نشین تھے۔ آپ اپنے والد سے سلسلہ چشتیہ احمدیہ میں مرید ہوئے اور تمام سلاسل کی اجازت و خلافت اور خاندانی فیوض و برکات سے شرف یاب ہوئے۔ آپ میں متانت، وقار توکل اور قناعت بے حد تھی۔ دنیا کی باتوں سے زبان کو بچانے کے لیے بہت کم بولتے تھے اور بلا ضرورت کبھی زبان نہیں کھولتے تھے۔ اگر کبھی تکلیف ظلم گوارا فرماتے تو پیران سلاسل کا ذکر زبان پر لاتے۔ اپنے خاندانی بزرگوں کی طرح برآمدہ درس و تدریس اور ہند گانہ خدا کی ہدایت و تعلیم میں اپنے اوقات صرف کیے۔

آپ کی تین شادیاں ہوئیں۔ پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ تھی۔ دوسری سے شاہ ولی بخش اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ تیسری بیوی سے شاہ معین الدین قطب الہند اور ایک صاحب زادی پیدا ہوئی۔

(سمات الاخیار ص: ۱۸۷ تا ۱۸۸) (ملخصاً)

کثرت سے آپ کی کرامت کا تذکرہ ملتا ہے۔ آپ کے مریدین و متوسلین دور دور تک

پھیلے ہوئے تھے۔ سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ مولوی شاہ عبدالغفور ابو العلاء یوسف پوری جو اپنے وقت کے ایک جلیل القدر بزرگ تھے، جنہوں نے ہند سے عرب تک کی سیاحت اور تمام تبرک مقامات کی زیارت کی تھی، عرب میں ایک بزرگ سے ملے جو نہایت مشغولی اور استغراقی حالت میں تھے۔ آپ کو حیرت ہوئی کہ ایسے بزرگ اس زمانے میں بھی موجود ہیں۔ پوچھا آپ کس کے مرید ہیں؟ جواب دیا کہ اپنے باپ کے مرید ہیں۔ پھر پوچھا کہ ان کے شیخ کون ہیں؟ جواب دیا کہ حضرت شاہ امیر الدین جون پوری جو ملک ہندوستان کے رہنے والے تھے۔ (سمات الاخیار ص: ۱۹۰) ۹ محرم الحرام ۲۲۵ھ کو آپ کا وصال ہوا اور رشید آباد میں مدفون ہوئے۔

آپ کے مریدین اور خلفا کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ آپ کے بعض خلفا کا ذکر یہ بھی ملتا ہے۔ ان میں سے چند کے اسماء ہیں: (۱) شاہ غلام معین الدین، آپ حضرت کے صاحب زاویے تھے اور جانشین بھی ہوئے۔ (۲) شیخ قمر حسین سکندر پوری، آپ شاہ معین الدین کے ہم عمر اور شاہ قیام الحق کے مرید و خلیفہ ہونے کے ساتھ سکندر پور کے رئیس اور شاہ عبدالعلیم آسی غازی پوری کے والد تھے۔ ۱۰ محرم الحرام ۱۲۸۰ھ کو اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ شاہ رشید الحق میر سید حسین علی جعفری (پ: ۱۲۳۶ھ، م: ۱۶/رجب ۱۳۰۳ھ) آپ مولوی سید جعفر علی کے بیٹے اور اپنے حقیقی چچا فیاض الحق سید سجاد علی کے مرید و خلیفہ اور سجادہ نشین تھے۔ شاہ قیام الحق سے بھی مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت حاصل تھی۔ ان کے علاوہ قطب الہند شاہ غلام معین الدین سے بھی اجازت و خلافت رکھتے تھے۔ سمات الاخیار کے مصنف نے ان تین کے علاوہ آپ کے چار اور خلفا کا بھی ذکر کیا ہے۔

(۸) شاہ غلام معین الدین امیری (وصال: ۱۶/ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ)

آپ کا نام غلام معین الدین، کنیت ابو الخیر اور لقب قطب الہند تھا۔ آپ حضرت قیام الحق کے چھوٹے لڑکے، مرید و خلیفہ، جانشین اور سلسلہ رشیدیہ کے پانچویں سجادہ تھے۔ اپنے والد سے مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت کے علاوہ شیخ بدر الدین بدر عالم فراہی سے سلسلہ زاہد یہ کی بطریق اویسیہ اجازت و خلافت رکھتے تھے۔

آپ نے حرمین شریفین کی زیارت کے لیے مکہ شریف کا سفر کیا تو حاجی امداد اللہ مہاجر کی چشتی صابری نے آپ سے ملاقات کی اور جو کچھ مطلوب و مقدر تھا لے گئے۔ دوسرے دن جب دوبارہ تشریف لائے تو ایک رسالہ مع اجازت نامہ کے دے گئے۔

صاحب سمات الاخیار تحریر کرتے ہیں کہ مولوی شاہ عبدالغفور ابو العلاء یوسف پوری جو بڑے سیاح اور بڑے مشائخ کی صحبت اٹھائے ہوئے درویش تھے، ان کا بیان ہے کہ ہند سے

عرب تک میں نے اس جامعیت کا شیخ کہیں نہیں پایا۔ کسی نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ شاہ معین الدین اور مولانا فضل الرحمن شیخ مراد آبادی میں کیا نسبت ہے؟ مولوی صاحب نے فرمایا کہ مولانا کی مثال اس شخص کی ہے جس نے بذات خاص ایک دولت پیدا کی ہو اور شاہ صاحب کی مثال اس آدمی کی ہے جس نے خود بنفس نفیس بھی دولت پیدا کی ہو اور اس کو اپنے باپ و اداکئی پشتوں کی دولت بھی ہاتھ لگئی ہو۔ ۱۶/ذی الحجہ ۱۳۰۰ھ کا دن قیامت ڈھانے والا تھا۔ اس شام کو مغرب کی فرض اور سنت نماز کے درمیان طالب مطلوب سے، عاشق معشوق سے جا ملا۔

(سمات الاخیار ص: ۲۰۰/۲۰۳/۲۰۶/۲۰۷/۲۰۸/۲۰۹/۲۱۰/۲۱۱/۲۱۲/۲۱۳/۲۱۴/۲۱۵/۲۱۶/۲۱۷/۲۱۸/۲۱۹/۲۲۰/۲۲۱/۲۲۲/۲۲۳/۲۲۴/۲۲۵/۲۲۶/۲۲۷/۲۲۸/۲۲۹/۲۳۰/۲۳۱/۲۳۲/۲۳۳/۲۳۴/۲۳۵/۲۳۶/۲۳۷/۲۳۸/۲۳۹/۲۴۰/۲۴۱/۲۴۲/۲۴۳/۲۴۴/۲۴۵/۲۴۶/۲۴۷/۲۴۸/۲۴۹/۲۵۰/۲۵۱/۲۵۲/۲۵۳/۲۵۴/۲۵۵/۲۵۶/۲۵۷/۲۵۸/۲۵۹/۲۶۰/۲۶۱/۲۶۲/۲۶۳/۲۶۴/۲۶۵/۲۶۶/۲۶۷/۲۶۸/۲۶۹/۲۷۰/۲۷۱/۲۷۲/۲۷۳/۲۷۴/۲۷۵/۲۷۶/۲۷۷/۲۷۸/۲۷۹/۲۸۰/۲۸۱/۲۸۲/۲۸۳/۲۸۴/۲۸۵/۲۸۶/۲۸۷/۲۸۸/۲۸۹/۲۹۰/۲۹۱/۲۹۲/۲۹۳/۲۹۴/۲۹۵/۲۹۶/۲۹۷/۲۹۸/۲۹۹/۳۰۰/۳۰۱/۳۰۲/۳۰۳/۳۰۴/۳۰۵/۳۰۶/۳۰۷/۳۰۸/۳۰۹/۳۱۰/۳۱۱/۳۱۲/۳۱۳/۳۱۴/۳۱۵/۳۱۶/۳۱۷/۳۱۸/۳۱۹/۳۲۰/۳۲۱/۳۲۲/۳۲۳/۳۲۴/۳۲۵/۳۲۶/۳۲۷/۳۲۸/۳۲۹/۳۳۰/۳۳۱/۳۳۲/۳۳۳/۳۳۴/۳۳۵/۳۳۶/۳۳۷/۳۳۸/۳۳۹/۳۴۰/۳۴۱/۳۴۲/۳۴۳/۳۴۴/۳۴۵/۳۴۶/۳۴۷/۳۴۸/۳۴۹/۳۵۰/۳۵۱/۳۵۲/۳۵۳/۳۵۴/۳۵۵/۳۵۶/۳۵۷/۳۵۸/۳۵۹/۳۶۰/۳۶۱/۳۶۲/۳۶۳/۳۶۴/۳۶۵/۳۶۶/۳۶۷/۳۶۸/۳۶۹/۳۷۰/۳۷۱/۳۷۲/۳۷۳/۳۷۴/۳۷۵/۳۷۶/۳۷۷/۳۷۸/۳۷۹/۳۸۰/۳۸۱/۳۸۲/۳۸۳/۳۸۴/۳۸۵/۳۸۶/۳۸۷/۳۸۸/۳۸۹/۳۹۰/۳۹۱/۳۹۲/۳۹۳/۳۹۴/۳۹۵/۳۹۶/۳۹۷/۳۹۸/۳۹۹/۴۰۰/۴۰۱/۴۰۲/۴۰۳/۴۰۴/۴۰۵/۴۰۶/۴۰۷/۴۰۸/۴۰۹/۴۱۰/۴۱۱/۴۱۲/۴۱۳/۴۱۴/۴۱۵/۴۱۶/۴۱۷/۴۱۸/۴۱۹/۴۲۰/۴۲۱/۴۲۲/۴۲۳/۴۲۴/۴۲۵/۴۲۶/۴۲۷/۴۲۸/۴۲۹/۴۳۰/۴۳۱/۴۳۲/۴۳۳/۴۳۴/۴۳۵/۴۳۶/۴۳۷/۴۳۸/۴۳۹/۴۴۰/۴۴۱/۴۴۲/۴۴۳/۴۴۴/۴۴۵/۴۴۶/۴۴۷/۴۴۸/۴۴۹/۴۵۰/۴۵۱/۴۵۲/۴۵۳/۴۵۴/۴۵۵/۴۵۶/۴۵۷/۴۵۸/۴۵۹/۴۶۰/۴۶۱/۴۶۲/۴۶۳/۴۶۴/۴۶۵/۴۶۶/۴۶۷/۴۶۸/۴۶۹/۴۷۰/۴۷۱/۴۷۲/۴۷۳/۴۷۴/۴۷۵/۴۷۶/۴۷۷/۴۷۸/۴۷۹/۴۸۰/۴۸۱/۴۸۲/۴۸۳/۴۸۴/۴۸۵/۴۸۶/۴۸۷/۴۸۸/۴۸۹/۴۹۰/۴۹۱/۴۹۲/۴۹۳/۴۹۴/۴۹۵/۴۹۶/۴۹۷/۴۹۸/۴۹۹/۵۰۰/۵۰۱/۵۰۲/۵۰۳/۵۰۴/۵۰۵/۵۰۶/۵۰۷/۵۰۸/۵۰۹/۵۱۰/۵۱۱/۵۱۲/۵۱۳/۵۱۴/۵۱۵/۵۱۶/۵۱۷/۵۱۸/۵۱۹/۵۲۰/۵۲۱/۵۲۲/۵۲۳/۵۲۴/۵۲۵/۵۲۶/۵۲۷/۵۲۸/۵۲۹/۵۳۰/۵۳۱/۵۳۲/۵۳۳/۵۳۴/۵۳۵/۵۳۶/۵۳۷/۵۳۸/۵۳۹/۵۴۰/۵۴۱/۵۴۲/۵۴۳/۵۴۴/۵۴۵/۵۴۶/۵۴۷/۵۴۸/۵۴۹/۵۵۰/۵۵۱/۵۵۲/۵۵۳/۵۵۴/۵۵۵/۵۵۶/۵۵۷/۵۵۸/۵۵۹/۵۶۰/۵۶۱/۵۶۲/۵۶۳/۵۶۴/۵۶۵/۵۶۶/۵۶۷/۵۶۸/۵۶۹/۵۷۰/۵۷۱/۵۷۲/۵۷۳/۵۷۴/۵۷۵/۵۷۶/۵۷۷/۵۷۸/۵۷۹/۵۸۰/۵۸۱/۵۸۲/۵۸۳/۵۸۴/۵۸۵/۵۸۶/۵۸۷/۵۸۸/۵۸۹/۵۹۰/۵۹۱/۵۹۲/۵۹۳/۵۹۴/۵۹۵/۵۹۶/۵۹۷/۵۹۸/۵۹۹/۶۰۰/۶۰۱/۶۰۲/۶۰۳/۶۰۴/۶۰۵/۶۰۶/۶۰۷/۶۰۸/۶۰۹/۶۱۰/۶۱۱/۶۱۲/۶۱۳/۶۱۴/۶۱۵/۶۱۶/۶۱۷/۶۱۸/۶۱۹/۶۲۰/۶۲۱/۶۲۲/۶۲۳/۶۲۴/۶۲۵/۶۲۶/۶۲۷/۶۲۸/۶۲۹/۶۳۰/۶۳۱/۶۳۲/۶۳۳/۶۳۴/۶۳۵/۶۳۶/۶۳۷/۶۳۸/۶۳۹/۶۴۰/۶۴۱/۶۴۲/۶۴۳/۶۴۴/۶۴۵/۶۴۶/۶۴۷/۶۴۸/۶۴۹/۶۵۰/۶۵۱/۶۵۲/۶۵۳/۶۵۴/۶۵۵/۶۵۶/۶۵۷/۶۵۸/۶۵۹/۶۶۰/۶۶۱/۶۶۲/۶۶۳/۶۶۴/۶۶۵/۶۶۶/۶۶۷/۶۶۸/۶۶۹/۶۷۰/۶۷۱/۶۷۲/۶۷۳/۶۷۴/۶۷۵/۶۷۶/۶۷۷/۶۷۸/۶۷۹/۶۸۰/۶۸۱/۶۸۲/۶۸۳/۶۸۴/۶۸۵/۶۸۶/۶۸۷/۶۸۸/۶۸۹/۶۹۰/۶۹۱/۶۹۲/۶۹۳/۶۹۴/۶۹۵/۶۹۶/۶۹۷/۶۹۸/۶۹۹/۷۰۰/۷۰۱/۷۰۲/۷۰۳/۷۰۴/۷۰۵/۷۰۶/۷۰۷/۷۰۸/۷۰۹/۷۱۰/۷۱۱/۷۱۲/۷۱۳/۷۱۴/۷۱۵/۷۱۶/۷۱۷/۷۱۸/۷۱۹/۷۲۰/۷۲۱/۷۲۲/۷۲۳/۷۲۴/۷۲۵/۷۲۶/۷۲۷/۷۲۸/۷۲۹/۷۳۰/۷۳۱/۷۳۲/۷۳۳/۷۳۴/۷۳۵/۷۳۶/۷۳۷/۷۳۸/۷۳۹/۷۴۰/۷۴۱/۷۴۲/۷۴۳/۷۴۴/۷۴۵/۷۴۶/۷۴۷/۷۴۸/۷۴۹/۷۵۰/۷۵۱/۷۵۲/۷۵۳/۷۵۴/۷۵۵/۷۵۶/۷۵۷/۷۵۸/۷۵۹/۷۶۰/۷۶۱/۷۶۲/۷۶۳/۷۶۴/۷۶۵/۷۶۶/۷۶۷/۷۶۸/۷۶۹/۷۷۰/۷۷۱/۷۷۲/۷۷۳/۷۷۴/۷۷۵/۷۷۶/۷۷۷/۷۷۸/۷۷۹/۷۸۰/۷۸۱/۷۸۲/۷۸۳/۷۸۴/۷۸۵/۷۸۶/۷۸۷/۷۸۸/۷۸۹/۷۹۰/۷۹۱/۷۹۲/۷۹۳/۷۹۴/۷۹۵/۷۹۶/۷۹۷/۷۹۸/۷۹۹/۸۰۰/۸۰۱/۸۰۲/۸۰۳/۸۰۴/۸۰۵/۸۰۶/۸۰۷/۸۰۸/۸۰۹/۸۱۰/۸۱۱/۸۱۲/۸۱۳/۸۱۴/۸۱۵/۸۱۶/۸۱۷/۸۱۸/۸۱۹/۸۲۰/۸۲۱/۸۲۲/۸۲۳/۸۲۴/۸۲۵/۸۲۶/۸۲۷/۸۲۸/۸۲۹/۸۳۰/۸۳۱/۸۳۲/۸۳۳/۸۳۴/۸۳۵/۸۳۶/۸۳۷/۸۳۸/۸۳۹/۸۴۰/۸۴۱/۸۴۲/۸۴۳/۸۴۴/۸۴۵/۸۴۶/۸۴۷/۸۴۸/۸۴۹/۸۵۰/۸۵۱/۸۵۲/۸۵۳/۸۵۴/۸۵۵/۸۵۶/۸۵۷/۸۵۸/۸۵۹/۸۶۰/۸۶۱/۸۶۲/۸۶۳/۸۶۴/۸۶۵/۸۶۶/۸۶۷/۸۶۸/۸۶۹/۸۷۰/۸۷۱/۸۷۲/۸۷۳/۸۷۴/۸۷۵/۸۷۶/۸۷۷/۸۷۸/۸۷۹/۸۸۰/۸۸۱/۸۸۲/۸۸۳/۸۸۴/۸۸۵/۸۸۶/۸۸۷/۸۸۸/۸۸۹/۸۹۰/۸۹۱/۸۹۲/۸۹۳/۸۹۴/۸۹۵/۸۹۶/۸۹۷/۸۹۸/۸۹۹/۹۰۰/۹۰۱/۹۰۲/۹۰۳/۹۰۴/۹۰۵/۹۰۶/۹۰۷/۹۰۸/۹۰۹/۹۱۰/۹۱۱/۹۱۲/۹۱۳/۹۱۴/۹۱۵/۹۱۶/۹۱۷/۹۱۸/۹۱۹/۹۲۰/۹۲۱/۹۲۲/۹۲۳/۹۲۴/۹۲۵/۹۲۶/۹۲۷/۹۲۸/۹۲۹/۹۳۰/۹۳۱/۹۳۲/۹۳۳/۹۳۴/۹۳۵/۹۳۶/۹۳۷/۹۳۸/۹۳۹/۹۴۰/۹۴۱/۹۴۲/۹۴۳/۹۴۴/۹۴۵/۹۴۶/۹۴۷/۹۴۸/۹۴۹/۹۵۰/۹۵۱/۹۵۲/۹۵۳/۹۵۴/۹۵۵/۹۵۶/۹۵۷/۹۵۸/۹۵۹/۹۶۰/۹۶۱/۹۶۲/۹۶۳/۹۶۴/۹۶۵/۹۶۶/۹۶۷/۹۶۸/۹۶۹/۹۷۰/۹۷۱/۹۷۲/۹۷۳/۹۷۴/۹۷۵/۹۷۶/۹۷۷/۹۷۸/۹۷۹/۹۸۰/۹۸۱/۹۸۲/۹۸۳/۹۸۴/۹۸۵/۹۸۶/۹۸۷/۹۸۸/۹۸۹/۹۹۰/۹۹۱/۹۹۲/۹۹۳/۹۹۴/۹۹۵/۹۹۶/۹۹۷/۹۹۸/۹۹۹/۱۰۰۰/۱۰۰۱/۱۰۰۲/۱۰۰۳/۱۰۰۴/۱۰۰۵/۱۰۰۶/۱۰۰۷/۱۰۰۸/۱۰۰۹/۱۰۱۰/۱۰۱۱/۱۰۱۲/۱۰۱۳/۱۰۱۴/۱۰۱۵/۱۰۱۶/۱۰۱۷/۱۰۱۸/۱۰۱۹/۱۰۲۰/۱۰۲۱/۱۰۲۲/۱۰۲۳/۱۰۲۴/۱۰۲۵/۱۰۲۶/۱۰۲۷/۱۰۲۸/۱۰۲۹/۱۰۳۰/۱۰۳۱/۱۰۳۲/۱۰۳۳/۱۰۳۴/۱۰۳۵/۱۰۳۶/۱۰۳۷/۱۰۳۸/۱۰۳۹/۱۰۴۰/۱۰۴۱/۱۰۴۲/۱۰۴۳/۱۰۴۴/۱۰۴۵/۱۰۴۶/۱۰۴۷/۱۰۴۸/۱۰۴۹/۱۰۵۰/۱۰۵۱/۱۰۵۲/۱۰۵۳/۱۰۵۴/۱۰۵۵/۱۰۵۶/۱۰۵۷/۱۰۵۸/۱۰۵۹/۱۰۶۰/۱۰۶۱/۱۰۶۲/۱۰۶۳/۱۰۶۴/۱۰۶۵/۱۰۶۶/۱۰۶۷/۱۰۶۸/۱۰۶۹/۱۰۷۰/۱۰۷۱/۱۰۷۲/۱۰۷۳/۱۰۷۴/۱۰۷۵/۱۰۷۶/۱۰۷۷/۱۰۷۸/۱۰۷۹/۱۰۸۰/۱۰۸۱/۱۰۸۲/۱۰۸۳/۱۰۸۴/۱۰۸۵/۱۰۸۶/۱۰۸۷/۱۰۸۸/۱۰۸۹/۱۰۹۰/۱۰۹۱/۱۰۹۲/۱۰۹۳/۱۰۹۴/۱۰۹۵/۱۰۹۶/۱۰۹۷/۱۰۹۸/۱۰۹۹/۱۱۰۰/۱۱۰۱/۱۱۰۲/۱۱۰۳/۱۱۰۴/۱۱۰۵/۱۱۰۶/۱۱۰۷/۱۱۰۸/۱۱۰۹/۱۱۱۰/۱۱۱۱/۱۱۱۲/۱۱۱۳/۱۱۱۴/۱۱۱۵/۱۱۱۶/۱۱۱۷/۱۱۱۸/۱۱۱۹/۱۱۲۰/۱۱۲۱/۱۱۲۲/۱۱۲۳/۱۱۲۴/۱۱۲۵/۱۱۲۶/۱۱۲۷/۱۱۲۸/۱۱۲۹/۱۱۳۰/۱۱۳۱/۱۱۳۲/۱۱۳۳/۱۱۳۴/۱۱۳۵/۱۱۳۶/۱۱۳۷/۱۱۳۸/۱۱۳۹/۱۱۴۰/۱۱۴۱/۱۱۴۲/۱۱۴۳/۱۱۴۴/۱۱۴۵/۱۱۴۶/۱۱۴۷/۱۱۴۸/۱۱۴۹/۱۱۵۰/۱۱۵۱/۱۱۵۲/۱۱۵۳/۱۱۵۴/۱۱۵۵/۱۱۵۶/۱۱۵۷/۱۱۵۸/۱۱۵۹/۱۱۶۰/۱۱۶۱/۱۱۶۲/۱۱۶۳/۱۱۶۴/۱۱۶۵/۱۱۶۶/۱۱۶۷/۱۱۶۸/۱۱۶۹/۱۱۷۰/۱۱۷۱/۱۱۷۲/۱۱۷۳/۱۱۷۴/۱۱۷۵/۱۱۷۶/۱۱۷۷/۱۱۷۸/۱۱۷۹/۱۱۸۰/۱۱۸۱/۱۱۸۲/۱۱۸۳/۱۱۸۴/۱۱۸۵/۱۱۸۶/۱۱۸۷/۱۱۸۸/۱۱۸۹/۱۱۹۰/۱۱۹۱/۱۱۹۲/۱۱۹۳/۱۱۹۴/۱۱۹۵/۱۱۹۶/۱۱۹۷/۱۱۹۸/۱۱۹۹/۱۲۰۰/۱۲۰۱/۱۲۰۲/۱۲۰۳/۱۲۰۴/۱۲۰۵/۱۲۰۶/۱۲۰۷/۱۲۰۸/۱۲۰۹/۱۲۱۰/۱۲۱۱/۱۲۱۲/۱۲۱۳/۱۲۱۴/۱۲۱۵/۱۲۱۶/۱۲۱۷/۱۲۱۸/۱۲۱۹/۱۲۲۰/۱۲۲۱/۱۲۲۲/۱۲۲۳/۱۲۲۴/۱۲۲۵/۱۲۲۶/۱۲۲۷/۱۲۲۸/۱۲۲۹/۱۲۳۰/۱۲۳۱/۱۲۳۲/۱۲۳۳/۱۲۳۴/۱۲۳۵/۱۲۳۶/۱۲۳۷/۱۲۳۸/۱۲۳۹/۱۲۴۰/۱۲۴۱/۱۲۴۲/۱۲۴۳/۱۲۴۴/۱۲۴۵/۱۲۴۶/۱۲۴۷/۱۲۴۸/۱۲۴۹/۱۲۵۰/۱۲۵۱/۱۲۵۲/۱۲۵۳/۱۲۵۴/۱۲۵۵/۱۲۵۶/۱۲۵۷/۱۲۵۸/۱۲۵۹/۱۲۶۰/۱۲۶۱/۱۲۶۲/۱۲۶۳/۱۲۶۴/۱۲۶۵/۱۲۶۶/۱۲۶۷/۱۲۶۸/۱۲۶۹/۱۲۷۰/۱۲۷۱/۱۲۷۲/۱۲۷۳/۱۲۷۴/۱۲۷۵/۱۲۷۶/۱۲۷۷/۱۲۷۸/۱۲۷۹/۱۲۸۰/۱۲۸۱/۱۲۸۲/۱۲۸۳/۱۲۸۴/۱۲۸۵/۱۲۸۶/۱۲۸۷/۱۲۸۸/۱۲۸۹/۱۲۹۰/۱۲۹۱/۱۲۹۲/۱۲۹۳/۱۲۹۴/۱۲۹۵/۱۲۹۶/۱۲۹۷/۱۲۹۸/۱۲۹۹/۱۳۰۰/۱۳۰۱/۱۳۰۲/۱۳۰۳/۱۳۰۴/۱۳۰۵/۱۳۰۶/۱۳۰۷/۱۳۰۸/۱۳۰۹/۱۳۱۰/۱۳۱۱/۱۳۱۲/۱۳۱۳/۱۳۱۴/۱۳۱۵/۱۳۱۶/۱۳۱۷/۱۳۱۸/۱۳۱۹/۱۳۲۰/۱۳۲۱/۱۳۲۲/۱۳۲۳/۱۳۲۴/۱۳۲۵/۱۳۲۶/۱۳۲۷/۱۳۲۸/۱۳۲۹/۱۳۳۰/۱۳۳۱/۱۳۳۲/۱۳۳۳/۱۳۳۴/۱۳۳۵/۱۳۳۶/۱۳۳۷/۱۳۳۸/۱۳۳۹/۱۳۴۰/۱۳۴۱/۱۳۴۲/۱۳۴۳/۱۳۴۴/۱۳۴۵/۱۳۴۶/۱۳۴۷/۱۳۴۸/۱۳۴۹/۱۳۵۰/۱۳۵۱/۱۳۵۲/۱۳۵۳/۱۳۵۴/۱۳۵۵/۱۳۵۶/۱۳۵۷/۱۳۵۸/۱۳۵۹/۱۳۶۰/۱۳۶۱/۱۳۶۲/۱۳۶۳/۱۳۶۴/۱۳۶۵/۱۳۶۶/۱۳۶۷/۱۳۶۸/۱۳۶۹/۱۳۷۰/۱۳۷۱/۱۳۷۲/۱۳۷۳/۱۳۷۴/۱۳۷۵/۱۳۷۶/۱۳۷۷/۱۳۷۸/۱۳۷۹/۱۳۸۰/۱۳۸۱/۱۳۸۲/۱۳۸۳/۱۳۸۴/۱۳۸۵/۱۳۸۶/۱۳۸۷/۱۳۸۸/۱۳۸۹/۱۳۹۰/۱۳۹۱/۱۳۹۲/۱۳۹۳/۱۳۹۴/۱۳۹۵/۱۳۹۶/۱۳۹۷/۱۳۹۸/۱۳۹۹/۱۴۰۰/۱۴۰۱/۱۴۰۲/۱۴۰۳/۱۴۰۴/۱۴۰۵/۱۴۰۶/۱۴۰۷/۱۴۰۸/۱۴۰۹/۱۴۱۰/۱۴۱۱/۱۴۱۲/۱۴۱۳/۱۴۱۴/۱۴۱۵/۱۴۱۶/۱۴۱۷/۱۴۱۸/۱۴۱۹/۱۴۲۰/۱۴۲۱/۱۴۲۲/۱۴۲۳/۱۴۲۴/۱۴۲۵/۱۴۲۶/۱۴۲۷/۱۴۲۸/۱۴۲۹/۱۴۳۰/۱۴۳۱/۱۴۳۲/۱۴۳۳/۱۴۳۴/۱۴۳۵/۱۴۳۶/۱۴۳۷/۱۴۳۸/۱۴۳۹/۱۴۴۰/۱۴۴۱/۱۴۴۲/۱۴۴۳/۱۴۴۴/۱۴۴۵/۱۴۴۶/۱۴۴۷/۱۴۴۸/۱۴۴۹/۱۴۵۰/۱۴۵۱/۱۴۵۲/۱۴۵۳/۱۴۵۴/۱۴۵۵/۱۴۵۶/۱۴۵۷/۱۴۵۸/۱۴۵۹/۱۴۶۰/۱۴۶۱/۱۴۶۲/۱۴۶۳/۱۴۶۴/۱۴۶۵/۱۴۶۶/۱۴۶۷/۱۴۶۸/۱۴۶۹/۱۴۷۰/۱۴۷۱/۱۴۷۲/۱۴۷۳/۱۴۷۴/۱۴۷۵/۱۴۷۶/۱۴۷۷/۱۴۷۸/۱۴۷۹/۱۴۸۰/۱۴۸۱/۱۴۸۲/۱۴۸۳/۱۴۸۴/۱۴۸۵/۱۴۸۶/۱۴۸۷/۱۴۸۸/۱۴۸۹/۱۴۹۰/۱۴۹۱/۱۴۹۲/۱۴۹۳/۱۴۹۴/۱۴۹۵/۱۴۹۶/۱۴۹۷/۱۴۹۸/۱۴۹۹/۱۵۰۰/۱۵۰۱/۱۵۰۲/۱۵۰۳/۱۵۰۴/۱۵۰۵/۱۵۰۶/۱۵۰۷/۱۵۰۸/۱۵۰۹/۱۵۱۰/۱۵۱۱/۱۵۱۲/۱۵۱۳/۱۵۱۴/۱۵۱۵/۱۵۱۶/۱۵۱۷/۱۵۱۸/۱۵۱۹/۱۵۲۰/۱۵۲۱/۱۵۲۲/۱۵۲۳/۱۵۲۴/۱۵۲۵/۱۵۲۶/۱۵۲۷/۱۵۲۸/۱۵۲۹/۱۵۳۰/۱۵۳۱/۱۵۳۲/۱۵۳۳/۱۵۳۴/۱۵۳۵/۱۵۳۶/۱۵۳۷/۱۵۳۸/۱۵۳۹/۱۵۴۰/۱۵۴۱/۱۵۴۲/۱۵۴۳/۱۵۴۴/۱۵۴۵/۱۵۴۶/۱۵۴۷/۱۵۴۸/۱۵۴۹/۱۵۵۰/۱۵۵۱/۱۵۵۲/۱۵۵۳/۱۵۵۴/۱۵۵۵/۱۵۵۶/۱۵۵۷/۱۵۵۸/۱۵۵۹/۱۵۶۰/۱۵۶۱/۱۵۶۲/۱۵۶۳/۱۵۶۴/۱۵۶۵/۱۵۶۶/۱۵۶۷/۱۵۶۸/۱۵۶۹/۱۵۷۰/۱۵۷۱/۱۵۷۲/۱۵۷۳/۱۵۷۴/۱۵۷۵/۱۵۷۶/۱۵۷۷/۱۵۷۸/۱۵۷۹/۱۵۸۰/۱۵۸۱/۱۵۸۲/۱۵۸۳/۱۵۸۴/۱۵۸۵/۱۵۸۶/۱۵۸۷/۱۵۸۸/۱۵۸۹/۱۵۹۰/۱۵۹۱/۱۵۹۲/۱۵۹۳/۱۵۹۴/۱۵۹

شاعر کے آسمی غازی پوری سے جانتی ہے۔ آپ ۱۹ شعبان ۱۲۵۱ھ سکندر پور میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام ظیل اشرف رکھا گیا۔ بچپن ہی میں آپ کی والدہ کا انتقال ہو گیا۔ آپ کے ماما مفتی احسان علی قاضی پوری، شاہ آباؤ نے آپ کی پرورش کی اور ابتدائی تعلیم سے بذات خود آراستہ کیا، پھر آپ اپنے والد کے پیر خانہ خانقاہ رشیدیہ میں حاضر ہوئے اور صاحب سجادہ شاہ غلام معین الدین سے بقیہ تعلیم حاصل کی۔ مولانا عبدالعلیم فرنگی محلی آپ کے اساتذہ میں آتے ہیں۔ آپ کے اساتذہ کو بھی آپ کی ذکاوت پر آزار و شاگردی پر فخر تھا۔

حضرت آسمی غازی پوری سلسلہ قادریہ احمدیہ میں شاہ غلام معین الدین سے مرید ہوئے اور ایک مدت تک آپ ہی کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے۔ سفر میں بھی آپ ساتھ رہتے۔ بالآخر مختلف اشغال و ذکار کی تعلیم کے ساتھ تمام سلاسل کی اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔

آپ اپنے وقت کے طیب حاذق بھی تھے حالانکہ فن طبابت میں کوئی استاد نہ رکھتے تھے۔ سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں کہ شاہ سراج الدین کی چاشنی سات ہی برس میں ختم ہو گئی اور ضرورت نے یہ سہرا آپ کے سر باندھا۔ سجادہ نشینی کے بعد جون پور میں مستقل قیام فرمایا۔ خانقاہ کے مشاغل اور اہل طلب کی کثرت کی وجہ سے رفتہ رفتہ طبابت چھوٹ گئی۔

(سمات الاخیار ص: ۲۵۴/۲۵۵)

دوسری جگہ تحریر کرتے ہیں کہ جب تک سجادہ نشینی کی خدمت آپ کے متعلق نہیں ہوتی تھی تب تک باوجود تکمیل مراتب ظاہری و باطنی و تحصیل اجازت و خلافت بھی کسی کو مرید نہیں کیا اور اپنے آپ کو طبابت کے بھیس میں ایسا چھپا رکھا کہ بجز اہل نظر کوئی پہچان نہ سکا اور آپ کی درویشی کی طرف کسی کا وہم و گمان بھی نہ جاسکا۔ (سمات الاخیار ص: ۲۵۳)

آپ کی طبیعت میں قدرت اور ضبط کا اتنا مادہ تھا کہ مجال نہ تھی کہ کسی حالت میں کوئی راز کھل جائے۔ اوپر عمر میں پختیت غالب آگئی تھی۔ بلا مزامیر کے سماع سنتے تھے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ قاضی عبدالعصیر معصوم پوری اور حافظ فرید الدین احمد غازی پوری آپ کی غزلیں شب کو سوتے وقت خوش الحانی کے ساتھ پڑھا کرتے تھے۔ ہاں منہ و ذہن کے عرس میں گا گرتے تھے وقت جو باقاعدہ ہوتی ہوئی ہے اس میں آپ شریک ہوتے تھے۔ وجد کی حالت میں صرف آنگھیں سرخ ہو جاتی تھیں اور بس۔ آپ کی شادی ہوئی اولاد بھی ہوئے مگر نبی سلسلہ قائم نہ رہا۔

(سمات الاخیار ص: ۲۵۶/۲۵۷)

آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی چاشنی کے سلسلے میں غور و فکر کیا اور سلسلے کے اصحاب حل و عقد سے مشورہ اور روحانی اشارات کے بعد شاہ سید شاہ علی سہز پوش کو اپنا جانشین بنا دیا۔ اس

واقعے کو سمات الاخیار کے مصنف نے تحریر کیا ہے کہ چاشنی کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ تھا جو اکثر مریدین یا احباب سمجھ بھی سکتے تھے کہ آپ نے کس کو تجویز فرمایا ہے، اس لیے کہ آپ کے بعد اول تو انتخاب میں وقت پڑے گی دوسرے انتخاب صحیح ناممکن بھی ہے۔ اس وقت آپ یہی فرماتے تھے کہ میں نے شاہ سراج الدین اور مفتی غلام قادر و دیگر کو منتخب کیا تھا لیکن خدا کی مشیت اور تھی اب میں اپنی رائے سے کچھ نہ کروں گا۔ اگرچہ آپ اسی جواب سے دوسروں کو ساکت و صامت فرما دیتے تھے مگر حقیقت یہ ہے کہ خود بھی اس سوال کی اہمیت خوب سمجھتے تھے۔ جب وقت آیا تو آپ نے حضرت قطب الاقطاب ابوالبرکات شمس الحق شيخ محمد رشید مصطفیٰ قدس سرہ کے خلیفہ اجل و اکمل حضرت میر سید قیام الدین گورکھ پوری رحمۃ اللہ علیہ کی نسل سے جناب سید شاہ علی صاحب کا انتخاب فرمایا اور اپنی صحبت کی سبب خاص میں رکھنے لگے۔

۱۳۲۹ھ میں آپ کا لقب شہود الحق اور نام رشید الدین ارشاد ہوا اور یہ بھی فرمایا کہ یہ نام و لقب بیروں نے میرے دل میں ڈالا ہے۔ اس کے بعد آپ نے خلافت نامہ بھی زیب رقم فرمایا۔ (سمات الاخیار ص: ۲۷۷/۲۷۸)

حضرت آسمی غازی پوری کا آخری دور استغراقی دور تھا۔ تقریباً پندرہ سولہ سالوں تک حالت استغراق میں رہے اور ۱۳۳۵ھ میں وصال ہو گیا۔ سمات الاخیار کے مصنف تحریر کرتے ہیں وصال کے قریب زمانے میں آپ کی ہیبت بہت بڑھ گئی تھی۔ خلوت و خلوت میں ساتھ رہنے والے اور ہر وقت بات کرنے والے مقربین کو بھی لب کھولنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ مریدان خوش اعتقاد و رواۃ نے بعد نماز مغرب حاضر ہوتے مگر سلام کرنے یا قدم بوس ہونے کی جرأت نہ ہوتی۔ آہستہ پانگ کی پٹی چوم کر تخت پر بیٹھ جاتے۔ کبھی آپ آہستہ پا کر اگر پوچھ لیتے کہ کون؟ تو بتا کر سلام عرض کرتے اور اگر اس سے قریب وہ متوجہ پاتے تو جرأت کر کے قدم بوس بھی ہو لیتے، ورنہ پٹی چوم کر واپس آ جاتے۔ وصال کے وقت تک بجز افراط استغراق و غلبہ بخوبی کوئی مرض نہ تھا۔

(سمات الاخیار ص: ۲۷۹)

وقت وصال جانب قبلہ اس شوق سے ملاحظہ فرما رہے تھے کہ دیکھنے والے بھی اس کا تہوار اچھی طرح کر سکے کہ ایک عاشق اپنے معشوق کو اشتیاق آمیز لگا ہوں سے دیکھ رہا ہے۔ آخر وہ قیامت خیز تاریخ ماہ جمادی الاولیٰ ۱۳۳۵ھ کی دوسری پہلی گئی اور وہ محشر انگیز روز اتوار آئی گی کیا جس میں اپنے وابستگان دامن ارادت کی چشم ظاہر سے آپ نے ہمیشہ کے لیے پردہ فرمایا۔ یعنی وہ معتزق و رہائے شوہ غوام محیط وحدۃ الوجود، فانی فی اللہ، باقی باللہ، قلب المشائخ و العالین، شیخ الاسلام و المسلمین حضرت مولانا شاہ محمد عبدالعلیم رشیدی قدس سرہ پچاسی برس کی عمر میں اول وقت

ظہر ایک بج کر بیس منٹ پر داخل بحق ہوئے۔

آج اسی نے کر لیا پروہ

ہم غریبوں سے وہ کریم چھپا

آپ کے وصال کے بعد آپ کے جانشین حضرت سید شاہ شاہد علی سبز پوش نے جن رسومات کی ادائیگی کی اس کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں جناب سید صاحب نے جون پوری خانقاہ میں حسب معمول خاندان رشیدی سوم، دسواں، بیسواں، چالیسواں وغیرہ کیا جس طرح حضرت نے اپنے پیر و مرشد کا سوم وغیرہ بمقام برہ سے آکر خانقاہ جون پور میں فرمایا تھا۔ ہر سال حسب آداب خاندان رشیدی غازی پور میں عرس کرتے ہیں اور مہمانوں کی میزبانی و راحت رسانی کو سعادت و آفرین سمجھتے ہیں۔ قابل ذکر امر یہ ہے کہ جواہل غازی پوری خدمت میں روزانہ بلا غہ حاضر ہوا کرتے تھے، وہ اب بھی بلا غہ بعد نماز مغرب فاتحہ کے لیے حاضری کو لازمی سمجھتے ہیں۔ ہر جمعرات کی شام کو مزار مبارک پر قل ہوا کرتا ہے۔ (سمات الاخیار ص: ۲۸۳)

سلسلہ رشیدیہ کے تقریباً تمام مشائخ کا یہ معمول رہا ہے کہ وہ طالبین و سائلین کی تعلیم و تربیت کرتے اور اسی کے پردے میں مقامات تک پہنچانے کی کوشش کرتے یعنی علم و عمل کے پردے ہی میں سارا کام ہو جاتا۔ اسرار و معارف کی باتیں بہت کم ظاہر ہو پاتیں۔ اس سلسلے کے مشائخ اور ان کے اخلاق کا حلقہ بہت بڑا تھا حضرت اسی غازی پوری کے خلفائے نیا و تراپیے اصحاب تھے جن کو ارادت بھی آپ ہی سے تھی مگر بعض وہ تھے جن کو صرف خلافت و اجازت آپ سے تھی۔ وہ علما و مشائخ جن کو ارادت و خلافت دونوں آپ سے تھی۔ ان میں سے سمات الاخیار کے مصنف نے ۹ رکا ذکر کیا ہے جس میں شاہ شاہد علی سبز پوش گورکھ پوری جو آپ کے جانشین بھی ہوئے ان کے علاوہ سید شاہ عبدالعزیز بہاری، سید شاہ ہندیر احمد بہاری، شاہ عبدالحق ظفر آبادی بھی شامل ہیں۔

جن مشائخ کو صرف خلافت میسر آئی، ان میں مولوی عبدالسبحان غازی پوری بھی ہیں۔ بیعت و تعلیم آپ کو مولانا عبدالقادر شاہ غازی پوری سے حاصل تھی۔ ۲۴ جمادی الاولیٰ ۱۳۲۳ھ بنگال میں وصال ہوا، غازی پور میں مدفون ہوئے۔ دوسرے مفتی محمد وحید قادری جو اسی صاحب کے ماموں زاد بھائی اور قاضی عنایت حسین چریا کوئی کے مرید تھے۔ تیسرے شاہ محمد فصیح شیخ پوری، آپ خواجہ محمد عیسیٰ تاج کے چھوٹے بھائی تھے۔ آپ اپنے والد شاہ عنایت حسین بلادی کے مرید تھے اور بعد میں حضرت اسی سے اجازت و خلافت میسر آئی۔ چوتھے شیخ محمد امیر معصوم پوری، آپ بلیا کے رئیس اور شاہ علی حبیب سبحان و شین خانقاہ مجیدیہ پھلوا روہی کے مرید اور فیض یافتہ تھے۔ چوں کہ آپ کے بزرگوں کو

مشائخ خانقاہ رشیدیہ سے براہر بیعت رہی، اس نسبت کو پاتی رہنے کے لیے آخر عمر میں آپ حضرت اسی سے طالب ہوئے اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔ ان کے علاوہ شاہ محمد ادریس پھلوا روہی، شاہ ذاکر حسین چوکی قتال پوری، مولوی عبدالرحیم سیوانی، مولوی محبت اللہ غازی پوری، شاہ الفت حسین غازی پوری اور مولانا سید محمد فاخر بے خود و قلمی الہ آبادی کو بھی حضرت اسی غازی پوری سے اجازت و خلافت حاصل تھی۔

اسی غازی پوری کی علمی خدمات

یوں تو سلسلہ رشیدیہ کے تمام مشائخ و علمائے علمی اور دینی خدمات میں اپنی حصہ داری پیش کی مگر بعض وہ مشائخ و علمی اور دینی خدمات کے اعتبار سے ممتاز حیثیت کے مالک ہیں، ان میں ایک نام حضرت اسی غازی پوری کا بھی آتا ہے۔ آپ نے خانقاہ رشیدیہ اور اس کے تحت چلنے والی خانقاہوں کی تعمیر و ترقی، رفقاء عام، خدمت خلق، درس و تدریس، تصنیف و تالیف، ارشاد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ سارے میدانوں میں اپنے وجود کا احساس دلایا۔ ایک طرف علمی اور روحانی اعتبار سے جہاں اچھے اور مفید افراد تیار کیے، وہیں دوسری طرف تصنیف و تالیف اور صوفیانہ و عارفانہ شعر کوئی اور غزل کوئی میں آپ نے ایک مثال قائم کی۔ آپ کی تصنیفات میں سراج العارف، نواید صدیقہ اور قواعد جویریہ کا ذکر ملتا ہے۔ شعر کوئی کے ذریعے ماخ جیسے شعرانے زبان کی صفائی و شگلی میں جو سنی بلوغ تھی اسے حضرت اسی نے آگے بڑھایا اور مزید نئی راہیں ہموار کیں بلکہ حضرت اسی نے اس فن میں جو کمال حاصل کیا اور جیسے تلامذہ پیدا کیے ان کی بنیاد پر آپ کو ماخ وقت کہنا بے جا نہ ہوگا۔ حضرت اسی کا کلام عیار کے پردے میں حقیقت کا جلوہ دکھاتا ہے، خود فرماتے ہیں:

اگر بیان حقیقت نہ ہو مجاز کے ساتھ

وہ شعر لغو ہے اسی کلام ناکارا

آپ کے خلیفہ و جانشین سید شاہ شاہد علی نے آپ کے وصال کے بعد عین المعارف کے نام سے آپ کے کلام کا مجموعہ تیار کیا اور عارف ہسوی نے آپ کے کلام کا تنقیدی جائزہ لیا۔ وہ لکھتے ہیں: "حضرت اسی کے کلام میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو مذاق سلیم کسی غزل میں تلاش کرنا ہے۔ انداز زبان کی متانت و چنگلی، مضامین کا علو، خیالات کی بلندی، جذبات کی پاکیزگی و لطافت، ان کے کلام کے مخصوص عناصر ہیں اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو ان کے کلام کو نیرنگی و اعتبار کے بلند درجے پر پہنچا دیتی ہیں۔ ایک خاص خوبی حضرت اسی کے کلام کی یہ ہے کہ ان کی غزلوں میں بھرتی کے شعر بالکل نہیں ہوتے۔ سو قیوت و عامیانہ مذاق سے کلام پاک ہے۔ نیز جرأت و ادب کی طرح ہوس ناکی، سفاہت بھی ان کے یہاں نہیں پائی جاتی۔ اسی ایک صاحب حال، صاحب دل،

صاحب نسبت بزرگ تھے، اس لیے فطرتاً ان کا کلام تصوف کی چاشنی سے معمور ہے۔ وہ کبھی تو ایسے اشارات صوفیانہ کر جاتے ہیں جس سے کلام کی رنگینی و رعنائی حد درجہ دل پذیر کی شان اختیار کر لیتی ہے اور کبھی کسی خاص مسئلہ تصوف پر شاعرانہ رنگ میں روشنی ڈال جاتے ہیں اور کبھی مجاز کے پردہ میں رموز حقائق کی طلسم کشائی کر جاتے ہیں چوں کہ تصوف میں بھی حضرت آسی کا مذاق وحدۃ الوجود کا ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس مسئلہ پر وہ مختلف والہانہ اور مستانہ انداز سے اپنے وادعات قلب کو قالب شعر میں ڈھال کر پیش کر جاتے ہیں جن کو سنتے ہی سامع پر ایک بے خودی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مذاق سلیم پیروں سر وضتا ہے۔“ (سمات الاخیار، ص: ۲۷۰)

حضرت آسی کی غزل اور آپ کی رباعیوں کے حوالے سے فراق گورکھ پوری کہتے ہیں: ”آسی غازی پوری کے کلام کے بھی ہم دونوں عاشق تھے جسے لذت لے لے کر ایک دوسرے کو سناتے تھے اور جس پر دونوں مل کر تبصرے کیا کرتے تھے۔ کئی برس بعد ایسا ہوا کہ میں کان پورستان دھرم کالج میں پروفیسر ہو گیا اور مجھ کو جواب دی اے پاس کر چکے تھے گورکھ پوری میں تھے۔ ہم دونوں کے شعور اور وجدان کے باہمی رابطہ کا یہ کرشمہ تھا کہ بغیر ایک دوسرے کی خبر رکھے ہوئے ہم دونوں نے پچاس باب عیال کہہ ڈالیں اور دونوں نے ایک دوسرے کو خط لکھا کہ آسی کی رباعیوں سے متاثر ہو کر یہ رباعیاں کہی گئی ہیں، ہم دونوں اب تک اس حسن اتفاق پر حیرت کرتے ہیں۔“ (مین المعارف، ص: ۳۳-۳۴)

مولانا ابوالحسن ندوی لکھتے ہیں: ”ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر سید محمود مرحوم سابق وزیر خاجہ حکومت ہند) کو جون پوری خانقاہ رشیدیہ سے بھی بڑا گہرا روحانی تعلق تھا۔ یہ تو یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ اس سلسلے میں بیعت بھی تھے لیکن ان کو اسی سلسلے کے مشہور شیخ مولانا عبدالعلیم آسی غازی پوری سے ایسی عقیدت و وابستگی تھی کہ اس سے قیاس ہوتا ہے کہ وہ اپنی نوجوانی میں ان سے بیعت ہو گئے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ ان کا کلام بڑے شغف اور جوش عقیدت کے ساتھ پڑھتے تھے اور اکثر ان کا تذکرہ فرماتے تھے۔“ (مین المعارف، ص: ۳۴)

ایسے ہی مولانا محمد علی جوہر تحریر کرتے ہیں:

”میں سفر (بہ سلسلہ مقدمہ کراچی) میں رات کے طول طویل گھنٹے درود و سلام کی تسبیحیں پڑھتے پڑھتے گڑا رویے اور آسی غازی پوری کا یہ شعر سارے سفر میں برابر و زبان رہا:

وہاں پہنچ کے یہ کہنا صبا سلام کے بعد

تمہارے نام کی رٹ ہے خدا کے نام کے بعد“

(مین المعارف، ص: ۳۴)

مجھوں گورکھ پوری تحریر کرتے ہیں:

”مشرق کے صوفی شاعروں میں صرف دو ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جنہوں نے مجازی حقیقت اور قدسیات کو کما حقہ تسلیم کیا ہے اور جن کے مسلک کو ”مجازیت“ کہا جاسکتا ہے۔ ایک تو حافظ دوسرے آسی“ (مین المعارف، ص: ۲۷۰)

ان حضرات کی ان تحریروں سے حضرت آسی کے کلام کی اثر انگیزی اور غزل کی شہرت کا علم ہوتا ہے۔

(۱۱) شاہ شاہد علی سبزویش (پ: ۱۳۰۷ھ/۱۸۸۸ء-م: ۱۳۷۷ھ/۱۹۵۳ء)

آپ کا نام شاہد علی اور لقب رشید الدین و شوہر الحق اور تخلص فانی تھا۔ آپ حضرت آسی غازی پوری کے مرید و خلیفہ اور سلسلہ رشیدیہ کے آٹھویں سجادہ جانشین تھے۔ آپ کے والد کا انتقال آپ کی پیدائش سے ۳۷۳ دن قبل ہو گیا۔ آپ کا نسبی سلسلہ ۲۹ واسطوں سے حضرت علی امیر المومنین رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔

آپ اپنے وقت کے اچھے شاعر اور متبحر عالم شریعت اور عارف باللہ تھے۔ (۴) مخلوق خدا کے ساتھ وقت کے بڑے نام ور شعرا سے بھی آپ کے اچھے تعلقات تھے۔ چند نام ور شعرا جو آپ سے اپنے تعلقات پر فخر کرتے تھے ان میں حفیظ جون پوری، جگر مراد آبادی، وحل بگرامی وغیرہم ہیں۔

(دیوان فانی، ص: ۲۷۰ ملخصاً)

اور ان جیسے دیگر علما و شعرا مثلاً علمائے فرنگی محل، اصغر گوڑوی، ہادی پھلی شہری، حسرت موہانی، سیما ب اکبر آبادی سے بھی آپ کے خاص روابط تھے۔ (سمات الاخیار، ص: ۳۰ تا ۳۴ ملخصاً) آپ نے دیوان فانی کے نام سے ایک شعری دیوان چھوڑا ہے جو عارفانہ اور صوفیانہ شاعری کا مجموعہ ہے۔ دعوت و تبلیغ کو جاری رکھتے ہوئے روحانی نعمتوں کو عام کرنے اور رقی دنیا کے لیے رشد و ہدایت کا سلسلہ باقی رکھنے کی غرض سے آپ نے کچھ افراد کی تعلیم و تربیت کر کے ان کو اجازت و خلافت سے بھی سرفراز فرمایا۔ ان میں سے چند جن کا نام کتابوں میں ملتا ہے وہ یہ ہیں: سید مصطفیٰ علی سبزویش، سید شاہ ایوب ابدالی سجادہ نشین خانقاہ اسلام پور پٹنہ، سید عبدالشکور سادات پوری، مولوی محمد نسیم چغتائی بزار پور، مولوی ذاکر حسین چوکی قتال پور، سیوان، بہار، بحیم لطیف الرحمن چغتائی بزار، پورنیہ بہار۔

(سمات الاخیار، ص: ۳۰۸)

(۱۲) سید شاہ مصطفیٰ علی سبزویش (وصال: ۱۸/وی القعدہ ۱۳۸۵ھ/۱۷ جولائی ۱۹۵۸ء)

آپ سید شاہد علی سبزویش کے لڑکے و جانشین اور خانقاہ رشیدیہ کے ۹ ویں سجادہ اور

موجودہ سجادہ نشین مفتی عبید الرحمن رشیدی مدظلہ العالی کے شیخ ارادت تھے۔ مدرسہ صوفیانہ مکہ معظمہ کے سند یافتہ عالم اور صاحب تصوف صوفی تھے۔ بہار کے ضلع چپران میں جہاں وہابیوں کا زور تھا آپ نے زیر دست دعوت و تبلیغ کی جس کی وجہ سے ہزاروں مسلمانوں نے توبہ کی اور جماعت اہل سنت میں شمولیت اختیار کی۔ (سمات الاخبار ص: ۳۰۹)

۱۸ ذی القعدہ ۱۳۷۸ھ / ۱۱ جولائی ۱۹۵۸ء کو گورکھ پور میں شہادت کی موت پائی اور واصل بحق ہوئے۔ جون پور، رشید آباد میں مدفون ہوئے۔ آپ کے بعد خانقاہ کا انتظام والفرام کچھ دنوں تک سید ہاشم علی کے سپرد کیا گیا پھر رشید آباد کا کام سید شاہد علی کے خلیفہ سید شاہ ایوب ابدالی جو شاہ مصطفیٰ علی شہید کے مرشد کامل ہوتے ہیں، ان کے حوالے کیا گیا۔

(سمات الاخبار ص: ۳۰۹ تا ۳۱۱ ملخصاً)

سلسلہ رشیدیہ کی موجودہ علمی و دعوتی سرگرمیاں

بانی سلسلہ رشیدیہ شیخ محمد رشید جن کی عارفانہ حیثیت کو ان کے ہم عصر مشائخ و صوفیہ نے تسلیم کیا اور جن کے بحر علمی کی شہرت اور ان جیسے دیگر علما و روحانوں نے تصدیق فرمائی کی ہے، اس سلسلہ کے مشائخ کی علمی اور روحانی حیثیتوں کو ملک العلماء فقیر الدین بہاری جیسی عجمی شخصیات نے بھی تسلیم کیا اور ان کے ادبی اور شعری شاہ پاروں کو دیکھ کر غالباً اور اس طرح جیسے فن کار شعرو سخن نے رشک کیا ہے۔ اس عظیم خانقاہ کی علمی اور روحانی حیثیت آج بھی باقی ہے۔ اس وقت ایک صاحب سجادہ کی نگرانی میں اس سلسلہ کی پانچ خانقاہیں مختلف مقامات پر چل رہی ہیں۔ سب کے سب دعوت و تبلیغ اور خدمت خلق میں مصروف ہیں اور اپنے مشائخ کے نقش قدم پر عمل کرتے ہوئے اشاعت علم و معرفت کا سلسلہ جاری رکھی ہوئی ہیں۔ یہاں کے موجودہ صاحب سجادہ حضرت مفتی عبید الرحمن رشیدی کی لائق تعریف اور حکیمانہ قیادت میں مختلف مقامات پر اس سلسلہ کے تہذیبی و علمی ادارے چل رہے ہیں جہاں نیکوؤں کی تعداد میں طالبان علوم نبویہ اپنی علمی ترقی بکھار رہے ہیں۔ ان اداروں کے اسماء ہیں: (۱) دارالعلوم مصطفیانہ، چنئی بازار، پورنیہ، بہار (۲) دارالعلوم سرکار آسی، سکندر پور، بلیا (۳) دارالعلوم طیبیہ، معینہ، بنارس (۴) دارالعلوم رشیدیہ، جون پور (۵) دارالعلوم حیدریہ، معینہ، سیوان (۶) دارالعلوم عظیمیہ شاہدینہ، غازی پور

مشائخ سلسلہ رشیدیہ کا اعتقادی، فقہی اور صوفی مسلک

خانقاہ رشیدیہ ہندوستان کی قدیم روحانی اور علمی خانقاہ ہے۔ یہاں کے مشائخ نے اپنی علمی اور دعوتی دونوں حیثیتوں کو ثابت کیا اور ان دونوں میدانوں میں بے لوث خدمات انجام

دیں۔ اس سلسلہ کے مشائخ نے اعتقادی، فقہی اور سوانحی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ خود بانی خانقاہ رشیدیہ شیخ محمد رشید قدس سرہ نے فن مناظرہ کی مشہور کتاب شریعہ کی رشیدیہ کے نام سے جو شرح کی ہے وہ ان کے وینی افکار اور خیالات کو ثابت کرتی ہے۔ یوں ہی اس سلسلہ کے مشائخ کی تصنیفات و تالیفات اور ملفوظات مثلاً: شیخ رشیدی، شیخ رشیدی، شیخ فیاضی، کرامات فیاضی، مناقب العارفین، سمات الاخبار، معین المعارف، دیوان فانی وغیرہ کے مطالعے سے واضح طور پر جن افکار و نظریات اور خیالات کا علم ہوتا ہے اس کو ذیل میں قلم بند کیا جاتا ہے:

اعتقادی مسلک

ہندوستان کی دیگر خانقاہوں اور خانوادوں کے علما و مشائخ کی طرح سلسلہ رشیدیہ کے علما و مشائخ اعتقادی طور پر حضرت امام ابو منصور ماتریدی قدس سرہ کے پیروکار رہے ہیں اور صدیوں سے متواتر طور پر چلے آ رہے ہیں۔ اہل سنت کے معتقدات و معمولات خواہ وہ ضروری ہوں یا ظنی، ان کو اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہیں۔

فقہی مسلک

ہندوستان کی اکثر مسلم آبادی فقہ و فتاویٰ میں حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت قدس سرہ کی پیروی کرتی ہے۔ ہندوستانی علما و مشائخ نے فقہ حنفی کی صرف پیروی ہی نہ کی بلکہ وسیع پیمانے پر اس مسلک و مذہب کی ترویج و اشاعت بھی کی ہے۔ سلسلہ رشیدیہ کے علما و مشائخ نے بھی دعوت و تبلیغ اور درس و تدریس کے ساتھ اپنی تصنیفات و تالیفات کے ذریعے بھی فقہ حنفی اور مسلک امام اعظم ابو حنیفہ قدس سرہ کی ترویج و اشاعت اور تبلیغ میں اپنے وجود کا احساس دلایا ہے۔

صوفی مسلک

حضرت خواجہ غریب نواز قدس سرہ کی حکیمانہ دعوت و تبلیغ کی بنیاد پر چشتیہ سب سے قدیم ہندوستان کے اکثر حصوں کو اپنی روحانیت سے منور اور پر سکون بنا دیا۔ بہت سے دوسرے مشائخ نے قادیانیت، نقشبندیہ اور سہروردیت کی بھی ترویج و تبلیغ کی اور ان تمام روحانی چشتیوں سے خود بھی فیض یاب ہوئے اور دوسروں کو بھی فیض یاب فرمایا۔ البتہ چشتیت اور قادیانیت کا غلبہ ہندوستان میں زیادہ رہا۔ خانقاہ رشیدیہ جون پور بھی اصلاً چشتی خانقاہ ہے لیکن یہاں کے مشائخ کو دیگر مختلف سلاسل کی اجازت و خلافت شروع سے چلی آ رہی ہے۔ یہاں کے اکثر مشائخ نے زیادہ تر بیعت، سلسلہ چشتیہ اور قادیانیت میں کی ہے اور اجازت سے نوازا ہے۔

یہاں کے بعض مشائخ چشتی صوفی رسوم مثلاً رقص و سماع وغیرہ سے بھی خوب لطف اندوز ہوئے ہیں۔ (۱)

تعلقات

(۱) بانی سلسلہ رشیدیہ شیخ محمد رشید کے جد امجد حضرت شیخ عبدالحمید حضرت مخدوم سید اشرف جہاں گیر کچھوچھوی کے مرید و خلیفہ تھے۔ اس روایت کے تعلق سے نوجوان فاضل مولانا امیر رضا مصباحی جو خانقاہ رشیدیہ سے اپنا روحانی رشتہ اور اس سلسلے کے مشائخ کے تعلق سے معلومات رکھتے ہیں، لکھتے ہیں: ”یہ روایت و عبارت بھی ناقابل تسلیم اور حقیقت سے بعید معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ خانوادہ رشیدیہ کی تاریخ پر معتبر و مستند کتاب ”شیخ ارشدی شریف“ اور دیگر کسی کتب تاریخ و سیرت میں اس امر کا کوئی ذکر نہیں ملتا کہ حضرت بندگان شیخ جمال الحق مصطفیٰ کے والد بزرگوار امام العارفین حضرت شیخ عبدالحمید حضرت سید اشرف جہاں گیر سمنانی کے مرید و خلیفہ تھے اور پھر یہ کہ ان دونوں حضرات کے زمانے میں بھی کافی تفاوت اور بون بید ہے۔ لہذا یہ روایت کسی بھی طریقے سے درست نہیں ہے۔ البتہ ”شیخ ارشدی شریف“ میں یہ ہے کہ حضرت شیخ عبدالحمید کی شادی شیخ عبدالقادر کی دختر سے ہوئی اور شیخ عبدالقادر کے والد قاضی عبدالصمد شیر شاہ سوری کے لشکر کے قاضی تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب حضرت قاضی محمد عرف تھیں صدیقی سے ملتا ہے جو کہ حضرت مخدوم میر سید اشرف جہاں گیر سمنانی قدس سرہ کے خلیفہ اور حضرت معروف شبلی کی اولاد سے ہیں۔“ (ماہنامہ جام نور، نئی دہلی، فروری ۲۰۱۲ء، ص: ۶۳)

(۲) بانی سلسلہ رشیدیہ شیخ محمد رشید کا نام عبدالرشید بھی ملتا ہے۔ آپ کے پیر بھائی اور خلیفہ شیخ طہین جھونسوی ”مناقب العارفین“ میں اپنے شیخ ارادت مخدوم شاہ طیب بناری قدس سرہ کے کمال و اعزاز کا ذکر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں: ”دوسری شخصیت استاذی و استاد العالمان، ملازمی و ملازم الصالحین، زبدۃ الاحبار، عمدة الامراء، محبوب قلوب الطہار، صاحب الرشاد و السداد، و امکان فی مقام الارشاد، قد و ابل التجرید و التفرید، بندگان میاں شیخ عبدالرشید ابدا اللہ تعالیٰ علال عاقل علی روس المعتمدین و المریدین کی ہے۔“ (مناقب العارفین، ص: ۸۶)

شیخ محمد رشید کے ہم عصر اور خواجہ تاش نے جن الفاظ و القاب میں آپ کا ذکر کیا ہے، اس سے جہاں آپ کی عظمت، رفعت اور مقام ولایت کا علم ہوتا ہے وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو عبدالرشید بھی کہا اور لکھا گیا ہے۔ یوں ہی تاثر انکرام کے مصنف میر سید غلام علی آزاد بنگرامی نے بھی آپ کا نام عبدالرشید اور لقب شمس الحق لکھا ہے۔ (تاثر انکرام، ص: ۳۱۱) حدائق الحقیقہ میں آپ کا تعارف کراتے ہوئے یوں تحریر ہے: ”مخدوم شیخ عبدالرشید بن شیخ مصطفیٰ عبدالحمید عثمان پہلانا نام آپ کا محمد رشید تھا اور اسی کو دوست رکھتے تھے اور مراسلات و مکاتبات میں لکھتے تھے۔ لقب آپ کا شمس الدین تھا (حدائق الحقیقہ ص: ۲۶۹) حدائق الحقیقہ میں آپ کی تاریخ وفات ۱۰۵۵ھ

بتائی گئی ہے جو دیگر تمام مراجع سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ تمام مراجع و مصادر میں ۱۰۸۳ھ ہے اور یہی درست ہے۔ صاحب نزہۃ النحواط نے بھی آپ کا نام محمد رشید اور شیخ ارشدی کے حوالے سے تاریخ وصال ۹ رمضان ۱۰۸۳ھ لکھا ہے۔ (نزہۃ النحواط، ج: ۵، ص: ۳۹۹، ۴۰۰)

صاحب تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمن علی صاحب نے آپ کا تذکرہ کرتے ہوئے یوں تحریر کیا ہے: ”مولانا عبدالرشید جون پوری ابن شیخ مصطفیٰ بن عبدالحمید، ان کا لقب شمس الحق تھا، شمس تخلص کرتے تھے، شیخ فضل اللہ جون پوری کے شاگرد اور اپنے والد شیخ مصطفیٰ (مرید نظام الدین ایلچھوی) کے مرید تھے، جو اولیائے کبار اور علمائے کرام سے تھے۔“ (تذکرہ علماء ہند، ص: ۲۹۷)

سمات الاخیار کے مصنف نے جو بات تحریر کی ہے وہ یہ ہے: آپ کا نام نامی محمد رشید ہے اور آپ کی بعض تحریروں سے عبدالرشید بھی ثابت ہے مگر تم، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو محمد رشید زیادہ مطبوع و محبوب تھا۔ آپ کی کنیت ابو البرکات اور لقب شمس الحق ہے۔ لوگ آپ کو قطب الاقطاب اور دیوان جی کہا کرتے تھے۔ (سمات الاخیار، ص: ۶۰) اب ان تفصیلات کے بعد آپ کے نام و لقب کے تعلق سے مزید کچھ لکھنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

(۳) شیخ محمد رشید کے شیوخ میں مخدوم شاہ طیب بناری حضرت عبدالقادر بن قلندر میر سید شمس الدین کاپڑی اور راجی احمد بختی نامک پوری جیسے مشائخ کا نام آتا ہے اور شیخ نور الحق ابن شیخ عبدالحق محدث دہلوی شارب بخاری اور افضل العلماء شیخ محمد افضل جیسے تخریروں کے اساتذہ ہوتے ہیں۔ ملا عبدالغنی سیالکوٹی (۱۲ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ) ملا عصمت اللہ سہارن پوری (۱۰۳۹ھ) اور شیخ محبت اللہ آبادی جیسے نامور علماء و مشائخ آپ کے ہم عصر اور ملاجھو جون پوری جیسے معنوی اور معنوی عالم آپ کے ہم سبق ساتھی تھے۔ آپ کے استاذ شیخ محمد افضل کہتے تھے کہ جس وقت علامہ تفتازانی اور جرجانی دنیا سے گئے اس وقت سے کسی نے بھی اتنے بڑے فاضلوں کو ایک شہر میں اکٹھا ہوتے نہیں دیکھا یعنی ملاجھو و اور شیخ عبدالرشید۔ (تاثر انکرام، ص: ۳۶)

(۴) آپ کے بارے میں خانقاہ رشیدیہ کے موجودہ سجادہ حضرت مفتی عبید الرحمن رشیدی مدظلہ العالی تحریر کرتے ہیں: آپ حضرت سرکار آسی مولانا الشاہ محمد عبدالعظیم قدس سرہ کے مرید خاص اور خلیفہ اول اور خانقاہ رشیدیہ جون پور کے سجادہ نشین رہے ہیں۔ آپ کی ذات والا صفات محتاج تعارف نہیں۔ حضرت ملک العلماء مولانا ظفر الدین فاضل بہاری مصنف صحیح النہاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ ”مؤمن الاوقات“ میں آپ کے جو ادب و القاب ذکر فرمائے ہیں وہ یہ ہیں: ”عارف باللہ، مقبول بارگاہ، ہمت الاصحار بالاکابر، وارث العلم والفضل والجد والشراف، کابر اعم کابر، جامع شریعت و طریقت، حاوی اسرار حقیقت و معرفت، عالی جناب، معنی القاب

سید شاہ علی صاحب سبز پوش سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ عظیمہ، جون پور، دام بالقیس والسرورانی مراد پور^{۳۰} (خطبات رشیدیہ، ص ۳۰)

حضرت مفتی صاحب نے الاحسان کو دیے گئے اپنے تحریری انٹرویو میں یہ بات بھی تحریر کی ہے کہ حضرت ملک العلماء ظفر الدین بہاری، حضرت سید شاہ شاہ علی سبز پوش کے خلیفہ شاہ ایوب ابدالی خانقاہ اسلام پور پٹنہ کے اجازت یافتہ بھی تھے، اور یہ بھی تحریر کیا ہے کہ ۱۹۴۶ء میں بنارس میں چار روزہ سنی کانفرنس کے انعقاد کے سلسلے میں حضرت صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادی خلیفہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا قدس سرہ نے خانقاہ رشیدیہ کے ۹ ویں سجادہ نشین سید شاہ شاہ علی سبز پوش قدس سرہ سے ملاقات کی اور ان کو کانفرنس کے غراض و مقاصد سے آگاہ کیا۔

(۵) سماع اور وجد و کیف اور رقص کے تعلق سے مناقب العارفین کے مصنف شیخ یحییٰ جھونسی اپنے شیخ ارادت مجدد شاہ طیب بہاری جو شیخ محمد رشید بانی سلسلہ رشیدیہ کے شیخ اجازت اور شیخ تربیت ہیں، کے بارے میں تحریر کرتے ہیں: "ابتداء میں آپ قدس سرہ کو کما سے بہت شغف تھا اور وجد و رقص بہت فرماتے تھے اور اکثر صانع قسم کے قوال آپ کے ساتھ رہتے تھے۔ کبھی کبھی سماع کے جوش میں جنگل کی طرف چلے جاتے، دو دروازہ جنگل میں رہتے اور کوئی نہ جانتا کہ آپ کہاں ہیں، لیکن جب قوال اس نواح میں جاتے اور گانا شروع کرتے تو اس کو سنتے ہی آپ کسی طرف سے ظاہر ہو جاتے اور رقص میں مشغول ہو جاتے۔ جب آپ پر حال طاری ہوتا اور آپ رقص فرماتے تو درود یار مست ہو جاتے اور ایسا معلوم ہونے لگتا کہ ہر چیز عالم رقص میں ہے۔ بہت سی راتیں اسی حال میں گزر جاتیں۔ آخر وقت میں سماع سے پرہیز فرمایا اور اپنے اختیار سے نہیں سنتے تھے مگر فرمایا کرتے کہ اس دور میں سرو نہیں سنتا چاہیے کیوں کہ اس کی کوئی شرط باقی نہیں رہ گئی ہے، زمانہ فاسد ہو چکا ہے، یاران موافق نہیں رہ گئے ہیں اور قوالوں میں طمع جاگزیں ہو گئی ہے، اس لیے ایسے وقت میں سرو کا سنتا فقرا کے طریقہ سے مناسبت نہیں رکھتا۔" (مناقب العارفین، ص ۷۵، ۷۶)

اور شیخ محمد ارشد ان شیخ محمد رشید کے بارے میں سمات الاخیار کے مصنف ایک واقعہ یوں تحریر کرتے ہیں: "سماع کا سنتا بعض روایتوں سے ثابت ہے۔ حضرت راجی سید احمد حلیم اللہ مائیک پوری کا عرس تھا، بہت سے بزرگان دین مل کر گریہ کرنے چلے قوال ساتھ تھے، واپسی میں جب یہ شعر گایا:

شنیدہ ام کہ سگال را قلا وہ می ہندی

چرا بہ گردن حافظ نمی رستے

آپ پر ایسی حالت طاری ہو گئی کہ دستار مبارک اتار کر قوال کو عطا فرمایا۔ پھر دوسروں نے بھی تبعاً اپنی اپنی دستار روئے ڈالی۔ آپ کی حالت نے ایسی تاثیر پیدا کی کہ دیکھنے والوں کی بھی

حالت متغیر ہو گئی۔ اسی طرح حضرت مخدوم طیب بہاری کے عرس میں آپ کو حال آیا۔ پہلے آپ نے بہت کچھ ضبط کیا مگر ضبط نہ ہو سکا تو فرمایا کہ حضرت مخدوم کی روح (روحانیت) نے غلبہ کیا۔ بزرگان چشتیہ نے سماع کی تعریف یوں کی ہے کہ سماع ایک تازیانہ ہے جو محبت کو محبوب کی طرف ہکا تا ہے اور ایک وسیلہ ہے جو دلوں کو معشوق کے قریب پہنچاتا ہے۔ رموز دہائی میں سے ایک رمز ہے جو بیان سے کھل نہیں سکتا اور زبان سے ادا ہو سکتا نہیں۔ شوریدگان محبت اس سے محفوظ ہوتے ہیں اور ہشیار و خود پرست اس سے بے بہرہ رہتے ہیں۔ سچ ہے۔

حدیث عشق باخبار در نمی گنجید بیان شوق بگفتار در نمی گنجید

(سمات الاخیار، ص ۱۲۱)

معلوم ہوا کہ یہاں کے مشائخ نے سماع کے جو شرائط ہیں، ان کا ملحوظ رکھتے ہوئے، سماع کا لطف اٹھایا ہے۔ جب جب شرائط پائے گئے تو سماع کیا اور جب شرائط کا فقدان رہا تو پرہیز کیا۔ یہی صوفیہ صاف کا طریقہ چلا آ رہا ہے۔ آج بھی اگر شرائط یعنی زمان، مکان اور اخوان پائے جائیں تو اس کا لطف لیا جاسکتا ہے، ورنہ پرہیز بہتر ہے۔

کتنا بیامانت

(۱) سمات الاخیار، مولوی محمد عبد المجید و سید محمد اصغر ایوبی، ذیقنس باؤ سنگ سوسائٹی، کراچی

مطبع: جمیل اور زلیا، لاہور، کراچی، ۱۴۱۹ھ

(۲) دیوان فانی، سید مصطفیٰ علی رشیدی، ناشر: انجمن فیضان رشیدی، کلکتہ

(۳) مناقب العارفین، شیخ یحییٰ جھونسی، مترجم: ناشر: خانقاہ رشیدیہ جون پور شریف

(۴) عین المعارف، مولف: شاہ شاہ علی رشیدی، ناشر: انجمن فیضان رشیدی، کلکتہ

(۵) انوار الاولیاء، مؤلف: مولوی حبیب اللہ حقار، خزمر پرینٹنگ پریس، کراچی، ۲۰۰۰ء

(۶) ماہنامہ جام نور، نئی دہلی، فروری ۲۰۱۰ء

(۷) تذکرہ علمائے ہند، مولوی رحمن علی، مطبع مٹھی نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۱۴ء

(۸) حدائق الحنفیہ، مولوی فقیر محمد چیملی، مکتبہ رضویہ، دہلی، ۲۰۰۶ء

(۹) نزہۃ الخواطر، عبدالحی حسنی، مکتبہ دار عرفات، دائرہ الشیخ علم اللہ، رے بریلی، ۱۹۹۲ء

(۱۰) تاثیر انکرام، غلام علی آزاد بگرامی، مترجم: یونس رضا ایوبی، جامعۃ الرضا، بریلی، ۲۰۰۸ء

(۱۱) خطبات رشیدیہ، مفتی عبید الرحمن رشیدی، مکتبہ آسی، بلیا، ۱۴۱۲ھ

صوفی ادب

تعلیمات تصوف اور مثنوی مولانا روم

تصوف وہ مبارک علم ہے جس میں حق تبارک و تعالیٰ کی ذات اور صفات کی کئی حقیقت سے بحث کی جاتی ہے۔ اس علم کو ایک کنوئین اور پاک طریق سے بھی تعبیر کیا گیا ہے جو قرآن و احادیث سے مستنبط اور مستخرج ہے، جسے صراطِ مستقیم کہتے ہیں۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر گام زن رہنے سے ذات باری تعالیٰ کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی وجہ سے اس علم شریف کا موضوع ذات و صفات خداوندی اور اس کی غرض و غایت اللہ جل شانہ کی ”معرفت“ قرار دی گئی۔ رب کائنات کی معرفت اور اس کی حقیقت تک رسائی، تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کے بغیر ممکن نہیں۔ تزکیہ نفس کے لیے شریعت مطہرہ کی پابندی لازم ہے۔ اس کے بعد سالک واصل الی اللہ ہوتا ہے یعنی اس کے انوار و تجلیات کا مشاہدہ کرتا ہے جس کا نام ”حقیقت“ ہے۔ وہاں تک رسائی کے لیے پیر کامل کی رہبری کی حاجت ہوتی ہے۔ اب اس سالک کے سامنے دنیا ایسی ہی ہو جائے گی جس طرح بھٹلی کے اوپر رائی کا دانہ۔ حضرت سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ نے اسی مفہوم کو ان لفظوں میں ادا کیا ہے:

نظرت الی بلاد اللہ جمعاً

کسر ذلۃ علی حکم اتصال

علم تصوف کی یہی وہ عظمت اور اہمیت ہے جس نے دنیا کے بڑے بڑے ارباب علم و کمال کو اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے اور بعض دانشورانِ علم و ادب کو بھی وراطۃ حیرت میں ڈال دیا ہے۔ الغرض سزا حق کو پانے کا نام ”تصوف“ ہے، جس کا طریقہ مولانا جلال الدین رومی علیہ رحمۃ الہامی نے کچھ اس طرح بتایا ہے کہ

لب بند و گوش بند و چشم بند
گم نہ بنی سر حق بومامختد

حضرت امام محمد باقر بن علی بن امام حسین رضی اللہ عنہم کا ارشاد فیض بنیاد ہے: ”التصوف خلق فمن زاد عليك في الخلق زاد عليك في التصوف، یعنی تصوف پاکیزہ اخلاق کا نام ہے جس کے جتنے پاکیزہ اخلاق ہوں گے اتنا ہی وہ تیار و صوفی ہوگا۔ حضرت جنید بغدادی کا خیال ہے: ”التصوف هو ان يمدك الحق عندك ويحييك به“، یعنی تصوف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے تیری اپنی ذات سے فنا کر دے اور اپنی ذات کے ساتھ تجھے زندہ کر دے۔

ایسے وہ تمام افراد جنہوں نے اس علم شریف سے اپنا رشتہ جوڑا۔ اس خازن راہی میں قدم رکھا اور معرفت باری تعالیٰ کے صبر آزما دور سے گذرے اصطلاح تصوف میں انہیں ”صوفی“ کہا جاتا ہے۔ حضرت ابو بکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ”التصوف في لا يرى في الدارين مع الله غير الله“، یعنی صوفی وہ ہے جو دونوں جہاں میں بجز ذات خداوندی کے کسی چیز کو نہ دیکھے۔ تصوف دراصل دین اسلام کی روح ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ”بعثت لا تمم مكارم الاخلاق“، یعنی میں مکارم اخلاق کو درجہ کمال تک پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہوں یہ مکارم اخلاق کیا ہیں علماء ان سے واقف ہیں اور صوفیان کے حامل ہیں۔

فوائد الفوائد میں ایک عارفانہ لطیفہ کا ذکر ہے کہ بوعلی سینا جب حضرت شیخ ابوسعید ابوالخیر علیہ الرحمہ سے ملاقات کر کے چلے گئے تب کسی نے پوچھا کہ بوعلی سینا کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟ شیخ ابوسعید ابوالخیر علیہ الرحمہ نے کہا: ”مکارم اخلاق ندار ابوعلی سینا کو جب معلوم ہوا تو کہا کہ میں نے تو مکارم اخلاق کے موضوع پر پوری ایک کتاب رقم کی ہے۔ شیخ نے فرمایا، میں نے یہ کب کہا تھا کہ مکارم اخلاق ندار، یہ کہا تھا کہ مکارم اخلاق ندار۔ جو علم مدرسوں میں پڑھایا جاتا ہے وہ سب علم کا ظاہر ہے جسے صوفیہ کرام حجاب سے تعمیر کرتے ہیں، پھر اس کا باطن ہے جسے صوفیہ عظام عشق کہتے ہیں۔ علماء اہل عقل اند و درویشاں اہل عشق۔ عشق دراصل دین کا قلب ہے اور یہ علم ظاہر سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ غالباً اسی لیے امام غزالی علیہ الرحمہ مدرسہ نظامیہ بغداد کی ملازمت سے استعفی دے کر راہ سلوک طے کرنے میں مشغول ہو گئے تھے۔

اس لیے خانقاہ میں بتلائے جانے والے عمل کے لیے ”علوم باطن“ کی اصطلاح استعمال ہوتی ہے۔ اس مدرسہ عشق میں داخلے کا تعلق ارادت یا بیعت سے ہے۔ بیعت یہ ایک معاہدہ یا اقرار ہے، جو پیر کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں:

پیر را بگوئیں کہ بے پیرا میں سفر
بست بس پر آفت و خوف و خطر

یعنی کسی کامل کو اپنا پیر بنا کہ بغیر پیر کے یہ سفر آفت و خوف و خطرات سے بھرپور ہے۔ پھر فرماتے ہیں:

گر تو کردی ذات مرشد را قبول
ہم خدا در ذاتش آمد ہم رسول

یعنی اگر تو نے مرشد کو قبول کر لیا تو اللہ اور اس کے رسول کا نور تیرے دل میں منور ہو جائے گا۔ ایک اور جگہ مولانا روم فرماتے ہیں:

قال را بگوئید مرد حال شو
پیش مردے کاٹے پامال شو

قال یعنی زبانی جمع خرچ کو ترک کر کے صاحب حال ہو جا، کسی شیخ کامل، عارف یا اللہ کی قدم ہوسی کر کے پامال ہو جا اور پیر کے آداب بتلاتے ہوئے فرماتے ہیں:

چوں گرفتنی پیر ہمیں تسلیم شو
ہنجو موسیٰ زیر حکم خضر رو

جب تمہیں پیر مل جائے تو خبردار اس کی نافرمانی نہ کرنا بلکہ اس کا تابع فرمان بن کر رہنا اور جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام کے حکم کے مطابق چلے تھے اسی طرح تم بھی چلو۔

صوفیہ کرام کی تعلیمات میں عبادت الہی اور خدمت خلق بنیادی شعبوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان ہر دو میں اخلاص کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک ظاہر و باطن میں یکسانیت کا نام اخلاص ہے۔ اخلاص کے علاوہ، زہد و تقویٰ، صبر و شکر، خوف ورجاء، فقر و توکل اور ادب و حیا جیسے اخلاق حسنہ صوفیانہ تعلیمات کے لوازم ہیں جبکہ عبادات، مراقبات و مجاہدات، اذکار و اشغال اور خلوت و استقامت صوفیہ کرام کے گویا مشاغل ہیں، جن کے دوران، بغض و کینہ، تکبر و غرور، کذب و تعیبت، حرص و حسد اور غفلت جیسی خواہشات نفسانی سے بچنے اور ان سے پرہیز کرنے کی عملی تربیت دی جاتی ہے۔ تصوف کی تعلیمات کا اصل منشا انسانی قلب سے تمام ناپسندیدہ خصالتیں اور نفسانی خواہشات کا دور کر دینا ہے۔

زہد کے سلسلے میں حضرت امام احمد بن حنبل علیہ الرحمہ کی رائے یہ ہے کہ حرام کا ترک کروینا عوام کا زہد ہے، حلال چیزوں سے فضولیات کا ترک کروینا یہ خواص کا زہد ہے اور بندے کو

اللہ سے غافل کروینے والی تمام چیزوں کا ترک کرنا عارفین کا زہد ہے۔
دنیا کیا چیز ہے اس کا تعارف کراتے ہوئے مولانا روم کہتے ہیں:

”جیسٹ دنیا از خدا غافل بدن
نے قماش و نقرہ و فرزند وزن“

یعنی اگر تمہارے پاس بال بچے ہوں اور مال و دولت بھی ہو، لیکن تم احکام خدا اور رسول پر عمل پیرا ہو تو ایسی صورت میں تم دنیا دار نہیں بلکہ دین دار رہی ہو۔

تعلیمات صوفیہ میں توکل سے متعلق حضرت بہل بن عبد اللہ تستری علیہ الرحمہ کا قول ہے کہ توکل کرنا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت ہے اور کسب کرنا آپ کی سنت ہے۔ لہذا حضور اقدس کے حال پر قائم رہنے والے کو سبب رسول ترک نہیں کرنا چاہئے۔ اس ضمن میں مولانا روم ارشاد فرماتے ہیں:

گر توکل می کنی در کار کن
کار کن پس بکنی در جبار کن

ادب اور اخلاق کے سلسلے میں حضرت علی ہجویری علیہ الرحمہ نے اپنی مشہور تصنیف ”کشف المحجوب“ میں حضرت ابوالحسن علیہ الرحمہ کا قول ان الفاظ میں نقل فرمایا ہے۔ ”تصوف رسوم و علوم کا نام نہیں بلکہ اخلاق و ادب کا نام ہے“۔ امام قشیری علیہ الرحمہ کے نزدیک نیک خصلتوں کے اجتماع کا نام ادب ہے۔ حضرت ابو حفص رحمہ اللہ نے ظاہری حسن ادب کو باطنی حسن ادب کا آئینہ دار ہونا قرار دیا ہے اور مولانا رومی علیہ الرحمہ ادب کے حصول میں اس طرح نعتیج ہیں:

از خدا خواہیم توفیق ادب
بے ادب محروم ماند از فضل رب

یعنی ہم اللہ کی بارگاہ بے نیاز سے ادب جیسی گراں قدر چیز مانگتے ہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ بے ادب اللہ کے فضل سے محروم ہو جاتا ہے۔

مولانا روم علیہ الرحمہ کا مکمل نام جلال الدین محمد ہے۔ مولانا روم کے لقب سے مشہور ہیں۔ 6 ربیع الاول 604ھ کو بلخ میں پیدا ہوئے۔ آپ کا دہسپال صدیقی اور زہد پال علوی ہے۔ آپ کے والد بزرگوار ایک عظیم صوفی تھے۔ مولانا روم نے ابتدائی تعلیم اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ والد کے انتقال کے بعد، آپ ملک شام میں تحصیل علوم کے لیے تشریف لے گئے۔ سات سال تک دمشق میں رہ کر علوم ظاہری کی تکمیل کی۔

اسی زمانے میں آپ کی ملاقات حضرت شمس تبریز رحمۃ اللہ علیہ سے ہوئی۔ ظاہری و باطنی

مکالمے کے بعد مولانا روم ان سے مرید ہوئے اور ایک ہی سال میں اس مرید مومن کی نگاہ کیسیا اثر نے مولانا کی زندگی میں عظیم انقلاب پیدا کر دیا جس نے ایک بحر عالم و فاضل اور واعظ کامل کو صوفی اور خانقاہی بنا دیا۔ 68 سال 3 ماہ کی عمر میں 5 جمادی الاخریٰ 672ھ کو وصال ہوا۔ تونیہ (ترکی) میں آپ کا مزار ابراہیم نواز زیارت گاہ ابراہیم خاں ہے۔ مولانا روم علیہ الرحمہ کی شہرہ آفاق تصنیف ”مثنوی معنوی“ کی 6 جلدیں ہیں۔ جو آپ کے مرید خاص حسام الدین علی کی فرمائش پر دس سال کے عرصہ میں مکمل ہوئیں۔ یہ ایسی مشہور زمانہ تصنیف ہے کہ ہر زمانے میں اہل نسبت اس کا مطالعہ کر کے قلبی و روحانی کیف و جذب سے سرشار ہوتے رہے ہیں اور آج بھی کامل و نچلی کے ساتھ مثنوی شریف پر مبنی اور سنی جا رہی ہے۔

ڈاکٹر اقبال نے بھی اس کی اہمیت کا اقرار کیا ہے چنانچہ کہتے ہیں

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

یعنی اگر کسی کو مرد کامل تلاش کے باوجود بھی نہ ملے تو اس کو چاہئے کہ وہ مولانا روم کی مثنوی شریف کا مطالعہ کرے تاکہ خدا تیرے اندر سوز و گداز کی کیفیت پیدا کر دے اور اس کی برکت سے تجھے پیر کامل مل جائے گا۔

مولانا روم کے علم و فضل اور اعلیٰ تحقیق کا سب سے بڑا شاہد اور سب سے زیادہ روشن دلیل مثنوی شریف ہے جس سے مولانا کی وہ وقعت اور دستگاہ ظاہر ہو جاتی ہے جو ان کو علم تفسیر وحدیث، عقائد و تصوف اور دیگر تمام علوم میں حاصل ہے۔ آیات قرآنی کی شرح جس خوبی سے کرتے ہیں وہ انہی کا حصہ ہے۔ ارشادات نبوی کا تحمل و متشا جس طرح وہ سمجھاتے ہیں دوسرے کے بس کا کام نہیں، عقائد و تصوف کے باریک و دقیق مسائل کو بیان کر کے واضح اور صاف مثالوں کے ذریعہ ذہن نشین کرانے میں تو انہیں خاص ملکہ حاصل ہے۔ عام نصائح جس کثرت کے ساتھ مثنوی میں موجود ہیں شاید وہ کسی کتاب میں ہوں اور خاص صوفیانہ امثال و نصائح کا گویا خزائن ہے۔ مثنوی کی اس چامعیت اور حسن نے سب کی زبان سے یہ کہلوایا ہے:

مثنوی مولوی معنوی
ہست قرآن در زبان پہلوی

مولانا روم کی مثنوی شریف کی حقیقت بیان کرنا اور اس پر پوری طرح نظر ڈالنا اور اس کے حقائق و دقائق کو دکھانا ان ہی اہل کمال کا کام ہے جو کتاب موصوف کے ماہر اور بحر تصوف کے کشا ور ہونے کے علاوہ تمام علوم میں اعلیٰ صلاحیت کے حامل ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ

رب العزت نے ظاہری عقل کا دل و ذہن باقی رہ کر ہر عقلی اور بصیرت جیتی بھی عطا فرمائی ہو۔ لہذا ہم جیسے کم سواد دو بے بضاعت کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ہم بہتر نظر سے دیکھیں اور سمجھتے رہیں اور روحانی سکون حاصل کرتے ہیں۔

آخر وقت میں مولانا رحمہ نے اپنے خاص لوگوں کو جو وصیت فرمائی وہ یہ تھی:

أوصيكم بتقوى الله في السر والعلانية وبقلة الطعام، وقلة المنام و هجران المعاصي والآثام ومواظبة الصيام ودوام القيام وترك الشهوات على الدوام واحتمال الجفائ من جميع الآثام وترك مجالسة السفهاء والعوام. ومصاحبة الصالحين والكرام وان خيرا الناس من ينفع الناس وخير الكلام ما قل ودل.

یعنی میں تم کو ان باتوں کی نصیحت کرتا ہوں: ظاہر و پوشیدہ طور پر خدا سے ڈرنا۔ کم کھانا، کم سونا، گناہوں کو چھوڑنا۔ اکثر روزے رکھنا اور رات کو اللہ کی عبادت میں کھڑے رہنا۔ ہمیشہ خواہشات نفسانی کو ترک کرنا۔ جو لوگ اپنا پہنچائیں اس کو بدداشت کر لینا۔ عوام کم عقل اور بے وقوفوں کے پاس نہ بیٹھنا۔ نیک شریف، دین داروں کی صحبت میں رہنا۔ بہترین آدمی وہ ہے جو لوگوں کو نفع پہنچائے اور بہترین بات وہ ہے جو مختصر ہو اور مفید و بدل ہو۔

صحبت صالح ثرا صالح کند
صحبت طالح ثرا طالح کند

○○○

ضیاء الرحمن علیمی

امیر خسرو کی عربی نثر نگاری

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ امیر خسرو فارسی کے ایک بے مثال شاعر ہیں لیکن اس وقت جو سوال زیر بحث ہے وہ یہ ہے کہ امیر خسرو کو عربی نثر نگاری پر قدرت تھی یا نہیں، بعض مورخین نے یہ لکھا ہے کہ امیر خسرو عربی زبان و ادب سے اچھی طرح واقف نہیں تھے، انہیں مورخین میں ایک وحید مرزا بھی ہیں (۱)۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ امیر خسرو نے اپنے بعض فارسی اشعار میں اپنے ترکی الاصل ہونے پر فخر کا اظہار کیا ہے اور اپنے ہندو ادبوں پر مسرت و شادمانی کا اظہار کیا ہے اور انہوں نے اس بات کی مراحت کی ہے کہ انہیں عربی نہیں آتی، چنانچہ اپنے ایک شعر میں وہ کہتے ہیں:

ترک ہندوستانم من ہندوی گویم جواب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

(۲)

لیکن بحث و نظر کے بعد جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نظریہ کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے، جس نے بھی ان کی تصنیفات اور ان کے دیوان کا مطالعہ کیا ہوگا اس پر یہ بات غلطی نہیں ہوگی کہ ان کو عربی زبان و ادب پر بڑی قدرت ہے، ان کے سیکڑوں عربی اشعار موجود ہیں، اور ان کی کتابوں میں عربی نثر کے بہت سے خوبصورت نمونے موجود ہیں۔

اہل علم اس بات سے واقف ہیں کہ لفظ ادب عربی زبان سے آیا ہے، اور مختلف ادوار میں اس کے مختلف معانی مراد لیے جاتے رہے ہیں، اور علماء نے بڑے بحث و نظر کے بعد ادب کی یہ تعریف کی ہے:

”ادب وہ کلام ہے جو عقل و شعور کی بڑی دقیق عکاسی کرے۔“ (۳)

ادب کا اطلاق شعر و نثر دونوں پر ہوتا ہے، ہمیں اس مقام پر شعر و شاعری پر کوئی گفتگو نہیں کرنی ہے البتہ نثر کے تعلق سے ابن رشیق نے لکھا ہے کہ کبھارے ہوئے موتی کا نام نثر ہے (۴)۔

گویا نثر ہر اس کلام کو کہیں گے جو منظوم نہ ہو۔ جس میں وزن اور قافیہ نہ ہو، اس لحاظ سے ہم جو روزمرہ کی گفتگو کرتے ہیں وہ بھی نثر میں شامل ہوگی، لیکن مورخین ادب کو اس قسم کی نثر سے کوئی سروکار نہیں ہوتا، بلکہ وہ اس نثر پر گفتگو کرتے ہیں جس پر ادب کا اطلاق ہو سکے، جس میں کوئی فنی جمال، جس نثر میں کوئی تاثیر ہو، جس میں نثر نگار نے خاص اسلوب کی پیروی کرتے ہوئے اپنے جذبات اپنے خیالات اور اپنی خوبصورت فکر کی رنگ آمیزی کی ہو۔

امیر خسرو کی کتابوں اور ان کے دیوان کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کی تحریروں میں عربی فنی نثر کے بہت سے نمونے موجود ہیں، جن کی ایک فنی تاثیر ہے، جن کی جانب دل کا میلان ہوتا ہے، اور طبیعت ان کے پڑھنے پر مجبور نظر آتی ہے، امیر خسرو کے مجموعہ آثار میں فنی نثر کے عربی نمونے کئی طرح کے ہیں، چند عربی خطبے ہیں جو انہوں نے اپنی فارسی کتابوں کے آغاز میں لکھے ہیں، سو سے زائد عربی مقولے ہیں جو ان کے طبع زاویہ ہیں، اس کے علاوہ بہت سے رنگا رنگ عربی جملے ہیں جو انہوں نے مختلف مواقع پر استعمال کے لیے لکھے ہیں مثلاً زندوں اور مردوں کے لیے دعا اور بددعا کے جملے، عاشق و معشوق کی زبانوں سے ممکنہ طور پر نکلنے والے جملے، مبارکبادی کے جملے، اور ان کے علاوہ بہت سے جملے جو انہوں نے مختلف مواقع پر استعمال کے لیے لکھے ہیں، ان جملوں کی خاصیت یہ ہے کہ یہ بالکل انوکھے ہیں، اور یہ سب کے سب امیر خسرو کے طبع زاویہ ہیں، جو ان کی تفصیلات دیکھنے کے خواہش مند ہوں ان کو امیر خسرو کی کتاب آغاز خسروی کا مطالعہ کرنا چاہئے۔ ہم یہاں ذیل میں ان کی مختلف کتابوں سے عربی نثر کے مختلف النوع نمونے ذکر کرتے ہیں:

خزائن الفتوح کے خطبے میں لکھتے ہیں:

”الحمد لله الفتاح الذي فتح خزائن الفتح على دين محمد وأعز جميع انصاره بنصر موبد، أعز شأنه وأعلى سلطانه، والصلوة والسلام على نبي السيف الذي شق بإشارة قلب القمر والصدد، ووضح من بوهانه القاطع ولقد نصركم الله بيد، والتمية والسلام على آله واصحابه الكرام المنبهين للنيام باللسان والحسام“۔ (۵)

اخبار خسروی کے پہلے رسالہ کے خطبے میں لکھتے ہیں:

”الحمد لله الذي خلق القلم للرقم، وخلق النسم لرقم القلم وأجرى قلمه على الخلق بالحكم والحكم، وجعل القلم علما للعلم في العالم، كما قال عز وجل: علم بالقلم علم الانسان ما لم يعلم، والصلوة على الرسول الذي أنزل إليه الكتاب

وبرئ به السوح والقلم، لما يصدر منهما الصدق والصاب، وعلى آله واصحابه ذوى الفضل والآداب، ثمنا الله على اتياعهم للنجاح يوم الحساب“۔ (۶)

دیوان نہایہ اکمال کے خطبے میں لکھتے ہیں:

”بسم الله الواهب المذی وهب الشعراء المتبحرة أقلاما جارية على بحور الاشعار وجعل محاربهم آبارا تفيض من قطر قطراتها البحار، حتى يجرى منها الظلام والضياء، ذلك فضل الله يؤتيه من يشاء، أحمدته وأمدح أحمدته محمد المذی فاح طيب الوحي من فيه وأنزل إليه لاريب فيه، عليه صلوة الحكيم العليم، ذى الفضل العظيم، وعلى أصحابه الذين فضلهم الله على أفاضل الأمم بفضائل النعم، انه طلعا رويانا من بحور رحمته نزل عليهم اجمعين“۔ (۷)

امیر خسرو نے اپنے استاد علامہ شہاب الدین کو تحریر کر دیا ہے ایک طویل عربی خط میں جو کچھ لکھا ہے اس کا ایک مختصر اقتباس ہے:

”أما بعد فان مرقوقك القليم خسروين لاجين يعرف بالنديم وضع المقلدة اليمنى على سلتك العلياء وسود التراب بمس السواد حتى يصير كحلا فكلحل بعين السواد، ثم امضى على وأيك المنير مضى اليدر المنير أن الصانع تعالى عن الخطاء قلمه في إنشاء المصنوعات وتنزه عن الغلط وقده في إبداع المنشآت، وهب لي بفضلته العظيم فهيا فيها الاهواء، إن الفضل بيد الله يؤتيه من يشاء“۔ (۸)

اب تک جو نمونے پیش کئے گئے ہیں ان کا تعلق خطبات اور مکتوبات سے تھا، اب ہم ان مقولوں، دعاؤں اور مختلف چھوٹے چھوٹے نثری جملوں کو ذکر کرتے ہیں جو انہوں نے ہمارے لیے یادگار چھوڑے ہیں، لیکن اس سے پہلے ضروری ہے کہ فنی نثر میں امثال اور مقولوں کی کیا اہمیت ہے اس پر تھوڑی سی روشنی ڈال لی جائے۔

مہر و کہتے ہیں کہ مثل مثال سے ماخوذ ہے، اور مثل اس مشہور قول کو کہتے ہیں جس میں دوسرے کے حال کی پہلے کے حال سے مشابہت پائی جاتی ہو، ابن السکیت کہتے ہیں: مثل وہ لفظ ہے جس کے الفاظ تو مسخر و بدلہ کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں لیکن معنی اسی کے حال کے موافق ہوتے ہیں۔

ابراہیم نظام مثل کے اجزائے ترکیبی کے تعلق سے لکھتے ہیں: مثل میں چار ایسی خصوصیت ہوتی ہے جو دوسرے کلام میں نہیں ہوتی، پہلا ایجاز، معنوی کمال، حسن تشبیہ، عمدہ کنایہ، اور اسی پر تو بلاغت مکمل ہو جاتی ہے، ابن المقفع لکھتے ہیں: مثل بولنے میں واضح، سننے میں پیارا اور معنوی لحاظ

سے سب سے زیادہ وسعت لیے ہوتا ہے۔ (۹)

امثال کے ذریعہ خطیب اپنی تقریر کو آراستہ کرتا ہے، نثر نگار اپنی نثر میں رنگ و روغن لگاتا ہے اور شاعر اپنے شعر میں گل بوئے جڑاتا ہے، اور عام لوگ بھی اپنی گفتگو میں اسے استعمال کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اور احادیث میں بھی کثرت کے ساتھ مثلین بیان کی گئی ہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”مثل الحيوة الدنيا كماء انزلناه من السماء فاختلط به نبات الارض فاصبح هشيشا تذروها الرياح“ (۱۰)۔ اور حدیث پاک میں ہے: ”مثل المنافق كالشاة العائرة بين الغنمين“ (۱۱)۔

امیر خسرو نے جو عربی مثلین لکھی ہیں ان میں مختلف قسم کی چیزوں کا سہارا لیا گیا ہے۔ مثلاً کچھ مثلین ایسی ہیں جن کا تعلق دین سے ہے، کچھ کا تعلق آسمان اور آسمان کے ستاروں سے ہے، کچھ کا تعلق برجوں سے ہے، عناصر اور بعد اور دوسری فلکیات کی چیزوں کی مدد سے بھی بہت سی مثلین تیار کی گئی ہیں، کچھ میں جانوروں، چوپایوں، پرندوں، پودوں اور جمادات کا بھی سہارا لیا گیا ہے۔ دینی امور کا سہارا لے کر تیار کیے گئے امثال کچھ اس طرح ہیں:

(۱) ما أضحى نور الله في خلد الظالم (ظالم کے دل میں اللہ کا نور نہیں رہتا)
(۲) حفظ الله لحية هارون من أخذ موسى (اللہ تعالیٰ ہارون کی ریش کو موسیٰ کی گرفت سے بچائے) (۳) لن يامن احد من ابى يحيى ولو خضر وعيسى (ابوہ کی موت) سے کوئی محفوظ نہیں رہ سکتا خواہ وہ خضر اور عیسیٰ ہی کیوں نہ ہو) (۴) كل من مات في حى عيسى ليس يسحب أن يحيى (ہر وہ شخص جس کو عیسیٰ علیہ السلام کی لگی میں موت آجائے ضروری نہیں کہ اس کو حیات مل جائے) (۵) الضعيف من مكف ذى الامان محمل على كسف سليمان (پناہ دینے والے کے پہلو میں کمزور انسان ایسے ہی ہے جیسے سلیمان علیہ السلام کے شانے پر چوٹی) (۶) مسكين ابراهيم لا يذبح اسماعيل (ابرہیم کی چھری اسماعیل کو ذبح نہیں کر سکتی) (۷) لذة الدنيا للاثم كدلة الاحلام في المنام (لوگوں کے لیے دنیا کی لذت ایسی ہے جیسا کہ حلام کی لذت) (۸) من مال ابي المال مات في الآمال (جو مال کی طرف مائل ہوتا ہے آرزوؤں میں ہی اس کو موت آتی ہے)۔

عناصر اربعہ سے تیار کی گئی مثلین اس طرح ہیں:

(۱) قليل النور تغمده بالريح وكثيرها توقد منها (تھوڑی سی آگ، ہوا سے بجھ جاتی ہے اور زیادہ آگ ہوا سے روشن ہوتی ہے) (۲) أمر الرياح على الغبار نافذ وعلى الجبال نافذ (ہوا کا حکم غبار پر چلتا ہے، پہاڑ پر نہیں) (۳) لا يمتصع الجمر بأسان البرد

(اتنگارے کو اولے کے دانت سے نہیں چبایا جاسکتا) (۴) لم تحصل الري برؤية الاسنان (برف جیسے دانتوں کو دیکھ کر پیاس نہیں بجھ سکتی) (۵) اذا سقط الرياحين فالتراب مسكي (اگر پھول مٹی پر گر جائے تو مٹی بھی خوشبو دار ہو جاتی ہے)۔

جانوروں، چوپایوں اور پرندوں اور جمادات کے استعمال سے تیار کی گئی مثلین کچھ اس طرح ہیں:

(۱) الاصلاق بناب الفيل اسهل من التعلق بباب البخيل (بختی کے دانت سے چٹنا بکھیل کے در سے چٹنے سے زیادہ آسان ہے) (۲) اذا زاد شعير الفرس جال على جو (گھوڑے کا چارہ جب زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ فضا میں اڑتا ہے) (۳) رقص البعير بليق بصوت الحمير (اونٹ کا رقص گدھے کی آواز پر ہی مناسب ہے) (۴) اذن الارب علم للفرار (خرگوش کے کان فرار کی نشانی ہیں) (۵) تمكن العنقاء في القاف تمكن القاف في العنقاء (عنقاء پرندہ کوہ قاف میں ایسے رہتا ہے جیسے لفظ عنقاء میں قاف) (۶) ما بلغ ماء البحر على نحر البط (سمندر کا پانی بھی بٹخ کی گردن تک نہیں پہنچتا) (۷) يبلغ اجل العصفور حين لعب مع الباذي (جب گوبر یا زکے ساتھ کھیلے تو کچھ لو کہ گوبر یا کی موت آگئی) (۸) ريش الديك ليس من المعامن (مرغ کی ڈاڑھی حسن نہیں ہے)، اذا حان بصفدع البئر مشته اعتصم بحبل الحية (جب کنوئیں کے مینڈک کی موت آتی ہے تو وہ سانپ کی رسی تھامتا ہے) (۹) سنان البطل لسان الاجل (بہادر کا تیزہ موت کا پیغام پہنچاتا ہے) (۱۰) اذا خرج الحية من حجر قتلت بالحجر (جب سانپ سوراخ سے نکلے تو اس کو پتھر سے قتل کر دیا جائے)۔ (۱۲)

امیر خسرو نے رنگ و رنگ وعاقوں کے جو نمونے ذکر کیے ہیں ان میں سے چند درج ذیل ہیں:

(۱) شوس القبول صدغها كخشويس القلوب (پروائی ہوا اس کی کپٹنی کے بال کو ایسے پریشان رکھے جیسا اس نے عاشقوں کے دلوں کو پریشان کیا) (۲) دام شبكة صدغها (اس کی کپٹنی کا بال دام عاشقان بنا رہے) (۳) لا زالت ذوا البها مسودة (اس کی ریشیں سیاہ رہیں) (۴) جعل الله ترائبها نوراً لشعاع خلدھا (اللہ تعالیٰ اس کے سینے کو اس کے رخسار کا نور بنا دے) (۵) أنبت الله عشقة العشق على قبرها من دموع العاشقين (اللہ تعالیٰ عاشقوں کے آنسو سے اس کی قبر پر عشق کا پودا لگائے) (۶) عذبها الحضان بنساحة المنهممين (اللہ تعالیٰ غم عاشق میں رونے والوں کے سبب اسے عذاب دے) (۷) نور بياض عينيه بسواد خالنا (ہمارے گل کی سیاہی سے اس کی آنکھوں کی پتلی نور ہو) (۸)

حشره الله مع المجنون (اللہ اسے مجنون کے ساتھ اٹھائے) (۹) طالع لیا لہ کأ صداعی (اس کی رات میرے کپٹی کے بال کی طرح طویل ہو) (۱۰) طالع علیہ سلسلۃ العذاب کجعده (اس کے گھٹنگھریلے بال کی طرح اس پر عذاب کا سلسلہ طویل ہو) (۱۳)

امیر خسرو کی عربی نثر نگاری پر کچھ لکھتے ہوئے علم بلاغت میں ان کی مہارت کا ذکر فائدہ سے خالی نہیں ہوگا، کیوں کہ کوئی بھی نثر نگار جب تک علم بلاغت سے اسے حصہ نہ حاصل ہو وہ اچھی نثر نہیں لکھ سکتا۔ ان کی کتابوں کے مطالعے سے یہ بات آشکارا ہو جاتی ہے کہ علم بلاغت پر انہیں زبردست مہارت حاصل تھی، اور اس دعویٰ پر ان کی کتاب اعجاز خسروی اور غرۃ الکمال کا دیکھا چہ شاہد ہے، خاص طور سے اعجاز خسروی جس کو رسائل الاعجاز کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، اس میں امیر خسرو نے مختلف بلاغی بحثیں کی ہیں اور ان کے جو نمونے انہوں نے پیش کیے ہیں وہ عموماً طبع زاد ہیں۔

علم بلاغت کا اطلاق علم معانی، بیان اور پہلچ پر ہوتا ہے، علم معانی، علم بیان اور پہلچ پر ان کی مہارت کا اندازہ مذکورہ نمونوں سے بھی لگایا جاسکتا ہے، لیکن خصوصیت کے ساتھ علم پہلچ میں ان کو جوابدہائی قوت اور تخلیقی صلاحیت عطا ہوئی ہے وہ دوسروں سے بہت ممتاز ہے بلکہ انہوں نے بہت سے محسنات لفظی اور معنوی کے تعلق سے انفرادیت کا بھی دعویٰ کیا ہے۔ وہ دعویٰ کتنا درست ہے ہمیں اس سے بحث نہیں، ہمیں بحث اس بات سے ہے کہ ان کو علم بلاغت پر بڑی قدرت حاصل ہے اور اس کے ذریعہ ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ ان کو عربی نثر نگاری پر کتنی قدرت رہی ہوگی۔ ہم ذیل میں ان چند صنائع کا ذکر کرتے ہیں جن میں تفرد کا انہوں نے دعویٰ کیا ہے:

۱- ذوالوہمیں یہ صنائع کی ایک قسم ہے جس میں کسی عبارت کو اس طرح لکھا جاتا ہے کہ لفظوں میں تبدیلی کر کے اس کو مختلف زبانوں میں پڑھا جائے، مثلاً امیر خسرو لکھتے ہیں:

رسیدی، بدیدی، مرادی، بہ خانے

زمانے بہ باشی بہ یاری نسائی

اس کلام مظلوم کو عربی میں اس طرح پڑھا جاسکتا ہے:

رشیدی، ندیدی، مرادی، نجاتی

زمانی بیاس تباری نسائی

(۱۴)

۲- قلب السامین: یہ بھی صنائع کی ایک قسم ہے اور ایسا جملہ لکھنا جس میں اس جملہ کو دوسرے کنارے سے پڑھا جائے وہ دوسری زبان میں با معنی بھی ہو جائے، اسے قلب السامین

کہتے ہیں:

حضرت امیر خسرو لکھتے ہیں:

بیائی یار کہ ماکاری کنیم بہم

ہر جا کہ باش باسن باش

اس شعر کو دوسری طرف سے پڑھا جائے تو عربی میں اس طرح عبارت بنے گی:

مہب مہبک یراک امک رای یائب

شاب نم آب شاہک اجرہ

(۱۵)

۳- وصل الحرفین: یہ بھی صنائع کی ایک قسم ہے جس میں استعمال کیے گئے کلمات مقرر نہیں ہوتے بلکہ دو حرفی ہوتے ہیں:

امیر خسرو لکھتے ہیں:

عش نزهة حاطک فالیم سائل

فاجب لربک ماتوقع عویل

(۱۶)

خاتمہ

مختلف گوشوں سے کی گئی گفتگو سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ امیر خسرو کو عربی نثر نگاری پر بڑی قدرت تھی اور ان لوگوں کا نظریہ درست نہیں جو اس بات کے قائل ہیں کہ امیر خسرو عربی زبان سے اچھی طرح واقف نہیں تھے لیکن ہم ساتھ ہی اس بات کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ امیر خسرو کی نثر نگاری قاضی فاضل اور حریری و ہمدانی کے طرز کی ہے، اور ظاہر ہے کہ امیر خسرو کے عہد میں خود عرب نثر نگاروں کی بھی صورت حال یہی تھی کہ ان کا عمومی سرمایہ نثر فارسی اسلوب، فارسی تشبیہات اور فارسی مواد سے بھرا ہوا تھا، صنائع لفظی و معنوی کے دل دادہ تھے۔ چنانچہ تو یہ، اشتقاق کا کثرت سے استعمال کیا کرتے تھے، اور جس طرح اس دور میں کی گئی عربی نثر نگاری کو تاریخ ادب عربی سے لگا نہیں جاسکتا ہے اسی طرح اس زمانے میں یا بعد کے زمانے میں غیر عرب قلم کاروں کی جانب سے اس طرز کی عربی نثر نگاری کو بھی تاریخ ادب سے خارج نہیں کیا جاسکتا اور بے وقعت نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

حاصل یہ کہ امیر خسرو عربی زبان سے اچھی طرح واقف تھے اور انہوں نے بھی اپنے زمانے میں رائج اسلوب میں عربی نثر نگاری کی ہے، وہ جہاں ایک عہد کی نمائندگی کرتی ہے وہیں

امیر خسرو کی مختلف الجہات شخصیت کو واضح کرتی ہے، اور یقیناً ان کی عربی نثر نگاری ان کے معاصرین کے لحاظ سے کسی بھی طرح کمتر نہیں ہے، خصوصاً خیال کی رنگینی سے جو انہوں نے مختلف طبع زاد قتلے اور مثالیں لکھی ہیں اور جدت طرازی سے پر جو دعائیں انہوں نے انشا کی ہیں وہ انہی کا حصہ ہیں۔

حواشی اور حوالے

The life & works of Ameer Khusru, Vol P: 34, (I)

Calcutta- 1935.

- (۲) دیباچہ غرقہ الکمال، ص: ۳، مطبوعہ دار تحقیقات عربی و فارسی، پٹنہ، بہار-۱۹۸۸ء
- (۳) فصول فی القند، ص: ۳۷، مطبوعہ شجرہ عربی، علی گڑھ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔
- (۴) طحسمین، من تاریخ الادب العربی، ج ۲، ص: ۲۱۳، دارالعلم للملایین، بیروت، ۱۹۸۲ء
- (۵) امیر خسرو، خطبہ خزائن الفتوح، ص: ۱، مطبوعہ علی گڑھ، ۱۹۷۷ء
- (۶) خطبہ اعجاز خسروی، رسالہ اولی، مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۷ء۔
- (۷) خطبہ دیوان نہایت الکمال، مطبوعہ مکتبہ قیسریہ، دہلی، ۱۳۳۲ھ۔
- (۸) امیر خسرو، اعجاز خسروی، رسالہ ثانیہ، خط سادس، ص: ۱۶۹، منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۷ء
- (۹) الامیدانی، ابوالفضل احمد بن محمد النیشاپوری، مقدمہ مجمع الامثال، ص: ۶، المطبعہ الیہیہ
- (۱۰) القرآن الکریم، الکلیف: ۲۵۔
- (۱۱) مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان۔
- (۱۲) اعجاز خسروی، رسالہ ثانیہ، خط سابع، ص: ۱۸۳-۱۸۹۔
- (۱۳) نفس مصدر، ص: ۱۹۰-۲۳۱۔
- (۱۴) نفس مصدر، رسالہ ثالثہ، ص: ۸، مطبوعہ منشی نول کشور لکھنؤ، ۱۸۷۷ء
- (۱۵) نفس مصدر، ص: ۶۲۔
- (۱۶) نفس مصدر، ص: ۷۸۔

(نوٹ: یہ مقالہ شاہ فی موریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام سید سرادق الہ آبادی میں اکتوبر ۲۰۱۰ء میں منعقد سیمینار بعنوان ”حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور فن“ میں پڑھا گیا تھا۔

○○○

مولانا الرشاد عالم رحمانی

امیر خسرو کی فارسی نعتیہ شاعری

حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ (۶۳۸ھ/۷۷۵ھ) ہندوستان کے ایک شہرہ آفاق فارسی شاعر اور صاحب دل صوفی بزرگ تھے۔ آپ اپنے وقت کے ولی کامل، سلطان المشائخ حضرت خواجہ نظام الدین محبوب الہی بدایونی ثم دہلوی کے بڑے چیمپے اور محبوب نظر مرید تھے۔ حضرت محبوب الہی کی صحبت و بیعت کے نتیجے میں جہاں آپ کی عملی زندگی میں انقلاب آیا وہیں آپ کی فکری، علمی اور فنی صلاحیتیں بھی خوب خوب پروان چڑھیں۔ متعدد سلاطین کے دربار سے وابستگی کے باوجود آپ کی عملی زندگی مرشد طریقت کی صحبت، عقیدت اور الہانہ وابستگی کے لحاظ سے مثالی ہے۔

آپ کی شاعرانہ عظمت و لیاقت، بلند فکری اور قادر الکلامی پر اب تک بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اصحاب علم و ادب نے آپ کی فارسی شاعری کے ساتھ ہندوی کلام نیز ان کی فارسی زبان و ادبی کے حوالے سے بہت کچھ خامد فرسائی کی ہے اور مختلف زاویہ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ تاہم آپ کی نعتیہ شاعری کے حوالے سے ابھی بہت کچھ لکھا جانا باقی ہے۔ ارباب ادب جس طرح اردو شاعری میں نعتیہ شاعری کو ادبی مقام دینے اور اس کا ادبی تجزیہ کرنے سے دانستہ صرف نظر کرتے ہیں، اسی طرح فارسی شعرا کے کلام کے تجزیہ میں دوسرے اصناف و عناصر کو بطور خاص ملحوظ رکھتے ہیں جب کہ نعتیہ شاعری سے صرف نظر کر جاتے ہیں۔ چنانچہ یہی کچھ حضرت امیر خسرو کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ آپ کی شاعری کے دیگر پہلوؤں کو خوب خوب اجاگر کیا گیا ہے لیکن نعتیہ شاعری کا جائزہ اب تک نشہ ہے۔ حضرت امیر خسرو علیہ الرحمہ کی نعتیہ شاعری کا تجزیہ کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے شاعرانہ کمالات کا ایک مرمری جائزہ پیش کر دیا جائے۔

کمالات خسرو

حضرت امیر خسرو ایک جامع کمالات شخصیت کے مالک تھے۔ شاعری کا مالک آپ کے اندر فطری تھا۔ غزل، مثنوی، قصیدہ، قطعہ اور رباعی سبھی اصناف سخن میں آپ نے طبع آزمائی کی۔

متعدد زبانوں کے ماہر تھے۔ عربی، فارسی، سنسکرت اور ہندوی میں ان کو کمال حاصل تھا۔ آپ کی شاعری کے نمونے ان زبانوں میں خوب ملتے ہیں۔ آپ ہندوستان میں فن موسیقی کے متعدد راگوں کے موجد تسلیم کیے جاتے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں:

”انہوں نے اس فن کو اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا۔“ (۱)

فارسی شاعری کے تو وہ مسلم الثبوت استاذ تھے جس کا اعتراف ایرانی فضلا نے بھی کیا ہے۔ بقول رام بابو سکسینہ: ”وہ اردو کے بھی سب سے پہلے شاعر تھے۔“ (۲)

عشق و محبت اور سوز و گداز ان کی خیر کے نمایاں اجزاء تھے۔ عشق مجازی سے جب عشق حقیقی کی طرف مائل ہوئے تو اس میدان میں ان کے پیر و مرشد محبوب الہی حضرت نظام الدین اولیاء نے ان کی صحیح رہنمائی فرمائی۔ عمر کے ابتدائی ایام سے ہی خسرو کا ایک پیر کامل کی صحبت میسر آ گئی۔ پیر و مرشد محبت میں آپ کو ”ترک اللہ“ کہا کرتے تھے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حضرت امیر خسرو کو سلطان الشعراء، برہان الفضلاء اور شاعری میں ”یگانہ عالم“ کے القاب سے یاد کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”آپ سلطان الشعراء، برہان الفضلاء، وادی خطابت و سخن کے عالم فرید و وجید، نوع انسانی کے دونوں جہان میں منتخب اور بے پایاں تھے۔ مضمون نگاری، معنی آفرینی، شعر گوئی اور تمام اقسام سخن میں آپ کو وہ کمال حاصل تھا جو محققین و متاخرین شعراء میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنے اشعار کو اپنے پیر کے فرمان و ارشاد کے مطابق اصطفائی طرز اور نیک پر کہا ہے۔“ (۳)

دولت شاہ ہرقندی نے اپنے تذکرہ شعراء میں آپ کو ”خاتم الکلام فی آخر الزمان“ اور ”در وریائے معانی“ کے القاب سے یاد کیا ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی نے انہیں ”طوطی ہند“ کے لقب سے یاد کیا ہے۔ ڈاکٹر نور الحسن خسرو کی نعتیہ شاعری کی نمایاں خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ان کا نعتیہ کلام نہایت ہی دلکش، روح افزا اور ایمان پرور ہے۔ اگرچہ مقدار میں کم ہے مگر جو کچھ ہے وہ امتیاز کی شان کا حامل ہے اور مقبول خاص و عام ہے۔ اکثر شعرا زور بیان اور شدت جذبات کی وجہ سے اس راہ میں بھٹکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کوئی عہد و معبود کے امتیاز کو مٹا دیتا ہے۔ کوئی سراپا نگاری میں ایسی بے سرو پا باتیں کہتا ہے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں نہیں۔ کسی نے نعت کی پاکیزہ صنف کو غزل بنا ڈالا اور کوئی صرف معجزات کے ذکر پر اکتفا کرتا ہے۔ خسرو اب شناس محبت اور رمز گاہ حقیقت تھے۔ وہ اپنے جذبات عقیدت کا اظہار خلوص کے ساتھ کرتے ہیں، لیکن پاس اوب ملحوظ رکھتے ہیں۔“ (۴)

امیر خسرو بحیثیت شاہنشاہ مصطفیٰ

خدا کی محبت کے ساتھ حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت جزو ایمان ہے۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ”قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحِبِّکُمُ اللّٰهُ“۔ (۵)

اے محبوب! آپ فرما دیجئے! اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں: ”لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اُحِبُّوَہُ“۔ (۶)

احبب الیہ من والدہ وولیدہ والناس اجمعین۔ (۷)

تم میں سے کوئی شخص ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے سر و یک اس کی اولاد، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔

حضرت امیر خسرو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے سچے عاشق تھے۔ اطاعت و اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ صادق ان کے ہر قول و فعل سے ظاہر ہوتا تھا۔ اسی جذبے کا نتیجہ تھا کہ آپ بارگاہ رسول میں مقبول تھے۔ بارگاہ حبیب خدا میں آپ کی مقبولیت کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ آپ اپنے مرشد کی زبانی خود فرماتے ہیں:

”ایک دن میں نے مرشد کی زبان سے سنا، آپ نے فرمایا: آج رات مجھے ایک آواز منائی دی کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خسرو کو ”مداح“ (تہریف کرنے والا) کے لقب سے یاد فرما رہے ہیں۔ غیب سے ہمارے پاس یہ خطاب آیا ہے جو حضور سراپا نور صلی اللہ علیہ وسلم کا عطا کردہ ہے اور ان شاء اللہ اس نام و خطاب کی بدولت یہ خادم بہت سے دیگر انعامات کا امیدوار ہے۔“ (۸)

حضرت امیر خسرو نے سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح و ثنا میں اپنی مثنوی اور غزل میں جگہ جگہ سرکار رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف حمیدہ و کمالات نبوت کا ذکر بڑے عارفانہ اور دلہانہ انداز میں کیا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ سرکار اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی کما حقہ مدح و ثناء بیان کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں، ہاں! صرف یہ ہو سکتا ہے کہ نعت گو شاعر کچھ اوصاف و کمالات محمدی کے بیان کے ساتھ اپنے قلبی احساسات و جذبات کا اظہار کر کے اپنی محبت و عقیدت کا خراج پیش کر سکے۔ چنانچہ یہی بات امیر خسرو پر بھی صادق آتی ہے۔ وہ حضرات جنہوں نے امیر خسرو کی شاعری کے نعتیہ عناصر کا مطالعہ کیا ہے انہوں نے صاف طور سے خسرو کے والہانہ عشق رسول کا اعتراف کیا ہے بلکہ بعض نے تو ”تغنی الرسول“ کے درجے پر آپ کا فائز ہونا بھی تسلیم کیا ہے سید صبا الدین عہد الرحمن اپنی کتاب ”مصفوفی امیر خسرو“ میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

”ان کی نعتیہ شاعری کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے پیروشی نظام الدین اولیا کی طرح فنا فی الرسول کے درجہ پر فائز تھے۔“ (۸)

حضرت امیر خسرو نے اپنے نعتیہ کلام میں جن خیالات و افکار کا خصوصیت سے بیان کیا ہے ان میں یہ موضوعات نعت بطور خاص قابل ذکر ہیں:

۱- رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا باعث تخلیق کائنات ہونا۔

۲- آپ کا پر تو جمال الہی و منظر ذات خداوندی ہونا۔

۳- سرور و شرف عاصیوں کی شفاعت فرمانا۔

۴- نور من نور اللہ ہونا۔

۵- آپ کی زبان سے اللہ تعالیٰ کا کلام فرمانا۔

۶- آپ کا خیر الائم ہونا۔

۷- خلق خدا کی دعا مقبول ہونے کے لیے آپ کی ذات مقدسہ کا وسیلہ اور آپ کا شفیع ہونا۔
مندرجہ بالا اوصاف وہ ہیں جن کا ذکر انہوں نے بار بار کیا ہے۔ بطور نمونہ ذیل میں اس تعلق سے ان کی مثنویوں اور غزلوں میں سے کچھ منتخب اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت اور نور محمدی کی اولیت بیان کرتے ہوئے امیر خسرو فرماتے ہیں:

شاہ رسل شفیع مرسل خورشید پسیم و نور اول

ہم نور وہ چراغ بینش ہم چشم و چراغ آفرینش

ثنا ہست تحت آسمانی خوانندہ تحفہ نہانی

سلطان ممالک رسالت طغرائے حقیقہ جلالت

یا رسول اللہ! آپ رسولوں کے بادشاہ ہیں، شفیع خلایق ہیں، آپ کا نور پہلے اور آفتاب بعد میں پیدا ہوا۔ آپ عقل کے چراغ کو نور عطا کرنے والے ہیں۔ آفرینش کے چشم بھی ہیں اور چراغ بھی۔ آسمانی تخت کے شہنشاہ، لوح محفوظ کی تحریر پڑھنے والے۔ مملکت رسالت کے سلطان اور حقیقہ جلالت کے طغرائے ہیں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات باعث تخلیق کائنات ہے بلکہ اصل وجود کائنات ہے۔ اسے بیان کرتے ہوئے امیر خسرو فرماتے ہیں:

زمولیش چراغ را منشور لولاک ز ریش کعبہ را زنجیر افلاک

میجا از دم خود رفتہ جالیش خضر از آب حیوان شستہ پالیش

یا رسول! اگر آپ نہ ہوتے تو آسمان پیدا نہ کیا جاتا اور کعبہ کو بھی رفعت حاصل نہ ہوتی۔

حضرت عیسیٰ نے اپنے دم سے آپ کی جگہ صاف کی اور حضرت خضر نے آب حیات سے آپ کے قدم دھوئے۔

اولیت محمدی کو بیان کرتے ہوئے امیر خسرو فرماتے ہیں:

ہنوز آدم اندر گل و آب بود کہ او قبلہ ہفت محراب بود

خلیل از وجودش پر انوار گشت کہ بروے گل مار گشتار گشت

سلیماں کہ شد شاہ دیو و پری ازو باقیہ تاج و انگشتری

لقا پیش ازو کہ وہ موسی ہوس نمودن سنگش کہ ایں پیش و پس

چوں اور لیس در خلد شد پیش او نگہداشت طوبی بر خویش ازو

ساعیل رو مایہ داشت پاک از او دشنہ نہ قلند خویش آفاک

پہ ملاحتش نوح چوں در نشست زبے آبی قدم خود باز دست

چنان سجدہ کردش مہ و آفتاب کہ یوسف ندید آن کرامت پہ خواب

چوں جاں بخش شتر بہ نطق فصیح نمادہ زحیرت دم اندر مسیح

چوں از معجزاتش برانم سخن قدر لرزہ در آسمان کہن

اختیارات مصطفیٰ کو بیان کرتے ہوئے امیر خسرو فرماتے ہیں:

اے نعمت سخج خدا را کلید گوہر آب سخج تو کردی پدید

از تو صلایے بہ الست آمدہ نیست بہ مہمانی ہست آمدہ

غرہ ماہ از خم امروئے تست طرہ شام از منگن موئے تست

آپ کی بات خدا کے خزانے کی کنجی ہے۔ اس خزانے کا گوہر آپ ہی نے ظاہر کیا۔ آپ

ہی کی وجہ سے الست کی آواز بلند ہوئی اور نیست ہست میں تبدیل ہو گیا۔ آپ ہی کا خم امروہا ہلال

میں ہے۔ آپ ہی کے موئے مبارک کی منگن شام ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریر حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

رسول قوی جہت آشکار بہ حکمت درست و بہ حکم استوار

آپ رسول قوی اور آپ حق کے واضح ثبوت ہیں۔ آپ کی حکمت درست ہے اور آپ

نے جتنا حکم دیا ہے وہ ہر طرح مضبوط ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم صفت شفیع عاصیاں ہونا بھی ہے۔ آپ دنیا و

آخرت دونوں میں امت کے شفیع ہیں، لیکن حقیقی شفاعت کا اظہار و اعلان میدان محشر میں ہوگا۔

جہاں سب اولین و آخرین لواء الحمد کے نیچے جمع ہوں گے۔ حضرت امیر خسرو نے جگہ جگہ حضور

رسالت ماب صلی اللہ علیہ وسلم کے اس وصف خاص کا اظہار فرمایا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

عاصیاں را در آفتاب نشور غل ممدود واد از منشور

ذات او خلق را تکلید نجات ہم حیات جہاں ہم آب حیات

گناہ گاروں کو قیامت کے روز کے آفتاب کے نیچے آپ ہی کے حکم سے لمبا سایہ کیا جائے گا۔ آپ کی ذات مقدس مخلوق کے نجات کی کنجی ہے۔ دنیا کے لیے حیات بھی ہے اور آب حیات بھی۔

امیر خسرو نے جہاں اپنی تعنوں میں اپنے مرشد کے جذبات و خیالات کی ترجمانی کی ہے وہیں اساتذہ فن کی تقلید میں بھی نعیتیں کہی ہیں۔

ذیل میں حضرت نظامی گنجوی اور امیر خسرو کے کچھ متوازی نعتیہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں:

اے ختم پیغمبران مرسل خلوائے پسین و طح اول (نظامی)

شاہ رسل و شفیع مرسل خورشید پسین و نور اول (خسرو)

اے عالم کشور کفایت فرمان دہ جملہ ولایت (نظامی)

سلطان ممالک رسالت طغرائے صحیفہ جلالت (خسرو)

اے خاک تو تو توتائے بنش روشن بہ تو چشم آفرینش (نظامی)

ہم نور وہ چراغ بنش ہم چشم و چراغ آفرینش (خسرو)

خاک تو اویم روئے آدم نور تو چراغ ہر دو عالم (نظامی)

گنجینہ کیمیائے عالم پیش از ہمہ پیشوائے عالم (خسرو)

ستون شد خرومند از پشت او مد انگشت کش گشت ز انگشت او (نظامی)

حمایت نشیں چراغ از پشت او مد از واغداران انگشت او (خسرو)

ان اشعار کو سید صباح الدین عبد الرحمن نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

”مقابلہ و موازنہ سے قطع نظر یہ کہنے میں تا مل نہیں کہ نظامی گنجوی نے جس جذبہ پاک سے اپنی نعیتیں کہی ہیں اسی والا نہ جذبے سے خسرو نے بھی اپنے نعتیہ اشعار کہے اور جس طرح نظامی نے ہر نعت کے بعد معراج کا ذکر کیا ہے، اسی طرح خسرو نے معراج محمدی لکھ کر اپنی عقیدت و محبت کے نذرانے پیش کیے ہیں، جن کو پڑھ کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے مرشد ہی کی طرح عشق رسول میں غرق تھے۔ (۹)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف و کمالات اس قدر بلند پایہ ہیں کہ اس کے بیان سے انسانی عقل عاجز ہے۔ ہر شاعر و صف رسول کے بیان میں اپنی کوتاہ نظری اور عجز کا اعتراف کرتا

ہوا نظر آتا ہے۔ حضرت امیر خسرو نے بھی ایک جگہ اپنے اعترافِ عجز کا اظہار یوں کیا ہے:

و عیش از حد عقل و جاں ہتر بارگا ہش از لامکاں ہتر

آپ کا وصف بیان کرنا عقل سے باہر ہے۔ آپ کی بارگاہ لامکاں سے بہتر ہے۔

مآخذ و مراجع

۱۔ شعر الجم ج ۲: ص ۱۳۵، مطبوعہ اعظم گڑھ

۲۔ تاریخ ادب اردو، سکینہ

۳۔ اخبار الاخبار مترجم: ص ۲۶۱، مطبوعہ، دہلی

۴۔ ص: ۳۵، مقدمہ دیوان امیر خسرو، مطبوعہ لکھنؤ

۵۔ آل عمران

۶۔ متفق علیہ

۷۔ اخبار الاخبار مترجم، ماہ نو، ہیکل کیشنور، دہلی ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء

۸۔ ص: ۱۳۵، صوفی امیر خسرو، سید صباح الدین عبد الرحمن، دار المصنفین اعظم گڑھ

۹۔ ایضاً

(نوٹ: یہ مقالہ شاہ فی میموریل ٹرسٹ کے زیر اہتمام میسر واں الہ آباد میں اکتوبر ۲۰۰۱ء میں

مشہور سیمینار بعنوان ”حضرت امیر خسرو کی شخصیت اور فن“ میں پڑھا گیا تھا۔

○○○

آئینہ حیات

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی

نام: احمد بن عبد الاحد فاروقی سرہندی

عرف: مجدد الف ثانی

لقب: شیخ الافغانی، امام ربانی، مجدد الف ثانی

ولادت: ۱۴ شوال ۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء

اساتذہ و مشایخ: والد ماجد شیخ عبد الاحد سرہندی، شیخ کمال الدین کشمیری، شیخ یعقوب صرہفی، قاضی بہلول بدخشی، شاہ سکندر کبھلی، شیخ رضی الدین محمد باقی باللہ عرف خواجہ باقی باللہ دہلوی

کھلافت: مجدد، مصوفی، واعظ، مصنف، شاعر، فقیہ، محدث

مسلک: حنفی، ماتریدی

اجازت و خلافت: شیخ عبد الاحد چشتی (۱۰۰۷ھ) شاہ سکندر کبھلی قادری (۱۰۲۳ھ) خواجہ باقی باللہ نقشبندی (۱۰۱۲ھ)

خبرۃ قدوسیہ: حضرت شاہ کمال قادری کبھلی نے شاہ سکندر کبھلی قادری کو خرقہ قادریہ عطا کرتے ہوئے حضرت مجدد و تک پہنچانے کی وصیت کی تھی۔ حضرت شاہ سکندر کبھلی قادری نے اسے مجدد صاحب کو عطا کیا اور آپ نے اسے زبیر تن فرمایا۔

مستأثر تلامذہ و خلفاء: خواجہ محمد صادق، خواجہ محمد معصوم، خواجہ آدم بنوری، بدیع الدین مبارک پوری، بدر الدین سمرقندی، خواجہ عبید اللہ، خواجہ عبد اللہ، عبد الباقی دہلوی، صالح کولابی، احمد برکی، یار محمد جدید بدخشی، یوسف سمرقندی، نور محمد بھٹی، میر محمد نعمان، حمید بنگالی، محبت اللہ مانک پوری، طاہر لاہوری۔

زاویہ

حضرت مجدد الف ثانی کی شخصیت اور ان کے اصلاحی کارناموں پر خصوصی گوشہ

تجدیدی اور اصلاحی کا دنا ہے: امر اور سلاطین کو دعوت۔ علمائے سوا اور جاہل صوفیہ کی اصلاح۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر دعوتی و فوڈ کی روانگی۔ شریعت و سنت کا احیا۔ سائنسین و طالبین کی تربیت۔ مکتوبات کے ذریعے اصلاح و احیاء دین۔ زمانہ اسیری میں غیر مسلموں میں دعوت و تبلیغ۔ وعظ و نصیحت مخلوق کا رجوع عام اور توبہ و انابت وغیرہ۔

تصنیفات: تعلیقات عوارف، حاشیہ عقائد جلالی، رسالہ فی اثبات النبوة، عبد و معاویہ، مکاشفات غیبیہ، معارف لدنیہ، روالرقصہ، مقتود الصالحین، مسئلہ وحدۃ الوجود، جذب و سلوک، آداب المریدین، مجموعہ تصوف، مکتوبات شریف تین جلدیں وغیرہ۔

معاصر علماء و مشائخ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی، شیخ محبت اللہ آبادی، شیخ محمد رشید جون پوری، شیخ شہباز محمد بھاکل پوری، شیخ طیب بن معین بناری، شیخ تاج الدین سمنگلی، میر سید عبدالواحد بگرامی، میر سید عبدالجلیل بگرامی، ملا عبدالقادر بدایونی، مولانا عبداللہ انصاری، شیخ نظام الدین تھانیسری، شیخ نورالحق بن عبدالحق دہلوی وغیرہ۔

وفات: ۲۹ مفر ۱۰۳۲ھ / ۱۶۲۲ء

پروفیسر اختر الواسع

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان

مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی (۱۵۶۲ء-۱۶۲۲ء) عہد اسلامی کے ہندوستان کی وہ عظیم شخصیت ہیں جس نے انتہائی نازک عہد میں سرمایہ ملت کی نگہبانی کی۔ شیخ احمد کو دو وجہوں سے مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے۔ ایک تو آپ تاریخ اسلامی کے دوسرے ہزارے میں پیدا ہوئے اور ایک حدیث شریف میں ہے کہ اس امت میں ہر سو سال پر ایک شخص اٹھے گا جو دین کی تجدید کرے گا اور مجدد الف ثانی کے تجدیدی کارنامے ہزار سال کے سرے پر ظہور پذیر ہوئے اس لیے ان کو الف ثانی یعنی دوسرے ہزارے کا مجدد کہا گیا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اکبر بادشاہ کے نظریہ الف ثانی یعنی یہ کہ اسلام اپنی تاریخ کے ہزار سال مکمل کر چکا جو کسی مذہب کی طبعی عمر ہوتی ہے، اب نئے ہزارے میں نئے دین کی ضرورت ہے۔ شیخ احمد نے اس نظریے کو اپنے قول و عمل سے باطل قرار دیا اور بتایا کہ اسلام کی عمر کو پہلے یا دوسرے ہزارے میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا بلکہ وہ رہتی دنیا تک چراغ ہدایت ہے۔ اس لیے شیخ احمد کو مجدد الف ثانی کہا جاتا ہے۔ شیخ کے ایک معاصر اور بہت بڑے عالم ملا عبدالکحیم سیالکوٹی نے آپ کو یہ لقب دیا اور ایسا مشہور ہوا کہ اب صرف مجدد الف ثانی بھی کہا جائے تو اس سے مراد شیخ احمد سرہندی ہی ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال نے شیخ احمد کے دہار میں حاضری دے کر اس طرح خراج عقیدت پیش کیا:

حاضر ہوا میں شیخ مجدد کی لحد پر
وہ خاک کہ ہے زیر فلک مطلع انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار
گردن نہ جھکی جس کی چہ انگیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احمرار

وہ ہند میں سرمایہ ملت کا گنہگار

اللہ نے ہر وقت کیا جس کو خبردار

شیخ احمد نے جو تہذیبی کام نامہ انجام دیا اس کے تین پہلو ہیں۔ ایک سرکاری، دوسرے علما اور تیسرے صوفیہ، سرکاری سطح پر اس دور میں اکبر کے دین الہی کا چرچا تھا۔ اکبر نے یہ نظریہ پیش کیا کہ اب اسلام کو آئے ہوئے ایک ہزار سال پورے ہو گئے جو کسی بھی مذہب کی طبعی عمر ہے، اس لیے اب اسلام کو ختم کر کے نئے دین کا آغاز ہونا چاہیے۔ اکبر کے بعض درباری علما جیسے ابو الفضل، فیضی اور ان کے والد ملا مبارک، میر فتح اللہ شیرازی اور شریف آملی وغیرہ نے اکبر کی اس سلسلے میں بڑی مدد کی بلکہ یہ ہے کہ انہی درباری علما نے اکبر کو یہ راہ بھیجی اور اکبر نے مختلف مذاہب کی اخلاقی تعلیمات کو سمجھا کر کے ایک تیار کروایا جس کا نام دین الہی رکھا اور سرکاری طور پر اس کی تبلیغ و اشاعت کا کام شروع کیا۔ لیکن یہ مذہب تو پورے طور پر نام کام ہو گیا اور چند درباری لوگوں کے سوا کسی نے اس کو اختیار نہیں کیا۔ البتہ اس کے اثرات اسلام پر بہت نا روا مرتب ہوئے۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو کھلے عام تنقید کا نشانہ بنایا جاتا۔ وحی کا مذاق اڑایا جاتا۔ قیامت اور حشر و نشر کے تصورات کو نشانہ بنایا جاتا۔ شریعت کے محرمات کو کھال کر نام شریعت کر دیا گیا اور حلال چیزوں پر پابندی لگائی گئی۔ خطبہ جمعہ میں سے صحابہ کے نام نکال لیے گئے۔ عربی مذاہن کی امداد و توقف کر دی گئی، جو سیرت کے زیر اثر آگ کی عظمت کا بیان ہونے لگا وغیرہ، بہت سے اعمال ہیں، جن کا تذکرہ ابو الفضل نے آئین اکبری میں ملا عبد القادر دہلوی نے منتخب التواریخ میں اور خود شیخ احمد سرہندی نے مکتوبات میں کیا ہے۔

ان نامساعد حالات میں اسلام کے لیے بحیثیت ایک مذہب زندہ رہنا مشکل ہو گیا۔ متعدد مقامات پر مسجدیں شہید کی گئیں اور اسلامی اعمال کی انجام دہی مشکل ہو گئی۔ اسلام کے ارکان کو نشانہ بنایا جانے لگا حتیٰ کہ بہت سے مقامات پر مسلمانوں کی جائیں بھی محفوظ نہیں رہیں۔ شیخ احمد نے اپنے خطوط میں اسلام کی اس زبوں حالی کا تذکرہ کیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھیے: (مکتوبات جلد اول، مکتوب نمبر ۹۲، ۱۱۹۵ اور ۱۲۰۰)

اکبر کی وفات کے بعد تخت نشینی کے مسئلے میں جہانگیر کو بعض ایسے درباری امرا کی حمایت حاصل ہو گئی جو اکبر کی مذہبی پالیسی کے خلاف تھے۔ خاص طور پر صدر جہاں، امیر خاں اور شیخ فرید کی حمایت مل جانے سے جہانگیر تخت نشین ہوا۔ شیخ احمد نے ان تمام امرا کو خطوط لکھے اور ان کو قہر و لائی کہ وہ اسلام کو زبردستی زندہ کرنے کی جدوجہد کریں۔ مثلاً صدر الصدور صدر جہاں کے نام ایک خط میں لکھا ہے:

”اب جب کہ صورت حال بدل چلی ہے، لوگوں کی عداوتیں کم ہو چکی ہیں، اسلامی زعماء صدر اسلام اور علمائے اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ شریعت کو نافذ کرنے کی کوشش کریں۔ اسلام کے جوار کان منہمدم ہو گئے ہیں ان کو دوبارہ رائج کریں۔ اگر بادشاہ شریعت مصطفویہ کے نفاذ میں کوشاں نہ ہوا اور اس کے قریبی لوگ اپنے آپ کو اس معاملے میں معذور سمجھیں اور وقت کو اسی طرح گزار دیتا چاہیں تو آگے چل کر عام مسلمانوں کے لیے جن کو کوئی قوت حاصل نہیں ہے، زندگی دشوار ہو جائے گی۔“

اس طرح شیخ احمد نے اکبری عہد میں اسلام اور مسلمانوں پر ہوئے اثرات بد کے ازالے کے لیے کوششیں کیں اور دوسرے ہزارے کے تصور کے تحت اسلام کی جو چیزیں ترک کر دی گئی تھیں ان کا احیا کرنے کے لیے درباری امرا کو متوجہ کیا۔

شیخ احمد سرہندی کا دوسرا نامہ علمائے اصلاح کا تھا۔ اس زمانے میں بہت سے علماء خاص طور پر دربار سے وابستہ علماء کے زیر اثر بدعات اور شرکاتہ اعمال کا زور بڑھ گیا تھا، تاریخ اسلامی خاص طور پر عہد صحابہ پر سخت تنقیدیں کی جانے لگیں، قاضی نور اللہ شومسری، ملا محمود ہروی اور ان کے ہم خیال علما نے صحابہ کرام پر سب و شتم شروع کر دیا تھا۔ بہت سے علما وحجی اور نبوت پر شک کرنے لگے۔ شیخ احمد سرہندی نے ان اثرات کے ازالے کے لیے اثبات انبیاء اور درویشوں کو کتابیں لکھیں اور دلائل سے ثابت کیا کہ نبوت، خلاف عقل نہیں ہے اور حضرت محمد مصطفیٰ آخری نبی ہیں۔ نبوت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے جو وہ اپنے منتخب بندوں کو دیتا ہے۔ یہ کسی چیز نہیں بلکہ وہی نعمت ہے۔ کشف اور الہام کے ذریعے نبوت کی حقیقت کو جانا جاسکتا ہے لیکن یہ کشف و الہام سے بدرجہا بلند ہے۔ اسی طرح صحابہ کرام کے بارے میں لکھا کہ مشاہرت صحابہ اجتہادی عمل ہیں۔ حضرت علی بر سر حق تھے اور ان کے مخالفین غلطی پر تھے لیکن ان کی غلطی بھی اجتہادی تھی۔ اس لیے ان کو سب و شتم کرنا جائز نہیں ہے اور صحابہ کرام کی اس تنقیص سے خود بھی بچنے پر حرف آتا ہے کہ آپ نے (نعمو باللہ) ایسے لوگ تیار کیے جنہوں نے آپ کی وفات کے فوراً بعد آپ کی ہدایت کو چھوڑ دیا۔ اس طرح شیخ احمد نے علمی غیر شرعی مشاکیفوں پر تنقید کی اور صحیح افکار کی اشاعت کے لیے بھرپور کوشش کی۔ کتابوں کے علاوہ انہوں نے خطوط لکھ کر بھی لوگوں کی اصلاح کی کوششیں کیں۔

شیخ احمد سرہندی کے تہذیبی کارناموں اور اصلاحی کوششوں کا تیسرا بڑا میدان جاہل صوفیہ کی اصلاح اور ان کے اثرات کا ازالہ تھا۔ اس دور میں صوفیہ کے اندر سماع، وجد اور رقص عام تھا سفر انکس اور سمن کے مقابلے میں ذکر و اذکار کو اہمیت دیتے تھے۔ پیروں کے بارے میں یہ تصور عام تھا کہ ان کے اندر ایسی قوت ہوتی ہے کہ اگر وہ کسی سے ناراض ہو جائیں تو اس کو روحانی ترقی

سے محروم کر سکتے ہیں۔ پیروں کو سجدہ، تعظیمی کیا جاتا تھا، مزاروں پر منت مانگی جاتی تھی، وجودی صوفیہ تو شریعت کو چاہے قرار دیتے تھے، زندگی کا مقصد فنا اور بقا کے تجربات بن گیا تھا، کشف و کرامات پر بے انتہا اعتماد کیا جاتا تھا، بعض صوفیہ اپنے وضو کے ماء مستعمل کو بطور تبرک مریدوں میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ شیخ احمد سرہندی نے ان تمام امور پر تنقید کی اور ان کو بدعت قرار دیا۔ رقص و موسیقی اور سماع و وجد پر تنقید کی۔ سجدہ، تعظیمی کی شدید مذمت کی۔ کشف و کرامات پر تنقید کی اور بتایا کہ یہ ولی کی عظمت کی نشانی نہیں ہیں۔ انہوں نے دلیل دی کہ جتنے بڑے صوفیہ گزرے ہیں جیسے حضرت خواجہ جنید بغدادی ان سے چند کرامات بھی منسوب نہیں ہیں۔ اگر کرامتیں ولی کے لیے معیار ہوتیں تو بڑے صوفیہ سے زیادہ کرامات کا صدور ہوتا۔ وحدۃ الوجودی صوفیہ پر ان کی تنقید اور سخت ہے، انہوں نے وحدۃ الوجود کے مقابلے میں ایک مستقل فلسفہ اور نظریہ پیش کیا جس کے مطابق انہوں نے وحدۃ الوجود کی کیفیت کو غیر حقیقی اور صرف بندے کے ذہن کا خیال قرار دیا۔ انہوں نے بتایا کہ وحدۃ الوجود راہ سلوک کی ایک منزل ہے، آخری منزل نہیں۔ آخری منزل عہدیت کا اثبات ہے۔ بندہ کی معراج یہ ہے کہ اس کو اپنی عہدیت کا احساس ہو جائے، وحدۃ الوجود نہیں۔ اس لیے انہوں نے زور دے کر کہا کہ وحدۃ الوجود جو مقام جمع کی ایک کیفیت ہے وہ صرف احساس اور مشاہدہ ہے، اس کو وحدۃ الشہود کہنا زیادہ سوزوں ہے۔ بندے کی اس منزل جمع کے بعد فرق کا اثبات ہے جب بندہ اس کیفیت سے آگے بڑھتا ہے تو اس کو اندازہ ہوتا ہے کہ مقام جمع یا وحدۃ الوجود صرف ایک خیال تھا، حقیقت اس کے برعکس ہے۔ بندہ کی معراج عہدیت کا اثبات ہے وحدۃ الوجود نہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

”فنا اور بقا شہودی ہے وجودی نہیں۔ بندہ نہ تو خدا بن سکتا ہے اور نہ خدا کے ساتھ متحد ہو سکتا ہے۔ بندہ ہمیشہ بندہ رہتا ہے اور خدا ہمیشہ خدا۔ جو لوگ فنا اور بقا کو وجودی کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بندہ اپنے وجودی تعینات سے بالاتر ہو کر ذات حق سے جو تعینات اور قبو سے بالاتر ہے، متحد ہو جاتا ہے، یا یہ سمجھتے ہیں کہ وہ قطرہ تھا جو دریا میں مل گیا اور دریا ہو گیا اور ان کی وجودی انفرادیت ذات واحد میں گم ہو گئی، وہ لوگ طرد اور زندیق ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس طرح کے طردانہ افکار سے محفوظ رکھے۔“ (مکتوب، جلد اول۔ مکتوب نمبر ۲۳)

شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے سترہویں صدی کے پس منظر میں شریعت کی زبردست خدمت کی۔ انہوں نے علمائے سو کے ذریعے شریعت کی من مانی تعمیر کی اصلاح کی۔ حکمران وقت نے مذہب کو جو زک پہنچائی تھی اور ایک نئے دین کا آغاز کرنے کی کوشش کی تھی، اس کا مقابلہ کیا اور جاہل صوفیہ نے تصوف کو من مانے معنی پہنا کر جو گمراہی پھیلائی، اس کی اصلاح کی

اور ان تمام فتنوں کے درمیان اسلام کی حقیقی تصویر کو زسر نوا جاگر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ دین کی اصل بنیاد نہ خصوص الحکم ہے نہ فتوحات یکیدہ اور نہ صوفیہ کے کشف و کرامات، بلکہ دین کی بنیاد قرآن و سنت ہے اور یہی دونوں دین کا معیار ہیں۔ اگر کسی صوفی کا کشف قرآن و سنت کے مطابق ہے تو اس کو اہمیت دی جاسکتی ہے لیکن جو کشف ان دونوں قیادوں کے خلاف ہو، وہ قابل رد ہے۔ شریعت کا مصدر قرآن و سنت ہے، کوئی اور چیز نہیں، چاہے وہ صوفی کا کشف ہو یا سالک کا مشاہدہ۔ ان سب کو قرآن و سنت کی کسوٹی پر جانچا جائے گا۔

شیخ احمد سرہندی کے یہ افکار جتنے ان کے عہد میں اہم تھے، اتنے ہی اہم آج بھی ہیں۔ آج بھی اس کی ضرورت ہے کہ مختلف افکار و نظریات اور فلسفہ ہائے حیات کے درمیان شریعت مطہرہ کی حقانیت کو اس کے بنیادی مصادر و آخذ کی روشنی میں جانا جائے اور ان سب کا جائزہ قرآن و سنت کی روشنی میں لیا جائے۔ شیخ احمد سرہندی کی یہ فکر اور ان کا پیغام آج بھی زندہ و تابندہ اور اہم ہے۔

مصادر

۱۔ شیخ احمد سرہندی، مکتوبات امام ربانی، تحقیق نور محمد، لاہور ۱۹۶۲

۲۔ اثبات النبوة مع اردو ترجمہ، کراچی، مبدون سنہ

۳۔ سلطان جہانگیر، بزرگ جہانگیری، تحقیق سر سید احمد خاں، علی گڑھ ۱۸۶۲

۴۔ ابوالحسن علی ندوی، تاریخ وکوت و عزیمت، لکھنؤ، ۱۹۸۰

۵۔ Rizwi, S.A.A.: Muslim Rivalist movement in Northern India in the sixteenth seventeenth century, Agra, 1965

(نوٹ: یہ مقالہ مجدد الف ثانی کی حیات و خدمات پر چنٹی گڑھ کے سینار میں بطور خطبہ صدارت پیش کیا گیا۔) (لؤلؤ)



مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی - حیات اور کارنامے

سولہویں صدی عیسوی اور گیارہویں صدی ہجری میں جس عبقری شخصیت نے عالم اسلام کو اپنے تجدیدی، اصلاحی، دعوتی اور علمی خدمات سے متاثر کیا، عرب و عجم میں اسلامی نظریات، شریعت محمدی کے احکام قوانین اور اسلام کی حقیقی روحانی تعلیمات کا حیا فرمایا، بدعتوں کا خاتمہ کیا اور سنتوں کو زندگی نو بخشی وہ ذات عارف ربانی، آیت رحمانی، شیخ لاثانی، مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد بن عبد الاحد سرہندی قدس اللہ سرہ الباقی کی ہے، اس صدی میں مسلم معاشرہ کا رخ جس طرح سیاسی مصالح، ذاتی اغراض و مقاصد، وسیع المذہبی نظریات اور دوسرے اسباب کی بنا پر اسلامی تہذیب و تمدن اور حجازی روحانیت سے پھیر کر اس میں Unifomation لانے اور "وحدت ادیان" کی طرف موڑا جا رہا تھا اور معاشرے کے افراد بھی "الناس علی دین ملوکھم" کے مظہر بننے چارہ تھے تو حضرت مجدد الف ثانی نے اپنی روحانی اور علمی قیادت کے ذریعہ سیاسی، سماجی، علمی، دینی اور تہذیبی سطح پر اصلاح و تجدید کا فرض انجام دیا، اس کے لیے آپ نے حکیمانہ طریقہ کار کے ذریعہ ایک طوفانِ تھام دیا۔ اپنے پیدا کردہ افراو کے ذریعہ ہندوستان اور اس کے باہر ممالک میں اللہ کے کلمہ کو بلند فرمایا، اکبری دور کے جاہل صوفیہ اور آزاد منش سجادہ نشینان کی خرابیوں سے مسلم معاشرے کو آگاہ فرمایا، رفس و تفضیلت کا پر وہ فاش کیا غوث و قطب، مہدی اور نبی ہونے کے دعوے داروں کی خبر لی، ارکان سلطنت اور سلاطین وقت کے سامنے روح اسلام اور دین محمدی کی اصلی صورت پیش فرمائی، مختصر یہ کہ ہر سطح پر لا اللہ اللہین البخالص کا صورت چھوٹک دیا، احترام شریعت محمدی کا جذبہ بیدار کر دیا، دلوں میں خدا طلبی کی روح ڈال دی اور اپنے خلفاء اور تلامذہ کے ذریعہ عالم اسلام کے کونے کونے تک آوازۂ اسلام کو پہنچا دیا، جس کی گونج آج تک واضح طور پر محسوس ہو رہی ہے۔ اور جن کا ہر نقش قدم دعوت و ارشاد کے میدان میں دلیل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔

مرے پیچھے یہ تو محال ہے کہ زمانہ گرم سفر نہ ہو
نہیں ہے مرا کوئی نقش پا کہ دلیل راہ گزر نہ ہو

ذیل کے صفحات میں اسی ذات اقدس کی حیات، اور آپ کے کارناموں کا مختصر جائزہ پیش کیا گیا ہے، یہ عنوان اتنا وسیع ہے کہ اس پر مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے اور لکھی گئی بھی ہے ظاہر ہے اس مختصر مقالے میں طوالت کی گنجائش نہیں ہے، اس لیے ہر عنوان کے تحت بنیادی معلومات فراہم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ امید ہے کہ قارئین اس کو پسند فرمائیں گے۔

حیات مجدد کے چند درخشاں پہلو

حضرت احمد مجد الف ثانی قدس سرہ کی پیدائش پچالہ کے قصبہ سرہند (پنجاب) میں شوال ۹۷۱ھ/۱۵۶۳ء میں حضرت عبدالاحد چشتی فاروقی (۱۰۰۷ھ/۱۵۹۸ء) خلیفہ حضرت رکن الدین بن عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہم کے گھریلوئی، آپ نہا فاروقی ہیں، آپ کا سلسلہ نسب بقول حضرت شاہ ابوالحسن زید فاروقی قدس سرہ ۳۰ واسطوں سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ (۱)

تعلیم و تربیت

اکثر مورخین کے مطابق آپ کی تعلیم کی ابتدا حفظ قرآن پاک سے ہوئی۔ والد ہندو گوار سے اکثر علوم معقول و منقول کی تحصیل کی، بعدہ میال کوٹ کا سفر فرمایا، شیخ کمال الدین کشمیری (م ۱۰۰۷ھ) نزیل میال کوٹ سے محققانہ انداز میں معقولی علوم کی کتابیں پڑھیں، حضرت شیخ یعقوب صرہفی کشمیری (م ۱۰۰۳ھ) سے سند حدیث حاصل کی، شیخ صرہفی کو حدیث کی اجازت حضرت شیخ شہاب الدین ابن حجر ہیتمی مکی سے حاصل تھی۔ (۲) حدیث مسلسل بواسطہ واحد اور دیگر مفردات کی اجازت اس زمانے کے ایک مقدس عالم حضرت قاضی بہلول بدخشی سے حاصل کی، ان سے حسب ذیل کتب کا درس لیا اور سند حاصل کی۔ امام واحدی کی تفسیر بسیط، تفسیر وسیط، اسباب النزول، تفسیر بیضاوی اور دوسری تصنیفات مثلاً منہاج الوصول اور الغایۃ القصوی وغیرہ کے علاوہ امام بخاری کی صحیح اور دوسری تالیفات مثل ثلاثیات، ادب المفرد، افعال العباد اور تاریخ وغیرہ، مشکوٰۃ المصابیح، شامک ترمذی، جامع صغیر للسیوطی اور قصیدہ ہمدہ وغیرہ غرضیکہ ہر علم و فن کو اس کے مشہور اور مستند اساتذہ سے حاصل کیا اور اس میں مہارت و کمال پیدا کیا۔ (۳)

تدریس

سترہ سال کی عمر میں علوم ظاہری سے فراغت حاصل کر لی، فراغت کے بعد ۹۹۳ھ/۱۵۸۳ء حضرت مجدد اکبر آباد (آگرہ) تشریف لے گئے اور درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا اور فقہائے عصر نے آپ سے استفادہ کیا، اس زمانے میں اکبر تخت ہند پر متمکن ہو چکا تھا اور پاپیتخت

ہونے کی وجہ سے اکبر آباد (آگرہ) علمی مرکز بنا ہوا تھا، اس عرصے میں ابو الفضل (م ۱۶۰۴) اور اس کے بھائی ابو الفیض فیضی (م ۱۵۹۵ء) سے آپ کے مراسم ہوئے، یہ دونوں بھائی آپ کی علمی صلاحیت کے معترف تھے، شروع میں احترام بھی کرتے تھے، لیکن حضرت مجدد الف ثانی ان دونوں بھائی کی آزار دہی سے بے زار تھے انہیں علما کی صحبت کے لائق نہیں گروا تھے۔ (۴)

شاہی خانہ آبادی

۹۹۷ھ/۱۵۸۹ء کو والد محترم حضرت عبدالاحد چشتی اپنے فرزند سے شوق ملاقات میں آگرہ آئے اسی سال اکبر کے مقرنین میں شیخ سلطان رئیس تھاہن سری کی صاحب زادی سے نکاح ہو گیا، اس کے بعد والد ماجد کے ہمراہ آپ سرہند تشریف لے آئے۔

خلافت، تعلیم و تحقیق

حضرت مجدد الف ثانی نے ابتدا میں اپنے والد ماجد سے ہی روحانی فیوض و برکات حاصل کیا ہے، سب سے پہلے سلسلہ چشتیہ کے فیوض آپ تک والد محترم کے توسط سے پہنچے۔ والد ماجد نے آپ کو بیعت و خلافت سے سرفراز فرمایا، آپ والد ماجد کی حیات تک انہیں کی خدمت میں رہے، ان سے پیش بہا فوائد باطنی حاصل کیے، انہیں کی فیض صحبت میں ایک دور رس اصلاح و انقلاب کے لیے سلسلہ چشتیہ کا سلوک طے کیا حضرت مجدد خود رقم فرماتے ہیں:

”میں فقیر کو نسبت فرویت اپنے والد بزرگوار سے ملی ہے، والد بزرگوار نے اس کو ایک عزیز شیخ کمال کیشتلی (۱۵۷۳ء) سے حاصل کیا تھا جو قوی جذبہ رکھتے تھے اور خوارق و کمالات میں مشہور تھے، اس کے علاوہ اس فقیر کو عبادت باقلہ خصوصاً نماز نافلہ کی توفیق اپنے والد بزرگوار سے ملی ہے اور انہوں نے یہ سعادت سلسلہ چشتیہ کا ایک مشہور بزرگ شیخ عبدالقدوس گنگوہی (۹۴۴ھ) سے حاصل کی تھی۔“ (۵)

سلسلہ قادریہ میں کیشتل کے بزرگ شاہ سکندر قدس سرہ (۱۰۴۳ھ/۱۶۱۴ء) سے اجازت و خلافت حاصل کی تھی، حضرت موصوف عارف کامل حضرت شاہ کمال کیشتلی قدس سرہ کے خلیفہ و جانشین تھے حضرت شاہ سکندر نے اپنے مرشد کے اشارہ باطنی سے حضرت مجدد الف ثانی کو حضرت غوث اعظم قدس سرہ کا چہر شریف عطا فرمایا، خرقہ شریف زیب تن فرمانے کے بعد دولت کدے سے باہر تشریف لائے اور فرمایا:

”حضرت شاہ کمال کا خرقہ پہننے کے بعد عجیب حالت رونما ہوئی۔“ (۶)

حضرت مجدد قدس سرہ کو سلسلہ نقشبندیہ میں خرقہ خلافت حضرت خواجہ ربیع الدین محمد باقی باللہ قدس سرہ (۱۰۱۴ھ) نے عطا فرمایا تھا، ان تینوں نعمتوں سے مالا مال ہونے کے بعد آپ

کمالات و درجات کے کن مقامات پر فائز ہوئے ہوں گے یہ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ آپ نے ان نعمتوں کی وجہ سے اپنے اوپر ہونے والے فیضان نبوت کا اعتراف جن الفاظ میں کیا ہے وہ یہ ہیں:

”مجھے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت سے واسطوں سے نسبت حاصل ہے۔ طریقہ نقشبندیہ میں ۳۱ واسطوں سے، طریقہ قادریہ میں ۲۵ واسطوں سے اور طریقہ چشتیہ میں ۲۷ واسطوں سے۔ میرا سلسلہ رحمانی ہے کیوں کہ میں رحمن کا بندہ ہوں، میرا رب رحمن ہے اور میرا مربی ارحم الراحمین۔ میرا طریقہ سبحانی ہے کیوں کہ میں ترکیہ کی راہ سے پہنچا ہوں، اسم و صفت سے مکتصود سوائے ذات حق کے کچھ نہیں ہے،“ (۷) لیکن ان ساری نسبتوں میں آپ پر نسبت نقشبندیہ بندیت حاوی ہوئی۔ خواجہ باقی باللہ نے حضرت مجدد کو نقشبندیہ کی جو دولت سونپی تھی، اس کا فروغ، اس کا احیا اور اس کی تجدید آپ سے مزید ہوئی، یہاں تک کہ اس کا فیضان تمام عالم اسلام میں عام ہو گیا۔ اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت باقی باللہ کی یہ بشارت تو اتر کے ساتھ مورخین نے نقل کی ہے جو بعد میں حقیقت واقعہ ثابت ہوئی: ”سرہند کے ایک شخص شیخ احمد امی نے جو کثیر العلم اور قوی العمل ہے فقیر کے ساتھ کچھ دنوں تک نشست و برخاست رکھی ہے اس کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسا آفتاب ہو گا کہ دنیا اس سے روشن ہو جائے گی۔“ (۸)

روحانی اور دنیوی اسفار

حصول تعلیم کے بعد آپ نے سرہند سے پہلا سفر اکبر آباد (آگرہ) کا کیا تھا جس کا مقصد درس و تدریس تھا، سرہند واپسی کے بعد والد ماجد کا انتقال ہو گیا اور آپ نے ۱۰۰۸ھ میں نقلی حج کے ارادے سے کعبۃ اللہ کے لیے رخصت سفر باندھ لیا، اثنائے سفر مولانا حسن کشمیری نے خواجہ محمد باقی باللہ قدس سرہ سے ملاقات کا اشتیاق پیدا کر لیا، آپ کو باریابی نصیب ہوئی اور دو تین ماہ رہ کر روحانی فیوض و برکات سے مالا مال ہو کر واپس ہو گئے، حضرت خواجہ کی ملاقات نے دل کی دنیا بدل دی اور ایک رحمانی نور آپ کے قلب مطہر پر مازل ہو گیا جس نے آپ کے ظاہر و باطن کو نور کر دیا۔ اس سفر ایمانی سے جو ترقیاں حاصل ہوئیں حضرت مجدد نے مولانا حسن کشمیری کا نیاز مندانه شکر یہ ادا فرمایا ہے۔ اور مشائخ کی صحبت کے متعلق فرمایا کہ ”مگر انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شرف صحبت سے شرف نہیں ہوا، لیکن اس صحبت کی سعادت سے محروم بھی نہیں رہا۔“

دوسرا سفر

دہلی میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت بابرکت میں دوبارہ حاضری ۱۰۰۹ھ/۱۶۰۰ء میں نصیب ہوئی اور عرصہ دراز تک صحبت و تربیت سے مستفیض ہوتے رہے، اس سچے شیخ و مرید میں بے حد موانست و مودت پیدا ہو گئی اور روحانی معاملے میں:

کند ہم جنس با ہم جنس پر واز

کی مثال بن گئے، دارالہکموہ اور دوسرے مشائخ نے اس صحبت کو عجب روزگار میں شمار کیا ہے۔ صحبت و تربیت کا یہ دوسرا روحانی سفر انتہائی کامیاب ثابت ہوا، حضرت خواجہ باقی باللہ نے اپنے مرید خاص کو روحانی کمالات سے نواز کر بیعت و ارشاد اور مریدین کی ہدایت و تربیت کا سلسلہ شروع کرنے کی اجازت دے دی اور مقامِ مشیت کی ذمہ داریاں آپ کے سپرد کر دیں۔ (۹)

تیسرا سفر

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے دہلی کا تیسرا سفر ۱۱۶۰ھ و ۱۶۰۳ء کے درمیان فرمایا، حضرت خواجہ قدس سرہ کے یہ آخری ایام تھے، اس مرتبہ مرشد گرامی نے اپنے مرید خاص سے اپنے صاحبزادگان خواجہ عبید اللہ اور خواجہ عبداللہ اور ان کی والدہ کی طرف توجہ باطنی فرمانے کے لئے کہا تو حضرت مجدد ویر کا حکم بجالائے، توجہ فرمائی اور اس باطنی توجہ سے تربیت کے اثرات نمایاں طور پر ظاہر ہوئے۔ اسی سفر میں پیر و مرشد نے لاہور میں دعوت و ارشاد کے لیے ہدایت فرمائی، چنانچہ آپ لاہور گئے، اصلاح و تربیت اور ہدایت و ارشاد کا سلسلہ شروع کر دیا، مخلوق آپ کی صحبت و تربیت سے مستفیض ہوئے مگر اسی بیچ پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کا ۲۵ جمادی الاخریٰ ۱۰۱۲ھ میں وصال ہو گیا۔ انا باللہ وانا الیہ راجعون۔

چوتھا سفر

سانچہ ارتحال کی خبر سن کر فوراً دہلی تشریف لائے، مرقداطہر کی زیارت کی، فاتحہ خوانی اور اہل خانہ کی تعزیت کے بعد سرہند واپس لوٹ گئے۔ (۱۰)

پانچواں سفر

اس کے بعد ۱۰۱۳ھ و ۱۶۰۴ء میں اپنے پیر و مرشد خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کے عرس میں شمولیت کی غرض سے آپ نے پانچویں مرتبہ دہلی کا سفر کیا (۱۱) واپسی کے بعد مستقل سرہند ہی میں رہے۔ بقول پروفیسر محمد مسعود احمد و تین مرتبہ اکبر آباد (آگرہ) تشریف لے گئے اور آخری عمر میں جہاں گیر کی مزاحمت کی وجہ سے لشکر شاہی کے ساتھ چند مقامات میں جانے کا اتفاق ہوا۔ (۱۲)

معمولات و اوصاف

حضرت مجدد الف ثانی کی عادات و اطوار اور معمولات روز و شب پڑھنے کے بعد امام غزالی کی وہ بات یاد آتی ہے کہ صوفیہ کی سیرت اور ان کے اخلاق سے بہتر کوئی دوسرا متبادل ماؤل نہیں، حکما کی حکمت، اہل دانش کی دانش اور علما کا علم صوفیہ کی سیرت کا نمونہ پیش کرنے سے قاصر ہیں کیونکہ صوفیہ کے تمام معاملات مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ ہوتے ہیں اور اس زمین میں نور نبوت

سے بڑھ کر کوئی ایسا نور نہیں جس سے ہدایت کی منزل کا سراغ مل سکے۔ حضرت مجدد کی عادات و اطوار پر خلق محمدی و درقرآنی اخلاق کی جلوہ نمائی صاف طور پر نظر آتی ہے۔

روز و شب کا ایک ایک لمحہ دین کی سر بلندی اور اللہ کے فکر و ذکر میں بسر ہوتا تھا، کثرت سے عبادت کرتے تھے۔ اپنے خدام اور رفقا کو بھی بکثرت دوام ذکر، حضور و مراقبہ کی تاکید فرماتے تھے، مذہب حنفی کے مقلد تھے، عقائد میں امام ماتریدی کے مسلک پر عمل پیرا تھے۔ قرأت خلف الامام کرتے تھے حتیٰ کہ اس کو مستحسن گردانتے تھے، نماز میں اکثر امامت خود فرماتے تھے۔ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کی قراءت کی حکمت یہ بیان فرماتے تھے کہ ”چونکہ میں مذاہب کو جمع کرنے کی کوشش کرتا ہوں اس لیے آسان صورت یہی معلوم ہوئی کہ خود امامت کروں۔“ (۱۳)

رات کو نصف اخیر میں اور کبھی ثلث اخیر میں نوافل پڑھتے، مراقبہ کرتے، منقول دعائیں پڑھتے، فجر کے لیے تازہ وضو فرماتے، سنت گھر پڑا دیا کرتے، فجر کی نماز آخر غلّس (اندھیرے) اور اول اسفار (روشنی) میں ادا کرتے تاکہ دونوں مذہبوں پر عمل ہو جائے، نماز فجر کے بعد اشراق کے وقت تک حلقہ فرماتے، نماز اشراق، تسبیحات اور ماثورہ دعائیں پڑھ کر دولت خانہ میں تشریف لاتے، گھر کے معاملات کی خبر و خبر کے بعد تلاوت کرتے، اور پھر طالبین کی تربیت و تزکیہ اور علمی مذاکرے میں مشغول ہو جاتے، لوگوں کو اتباع سنت اور اتھنائے حال کی ترغیب دیتے اور کلمہ طیبہ کی عظمت بیان کرتے، علمائے احکام شریعت حاصل کرنے کی ترغیب دیتے، علامہ ہاشمی کے بیان کے مطابق مضامین عالیہ بیان کرتے وقت آنکھیں اشک بار اور سرخ ہو جاتیں اور رخسار مبارک تھما جاتا، چاشت کی نماز کے بعد نحوہ کبریٰ کے وقت حرم سرا تشریف لے جاتے اور ماحضر مختصر تناول فرماتے، قبول فرمانے کے بعد ظہر کی نماز میں سنت کے بعد کسی حافظ سے ایک پارہ یا کم و بیش ایک پارہ سنتے۔ عصر کی نماز کے بعد غروب تک اصحاب و خدام کے ساتھ سکوت و مراقبہ میں مشغول ہو جاتے، طالبین کے باطنی کیفیات کی طرف توجہ فرماتے، مغرب کی سنت کے بعد اوایین ادا کرتے تھے۔ نماز عشاء اول وقت میں ادا فرماتے، رمضان میں احتکاف کرتے، دعائیں پڑھتے اور کثرت سے تلاوت کرتے۔ تحفۃ اللیثیہ و تحفۃ المسجد کا بھی اہتمام کرتے تھے۔ ہر روز سیکڑوں علما، صلحا اور حفاظ کو آپ کی خانقاہ سے کھانا ملتا تھا، مریضوں کی عیادت کے لیے یہ نفس نفیس تشریف لے جاتے، ان کے لیے دعائیں کرتے، قبروں کی زیارت فرماتے۔ زکوٰۃ کے لیے خولان حول کا انتظار نہ فرماتے، فتوحات کا فوراً حساب لگا کر حاجت مندوں تک پہنچا دیتے، اہل قرابت کو ترجیح دیتے، اخلاق و انصاف، مخلوق پر شفقت، قناعت و صبر، اور تسلیم و رضا میں مشائخ مختلفہ میں کا نمونہ تھے، خلاصہ یہ کہ خلق محمدی میں اسوۂ حسنہ کی زندہ مثال تھے۔ (۱۴)

آپ کے باطنی تصرفات و کمالات اور مقامات و احوال کو مجھ جیسا کم سواد کیا بیان کر سکتا ہے۔ بس صرف اتنی بات عرض کرتی ہے کہ آپ کی ذات کے متعلق خود آپ کے پیروں و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس نے اپنے اقوال و خطوط میں جن خوبیوں اور کمالات باطنی کو سراہا تھا بیان فرمایا ہے وہ آپ کے باطنی اوصاف اور اعلیٰ مقامات کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں، جنہوں نے زندگی ہی میں مشیخت کی ذمہ داریاں آپ کے حوالے کر دی ہو اور مخلوق کو آپ کی طرف رجوع کرنے کی ترغیب دی ہو ان کی عظمت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے؟ آپ کی ذات وہ مرکز روحانیت ہے جس کو مشہور رسائل طریقت کے ارباب تصوف نے ظاہری اور باطنی علوم و معارف سے مالا مال کر کے مخلوق کے لیے آفتاب ہدایت بنا دیا کہ جن سے سارا عالم روشن ہو گیا۔ حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہ کو آپ سے کچھ مسائل میں اختلاف تھا مگر اس کے باوجود آخر عمر میں حضرت شیخ متقی کو آپ سے جس قدر باطنی لگاؤ ہو گیا وہ حضرت مجدد کے باطنی تصرفات کا منہ بولتا ثبوت ہے فرماتے ہیں:

”ان دونوں شیخ احمد سلمہ اللہ تعالیٰ سے فقیر کی صفاتی حد سے متجاوز ہے۔ درمیان میں پردہ بشریت و فطرت نہیں ہے۔ انصاف و عقل اور طریقے کی رعایت سے قطع نظر باطن میں ذوق و وجدان اور غلبہ (محبت) میں وہ چیز دل میں آتی ہے جسے زبان بیان کرنے سے عاجز ہے۔ سچا کی ہے اس ذات کے لیے جو دلوں کو پھیرنے والا ہے، احوال کو بدلنے والا ہے، شاید ظاہر بینوں کو یہ بات مستبعد معلوم ہو لیکن میں نہیں جانتا کہ کیا حال ہے اور کس طرح ہے؟ (۱۵)

حضرت مجدد کے دعویٰ اور اصلاحی کارنامے

حضرت مجدد الف ثانی کی علمی خدمات اور دعویٰ اور اصلاحی کارناموں کا وارہ انتہائی وسیع ہے۔ حضرت مجدد کی خدمات اور ان کے کارناموں کی معنویت کا اندازہ صحیح طور پر اسی وقت ہو سکتا ہے جب اکبری دور کی مذہبی، سماجی اور تہذیبی صورت حال ہمارے سامنے ہو، اس صورت کو تفصیل سے واضح کرنے کے لیے مقالہ نہیں پوری کتاب کی تصنیف درکار ہے، مگر مورخین نے اس پر دو تحقیق بھی دی ہے، خاص طور پر ڈاکٹر محمد اسلم استاد شعبہ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کی کتاب ”دین الہی اور اس کا پس منظر“ اس حوالے سے کئی تاریخی حقائق سے پردہ اٹھاتی ہے۔ ذیل کے سطروں میں اس کی ایک جھلک پیش کر کے حضرت مجدد کے تجدیدی کارناموں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

اکبری دور (۱۵۵۶-۱۶۰۶ء) کو آزاد مورخین نے جس طرح مسلمان میں تکثیریت پسند سماج کی ضروریات کو پورا کرنے والا دور قرار دے کر اس کی بے پناہ تعریف کی ہے وہیں یہ دور مذہبی اور اسلامی سلطنت ہونے کے نقطہ نظر سے بے شمار خرابیوں کا مجموعہ بھی تھا۔ خواجہ اکبر گمراہ اور مجدد ہو گیا تھا، اس نے تمام مذاہب کو ملا کر ایک نیا دین ایجاد کر لیا تھا جسے ملا عبد القادر

ہدایونی نے ”توحید الہی“ اور ”دین الہی“ کا نام دیا ہے، اس دین میں ہر طرح کی خرافات و بدعات درآئی تھیں، اس میں خدا کے علاوہ ہندو نہ رسوم کے مطابق مظاہر کی پرستش کی جاتی تھی۔ شراب حلال کر دی گئی تھی، زنا اور دوسری برائیوں پر پابندی تو درکنار بلکہ حلال کر دی گئیں تھیں، اس مذہب میں تمام مذاہب کی عبادتیں روا دارانہ طریقے پر آوا کی جاتیں۔ آگ کی پرستش ہوتی، عیسائی طریقے پر بھی عبادت کی جاتی۔ نقطوی تحریک کے اثرات بھی اکبر کی تحریک پر نمایاں ہیں۔ نقطوی تحریک کو ہندوستان میں عروج دلانے میں ابو الفضل اور فیضی کا بیاد دی کردار رہا ہے، اسی طرح اکبر کے مشیر خاص ابو الفضل اور فیضی نے شیعہ اور تفصیلی عقائد و نظریات کو فروغ دینے اور امراء سلطنت کو دین حنیف سے بدگشت کرنے میں نمایاں کردار ادا کیا، اکبر نے رائج العقیدہ مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا تھا، حتیٰ کہ مسجدیں گروا کر مندر بنوائے تھے، مسلمانوں کو تہج کیا تھا۔ حضرت مجدد درقم طراز ہیں:

”اسلام کمزور ہو گیا ہے، کفار ہند بے تحاشا مسجدوں کو منہدم کر رہے ہیں اور اس کی جگہ مندر بنارہے ہیں“ (مکتوبات: مکتوب نمبر ۶۳)

دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ:

”مسلمان احکام اسلام کے اظہار کرنے سے عاجز آ گئے ہیں، اور اگر کرتے ہیں تو انہیں قتل کر دیا جاتا ہے۔“ (تذکرہ مجدد الف ثانی ص: ۱۰۴)

ایک طرف سلطنت کے امراء حکام اور سلطان کا یہ حال تھا دوسری طرف مسلم سماج میں فکری اور عملی انحراف کا دور دورہ ہو چکا تھا، بدعات کا نفوذ، علما کی ظاہر داری اور مدامت اور جاہل صوفیہ کی خرافات اور گمراہیاں زوروں پر تھیں۔ وحدۃ الوجود، صوفیہ کے یہاں جس کا تعلق محض سالک کے حال سے ہوتا ہے جاہل صوفیہ نے اس کا سہارا لے کر حلقہ شریعت سے اپنی گروئیں آزاد کر لی تھیں اور شیطان نما آدم زادے مستشار شاہ کے دعوے دار تھے۔ شعبدے بازی، جمل سازی ان کا شیوہ تھا، ان کے عقائد و اعمال حد و شریعت سے نکل کر مشتبہ عقائد، تاجخ اور طول و اتھا تک پہنچ چکے تھے۔ یہ وہ رستہ خیر حالات تھے جس نے ملت کے شیرازہ کو پارہ پارہ کرنے میں بیاد دی کردار ادا کیا۔ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ نے ان سارے محاذ پر اپنے جہاد، اجتہادی اور تجدیدی کارناموں سے مقابلہ کیا، اور منہاج نبوت کے طریقے پر دعوت و ارشاد کا کام انجام دیا، امراء سے لے کر عوام تک، علما سے لے کر صوفیہ تک خطاب و کتاب دونوں کے ذریعہ ملت اسلامیہ کی کٹاوت کا تھک، اسلام کو دوبارہ حقیقی روحانی اور اصلی بنیادوں پر قائم کیا، اور شریعت اسلامی کو غلبہ عطا فرمایا۔ اس عظیم کارنامے کے لیے آپ نے مندرجہ دعویٰ طریقوں پر اسلامی شریعت کا احیا فرمایا ہے۔

دعوتِ دینی و روحی

حضرت مجدد الف ثانی نے امراء، علماء، عوام اور صوفیہ چاروں گروہوں کی اصلاح و تربیت کے لیے اجتماعی کوشش فرمائی ہے۔ ان کے اندر درآئی فکری انحراف، بد عملی، خود غرضی، نفس پرستی، جاہ و شہمت کی چاہ، جاہلانہ رسوم و روایات، مہوہوم خیالات کو دور فرمایا۔ مسلم سوسائٹی کو دوسرے مذاہب و مسلک کے معزومات سے نجات دلائی۔

آپ نے ان کاموں کے لیے اولاً: اپنے مریدین کی بڑی تعداد اس کام کے لیے تیار کی اور انہیں ہر طرف اسلام کی تبلیغ، لوگوں کو دائرہ شریعت میں واپس لانے اور سنتوں کو زندہ کرنے کے لیے باضابطہ فوجی شکل میں ملک و بیرون ملک روانہ فرمایا۔ ۱۰۲۶ھ میں خلفاء اور مریدین میں سے ستر مولانا محمد قاسم قدس سرہ کی قیادت میں ترکستان کی طرف بھیجے گئے، چالیس حضرت مولانا فرخ حسین کی امارت میں عرب، یمن، شام اور روم کی طرف بھیجے گئے، دس ذمہ اور تربیت یافتہ حضرات مولانا محمد صادق کائی کے ماتحت کاشغری طرف اور تیس خلفاء مولانا شیخ احمد برکی (م ۱۰۲۶ھ) کی سرورائی میں توران، بدخشاں، اور خراسان گئے۔ ان مقامات پر خلفاء کا استقبال کیا گیا، ہندوگان خدا نے ان سے استفادہ کیا اور جب یہ قافلے واپس آئے تو مختلف بادشاہوں کے تحفے ساتھ لائے۔ (۱۶)

خود ہندوستان میں آپ نے اپنے خلفاء کو ارشاد ہدایت پر مامور فرمایا، خواجہ میر نعمان (م ۱۰۵۰ھ) کو خلافت عطا فرما کر دکن بھیجا، شیخ بدیع الدین سہارن پوری (م ۱۰۴۲ھ) کو خلافت سپرد فرما کر سہارن پور پھر شاہی لشکر گاہ آگرہ میں متعین کر دیا، بہت سے ارکان سلطنت ان کے حلقے میں داخل ہو گئے، میر محمد نعمان شہمی کو اجازت نامہ مرحمت فرما کر برہان پور روانہ کر دیا، آپ وہاں مرجع خلافت بن گئے، شیخ طاہر لاہوری (م ۱۰۴۰ھ) کو شہر لاہور کے طالبان معرفت کی رہنمائی کے لئے روانہ فرمایا، شیخ نور محمد عینی کو شہر پٹنہ روانہ فرمایا، شیخ حمید بیگانی (م ۱۰۵۰ھ) کو تعلیم و تربیت کی اجازت دے کر بیگل کی زمین میں ہدایت کی شمع بنا کر بھیج دیا، شیخ طاہر بدخشی (م ۱۰۴۷ھ) کو جون پور روانہ فرمایا، مولانا احمد برکی تعلیم و تلقین میں مجاز ہونے کے بعد برک پٹنجی کرارشاہ و اصلاح کافریشا انجام دیا، سید محبت اللہ مانیک پوری کو مانیک پور، الہ آباد روانہ فرمایا، شیخ نور محمد عینی دریائے گنگا کے کنارے پیٹھ کرارشاہ و ہدایت کے چشمے سے مخلوق کو سیراب کرتے رہے۔

ایک سال مکمل ہوتے ہوئے حضرت مجدد کی شہرت و تربیت کی آواز عرب و عجم میں پھیل گئی، عالم اسلام کے چہار جانب سے مخلوق نوٹ کر اپنی اصلاح طاہر و باطن کے لیے جوق درجوق آپ کے یہاں آتی، اور دریائے فیض سے فیض یاب ہو کر واپس لوٹ جاتی۔ (۱۷)

تصانیف و مکتوبات

دعوت و اصلاح اور تربیت و سلوک دوسرا ایذا ذریعہ اور میڈیم آپ نے تحریر و قلم کو بنایا آپ نے اپنی تصانیف و مکتوبات کے ذریعہ علمی، عقلی اور استدلالی طریقے پر شریعت محمدی، اور طریقت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کو ثابت کیا اور مرفراز کیا، آپ کی تحریری خدمات کے ذریعے مذہبی حقائق سے پردے اٹھے، اتباع سنت کا جذبہ بیدار ہو گیا، خاص طور سے مکتوبات کے ذریعے اہل باطل کی تردید ہوئی اور سنتوں کا احیا ہوا، آپ کے مکتوبات علوم و فنون کا خزانہ ہیں یہ گمراہوں کے لیے نقوش ہدایت اور طالبین مولیٰ اور سالکین راہ طریقت کے لیے نمونہ کیمیا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی تصانیف کی تعداد پر و فی سر محمد مسعود احمد نے مندرجہ ذیل بتائی ہیں:

- ۱۔ الرسائل فی اثبات النبوة (عربی) ۲۔ تعلیقات العارف ۳۔ الحاشیہ علی شرح العقائد الجلالی
- ۴۔ المقدمات السنیہ فی انتصار الفرقہ السنیہ ۵۔ در المعرفۃ جلد اول مکتوبات شریف، مرتبہ مولانا یار محمد جدید بدخشی طالقانی، تعداد مکتوبات ۳۱۳، سنہ تالیف ۱۰۲۵ھ، ۶۔ نور الخلاق، جلد دوم، مکتوبات شریف مرتبہ مولانا عبدالحی حساری، تعداد مکتوبات ۹۹-۱۰۲۸ھ، ۷۔ معرفۃ الخلاق، جلد سوم مکتوبات شریف، مرتبہ محمد ہاشم لکھنوی، تعداد مکتوبات ۲۲۲-۱۰۴۱ھ، ۸۔ مبداء و معاد ۹۔ مکاشفات غیبیہ ۱۰۔ معارف لدنیہ ۱۱۔ درالرفقہ ۱۲۔ شرح رباعیات خواجہ میر بک ۱۳۔ رسالہ تعین و التعمین ۱۴۔ رسالہ مختص و الصالحین ۱۵۔ رسالہ در بیان مسئلہ وحدۃ الوجود ۱۶۔ ادب المریدین ۱۷۔ رسالہ جذب و سلوک ۱۸۔ رسالہ علم حدیث ۱۹۔ رسالہ حالات خواجگان نقشبندیہ ۲۰۔ مجموعہ تصوف ۲۱۔ رسالہ تہذیبیہ وغیرہ (۱۸)

مکتوبات کی علمی اور دعوتی حیثیت

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی تمام تصانیف اور تحریروں کا مرکزی محور اور مقصد اسلامی سوسائٹی کے چار ریزے، طبقت، علماء، صوفیہ، حکمران اور عوام کی اصلاح و تربیت اور اللہ و رسول سے قلبی رابطے کو مضبوط کرنا ہے۔

مکتوبات میں آپ نے امراء کے نام خطوط لکھ کر حکومت و وقت میں غیر اسلامی عناصر کی جڑیں کمزور کر دیں اور شریعت محمدی کا غلبہ اور اسلامی انقلاب کے لیے ایک ماحول برپا کیا اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق آپ نے اپنے خلفاء کو مختلف ممالک کے حکمران طبقوں کے پاس بھیج کر اسلام کی تعلیمات اور نبوی وراثت سے آشنائی کرایا اور انہیں اپنی اصلاح کی دعوت دی، چنانچہ اس کے زبردست اثرات مرتب ہوئے۔ ہندوستان اور کئی دوسرے اسلامی ممالک میں حکمران، امراء، اور وزرا نے آپ کی تربیت قبول کی اور حکمرانہ ادا کیا، اگر یہ سچائی ہے کہ قوم کے امراء و مصلحین جب راہ راست پر آجاتے ہیں تو پوری قوم ہدایت کی راہ پر گامزن ہو جاتی ہے، تو حضرت

مجدد الف ثانی کے دور میں اس چٹائی کا مشاہدہ اسی وقت کیا جاسکتا ہے، جب یمن، شام، ایران، عراق اور روس کے بہت سے ممالک سے آپ کی طرف مخلوق کا رجوع ہوا، اسی طرح مکتوبات اور تصانیف میں علمی جواہر پاروں اور تحقیق و معارف کے اسرار و رموز، حدیث و تفسیر، منطق و فلسفہ، انشا و ادب کی چاشنی اور تعمیرِ دنیا پر ایک بنی کا کھلے دل سے اعتراف کرنا پڑتا ہے، مکتوبات کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ امام ربانی کے نزدیک دنیاوی کام مقاصد شریعت اور کارِ نبوت کو آگے بڑھانا ہے، اگر یہ ہے تو سب کچھ ہے ورنہ باقی ہر فسانہ اگر علم نبوت سے نفوس کا تزکیہ کتاب الہی کا ابلاغ، اور شریعت کی حکمتوں سے اُستائی حاصل ہوتی ہے تو وہ علم کا رُشد ہے ورنہ بقول حضرت مجدد الف ثانی:

”جو عالم دنیا کی محبت میں گرفتار ہیں اور جنہوں نے علم دین کو دنیا کے حصول کا ذریعہ بنالیا ہے ان کا شمار علمائے سو میں ہے۔“

امراء و سلاطین کو دعوت

آپ کی اصلاحی اور دعوتی خدمات کا ایک روشن باب یہ بھی ہے کہ آپ نے ہندوستان اور ہندو ہند کے امراء و حکام اور سلاطین کو اسلامی تعلیمات کی طرف متوجہ ہونے، اسلامی زندگی گزارنے اور رعایا کو اسلام کے راستے پر گامزن رکھنے کے لیے دعوتی خطوط روانہ کیے ہیں۔ اکبر کے بعض ارکان و امراء کے نام حضرت کے خطوط ملتے ہیں، انہیں میں شیخ فرید بخاری معروف بہ مرتضیٰ خاں اور عبد الرحیم خان خاں بھی شامل ہیں جو حضرت مجدد کے عقیدت مندوں میں شامل تھے۔ حضرت مجدد نے اکبر کے انتقال (۱۰۱۴ھ) کے بعد اپنی دعوتی مساعی کو مزید تیز سے تیز کر دیا، اور سلطنت میں اکبر کے دین الہی کے اثرات اور خود جہاں گیر کی اصلاح کے لیے دربار کے بااثر افراد کا حکیمانہ طریقے پر استعمال کیا، جہاں گیر کے مقررین و امراء میں بہت سے شیعہ حضرات و بھی تھے جو ابوالفضل اور فیضی کی باقیات کو آگے بڑھانا چاہتے تھے شیخ کے اثر و رسوخ کو کم کرنے کے لیے جاں گیر کو طرح طرح سے ورغلائے رہتے تھے۔ نتیجے میں ایک مرتبہ حضرت مجدد و الف ثانی کو کچھ مسائل کی صفائی کے لیے دہلی میں بلایا گیا، مسائل میں لا جواب ہونے کے بعد امراء نے جہاں گیر کو ورغلا دیا کہ انہوں نے آداب شاہی (سجدہ تعظیمی) نہیں بجالائے ہیں، اسی سبب جہاں گیر نے آپ کو قلعہ گوالیار میں محبوس کر دیا، قلعہ میں جو دعوتی کام ہوئے وہ تو اپنی جگہ مگر اسی سبب حضرت مجدد و الف ثانی نے شیخ فرید بخاری اور دوسرے بااثر افراد کے ذریعہ جہاں گیر کو اسلام کی طرف راغب کرنے میں کامیابی حاصل کر لی، جہاں گیر نے متاثر ہو کر شیخ فرید کو مذہبی معاملات میں علما کا ایک مشاوری بورڈ بنانے کے لیے کہا۔ اس بات کو سن کر حضرت مجدد و الف ثانی نے شیخ فرید کو اس بورڈ میں علمائے آخرت کو شامل کرنے کا مشورہ دیا۔ جہاں گیر کے بیان کے مطابق آپ ایک سال قید میں رہے، جب آپ کی رہائی ہوئی تو حکیمانہ طریقہ و عفو و نصیحت

سے اس کو اسلام کی طرف مائل کیا اور اکبری اثرات زائل کیے۔ جہاں گیر سے مجالس کے کچھ احوال آپ نے اپنے مفرزند کو جو شکل مکتوب لکھے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے، مائتین انتہا کس قدر پداہیت کے لیے حریص ہوتے ہیں، ان صحبتوں کے اثرات صاف طور پر جہاں گیر کی زندگی میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس نے قلعہ کا گھڑا کی فتح کو قنصل ربانی قرار دیا، مسجدیں تعمیر کرائیں، مسلمانوں پر ظلم و جبر ختم ہوا، مسلمان اپنے اسلامی احکام و قوانین پر عمل کرنے کے معاملے میں آزاد ہو گئے۔ (۱۹)

علماء و صوفیہ کی اصلاح

اکبری دور اور جہاں گیر کے دور میں بھی اس میں کوئی شک نہیں کہ علماء کی صف میں مدد و اور تساہلی آگئی تھی، جب جاہ و رجب دنیا نے زبانوں پر مہر لگا رکھے تھے، علماء کے لیے حضرت مجدد نے ایک خط جس بات کی طرف صراحت فرمائی ہے وہ قابلِ عبرت ہے فرماتے ہیں کہ:

”علمائے دین کی محبت و رغبت ان کے جمیل چہرے کا بد نما داغ ہے، جو علمائے دنیا سے محبت کرتے ہیں ان کے علم سے ممکن ہے دوسروں کو فائدہ پہنچ جائے مگر انہیں خود کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اگر ان کی ذات سے دین یا ملت کو تقویت حاصل ہو جائے تو یہ کوئی قابلِ قدر بات نہیں، کیونکہ کبھی اللہ ایک فاسق و فاجر سے بھی اپنے دین کی تائید کر لیتا ہے۔“ (۲۰)

دوسری طرف جاہل صوفیہ کا حال یہ تھا کہ وہ وحدۃ الوجود جیسے پاکیزہ حالی مسئلے کا سہارا لے کر اپنے کو شریعت سے آزاد کر دیتے تھے، عرف طریقت و حقیقت کے الفاظ کی رٹ لگاتے تھے، جن کے متعلق حضرت مجدد قدس سرہ نے لکھا ہے کہ:

”اکثر جہلا صوفی نمائے زمانہ، حکم علمائے سوء و ارباب فساد، ہا نیز فساد متعدي است۔“ (مکتوبات، جلد اول ص ۷۷)

اس کے علاوہ اس دور میں کچھ مجاذیب کو عوام نے قابلِ تقلید و اتباع بنالیا تھا جب کہ مجاذیب صاحبِ تمکین اور صاحبِ ارشاد نہ ہونے کی وجہ سے اتباع کے لائق نہیں ہوتے ہیں اور نہ ہی ان کی تردید کی جاتی ہے۔ بلکہ ان کے حق میں سکوت اختیار کیا جاتا ہے۔ چوتھی طرف اکبری دور میں تصوف کے نظریات کو تو مرموز کر دین الہی سے متاثر افراد نے اتحاد و حلول کا عقیدہ گڑھ لیا تھا، جس کی وجہ سے شریعت و طریقت بازنسچہ اطفال بن گئی تھی، حضرت مجدد و الف ثانی نے ان سب کے خلاف سنت و شریعت کی آواز بلند کی، جاہل صوفیہ کا رو کیا، حلول و اتحاد اور نتائج جیسے ویدانتی عقائد کو مخالف اسلام قرار دیا، اور طریقت و حقیقت کی بھٹی میں خود چپ کر اس راہ کے مسائل اور نازک پہلوؤں کی نشان دہی فرمائی اور یہ کہا کہ تو حید و جود اور تو حید و ہوی ممالک کے راہ سلوک میں دو الگ الگ حال کا نام ہے۔ باطنی معاملات کا تعلق دعاوی سے نہیں، احوال سے ہوتا ہے۔

حضرت مجددِ قیام شہودی کو مقامِ مشاہدہ مانتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک وہ اعلیٰ ہے اور توحید وجودی کو سالک کا مقام مانتے ہیں اور ماسوائے وجودِ مطلق کے تمام مظاہر کو تنوعات و کمونیات میں سے قرار دیتے ہیں۔ ان پر یہ حقیقت سلسلہٴ نقشبندیہ سے منسلک ہونے کے کچھ سال بعد عیاں ہوئی ورنہ آپ خود توحید وجودی کے احوال سے گزر چکے تھے، یہ نعمت آپ کو والد ماجد سے وراثت میں ملی تھی۔ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ توحید شہودی کو آپ نے ظاہرِ شریعت سے زیادہ اقرب پایا ہے اس لیے آپ نے بعد میں اسی پر زور دیا تا کہ جاہلِ صوفیہ کے اثر و رسوخ کو ختم کیا جاسکے۔ اسی وجہ سے آپ نے شریعت پر سختی سے عمل ہی کو روحانی ارتقا کا ذریعہ قرار دیا ہے۔

آپ شریعت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں پر زور دیتے ہوئے لکھتے ہیں: ”ظاہر کو شریعت غرا کے ظاہر سے آراستہ کرنا اور باطن کو ہمیشہ حق جل و علا سے وابستہ رکھنا بڑا ہی اونچا کام ہے، دیکھیں کس خوش قسمت کو ان دو عظیم نعمتوں سے مشرف کیا جاتا ہے آج ان دونوں نعمتوں کا ایک ہونا بلکہ صرف ظاہرِ شریعت ہی پر مستقیم رہنا بہت ہی نادر اور نادر ہے، حق سبحانہ و تعالیٰ اپنے کمالِ کرم سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ظاہری اور باطنی متابعت پر استقامت کی توفیق عطا فرمائے“ (۲۱)

ایک اور مقام پر فرماتے ہیں کہ:

”شریعت کے تین حصے ہیں علم، عمل، اخلاص، جب تک یہ تینوں چیزیں متحقق نہیں ہو جائیں شریعت متحقق نہیں ہو سکتی، اور جب شریعت متحقق ہوگی تو پھر حق سبحانہ کی رضا حاصل ہوگی جو تمام دینی و دنیوی سعادت سے بڑھ کر ہے۔ ورضوان من اللہ اکبر“ (۲۲)

آپ کی انہیں مساعی جیلہ کا شمار یہ نکلا کہ ہندوستان و بیرون ہند کے مشاہیرِ علماء و مشائخ نے آپ کے دریائے فیض سے استفادہ کیا، ہندوستان کے مختلف صوبوں سے اربابِ علم و معرفت نے آپ کی ذات سے وابستہ ہو کر دعوت و اصلاح کے میدان میں نمایاں کارنامے انجام دیے۔ شریعت و طریقت کے میدان میں کامل و مکمل ہو کر تبلیغ دین کے لیے اسکاٹاف عالم میں پھیل گئے، خلافت و اجازت سے سرفراز ہو کر مشرقِ باگاہِ الہی بن گئے، یہ سب تائیدِ نبوی، غایتِ اخلاص، سنت و شریعت پر عمل اور غیر معمولی روحانی کمالات کے بغیر ناممکن ہے۔

این سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد خداے بخشندہ

آپ کے خلفا کی ایک لمبی تعداد ہے۔ پچھلے صفحات میں حضرت مجددِ دلف ثانی کے دعوتی طریقوں کی طرف اشارہ کیا گیا ان سارے محاذ پر آپ نے کام کرنے کے لیے آدم گری اور مردم سازی کا کام انجام دیا ہے کیونکہ بغیر صالح افراد کے کوئی انقلاب نہیں لایا جاسکتا ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم

نے بتایا کہ کس طرح حضرت مجددِ دلف ثانی نے خلفا کی قیادت میں دعوتی و فوہ دروانہ کیے ہیں، مذکورہ خلفا کے علاوہ اور بھی خلفا کی ایک بڑی تعداد ہے جو اس کام پر مامور تھے، یہاں ان کے کارناموں کو مختصراً بھی پیش نہیں کیا جاسکتا ہے اس لیے ہم نے ذیل میں ایک فہرست دینے پر اکتفا کیا ہے۔

خلفا

- ۱- حضرت خواجہ محمد صادق ۲- حضرت خواجہ محمد مصحوم عروۃ الثانی ۳- حضرت سید آدم بنوری ۴- مولانا امان اللہ لاہوری ۵- مولانا بدرالدین سرقدی ۶- حضرت خواجہ محمد سعید ۷- حاجی خضر خاں افغانی ۸- میر نصیر احمد رومی ۹- خواجہ عبید اللہ خواجہ کلاں ۱۰- خواجہ عبداللہ خواجہ خردا ۱۱- شیخ عبدالحمید حساری ۱۲- مولانا عبدالاحد لاہوری ۱۳- شیخ عبدالہادی فاروقی بدایونی ۱۴- شیخ حسن ابدالی ۱۵- مولانا صالح کولابی ۱۶- مولانا صدیق تھمی ۱۷- شیخ مزل ۱۸- حافظ محمود لاہوری ۱۹- شیخ یا محمد جدید بدخشی طالقانی ۲۰- مولانا محمد قدیم ۲۱- شیخ یوسف برکی ۲۲- مولانا یوسف سرقدی (۲۳)

ان خلفا کے علاوہ بھی دوسرے مشاہیرِ علمائے آپ سے استفادہ کیا اور آپ کے تجدیدی و اصلاحی مشن کو آگے بڑھانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ خاص طور پر اس سیاق میں حضرت علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی قدس سرہ کی ذاتِ انتہائی پیش پیش اور نمایاں رہی ہے، حضرت مجدد دسے آپ کی وابستگی ۱۰۲۲ھ میں ہوئی، حضرت مجددِ دلف ثانی کی تجدیدی خدمات، دعوتی اور اصلاحی کارناموں کی وسعت و ہمہ گیریت اور تمام طبقات میں اس کے نمایاں اثرات و یکھنے کے بعد آپ ہی کی ذات نے حضرت شیخ احمد سرہندی کو ”مجددِ دلف ثانی“ قرار دیا اور ملتِ اسلامیہ نے اس کی تائید و توثیق کی (۲۴)

مذکورہ اسما کے علاوہ بھی خانقاہ میں جاں نثار مریدین اور خلفا کی ایک بڑی تعداد تھی، بقول صاحبِ زبدۃ القامات ان خلفا کے علاوہ بھی بہت سے صاحبِ دل خلفا ایسے ہیں جو قزاق و بقر اور گوشہ گمنامی میں زندگی بسر کر رہے ہیں اور ان سے اکثر خادمانِ آستانہ بھی واقف نہیں ہیں۔ (۲۵)

زمانہ سیری میں عملی دعوت

۱۰۲۸ھ میں جب جہانگیر نے سجدہٴ تعظیمی کے انکار کی وجہ سے حضرت مجددِ دلف ثانی کو قلعہ کوہاڑ میں محبوس کر دیا تو آپ نے اس صعوبت کو صوبت نہیں بلکہ نعمت خداوندی اور انعامِ الہی قرار دیا۔ آپ نے خود فرمایا کہ یہاں مزید فیوض و برکاتِ الہی کا احساس ہو رہا ہے۔ پہلے میری تربیت جمالی طریقہ پر ہوئی تھی اور اب جمالی طریقہ پر ہو رہی ہے۔ یہ سفر آپ کے روحانی عروج و ارتقا کے علاوہ دعوتی نقطہٴ نظر سے نقطہٴ انقلاب (Turning Point) ثابت ہوا، چنانچہ ملک اور بیرون ملک آپ کے واقعہٴ سیری سے حکام، امراء، علماء و عوام شہد ہو گئے، خوداراکینِ سلطنت میں اختلاف ہو گیا، امراء و علماء سے خط و کتابت جاری رہا اور پھر ربانی کے بعد باؤشاہ تک کلمہ حق پہنچانے کا سنہرا

موقع ہاتھ آگیا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ نے ایک سال کے اندر رقلے کے اندر قید یوں میں اسلام کی ایسی پرستش کی جس سے ان کے دل ایمان کی روشنی سے منور ہو گئے ڈاکٹر آرنلڈ نے اس واقعے کو اپنی کتاب The Preaching of Islam میں یوں لکھا ہے کہ:

”شہنشاہ چنگیز (۱۶۰۵-۱۶۲۸ء) کے عہد میں ایک سنی عالم شیخ احمد مجدد نامی تھے۔ جو شیعہ عقائد کی ترویج میں خاص طور پر مشہور تھے، شیعوں کو اس وقت دربار میں رسوخ حاصل تھا۔ ان لوگوں نے کسی بہانے سے انہیں قید کروا دیا، دو سال وہ قید میں رہے اور اس مدت میں انہوں نے اپنے رفقاء زندان میں سے سیکڑوں بیت پرستوں کو حلقہ گوشہ بنا لیا“ (۲۶)

مذکورہ خدمات سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ حضرت کے مجدد کی خدمات کا دائرہ کتنا وسیع اور ہمہ گیر ہے اور آپ نے ہر سطح پر کس طرح اصلاح و تربیت سے شریعت اسلامی کو نافذ کرنے میں تگ و دو فرمائی ہے، مسلم سوسائٹی کی فکری، اعتقادی اور عملی انحراف کو سخت نبوی اور اتباع طریقہ محمدی سے بدلایا۔ اکبر کے رائج کردہ دین الہی کی خرافات و بدعات کو سرچند کے اس پوریہ نشین درویش ہمہ صفات نے فیوضِ باطنی اور جہاد مسلسل سے خاتمہ فرمایا ہے، حضرت مجدد کے تمام تجدیدی کارناموں کا دائرہ طریقہ نبوی پر خطاب و کتاب کے ذریعہ ایمان و ایقان کی تجدید و احیاء تھی جس کو نافذ کرنے میں وہ کامیاب ہو گئے، اور نیا بت کا حق ادا کرتے ہوئے مخلوق کے قلوب کا تزکیہ، شریعت کے ظاہر و باطن کی تعلیم اور دلوں میں اتباع نبوی اور اسوۂ حسنہ کی ویپ جلا دی اور حجازی سرمایہ ملت کو اقطار عالم تک پہنچا دیا۔

وقات پر ملا

علم و آفتاب کا یہ سورج حیات نبوی کے مطابق ۶۳ سال تک پوری آب و تاب کے ساتھ عالم کو منور کرنے کے بعد ۱۰۳۳ھ میں ضیق النفس کے عارضے کا شکار ہو گیا۔ وفات کی نشانیاں اور وصال کی خبر تو اتر سے اپنے مقربین کو بتا چکے تھے اخیر وقت تک سنت نبوی پر عامل تھے، آخری وقت میں صاحبزادگان کو وصیت فرمائی کہ ”سنت را بدندان خواند گرفت“ (۲۷) اور میری قبر کسی گناہ جگہ بنا دینا، اللہ اکبر! جدیدہ عالم پر نشانیاں ثبت کرنے کے بعد اس طرح چلتی کی تھیں۔

ہرگز نمیر و آں کہ دلش زندہ شد بہ عشق

ثبت است بر جدیدہ عالم دوام ما

۲۹ صفر المظفر ۱۰۳۳ھ/۱۶۲۳ء کو سرمایہ ملت کے اس عظیم المثل نگہبان کا وصال ہو گیا۔

اولاد و احیاء

پسندگان میں آپ نے سات صاحبزادے اور تین صاحبزادیاں چھوڑیں۔

صاحبزادے

- ۱- خواجہ محمد صادق قدس سرہ (م ۱۰۲۵ھ) ۲- خواجہ محمد سعید قدس سرہ (۱۰۷۰ھ) ۳- خواجہ محمد مصوم قدس سرہ (۱۰۷۹ھ) ۴- خواجہ محمد فرخ قدس سرہ (۱۰۲۵ھ) ۵- خواجہ محمد عیسیٰ قدس سرہ (۱۰۲۵ھ) ۶- خواجہ محمد اشرف قدس سرہ ۷- خواجہ محمد کی قدس سرہ (۱۰۹۶ھ)

صاحبزادیاں

- ۱- بی بی رقیہ ۲- بی بی خدیجہ بانو، ۳- بی بی ام کلثوم قدس سرہ ۴- بی بی ام کلثوم قدس سرہ کی تمام اولاد آپ کے راستے پر تھیں اور آپ کے مشن کو آگے بڑھانے میں آپ ہی جیسا کردار پیش کیا ہے، اولاد کی باطنی خصوصیات و اوصاف کے متعلق حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے مقبولات شاہد ہیں، یہ ایسی صالح اولاد تھیں جنہیں کسی اور کسی طرح کے کمالات حاصل تھے۔

معاصر علماء و مشائخ

حضرت مجدد الف جنس صدی میں اصلاح و تجدید کے فریضے انجام دے رہے تھے، حکومتی، سماجی، سیاسی اور علمی سطح پر خرابیوں کی اصلاح کر رہے تھے، اسی زمانے میں آپ کے معاصر علماء و مشائخ کی ایک بڑی تعداد بھی اپنے اپنے دائرے میں اصلاح و تربیت اور علم نبوت کی اشاعت میں ہمہ تن مصروف تھے۔ ملک بھر میں علم و فضل اور فیض و روحانیت کی ایک کھنکشاں آباد تھی جس سے جڑے ستاروں میں ترجیح ایک مشکل امر ہے۔ ایسے دور میں مجدد و صاحب کی ہمہ گیر اصلاحات ان کی انفرادیت کو نمایاں کرتی ہے۔ ذیل میں آپ کے چند معاصرین کے نام درج کیے جاتے ہیں:

- ۱- شیخ احمد بن مجتبیٰ مائیک پوری (۱۰۰۴ھ) ۲- ملا عبد القادر بدایونی (۱۰۰۴ھ) ۳- حضرت مولانا عبد اللہ انصاری (۱۰۰۷ھ) ۴- حضرت شیخ بہلول دہلوی (۱۰۰۷ھ) ۵- حضرت سید میر عبد الواحد بکرامی (۱۰۱۷ھ) ۶- شیخ محمد رشید عثمانی جون پوری (۱۰۲۳ھ) ۷- حضرت شیخ نظام الدین تھانیسری (۱۰۲۴ھ) ۸- شیخ عیسیٰ بن قاسم سندھی (۱۰۳۱ھ) ۹- مولانا شکر اللہ شیرازی (۱۰۳۸ھ) ۱۰- حضرت شیخ تاج الدین سنہلی خلیفہ اول حضرت خواجہ باقی باللہ (۱۰۵۰ھ) ۱۱- حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی (۱۰۵۲ھ) ۱۲- حضرت شیخ محبت اللہ آبادی (۱۰۵۳ھ) ۱۳- حضرت سید میر عبد الحلیل بکرامی (۱۰۵۷ھ) ۱۴- حضرت شہباز محمد بھاگلپوری (۱۰۶۰ھ) ۱۵- قاضی محمد اسلم (۱۰۶۱ھ) ۱۶- حضرت طیب بن معین بناری (۱۰۶۲ھ) ۱۷- ملا محمود جون پوری (۱۰۶۲ھ) ۱۸- حضرت شیخ نورالحق دہلوی (۱۰۷۳ھ) ۱۹- حضرت احمد بن عبد اللہ خضریٰ حیدر آبادی (۱۰۷۳ھ) ۲۰- حضرت شیخ احمد بن محمد کاسیوی (۱۰۸۲ھ) (۲۸)

حواشی و تعلیقات

- ۱- مقامات خیرص: ۳۳
- ۲- تذکرہ علمائے ہند (مترجم)، پاکستان پبلیکیشن سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص: ۸۸
- ۳- تذکرہ مجدد الف ثانی مرتبہ مولانا منظور مطبوعہ لکھنؤ، ۱۴۰۲ھ، ص: ۲۴۵-۲۴۶
- ۴- مجدد الف ثانی، پروفیسر محمد مسعود احمد، اسلامک پبلیشرز دہلی، ۲۰۰۳ء، ص: ۲۵
- ۵- حوالہ سابق ص: ۲۸
- ۶- زبدۃ القامات ص: ۱۳۴-۱۳۵، ملخصاً بحوالہ تاریخ مشائخ نقشبندیہ از مولانا نفیس احمد مصباحی، مطبوعہ لکھنؤ، ۲۰۱۰ء، ص: ۲۸۴-۲۸۳
- ۷- مکتوبات امام ربانی، دفتر سوم، مکتوب، ۸
- ۸- اخبار الاخیار مع مکتوبات از شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مطبوعہ لاہور، ۲۰۰۹ء، ص: ۳۲۴
- کچھ تذکرہ نویسوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی کو سلسلہ سہروردیہ میں حضرت استاد محترم شیخ یعقوب صمری کشمیری قدس سرہ سے خلافت و اجازت حاصل تھی اور حضرت موصوف کو شیخ حسین خوارزمی سہروردی سے۔ لیکن خود شیخ محمد نے جن بہتوں سے استفادے کا ذکر مکتوبات میں فرمایا ہے وہ تین ہی ہیں، ممکن ہے عقیدت میں کچھ مورخین نے سہروردیہ کا اضافہ کر دیا ہو۔
- ایک دوسری بات یہ عرض کرنی ہے حضرت مجدد قدس سرہ کی شخصیت کی عمق پرستی اور ان کے روحانی کمالات کے متعلق آپ کے پیر طریقت حضرت خواجہ باقی باللہ کے کئی اقوال مورخین نے نقل فرمائے ہیں ان میں کچھ وہ بھی ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ حضرت مجدد کے روحانی کمالات اپنے پیر پر بھی فائق تھے۔ جب کہ طریقت کے ادنیٰ طالب علم کے لیے یہ بات سرے سے ناقابل اعتبار ہے، کیوں کہ اس راہ میں جملہ فیوض و برکات پیر کے پردے میں ملتے ہیں۔ البتہ یہ یقین ممکن ہے کہ حضرت مجدد دس غلبہ محبت میں مورخین نے اس قسم کی باتیں لکھ دی ہوں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان اصحاب کے دل کدورت زدہ تھے۔ ہرگز نہیں۔ غلبہ حال کی باتیں تحریر میں آجانے سے تمام باتوں کا انکار علمی دیانت کے خلاف ہے لیکن تمام باتیں تسلیم کرنا بھی خلاف عقل ہے۔
- ۹- زبدۃ القامات ص: ۱۵۶ بحوالہ مجدد الف ثانی، پروفیسر مسعود احمد ص: ۲۹
- ۱۰- حضرت مجدد الف ثانی مصنفہ پروفیسر محمد مسعود احمد ص: ۴۲
- ۱۱- مجددی عقائد و نظریات از مولانا عبدالحکیم خاں اختر شاہیچہا پوری مطبوعہ لاہور، ۱۹۹۹ء، ص: ۱۶
- ۱۲- حضرت مجددی، ص: ۲۲۔ حضرت پروفیسر نے بقیہ اسفار کو اتفاقی کہا ہے جب کہ مشائخ کے اسفار محض اتفاقی نہیں ہوتے ہیں اس میں من جانب اللہ امر اور حکمت کا جہاں پوشیدہ

- ہوتا ہے۔ وہ کوئی قدم اپنی مرضی سے نہیں اٹھاتے ہیں خود حضرت مجدد الف ثانی نے جتنے دن قلعہ گولیار میں قید و بند کی زندگی بسر کی ہے ان دنوں دعوت کا کام وہیں سے بحسن و خوبی انجام پاتا رہا ہے۔ قلعہ کے قیدیوں نے آپ کے ہاتھ پر توبہ کیا اور ایمان لائے، اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مشائخ کے اسفار و اقدام حکمتوں سے پُر ہوتے ہیں۔ خود حضرت مجدد نے اس سفر کو نصیحت قرار دیا ہے۔ اور اہم بات یہ ہے کہ آپ کی دعوتی زندگی کا یہ سفر Turning Point (نقطۂ انقلاب) ہے جہاں سے اسلامی تحریک کے احیا کا دور عروج شروع ہوتا ہے۔
- ۱۳- زبدۃ القامات ص: ۲۰۹، بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت چہار مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی مطبوعہ لکھنؤ، ۱۹۸۸ء، ص: ۱۸۴
 - ۱۴- تاریخ دعوت و عزیمت چہارم ملخصاً ص: ۱۸-۱۸۱
 - ۱۵- اخبار الاخیار ص: ۳۲۶۔ حضرت شیخ نے یہ کلمات خواجہ حسام الدین قدس سرہ (۱۰۳۳ھ) کے نام ارسال فرمائے تھے، جسے مورخین نے تواتر کے ساتھ نقل کیا ہے۔ اخبار کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے اس میں اصل متن میں حضرت شیخ مجدد کا ذکر نہیں ہے۔ البتہ کتاب کے اختتام پر کسی عزیز نے حضرت مجدد کا تذکرہ اضافہ کر دیا ہے۔
 - ۱۶- روختہ القیومیہ: ۱۶۶-۱۶۷ بحوالہ تاریخ دعوت و عزیمت ص: ۱۶۰
 - ۱۷- تاریخ دعوت و عزیمت جلد ۲، ص: ۱۶۲-۱۶۱ ملخصاً
 - ۱۸- حضرت مجدد الف ثانی ص: ۱۹۹-۱۹۵
 - ۱۹- نزہۃ الخواطر، عبداللہ بن فخر الدین حسنی، جلد ۵، ص: ۴۷-۴۸، ملخصاً
 - ۲۰- مکتوبات امام ربانی، مطبوعہ کراچی، ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء، مکتوب نمبر ۳۳، ص: ۹۵
 - ۲۱- ایضاً، مکتوب: ۸۳، ص: ۱۸۴
 - ۲۲- حضرت مجدد الف ثانی، پروفیسر محمد مسعود احمد ص: ۹۹
 - ۲۳- تاریخ دعوت و عزیمت، ص: ۳۷۱
 - ۲۴- سیکل احمد سکندر پوری مدظلہ، دہلی، ۱۳۰۹ھ، ص: ۹۸، بحوالہ حضرت مجدد الف ثانی: ۱۶۸
 - ۲۵- بحوالہ تذکرہ مجدد الف ثانی، مولانا محمد منظور نعمانی ص: ۳۵۰
 - ۲۶- The Preaching of Isla 1953, P.988 بحوالہ حضرت مجدد الف ثانی
 - ۲۷- زبدۃ القامات ص: ۰۹-۲۸۹، بحوالہ حضرت مجدد الف ثانی پروفیسر محمد مسعود احمد ص: ۱۶۲
 - ۲۸- معاصرین کا انتخاب میں نزہۃ الخواطر، حدائق الحقیر اور دیگر کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

مجدد الف ثانی کی تجدیدی خدمات

سنن ابوداؤد کی مشہور حدیث ہے: ان الله وعز وجل يبعث لهنه الامه على راس كل مئة سنة من يجدد لهاد بنها (بے شک اللہ تعالیٰ ہر صدی کے اختتام پر ایک ایسا عظیم الشان اور ہمہ جہت و ہمہ گیر عالم پیدا فرمائے گا جو بدعات و خرافات کو مٹانے، مگر اہی کو ختم کرنے اور احیائے سنت و تجدید دین کا فریضہ انجام دے گا۔) اس حدیث پاک کو حاکم نے اپنی مستدرک میں اور ملا علی قاری نے مرقاۃ میں نقل کیا ہے۔ کثر العمال میں بھی یہ حدیث موجود ہے۔

ایسے جید عالم یا عمل کو مجدد دین و ملت قرار دیا جاتا ہے جو لومۃ لائم کی پرواہ کیے بغیر حق کا پرچم بلند کرتا ہے۔ ایسے شخص کو بدعتیوں، مگر اہوں اور بدعتیوں کی طرف سے سخت مخالفت اور ظلم و جور کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے، سب و شتم، مصائب و آلام، تشدد و ور قید و بند سے بھی دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن ایسی پر عزم ہستیاں ہمیشہ رخصت پر نہیں عزیمت پر عمل کرتی ہیں۔ وہ کسی حال میں اہل ظلم و جور کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتیں بلکہ سر بلندی و سرفرازی ان کا شیوہ اور طریقہ ہوا ہے۔ ایسی ہی ہستیوں اور مجددوں میں شیخ احمد فاروقی سرہندی المعروف بہ مجدد الف ثانی علیہ الرحمۃ والرضوان کا نام نامی اسم گرامی بہت نمایاں ہے۔ ان کی عظمت و شان کو ظاہر کرنے کے لیے علامہ اقبال کے یہ اشعار کفایت کرتے ہیں:

وہ ہند میں سرمائے ملت کا نگہبان
اللہ نے بر وقت کیا جس کو خیر دار
گروں نہ جھکی جس کی جہاں گیر کے آگے
جس کے نفس گرم سے ہے گرمی احرار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے
اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحب اسرار

عام طور سے ہر صدی کے اختتام پر کسی ایسے عالم دین کو جس نے خدمت دین مبین اور احیائے سنت کا فریضہ بہت نمایاں انداز میں انجام دیا ہو مجدد و مقرر دیا گیا ہے۔ چوں کہ یہ اعزاز و خواص امت نے اپنے اپنے ذوق اور صواب و ید کے مطابق عطا کیا ہے، اس لیے ایک ہی صدی میں کئی کئی افراد کو مجدد و مقرر کہا گیا ہے اور ان کے سلسلے میں اختلاف بھی کیے گئے ہیں لیکن شیخ احمد فاروقی سرہندی علیہ الرحمۃ والرضوان کا یہ امتیاز خاص ہے کہ انھیں سن ہجری کے دوسرے ہزارے کے آغاز پر مجدد الف ثانی کہا گیا اور اس تو اتر اور شد و مد سے کہا گیا کہ آج ان کے نام کی جگہ یہ لقب ہی مشہور و معروف ہے، نام پس منظر میں چلا گیا ہے۔ اب مجدد الف ثانی کہتے یا سنتے ہی ذہن صرف اور صرف آپ ہی کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یہ آپ کے حقیقی اور عظیم مجدد دین و ملت ہونے کی ایسی دلیل قاطعہ ہے کہ جسے روٹھیں کیا جاسکتا۔

شیخ احمد کی ولادت شب جمعہ ۱۲ اشوال ۱۲۹۳ھ ۱۵۶۳ء میں مشرقی پنجاب کے مشہور شہر سرہند میں ہوئی تھی۔ والد گرامی شیخ عبدالاحد، صاحب نسبت بزرگ تھے۔ مشہور و معروف بزرگ حضرت عبدالقدوس گنگوہی اور پھر ان کے فرزند شیخ رکن الدین کی خدمت میں رہ کر متاثر و متاثر ہو کر سچے سچے تھے اور قادری چشتی سلاسل میں خرقہ خلافت اور رشد و ہدایت نیز تقنین و تربیت کی اجازت سے سرفراز تھے۔

حضرت شیخ احمد نے حفظ قرآن کی تکمیل کے ساتھ دیگر علوم دین ۱۶ سال کی عمر میں ہی کمال و مقام حاصل کر لیے تھے۔ کچھ عرصہ درس و تدریس سے بھی وابستہ رہے۔ اس دوران کئی رسائل جیسے رسالہ تحلیلہ، اور رسالہ رد مذہب شیعہ، وغیرہ تحریر فرمائے۔ دہلی میں معروف بزرگ شیخ عبدالباقی نقشبندی المعروف بہ خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ والرضوان سے اکتساب فیض کیا۔ بیعت و ارادت کا رشتہ استوار کر کے چند روزہ قیام میں ہی راہ سلوک کی بہت سی منازل سر کر لیں۔ دوسری بار جب دہلی تشریف لائے تو خلافت و اجازت سے سرفراز کر دیے گئے اور طالبان خدا کو تعلیم طریقت اور رشد و ہدایت سے شاد کام کرنے کا حکم صادر ہوا۔ عام طور پر پر مہین و متوسلین ہی اپنے شیخ کی تعریف و توصیف میں رطب اللسان رہتے ہیں لیکن خود شیخ طریقت اپنے اس مرید خاص سے کس قدر متاثر و اراں کی صلاحیتوں اور آئندہ کی انجام پانے والی خدمات دین کے سلسلے میں کس قدر یقین اور مطمئن تھے، اس کا اندازہ آپ کے اس جملے سے لگایا جاسکتا ہے ”شیخ احمد آفتاب است کہ مثل ماہزراں سیارگا در ضمن ایشان گم اند“ (دیکھئے زبدۃ المقام، ۳۴۰) شیخ احمد آفتاب ہیں کہ جن کی روشنی میں ہم جیسے ہزاروں سیارے گم ہیں)

حضرت والا اپنے احوال اور ترقیات باطنی کی تفصیلات سے نہ صرف خود آگاہ رہتے تھے بلکہ

ان کا اظہار بھی فرماتے تھے۔ آپ کو یقین کامل تھا کہ اللہ تعالیٰ آپ سے کوئی بڑا کام لینا چاہتا ہے۔“

(دیکھئے مکتوب ۲۷۔ فتر دوم)

دراصل عہد اکبری میں اسلام کی بیخ کنی کا کام جس منصوبہ بندی، شد و مد اور وقت سے کیا گیا تھا، شعائر اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی جیسی وسیع کوششیں کی گئی تھیں، اسلام کے بجائے دین الہی، اکبر شاہی کو رائج کرنے کی جیسی منظم کوشش کی گئی تھی، فلاسفہ، نام نہاد عقائد، دو دانش وروں، علمائے سوء اور جاہل صوفیہ و نام نہاد اہل طریقت نے اسلام کے نورانی چہرے کو داغدار کرنے کی جیسی سعی یا مسعودی کی تھی، ان سب کے ازالے کے لیے ایک ایسی یا صلاحیت، ہمہ گیر و ہمہ جہت مجدد دین و ملت شخصیت کی ضرورت تھی جو حکمت، تدبیر و تدبیر کے ساتھ تمام نامعقول و نامسعودی عادات و خرافات اور خیالات و نظریات کا قلع قمع کر کے اللہ کے پسندیدہ دین کو پھر سے اس کی اصلی حالت میں لا کر بندگان خدا تک پہنچا سکے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی ذات والا صفات کو اس خدمت عالیہ کے لیے منتخب فرما لیا تھا، اسی لیے آپ نے اس فریضہ کو آزادی اور اسیری دونوں میں اپنی تحریر سے بقتیر سے، تبلیغ سے اور جہد و عمل سے، اس احسن طریقے سے انجام دیا کہ ہر طرف سے آپ کو ”مجدد الف ثانی“ کے خطاب لاٹانی سے یاد کیا جانے لگا۔ آپ کے تفصیلی احوال و خدمات تو ضخیم کتابوں کا موضوع ہیں، اس لیے فی الوقت آپ کے تجدیدی کارناموں کا ذریعہ واکہ یعنی آپ کے گرامر اقدار مکتوبات کا مختصر ماحولی و تدبیری تجزیہ ہی مقصود ہے۔

مکتوبات امام ربانی کے نام سے موسوم مکتوبات، حضرت والا کی سب سے بڑی علمی و تدبیری اور اصلاحی تجدیدی خدمت اور یادگار ہیں۔ یہ مکتوبات جنہیں جدید علمی اصطلاح میں مقالات کہا جاسکتا ہے، آپ کے علمی مقام، فارسی ادب پر آپ کی دسترس، آپ کی رشد و ہدایت کی صلاحیت کا آئینہ، تبلیغ و ارشاد کی مساعی کا نمونہ اور علوم و معارف کا گنجینہ ہیں۔ اسی لیے ان کے تراجم اردو، عربی، ہندی اور دیگر زبانوں میں بھی ہوئے، تاکہ ان سے وہ لوگ بھی استفادہ کر سکیں جو فارسی سے ناواقف ہیں، اس طرح ان کا فیض عالم اسلام کے بیشتر ممالک تک پہنچا۔ ان کی شریں بھی لکھی گئیں، علمی و روحانی مراکز میں انھیں نصاب میں شامل کیا گیا اور ان کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہوا۔ اہل علم و نظر اور اہل سلوک نے انھیں حرز جان بنایا۔

ان مکتوبات کی مجموعی تعداد ۵۳۶ ہے، انھیں فتروں یا حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ فتر اول ”دار المعرفت“ کے نام سے موسوم ہے، اس میں شامل مکتوبات کی تعداد ۳۱۳ ہے، ۳۱۴ کا عدد متبرک سمجھا جاتا ہے، اس لیے کہ رسولوں کی تعداد بھی ۳۱۳ بتائی گئی ہے، حضرت داؤد نے جس فکر کے ساتھ جالوت کی افواج کا مقابلہ کیا تھا، اس میں بھی ۳۱۳ مجاہدین تھے نیز رسول اکرم ﷺ کی

قیامت باسعادت میں کفر و اسلام کے درمیان میدان بدر میں جو عرصہ کا رزار گرم ہوا تھا اس وقت بھی حامیان اسلام اور اصحاب بدر کی تعداد ۳۱۳ ہی تھی۔ اسی لیے مکتوبات بھی ۳۱۳ ہی شامل کیے گئے۔ انھیں خود حضرت والا کے ایماء سے آپ کے خلیفہ خاص حضرت مولانا محمد جید بدخشانی طالقانی نے ۱۰۲۵ھ میں مرتب کیا تھا۔

فتر دوم میں کل ۹۹ مکتوبات ہیں جنوں کے اسمائے حسنی اور اسمائے رسول مقبول ﷺ کی تعداد بھی ۹۹ ہے اس لیے اس عدد کو بطور تحریک اختیار کیا گیا۔ ”نور اللغات“ کے تاریخی نام سے موسوم اس فتر کے مرتب مولانا عبدالحی حصار شادمانی ہیں جنھیں ان کی ترتیب کا حکم حضرت والا کے صاحبزادے خواجہ محمد معصوم نے دیا تھا۔ ۱۰۲۸ھ میں یہ ترتیب پایہ تکمیل کو پہنچی۔ فتر سوم موسوم بہ معرفۃ الحقائق مرتبہ مولانا محمد ہاشم ٹھٹھی ہے، ۱۰۳۱ھ میں مرتب کیے گئے، اس مجموعے میں ابتداء ۱۱۴ مکاتیب تھے اور اس عدد کو سورہ ہائے قرآنی کے اعداد کی مناسبت سے اختیار کیا گیا تھا۔ بعد میں دس مکاتیب کا اضافہ کر کے اس تعداد کو ۱۲۴ تک پہنچا دیا گیا۔

ان مکتوبات میں سے ۲۰ مکاتیب حضرت والا نے اپنے پیر و مرشد حضرت خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمۃ والرضوان کی خدمت اقدس میں ارسال کیے ہیں۔ دو تین مکتوبات بہ عنوان یکبارہ اصلاحات لکھے گئے ہیں جو غالباً کسی مریدہ کے نام ہیں۔ ایک خط ہر دے رام نام کے کسی ہندو کے نام ہے، بقیہ مکاتیب اپنے معاصرین، معتقدین و مریدین کو ارسال کیے گئے ہیں۔ ان میں سے اکثر مکتوب بجائے خود ایک کتابچے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مضامین میں وہ رفعت، جامعیت، افادیت اور تاثیر و طاقت ہے جو چار صدیوں سے اپنے قارئین کو متاثر و مرعوب کر رہی ہے۔ انھیں علمی نکات اور حقائق و معارف سے بہرہ ور کر رہی ہے۔ دراصل مکاتیب کے یہ دفاثر ایسا سدایہ رچن ہیں کہ جن پر گزشتہ چار صدیوں سے خزان کا سایہ بھی نہیں پڑا ہے۔ تراجم کے ذریعہ متعدد زبانوں میں ان کی لطافت و اشاعت، مطالعے اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری ہے اور ان شاء اللہ جاری رہے گا۔ عہد مجد و الف ثانی کے فکری و ادبی رجحانات کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں شش جہتی بگاڑ اور زراپاں تھیں اور اس دور پر ہی کیا موقوف، یہ بگاڑ اور زراپاں تو اتر کے ساتھ جاری ہیں، آج بھی یہ اپنا کام کر رہی ہیں۔ درحقیقت شیطانی مشن ہر دور میں اور ہر وقت مہر و ف کا رہتا ہے لیکن حضرت مجدد الف ثانی جیسی شخصیت صدیوں کے وقفے کے بعد ظہور میں آتی ہے۔ لیکن جب ظاہر ہوتی ہے تو شیطانی مشن کے نارو پو و بکھیر دیتی ہے۔ بہر حال آپ کے دور کے شش جہتی بگاڑ اور ان کے خلاف آپ کی جدوجہد و روح ذیل انداز سے سمجھا جاسکتا ہے:

ایک طرف علمائے سوتھے جو اپنے معمولی مفادات اور حرص و ہوس کے لیے باہم دست و گریہاں رہتے تھے، طبقہ امراء کی خوشنودی کے لیے حکام دین کی ایسی تاویل کرتے تھے، فقہی مسائل کو اس طرح بیان کرتے تھے کہ جن سے امراء کے لیے آسانیاں فراہم ہوں اور وہ صلے میں انھیں انعام و اکرام سے نوازیں۔ مثلاً انھوں نے حلال حول (زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے مال کے ایک سال تک ملکیت میں رہنے کی شرط) کو اس طرح موڑ دیا تھا کہ کل مال کا چھہ سات مہینہ شوہر مالک رہے پھر وہ مال بیوی کو ہبہ کر دیا جائے اور اس طرح دونوں باہم منتقل کرتے رہیں تو اس صورت میں زکوٰۃ کسی پر واجب نہ ہوگی۔ اسی طرح فرسہ رج کو بھی راستوں کے مخدوش اور پرخطر ہونے کی بنا پر ملتوی کر دیا گیا تھا۔ انھوں نے شاہیوں کی خوشنودی کے لیے مجدد تغلیس کو بھی جائز قرار دے دیا تھا اور پسندیدہ عورتوں کو حاصل کرنے کے لیے بھی طرح طرح کے حیلے پہنانے اور جواز تلاش کیے گئے تھے۔ ایسے ہی علماء کی رکیک حرکتوں نے اسلام کے پر جوش معتقد مگر پر تجسس اکبر کو نہ صرف علماء سے بلکہ خود اسلام سے بھی بدظن کر دیا تھا۔ آج کے علماء سوجھی اپنے ”فرائض“ اسی تواتر سے انجام دے رہے ہیں۔ آج بھی حکومت وقت اور امراء کی کاسہ لیس ان کا شعار ہے، ان کے اشاروں پر افتراق بین المسلمین میں مشغول ہیں۔ حضرت مجدد الف ثانی نے اپنے دور کے علمائے سوئی خوب خبر لی۔ ان کی حرص و ہوس کو بے نقاب کیا، ان کی تاویلوں اور رکیک حرکات کو اجاگر کیا اور درباری طبقہ امراء تک علمائے حق کو پہنچانے کی کوشش کی تاکہ ان کی صحیح رہنمائی ہو سکے۔ آپ کی مساعی جلیلہ بڑی حد تک ثمر آور ہوئیں اور علمائے سوء کے پھیلانے ہوئے جال بڑی حد تک دور ہوئے۔

دوسری طرف فلاسفہ اور نام نہاد عقلاء و اہل دانش کا آزاد خیال طبقہ تھا جو آزاد روی کا ولدا وہ تھا اور اسی کو شعار بنائے ہوئے تھا، وحدت ادیان کا راگ الاپ رہا تھا، اللہ کی ذات و صفات اور دین کے اصول و نظریات کو اپنی عقل خام کی کسوٹی پر کس رہا تھا اور سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کو رد کر کے ایک ایسا دین بنانے پر آمادہ تھا جو تمام ادیان کا میخون مرکب ہو جس میں ان کے خیال کے مطابق سبھی ادیان کی اچھی باتوں کو سمویا جائے اور مضریاتوں کو رد کر دیا جائے جو آسانیاں فراہم کرے اور مرضی و منشاء کے تابع ہو۔ دراصل اس وقت ایران سے ہندوستان تک ایک شوہ چھوڑا گیا تھا کہ نبوت محمدی ایک ہزار سال کے لیے تھی، اب یہ وقت پورا ہو گیا ہے اس لیے اس کا دور ختم ہوا۔ اب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ایک ایسے دین کی ضرورت ہے جو ضرورت وقت کے مطابق ہو۔ جس کی اساس عقل و فلسفہ پر ہو۔ ایران کی صفوی تحریک، اور ہندوستان میں دین الہی اکبر مٹائی، اس نظر سے کام لیا گیا اور رد عمل تھے۔ حریکیں نہ صرف رمالیت محمدی علیہ التحیۃ والثناء کی منکر تھیں اور شریعت محمدیہ کو ازکار رفتہ ثابت کرنے پر تکی ہوئی تھیں، بلکہ اللہ جل جلالہ کی ذات

وصفات کے متعلق بھی غلط فہمیوں کے زیراثر عجیب و غریب افکار و نظریات کا اظہار کر رہی تھیں اور بے پناہ قوتوں و قدرتوں کو محدود کر کے اسے لاچار و مجبور اور بے دست و پا لہ قرار دینے کے لیے کو مثال تھیں سرکارِ دو دربار میں اس گروہ کا بڑا اثر و نفوذ تھا۔ ابوالفضل اور فیضی جیسے اہل عقل و دانش کی قیادت میں یہ طبقہ بڑا سرگرم تھا۔ اس لیے انھیں سے سب سے بڑا معرکہ درپیش تھا۔ آپ نے اس امر پر زور دیا کہ عقل و دانش حقائق دینی کے ادراک میں نا کافی و ناقص ثابت ہوتی ہیں۔ انوار نبوت کی رہنمائی کے بغیر اور اس کی رہنمائی و مدد کی عدم موجودگی میں یہ ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کا ادراک کیا جاسکے یا احکام شریعت کو سمجھا جاسکے۔ اس ضمن میں فرماتے ہیں: عقل اگر معرفت الہی کے مسئلہ میں کافی ہوتی تو فلاسفہ یونان جنھوں نے عقل کو اپنا مقتدی بنایا تھا، مگر اسی کے پیابا نوں میں نہ پہنچتے اور حق تعالیٰ کو دوسروں کے مقابلے میں زیادہ پہنچاتے۔“ (از مکتوب ۲۱۳)

دفعہ سوم بنا خواجہ ابراہیم قبادیانی

ایک اور مکتوب میں ارشاد گرامی ہے:

”عقل کے ساتھ وہم و خیال، حرص و ہوس خطا و نسیان اور غصہ و خواہشات بھی لگی ہوتی ہیں ان کے ہوتے ہوئے کیا عقل ہمیشہ صحیح نتائج تک پہنچا سکتی ہے؟“

(از مکتوب ۲۶۶، دفتر اول بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبید اللہ)

ایک مکتوب میں کیا خوب فرماتے ہیں:

”دلفس، خواہ نزدیک کے بعد نفس مطمئنہ ہی کیوں نہ بن گیا ہو لیکن وہ اپنی صفات سے پوری طرح الگ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے غلطی کا احتمال اس میں بھی باقی رہتا ہے۔“

(از مکتوب ۳۱ بنام شیخ درویش)

حضرت والا کے یہ ارشادات اہل عقل و دانش کو قائل کرنے کے لیے کافی ہیں بشرطیکہ واقعی ان کے پاس عقل سلیم ہو۔ نہ ماننے والوں اور ضد و ہوت دھرمی پر قائم رہنے والوں کو کوئی دلیل مطمئن نہیں کر سکتی۔

دراصل اہل مذہب اور اہل عقل و دانش کا قضیہ بڑا قدیم ہے۔ مسلمانوں میں عہد عباسی میں یہ قضیہ اس وقت پیدا ہوا جب یونانی علوم اور فلسفہ کو عربی میں منتقل کیا گیا۔ ان کے زیراثر ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جس نے بہت سے مسلم اعتقادات و نظریات کا انکار کرنا شروع کیا اور مذہبی معتقدات کو فلسفہ و عقل کی کسوٹی پر کسنا شروع کیا۔ نتیجہ میں اہل مذہب کے ساتھ ان کا مناقشہ ہوا۔ یہ طبقہ ”معتزلہ“ کے نام سے مشہور رہا اور اس نے عباسی خلیفہ مامون الرشید اور اس کے بعد اس کے دو تین جانشینوں کے عہد میں بڑا عروج پایا اور اپنے خیالات کو بڑے روتوت پھیلانے کی کوشش کی۔

تقریباً ایسا ہی طبقہ ”عبدالکبریٰ میں پیدا ہوا تھا جس کا مقابلہ اس دور کے علما نے کیا اور پھر حضرت مجدد الف ثانی نے ان کے نظریات کی کنز وریاں ظاہر کر دیں۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں بھی سائنسی ترقیوں اور ایجادات کے ظہور میں آنے کے بعد عقل کی کارفرمائی پر بہت زور دیا جانے لگا تھا مغرب کے نام نہاد عقلاء، سائنس دان اور فلسفی اپنی عقل و دانش کے زعم میں ہر اس بات کے منکر تھے جو سمجھ میں نہیں آتی یا نظر نہیں آتی۔ چونکہ مذہب کو عقل سے نہیں وجدان سے سمجھا جاسکتا ہے اس لیے ان لوگوں کے نزدیک مذہب کا رزق اور بے کار محض قرار پایا۔ مشرق کے نقالوں اور مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا افراد مغرب کی ہر بات پر آمنا و صدقہ کہنے پر مصر تھے اس لیے مذہب کا انکار بلکہ اس کا مستحکم ان کے لیے بھی ناگزیر تھا۔ ان میں کچھ لوگ وہ بھی تھے جو مذہب کو مطلقاً چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھے لیکن ”داناے مغرب“ کے ارشادات بھی ان کے لیے وحی الہی سے کم نہیں تھے۔ اس لیے انھوں نے دونوں میں تطبیق کی کوشش کی اور اس کی صورت یہ تھی کہ مذہب کی جو بات خلاف عقل محسوس ہو اس کا انکار کر دو اور مذہب کو سائنس و فلسفے کے تابع کر دو، مراد یہ تھی کہ سائنس و فلسفہ مذہب کی جس بات کو ماننے کی اجازت دے اسے مان لو بقیہ سب کو قصے کہانیاں، اسرائیلی اور لاطینی باتیں قرار دے کر رو کر دو۔ اس طرح مذہب بھی باقی رہے گا اور عقل و دانش کی علمبرداری بھی۔ اب اس کوشش میں ”نہ خدا ہی ملانہ وصال صنم“ نہ ادھر کے رہے نہ ادھر کے رہے“ والا معاملہ ہوتا ہو لیکن دو کشتیوں کی سواری کا مرکز قتل ہی جائے گا سرسید کی تحریک نیچریت کی بنا اسی پر تھی کہ جو بات سمجھ میں نہیں آتی اور جو چیزیں نظر نہیں آتیں، ان کا انکار ضروری ہے۔ ”دانا یاں فرنگ، جن باتوں کے منکر ہیں بھلا ہم انھیں کیسے مان سکتے ہیں؟ ایسے میں مغرب سے ہی ایک جرمن فلسفی کا نٹ نے عقل کی حدود اور رسائی دلائل و براہین سے ظاہر کی، اس کی معرکہ آرا کتاب Critique of the pure reason جس کا اردو ترجمہ ”تفتید عقل محض“ کے نام سے ہو چکا ہے، تقریباً ان ہی خیالات کا اعادہ کرتی ہے جو کانٹ سے تقریباً دو سو سال قبل حضرت مجدد الف ثانی نے ظاہر فرمائے تھے۔ مغرب میں اس کے خیالات کی بڑی پیرائی ہوئی۔ اس نے عقل کی ماریٹائی پر پھر پورا انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ بقول علامہ اقبال ”کانٹ نے روشن خیالوں کے کارناموں کو خاک کا ڈھیر بنا دیا ہے، Reduced the whole work of the rationalists to a beap of uins. the reconstruction of religious thought in Islam, P:5“

مجدد الف ثانی کی عظمت اور آپ کا تجدیدی کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے عقلیت پسندوں کے خیالات کو پر کاہ بنا کر اڑا دیا تھا اور ایسے خیالات کا اظہار فرمایا تھا جو ہمیشہ تروتازہ

رہنے والے، ہمیشہ کام آنے والے اور عقلیت پسندوں کو خاموش کر دینے والے تھے۔

تیسری طرف جاہل صوفیاء و رمانہا و طریقت کے علمبرداروں کا گروہ تھا جنھوں نے کشف و کرامات کے قصوں کو الف لیلیٰ کی کہانیاں بنا دیا تھا، جن میں ہر طرف مافوق الفطرت واقعات اور محو رکن معاملات کی بھرمار تھی۔ یہ لوگ علی الاعلان کہتے تھے کہ شریعت اور طریقت دو الگ الگ راہیں ہیں۔ اہل طریقت کو شرعی پابندیوں کی ضرورت نہیں، معرفت الہی کے بعد بندہ تکالیف شریعہ سے آزاد ہو جاتا ہے۔ واقعی ان لوگوں نے شریعت سے آزاد ہو کر طرح طرح کی بدعات و خرافات ایجاد کر لی تھیں جن کی تفصیلات حیرت انگیز بھی ہیں اور تکلیف دہ بھی۔ اس پر طرفہ کہ یہ ولایت کو نبوت سے بڑا درجہ دینے پر مصر تھا، دلیل یہ تھی کہ ولایت تو بڑی حد تک کسی بخت عبادت و ریاضت کے بعد ہی کوئی شخص درجہ ولایت کو پہنچا ہے جبکہ نبوت وہی ہے، نبی پیدائشی نبی ہوتا ہے۔ عطیہ خداوندی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے چاہا اپنے فضل و کرم سے نبی و رسول بنایا۔

اس یا ظیل نظریے کا رد فرماتے ہوئے حضرت والا نے تحریر کیا تھا۔

”کمالات ولایت کا کمالات نبوت کے مقابلے میں کوئی شمار نہیں، وہ تہمت بھی تو نہیں، جو قطرے کو سمندر سے ہوتی ہے..... افضلیت مطلق انبیاء ہی کو ہے..... کوئی ولی نبی کے درجے کو نہیں پہنچ سکتا بلکہ ولی کا سر نبی کے قدم کے نیچے ہوتا ہے“

(از مکتوب ۲۲۶ دفتر اول بنام خواجہ عبداللہ و خواجہ عبید اللہ)
اسی طرح طریقت کو شریعت پر ترجیح دینے والوں کی خبر لیتے ہوئے آپ نے فرمایا تھا:
”طریقت تابع و خادم شریعت ہے۔ کمالات شریعت احوال و مشاہدات پر مقدم ہیں ایک حکم شرعی پر عمل، ہزار سالہ ریاضت سے زیادہ نافع ہے..... حلت و حرمت میں صوفیہ کا عمل سب سے سبب و منت اور کتب فقہ کی دلیل چاہیے۔ اہل عنایت کی ریاضتیں موجب قرب نہیں باعث بعد ہیں۔ صورت و اشکال نجبی داخل ہو، واپس ہیں تکلیف شرعی کبھی ساقط نہیں ہوتی۔“ آپ نے ہمیشہ شریعت کی بالادستی پر زور دیا اور طریقت کو اس کا تابع اور معاون قرار دیا۔

شیخ اکبر نے وحدت الوجود کے سلسلے میں جو کچھ کہا اور لکھا اس کی تفصیل اور منشا و مقصد کچھ اور تھا لیکن بعد میں اس کے معانی مطالب اور منشا و مقصد کو بالکل سمجھ کر دیا گیا تھا اور اسے اس غلط ڈھنگ سے پیش کیا گیا ہے کہ یہ بجائے خود ایک چیتاں اور گمراہ کن فلسفے کی شکل اختیار کر گیا، اسی لیے آپ نے اس مخ شہ صورت کی لٹی کی اور وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشہود پر زور دیا۔ اول الذکر کے مطابق، ہمہ اوست تھا تو آپ نے فرمایا ”ہمہ از اوست، حقیقت میں یہ شریعت اسلامیہ کے منشاء و مقصد کے عین مطابق ہے۔ چوتھی طرف رفض و تفصیلیت کے نظریات

تھے جو حب اہل بیت کے پر دے میں صحابہ کرام اور خصوصاً خلفائے ثلاثہ سے بدظن و بدگمان کر رہے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف ان کے عظیم الشان کارناموں اور خدمات کے منکر تھے بلکہ انھیں اسلام سے خارج سمجھتے تھے اور اسی کی تبلیغ و اشاعت میں لگے ہوئے تھے۔ یہ طبقہ تاریخ اسلام کو ایسی مسخ شدہ شکل میں پیش کر رہا تھا جس سے اسلام کو ایک ماکام نظر یہ ثابت کیا جاسکے اور اسلام سے بدظنی کا باعث ہو۔ انھوں نے عہد رسالت مآب ﷺ کی ۲۳ سالہ جدوجہد اور اس کے نتیجے میں عالم عرب میں برپا ہونے والے انقلاب اور پورے جزیرہ نمائے عرب کے مسلمان ہو جانے کو اس طرح محدود کر دیا تھا کہ ان کے بقول آپ کے بعد صرف چھ مسلمان باقی رہ گئے تھے باقی سب گمراہ ہوئے وین ہو گئے تھے۔ آپ نے رفض و تفضیلیت کے نظریات پر کاری شرب لگائی اور یہودیوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دلائل و براہین کے ساتھ رد کیا، صحابہ کرام کی عظمت و فضیلت اور خدمات کو اجاگر کیا۔ خلفائے ثلاثہ کے انتخاب اور اس پر حضرت علی کس طرح ان کے ہر قدم پر مدد و معاون رہے۔ خلفائے ثلاثہ خصوصاً شیخین کرام رضی اللہ عنہم کی ناقابل انکار خدمات پر آپ نے بھرپور رانداز سے روشنی ڈالی سرکارِ رودربار میں شیعہ امراء کے اثرات کو کم کرانے کے لیے آپ نے سنی امراء کی غیرت و حمیت کو لٹکا را اور انھیں اپنے اثر و رسوخ استعمال کرنے کی دعوت دی۔ ان سب کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس میدان میں آپ کی مساعی جلیلہ اور تجدید کا دماغ بڑے وسیع اور با اثر ثابت ہوئے۔ پانچویں طرف راجپوت راجاؤں، رانیوں اور دربار میں داخل برہمنوں، پنڈتوں اور نجویوں کا اثر و رسوخ تھا جو سرکارِ رودربار پر حاوی ہو کر انھیں ہندو رنگ میں رنگنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دربار اور مغل امراء پر یا تو ایرانی رنگ غالب تھا یا ہندوستانی۔ انھیں کے رسم و رواج طور طریقوں اور تیوہاروں و تقریبات کو فخر سے اپنایا جاتا تھا۔ نوروز، ہولی، دیوالی، دھروہ اور بستی وغیرہ تیوہار و رسوم و عوام سے اور انھیں کی روایات کے مطابق منائے جاتے تھے۔ اس کے برعکس اسلامی شعائر کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ان سب کی تفصیل کے لیے ملا عبد القادر بدایونی کی ”مختار التواریخ“ اور اس دور کی دیگر تاریخی کتب کا مطالعہ کفایت کرے گا۔ پنڈت، نجوی اور راجپوت درباری اس امر میں کوشاں تھے کہ نام نہاد آزاد خیال علما کی راہ سے مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کر کے ہندو تہذیب میں رنگ دیا جائے تاکہ کچھ عرصہ بعد یہ قوم بھی اسی طرح ہندو تہذیب کا حصہ بن جائے جس طرح عربوں، راجپوتوں، افغانوں اور ترکوں یعنی مسلمانوں سے قبل آنے والی قومیں ہندو تہذیب و معاشرہ کا حصہ بن گئیں تھیں اور اپنی شناخت کھو بیٹھی تھیں۔ یہ لوگ حقیقت میں اپنے متعصب کی کامیابی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ منکریت سے ہونے والے لڑتاجم اور علوم و فنون نے ایک بڑے طبقہ کو اپنا گرویدہ بنا لیا تھا اور وہ خود کو ان کے رنگ میں رنگنے پر آمادہ تھے۔ چھٹی اور آخری

سمت میں عوام و خواص کا وہ طبقہ تھا جو یا تو مذہب سے آشنائی نہ تھا یا اس کی پابندیوں سے آزاد ہو کر اپنی مرضی و منشا کی زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ اسے تن آسانی اور من مانی کی کھلی چھوٹ دے رکھی۔ ان انتہائی مشکل و پیچیدہ حالات میں حضرت مجدد الف ثانی کو یقیناً ”شش جہتی“ جنگ و جہاد کرنا تھا۔ حضرت والا نے اپنے مکتوبات کے ذریعہ مذکورہ بالا باطل و گمراہ کن نظریات کا دلائل و براہین کے ساتھ رد کیا، براہ راست مستقیم کی طرف رہنمائی فرمائی اور سرکارِ رودربار کی با اثر اور سعید شخصیتوں کو اس جہاد میں شرکت کے لیے آمادہ کیا۔ انھیں ”امر بالمعروف و نہی عن المنکر“ کے فریضہ کا احساس کرایا اس سلسلہ میں خصوصاً شیخ فرید، خان جہاں، صدر جہاں اور لالو بیگ وغیرہ با اثر امراء کو آپ نے مخاطب کیا۔ انھیں عقائد و اعمال کی درست پر توجہ دلائی نیز ان کے اثر و رسوخ کو بدعات و خرافات کے مٹانے کا ذریعہ بنانے پر زور دیا۔ آپ کے رسومات و احکامات میں درد و اثر اور سوز و گداز تھا۔ اسلام کی سچی محبت اور اسکے نفاذ کا غم جو جذبہ تھا اس لیے ”از دل خیزو، مدد دل ریزو، کے مصداق مخاطبوں کے دلوں پر اثر ہوا آپ کی پر سوز مساعی اور جہد مسلسل نے اپنا کام کیا۔ سرکارِ دربار کا رنگ بدلا۔ جہاں گیر میں ہی کچھ تبدیلی آئی اور اس کے بعد تو شاہ جہاں جیسا نیک دل یا دشاہ ہوا اور شاہ جہاں کے بعد اورنگ زیب جیسا حامی دین تین بادشاہ ہوا۔ برصغیر میں اسلام اور ملت اسلامیہ کی غربت، کس پمیری اور بے چارگی کے عالم میں آپ نے جیسا کھئی و لسانی جہاد فرمایا، اس کا صلہ تو یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ کو حاصل ہوگا۔ اس دنیا میں بھی ”مجدد الف ثانی“ جیسا خطاب لانا آپ کو حاصل ہوا۔ یہ دین و دنیا میں آپ کی مقبولیت کی دلیل ہے۔ مغلوں کے آخری دور میں ہی سر ہند مسلمانوں سے تقریباً خالی ہو گیا تھا۔ سکھ سردار ہندو پیراگی نے اسے تاخت و تاراج کر دیا تھا۔ برصغیر کی آزادی کے بعد تو پورا مشرقی پنجاب مسلمانوں سے خالی ہو گیا تھا اور آج بھی تقریباً خالی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے دشمنوں سے ہی آپ اور آپ کے متعلقین کے مقابلہ و مساجد کی حفاظت کرائی۔ آپ کے عرس کے موقع پر ہر سال خاصا مجمع ہوتا ہے آج بھی آپ کا مزار پر نور مرجع خلافت ہے۔

(۱) آپ نے مغلیہ دربار اور طبقہ امراء کی اصلاح کی کوشش کر کے ہندوستان کو دارالاسلام بنانے کا بیڑا اٹھایا۔

(۲) عبد اکبری میں شروع ہوئے اعتقادی، فنی اور تہذیبی و تمدنی ارتداد کو روکنے کی بھر

پور کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیاب رہے۔ تمام مغل بادشاہوں میں صرف اکبر و جہاںگیر ہی بے ریش اور ہندو رنگ میں نظر آتے ہیں باقی سب کم سے کم تہذیبی و تمدنی طور پر مسلمان ہی نظر آتے ہیں۔

(۳) آپ نے وحدت ادیان کے نظریے اور گمراہ صوفیہ و اہل طریقت کے نظریات اور بدعات و خرافات کا قلع قمع کرنے کی کوشش کی۔

(۴) طریقت پر شریعت کی بالادستی کو شد و مد سے پیش کیا اور دلائل کے ساتھ ثابت کیا کہ طریقت شریعت کی تابع و محکوم اور مدد و معاون ہے، اس سے الگ کوئی نظام نہیں ہے بلکہ اسی کا ترجمہ اور تکملہ ہے۔

(۵) وحدت الوجود کے مقابلے میں وحدت الشہود کے نظریے پر زور دیا جس سے بہت سی فکری گمراہیاں دور ہوئیں۔ آپ نے ہمہ اوست، کے مقابلہ میں، ہمہ از اوست قرار دیا اور اعتدال اور صراطِ مستقیم واضح کی۔

(۶) رفض و تفضیلیت کے نظریے پر ضرب لگا کر اہل سنت والجماعت کے نظریے کو مقبول عام بنانے کی کوشش کی۔

ان ہی تجدیدی خدمات اور جہد مسلسل نے بالاتفاق آپ کو ”مجدد الف ثانی“ بنا دیا۔

○○○

کتب اکثر قمر الہدیٰ فریدی

مکتوبات امام ربانی میں تصوف کے رموز و نکات

”مکتوبات امام ربانی“ کے مطالعے سے قبل، حضرت مجدد الف ثانی کے بارے میں چند کلمات عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

آپ کا نام شیخ احمد، تاریخ ولادت شیب جمعہ ۱۴ شوال ۹۱۱ھ/۱۵۶۳ء اور جاے پیدائش سرہند ہے۔ سلسلہ تنقب حسب ذیل ہے:

حضرت شیخ احمد بن محمد بن عبد اللہ بن زین العابدین بن عبد الحئی بن محمد بن حبیب اللہ بن امام رفیع الدین بن سلیمان بن یوسف بن اسحاق بن عبد اللہ بن شعیب بن احمد بن یوسف بن شہاب الدین علی فرخ شاہ بن نور الدین بن نعیم الدین بن محمود بن سلیمان بن مسعود بن عبد اللہ الواعظ الاصفہانی بن عبد اللہ الواعظ الاکبر بن ابوالفتح بن اسحاق بن ابراہیم بن ناصر بن عبد اللہ بن عمر بن حفص بن عاصم بن حضرت عبد اللہ بن حضرت عمر فاروق اعظم۔

شیخ احمد مجدد الف ثانی کے جداد میں ایک بزرگ امام رفیع الدین غالباً آٹھویں صدی ہجری میں کابل سے ہندوستان تشریف لائے۔ انھوں نے پہلے تمام میں، پھر سرہند میں سکونت اختیار کی۔

اُس زمانے میں سرہند کا نام سرہند تھا اور یہ ایک غیر آباد مقام تھا۔ اس سے ذرا فاصلے پر سرالیں کے نام سے ایک بستی تھی جہاں کے باشندوں کی درخواست پر مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری (متوفی ۸۵ھ) کے سلطان فیروز شاہ سے سرہند میں قلعہ تعمیر کرائے کی سفارش کی اور اس طرح ۸۶۰ھ کے آس پاس سرہند آباد ہوا۔ اپنے شیخ مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے حکم پر امام رفیع الدین نے اس شہر میں قیام فرمایا۔

اسی خاندان کے ایک فرد مخدوم شیخ عبد اللہ احد تھے جنھیں شیخ عبد القدوس گنگوہی سے شرف بیعت، اور ان کے صاحب زادے شیخ رکن الدین سے خلافت و اجازت، اور قادری سلسلے کے مشہور بزرگ شاہ کمال کیقلی سے نسبت خصوصی حاصل تھی۔ انھوں نے شاہ سکندر سے بھی کسب فیض کیا

تھا۔ کتب فقہ وحدیث پر ان کی گہری نظر تھی۔ شیخ احمد مجدہ والف ثانی ان ہی کے فرزندِ دل بند تھے۔

شیخ احمد مجدہ والف ثانی کی تعلیم کا آغاز حفظِ قرآن سے ہوا۔ پھر والدِ گرامی سے اور بعد میں اس دور کے جید علماء محدثین سے علومِ متداولہ کی تحصیل کی۔

تحصیلِ علم کے بعد کچھ دنوں اکبر آباد (آگرہ) میں بھی قیام فرمایا جو اس زمانے میں مغلیہ سلطنت کا دار الحکومت تھا۔ یہاں ابوالفضل اور فیضی سے اُن کی ملاقاتیں رہیں لیکن مزاج میں اختلاف کی وجہ سے تعلقات ایک حد سے آگے نہ بڑھ سکے۔ ادھر مخدوم شیخ عبدالاحد کو اُن کی جدائی شاق گزری اور وہ بیٹے کو گھر لے جانے کی غرض سے آگرہ تشریف لے گئے۔

والہی کے سفر میں حاکم تھانسر شیخ سلطان کی صاحبِ زادی شیخ احمد کے کاح میں آئیں اور آپ والدِ محترم اور رفیقہ حیات کے ساتھ سرہند لوٹے۔ والد کی ضعیفی کے پیشِ نظر آپ نے سرہند میں ہی قیام کو مناسبت جان کر ۱۰۷۱ھ کو آپ کے پیرِ بزرگوار شیخ عبدالاحد نے اسی سال کی عمر میں وفات پائی۔

والدِ ذی شان کی رحلت کے بعد آپ حج کے ارادے سے گھر سے نکلے۔ اُن ہی دنوں حضرت خواجہ باقی باللہ (پ ۱۰۷۱ھ - ۱۰۹۷ھ - ۱۱۲۴ھ) کا سن سے دہلی تشریف لائے تھے۔

دہلی پہنچ کر آپ خواجہ باقی باللہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ خواجہ صاحب نے آپ کی آمد پر مسرت کا اظہار فرمایا اور چند روز اپنے ساتھ قیام کرنے کی دُعا دی۔ آپ نے سر تسلیم خم کیا۔ یہاں تک کہ ایک ماہ سے زائد عرصہ گزر گیا۔ اس درمیان آپ خواجہ صاحب سے اس قدر متاثر ہوئے کہ داخلِ سلسلہ ہونے کے متمنی ہوئے۔ درخواست قبول ہوئی۔

حضرت خواجہ باقی باللہ نے جب ہندوستان آنے کا قصد فرمایا تھا تو انھیں کشف ہوا تھا کہ ایک تہایت خوب صورت اور شیریں مقال طوطی اُن کے ہاتھ پر آ بیٹھا ہے۔ خواجہ صاحب اپنا لعابِ دہن اس کے منہ میں ڈال رہے ہیں اور وہ اپنے منقار سے اُن کے دہنِ مبارک میں شکر دے رہا ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ کے پیر و مرشد شیخ محمد المنگی نے اس کی یہ تعبیر بتائی تھی کہ ہندوستان میں تمھاری تربیت سے کوئی ایسا شخص سر فرزا ہوگا جس سے عالم منور ہوگا اور شخص بھی اُس سے حصہ ملے گا۔ حضرت خواجہ باقی باللہ نے شیخ احمد کو اپنے کشف کی تعبیر خیال فرمایا، داخلِ سلسلہ کیا اور مزید چند دنوں اپنی خدمت میں رکھ کر والہی کی اجازت عطا فرمائی۔

اس کے بعد مرشد سے دہلی میں دو اور ملاقاتیں ہوئیں۔ دوسری مرتبہ جب آپ شیخ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو خرقہ خلافت سے نوازے گئے۔ تیسری بار آپ خواجہ صاحب سے

دعا کیں لینے دہلی پہنچے تو پیر و مرشد نے بڑی شفقت فرمائی۔ تحسینی کلمات سے نوازا اور رخصت کے وقت ارشاد فرمایا: اب امیدِ حیات کم ہے۔

اندیشہ درست ثابت ہوا۔ چار شنبہ ۱۲۰۲ھ وادیِ الآخرہ ۱۰۱۴ھ کو حضرت خواجہ باقی باللہ نے دہلی میں داعی اجل کو لبیک کہا۔ اُس وقت آپ کی عمر چالیس سال چار ماہ تھی۔

اُن دنوں حضرت مجددِ لاہور میں تھے۔ شیخ کے وصال کی خبر سنتے ہی دہلی کے لیے رنج سفر باندھا۔ مرشدِ زادوں سے تعزیت کی اور چند روز بعد سرہند لوٹ کر تبلیغ و ارشاد کو وظیفہ حیات بنایا۔

وقت کے ساتھ ساتھ آپ کی شہرت اور مقبولیت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ نیاز مندوں میں عوام، علماء، امرا اور رؤسا سبھی شامل تھے۔ آپ نے زبانی وعظ و نصیحت کے علاوہ،

طالبانِ حق، امرا اور اراکینِ سلطنت کی اصلاح کے لیے پنے درپے مکاتیب لکھے اور تبلیغِ دین کے لیے متعدد خلفا ملک کے دور دراز علاقوں میں بھیجے۔ اُن دنوں جہاں گیر سربراہ راعی سلطنت

تھا محمد و صاحب کی دینی سرگرمیوں کو اس نے شبہ کی نظر سے دیکھا۔ اُسے تشویش ہوئی کہ سلطنت کے خلاف یہ کوئی خفیہ سازش تو نہیں؟ اس نے اپنے خدشے کو دور کرنے کے لیے حضرت کو یہاں سے طلب فرمایا۔

طلبی کی وجہ تو یہ کہ جہاں گیر جلد دوم میں اس طرح بیان کی گئی ہے:

”مجھے اطلاع دی گئی کہ شیوا، جس کا نام شیخ احمد سرہندی ہے، سرہند میں دامِ زرق و ساروں (مکر و فریب) پھیلا رکھا ہے اور بہت سے لوگوں کو (ظاہر و چھپوں کو) بغیر روحانیت کے

شکا رہا لیا ہے اور ہر شہر میں اور دیار میں اپنے مریدوں میں سے ایک کو بھیجا ہے جسے وہ خلیفہ کے نام سے پکارتا ہے اور جن کو اوروں کے مقابلے میں آئینِ دکان آرائی و معرفتِ فردوسی اور مردم فرینی

میں زیادہ بہتر سمجھتا ہے۔ اس نے بہت سی مؤخر فاتی (بناوٹی باتیں) اپنے مریدوں اور معتقدین کو لکھ بھیجی ہیں اور اسے ایک کتاب میں کیجا کر دیا ہے جس کا نام مکتوبات ہے۔ اس جنگِ مہملات (یا

اس مہمل و خیرہ خطوط) میں بہت سی لاطائل باتیں لکھی ہیں جس سے کفر و زندہ ظاہر ہوتا ہے۔ ... اس وجہ سے میں نے حکم جاری کیا کہ انھیں دربار میں پیش کیا جائے۔ حسبِ اہم اُن کو پیش کیا گیا۔

میں نے جو بھی سوال کیا، اس کا کوئی معقول جواب نہیں ملا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی ما و تقییت ہی میں بہت مطمئن اور فخر محسوس کرتے تھے۔ میں نے سوچا کہ ان کے لیے سب سے بہتر یہ ہوگا کہ

وہ کچھ دنوں تک قید میں رہیں تاکہ ان کے دماغ کی گرمی اور حرارت اور مزاج کی پراگندگی کم ہو سکے اور لوگوں کا جوش بھی کم ہو جائے۔ اس لیے انھیں اتنی راتے سنگھ دین کے حوالے کیا گیا کہ انھیں گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا جائے۔“ (۱)

مندرجہ بالا اقتباس کا یہ جملہ قابلِ غور ہے: ”مجھے ایسا محسوس ہوا کہ وہ اپنی ما و تقییت ہی

میں مطمئن اور فخر محسوس کرتے تھے۔“

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جہاں گیر سے حضرت مجدد کا طرزِ نظم کیا رہا ہوگا۔ یقیناً انھوں نے بادشاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کی ہوں گی جس سے اُس کی کبیدگی میں مزید اضافہ ہوا۔ اقتباس کا ایک اور جملہ توجہ طلب ہے: ”میں نے سوچا کہ... وہ کچھ دنوں تک قید میں رہیں تاکہ اُن کے دماغ کی گرمی اور حرارت اور مزاج کی پراگندگی ختم ہو سکے اور لوگوں کا جوش بھی کم ہو جائے۔“

یہ سطریں بھی اس بات کی غمازی کر رہی ہیں کہ عوام و خواص میں حضرت مجدد کی غیر معمولی مقبولیت جہاں گیر کی فکر کا پادشاہ تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس نے حضرت کی مذہبی سرگرمیوں بالخصوص اُس خط کو بنایا جو آپ نے اپنے شیخ کی خدمت میں لکھا تھا اور جس میں اپنے بعض احوال اور علوم مرتبہ کا ذکر تھا۔

بہر حال تو رک جہاں گیری سے قطع نظر، حضرت کے سوانح نگاروں نے یہ معلومات فراہم کی ہے کہ جب امام ربانی دربار میں تشریف لے گئے تو انھوں نے وہ آداب شاہی، جو شرعاً ناجائز تھے، ادا نہ کیے۔ بادشاہ نے درباری رسوم و آداب سے روگردانی کا سبب جانتا تھا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے آداب و احکام کے علاوہ، میں کسی اور رسم کو نہیں جانتا۔ جہاں گیر یہ سن کر خفا ہوا اور اس نے جبراً آپ سے سجدہ کرانا چاہا۔ آپ نے انکار کیا۔ براہِ فرود ت ہو کر اس نے آپ کی نظر بندی کا حکم صادر کیا۔ ربیع الثانی ۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء کو آپ قید کیے گئے اور ایک سال بعد جمادی الآخر ۱۰۲۹ھ / مئی ۱۶۲۰ء میں رہا ہوئے تو رک جہاں گیری جلد دوم میں پندرہویں سہ جلدوں کے حوالہ کے تحت مرقوم ہے:

”آج سرہند کے شیخ احمد، جن کو کچھ دنوں سے دکان آرائی، خور و نوشی و بے صرفہ گوئی کی وجہ سے قید کر دیا گیا تھا، اپنے پاس طلب کیا اور رہا کر دیا۔ ایک خلعت اور ایک ہزار روپے خرچ کے لیے دے کر ان کو جانے یا رہنے کی آزادی دے دی۔“ (۲)

جہاں گیر کے قول کے مطابق حضرت نے اس کے ساتھ رہنا قبول کیا۔ بعض دوسری روایتوں میں ہے کہ حضرت رخصت چاہتے تھے لیکن بادشاہ کی خواہش پر آپ نے لشکر میں قیام فرمایا۔ بہر حال لشکر میں حضرت کا قیام تقریباً ساڑھے تین سال تک رہا۔ اس درمیان فوج کے ہمراہ بعض شہروں اور مقامات سے حضرت کا گزر ہوا اور وہاں کے لوگ آپ سے مستفید ہوئے۔ ذی الحجہ ۱۰۳۲ھ میں آپ شاہی لشکر سے رخصت ہوئے اور رجب ۲۸ شعبان ۱۰۳۳ھ کو بیسٹھ سال کی عمر میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔ اب جہاں گیر ہے، نہ ہوئی جہاں گیری!

مگر وہ جو دلوں میں اخلاص کے سچ ہوتے ہیں اور عملِ صالح کی فصل کاٹتے ہیں، خوفِ خدا سے لرزتے ہیں اور شوکتِ بحر و سلیم کے آگے سر اٹھا کر باتیں کرتے ہیں، جن کی راتیں آنسوؤں میں نہا کر گزرتی ہیں اور آخرِ عمر گہری سچائی کے معمولات کا آغاز ہوتا ہے، دنیا اُن کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوتی ہے، اور یوں ہی کھڑی رہتی ہے، اُن کے ارشادات کی منتظر اور نگاہِ کرم کی تمنی! اُن کا فرمایا ہوا ہر لفظ اور لکھا ہوا ایک ایک حرف، وقت کی پھٹلی پر شعاعِ مہر کی طرح جگمگاتا ہے اور ہر ناظرِ شہادت دیتا ہے کہ یہ محض بیانات نہیں ہیں، علم و حکمت کے سچے ہائے گراں مایہ ہیں۔ کاش ہمیں بھی چند موقیٰ چننے کی سعادت نصیب ہو جائے!

حضرت مجدد الف ثانی کے خطوط تین جلدوں میں ہم تک پہنچے ہیں۔ ”مکتوباتِ امام ربانی“، دفترِ اول تین سو تیرہ خطوں پر مشتمل ہے۔ اس میں چوبیس عریضے حضرت باقی باللہ کے نام ہیں اور بقیہ کے مخاطب دوسرے حضرات ہیں۔ یہ مجموعہ امام ربانی کی حیات (۱۵۲۵ھ / ۱۶۱۶ء) میں ہی مدون کر لیا گیا تھا۔ اس کے مرتبہ شیخ کے مرید اور خلیفہ حضرت مولانا محمد حبشی طالقانی ہیں۔

مکتوبات کی دوسری جلد جسے دفترِ دوم کہا گیا ہے، ننانوے خطوط پر مشتمل ہے۔ سفرِ زندہ امام ربانی خواجہ محمد معصوم کی فرمائش پر ۱۰۲۸ھ میں اس کی ترتیب عمل میں آئی۔ اس کے مرتب مولانا عبدالحی حصاری شادمانی ہیں۔ اس مجموعے کے مکتوب الہم کی تعداد اکہتر ہے۔ اس کے تین مکاتیب ۱۵، ۱۵، ۱۶ اور ۱۷ میں اجتماعی مخاطبت اختیار کی گئی ہے۔

دفترِ سوم حضرت مجدد الف ثانی کے خلیفہ مولانا محمد ہاشم کشمی کا مرتب کردہ ہے۔ اس میں اولاً ایک سو چودہ خطوط شامل کیے گئے تھے۔ بعد میں دس مکاتیب کا اضافہ ہوا اور اس طرح اس مجموعے کے خطوں کی تعداد ایک سو چوبیس ہو گئی۔ تینوں دفاتر میں شامل خطوں کی کل تعداد پانچ سو چھتیس ہے۔

آئیے، تجزیہ معانی، مکاتیبِ امام ربانی کے مطالعے سے آنکھیں روشن کریں۔ صفحات کی تحدید کے پیش نظر، اس مضمون میں اقتباسات کی غیر ضروری تسہیل سے گریز کیا جائے گا۔ خیال رکھا جائے گا کہ راقمِ امام ربانی کے ارشادات اور قارئین کے درمیان کم سے کم حائل ہو۔ معرفتِ توحید سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔

معرفتِ توحید

حضرت مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ اثنائے راہ میں مالک جن معرفتوں سے مرشاد ہوتا ہے، ان میں سے ایک توحید وجودی ہے، دوسری توحید شہودی۔

توحید وجودی سے مراد ہے: ”ایک موجود کو جاننا اور اس کے غیر کو نابود سمجھنا۔“ اور:

”توحید شہودی ایک کو دیکھنا ہے، یعنی ایک کے سوا سارے کو کچھ مشہو نہیں ہوتا۔“ (۳)

امام ربانی کا بیان ہے کہ وہ خود بھی ایک غریب سے تک توحید و جود سے سرشار رہے۔ اس عالم میں تجلی ذاتی کے علوم و معارف اُن پر منکشف ہوئے۔ مدتوں بعد: ”ما گاہ حق تعالیٰ کی عہدیت بے غایت در سچہ غیب سے میدان ظہور میں آئی اور... وہ پہلے علوم جو اتحاد و وحدت و جود کی خبر دیتے تھے، زائل ہونے لگے۔... اور یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ... حق تعالیٰ کسی چیز سے متحد نہیں ہے۔ خدا خدا ہے اور عالم عالم۔... واجب ممکن کا عین اور قدیم حادث کا عین ہرگز نہیں ہو سکتا۔... عالم ہر چند صفاتی کمالات کا آئینہ اور اسمائے ظہورات کا جلوہ گاہ ہے۔ لیکن مظہر ظاہر کا عین اور خلل اصل کا عین نہیں ہے، جیسے کہ توحید و جود والوں کا مسلک ہے۔“ (۴)

شیخ صوفی کے نام لکھے گئے اس مکتوب میں ایک مثال کے ذریعے مظہر اور ظاہر کے فرق کی وضاحت کرتے ہوئے، سلسلہ کلام کو اس طرح دراز کیا گیا ہے:

”مثلاً کسی اہل فن نے چاہا کہ اپنے مختلف کمالات کو ظاہر کرے اور اپنی پوشیدہ خوبیوں کو واضح کرے تو اس نے حروف اور آوازوں کو ایجاد کیا، اور ان حروف اور آوازوں کے آئینوں میں اپنے پوشیدہ کمالات کو ظاہر کیا۔ اس صورت میں نہیں کہہ سکتے کہ یہ حروف اور آواز جو ان مخفی کمالات کے لیے آئینے اور مظہر ہیں، ان کمالات کا عین ہیں یا بالذات ان کمالات کو محیط ہیں۔ یا بالذات اُن کے قریب ہیں، یا ان کے ساتھ معیت ذاتی رکھتے ہیں بلکہ ان کے درمیان ولایت اور مدلولیت کی نسبت ہے۔ حروف اور آواز اُن کمالات پر صرف دلالت کرنے والے ہیں اور وہ کمالات اپنی محض غیر مقلد حالت پر ہیں۔ وہ نسبتیں جو پیدا ہوئی ہیں، وہی اور خیالی ہیں۔ حقیقت میں ان نسبتوں سے کوئی ثابت نہیں۔... عالم اپنے صنائع کے وجود کے لیے علامت اور اس کے اسمائی اور صفاتی کمالات کے ظہور کے لیے مظہر ہے۔ اور یہی علاقہ بعض عارضوں کے باعث بعض کے لیے وہی احکام کا باعث ہو جاتا ہے۔

بعض کو توحید کے مراقبوں کی کثرت ان احکام پر لے آتی ہے کیوں کہ ان مراقبوں کی صورت تو متخیلہ میں نقش ہو جاتی ہے۔ اور بعض دوسروں کو توحید کا علم اور اس کا حکمران احکام کے ساتھ ایک قسم کا ذوق بخشتا ہے اور توحید کی یہ دونوں صورتیں معلول اور ضعیف ہیں اور دائرہ علم میں داخل ہیں، حال کے ساتھ کچھ تعلق نہیں رکھتیں۔ اور بعض دوسروں کے لیے ان احکام کا مشا محبت کا غلبہ ہے۔ کیوں کہ محبوب کی محبت کے غلبے کے باعث محبوب کا غیر محبوب کی نظر سے دور ہو جاتا ہے اور محبوب کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا۔... واجب تعالیٰ جو بے چوں اور بے پچوں ہے، ہرگز چوں کے آئینوں میں نہیں سما سکتا۔... بے چوں کو دائرہ چوں کے باہر ڈھونڈنا چاہیے اور

لامکانی کو مکان کے باہر تلاش کرنا چاہیے۔ جو کچھ آفاق و انفس میں دیکھا جاتا ہے، وہ حق تعالیٰ کے نشانات ہیں۔“ (۵)

لیکن یہ بحث اتنی آسانی سے ختم نہیں ہو سکتی۔ صوفیائے کرام کے الگ الگ مشاہدات ہیں اور گونا گوں تجربات پر مبنی اقوال۔ ان کے درمیان تطابق اور اُن کی مناسبت تو جیہ بھی ضروری ہے۔ امام ربانی کو اس کا احساس ہے۔ چنانچہ وہ محولہ مکتوب میں مسئلے کے بعض دوسرے پہلوؤں کا بھی جائزہ لیتے ہیں:

”اگر گھنٹیں کہ اکثر مشائخ نقشبندیہ اور دوسرے سلسلے کے مشائخ کی عبارتوں میں صاف طور پر لکھا ہے جو وحدت وجود اور احاطہ اور قرب اور معیت ذاتی اور کثرت میں وحدت کے مشاہدے اور کثرت میں احدیت کے مشاہدے پر دلالت کرتا ہے، تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احوال شہود و احوال کے اشائیں اُن پر ظاہر ہوئے ہوں گے اور بعد ازاں اس مقام سے گزر گئے ہوں گے۔ جیسے کہ اس فقیر نے پیش تر اپنے حال کی نسبت لکھا ہے۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ بعض کے ظاہر کو کثرت ہیں ہے، باطن میں احدیت صرف کی طرف پوری گمراہی ہونے کے باوجود ان احکام اور اس شہود سے شرف کرتے ہیں۔ گویا باطن میں احدیت کے گمراہ ہوتے ہیں، اور یہ ظاہر کثرت میں مطلوب کے مشاہدہ کرنے والے جیسے کہ اس فقیر نے اس مکتوب کی ابتدا میں اپنے والد بزرگوار کے حال سے خبر دی ہے۔ اور اس جواب کی تحقیق مفصل طور پر اس رسالے میں لکھی گئی ہے جو وحدت وجود کے مراتب کی تحقیق میں لکھا ہے۔

یہ نہیں کہا جائے کہ جب نفس امر میں بہت سے وجود ہوں اور قرب اور احاطہ ذاتیہ نہ ہو اور کثرت میں وحدت کا شہود واقع کے مطابق نہ ہو تو ان بزرگواروں کا حکم چھوٹا ہوگا۔... ہم جواب (میں) کہتے ہیں کہ ان بزرگواروں نے اپنے شہود کے اندازے کے موافق حکم کیا ہے جس طرح کوئی شخص یہ حکم کرے کہ میں نے زید کی صورت کو آئینے میں دیکھا ہے۔ یہ حکم بھی واقعے کے مطابق نہیں کیوں کہ آئینے میں اس صورت کو نہیں دیکھا ہے۔ کیوں کہ صورت آئینے میں بالکل نہیں ہے جو دیکھی جائے۔ اس شخص کو عام طور پر کاذب نہ کہیں گے اگرچہ واقعے اور نفس الامر کے مطابق نہیں ہے۔... ان حالات کے ظاہر کرنے سے... مقصود یہ ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اگر فقیر نے وحدت و جود کو قبول کیا ہو اتنا تو وہ کشف سے تھا، نہ از روئے تقلید کے۔ اور اگر اب انکار ہے تو الہام کے سبب سے ہے۔ اور الہام میں انکار کی گنجائش نہیں۔ اگرچہ الہام غیر پر حجت نہیں ہے۔

دوسرا جواب چھوٹے کا شہد دور کرنے کے لیے یہ ہے کہ افراد عالم ایک دوسرے کے ساتھ بعض امور میں مشترک اور شریک ہیں اور بعض دوسرے امور میں ایک دوسرے سے ممتاز اور جدا۔

اسی طرح ممکن کا واجب کے ساتھ بعض امور عارضی میں اشتراک ہے اگرچہ بالذات ایک دوسرے سے ممتاز ہیں۔ پس محبت کے غلبے کی وجہ سے وہ چیز جو بین الانبیاء ہو سکتی ہے، نظر سے پوشیدہ ہو جاتی ہے اور وہ چیز جس سے دونوں میں اشتراک ہے، نظر میں رہ جاتی ہے۔

پس اس صورت میں اگر ایک دوسرے کے عین ہونے کا حکم دیں تو واقع کے مطابق ہوگا اور جھوٹ کی ہرگز مجال نہ رہے گی۔ احاطہ ذاتی کی مانند اور باتوں کو بھی اس پر قیاس کرنا چاہیے۔“ (۶) مذکورہ بالا اقتباس میں برہنہ کیلئے مذکورہ کشف اور الہام کی نوعیت بھی زیر بحث آگئی ہے۔ بقول امام ربانی، کشف کی وجہ سے وہ شروع میں وحدت وجود کے قائل تھے اور پھر الہام کے نتیجے میں اس سے بے رغبتی پیدا ہوئی۔ ”اور الہام میں انکار کی گنجائش نہیں۔ اگرچہ الہام غیر پر جت نہیں ہے۔“

اس جگہ ذرا سا ٹھہر کر ہمیں تصوف کے اس روحانی تجربے پر غور کرنا چاہیے جسے کشف، الہام، القا وغیرہ ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اصلاً یہ سالک کے انفرادی باطنی تجربات ہیں جن کے ذریعے اس پر حقائق کا انکشاف ہوتا ہے۔ ان کے حصول کے ذرائع ہر صوفی کے لیے یکساں نہیں ہوتے۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ایک صوفی اپنے کشف سے جس نتیجے پر پہنچے، دوسرے صوفی کے مشاہدات بھی اس معاملے میں اس کے مماثل ہوں۔ سالک کے لیے اپنے اس روحانی تجربے پر عمل درآمد کس حد تک ضروری ہے اس سوال کے جواب میں صوفیہ کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ کشف پر عمل کرنا یا دوسروں کو اس سے آگاہ کرنا صاحب کشف کی مرضی پر منحصر ہے۔ دو چار تو اسے قبول کرے، لوگوں تک پہنچائے یا پھر سکوت اختیار کرے۔ اس کے برعکس بعض صوفیہ کا موقف یہ ہے کہ کشف اگر شریعت سے متعارض نہ ہو تو صاحب کشف کے لیے اسے اشارہ غیبی اور عنایت الہی سمجھ کر تسلیم کرنا لازمی ہے۔

ذاتی تجربہ ہونے کی وجہ سے صوفیہ نے یہ وضاحت بھی کی ہے کہ کشف میں خطا کا امکان ہے۔ ایک نقطہ نظر یہ بھی ہے کہ کشف فی نفسہ درست ہوتا ہے۔ البتہ اس کی تعبیر یا استنباط نتائج میں تسامح ہوسکتا ہے۔ بہر حال اس بات پر بزرگوں کا اتفاق ہے کہ کشف بھی حصول علم کا ایک ذریعہ ہے اور اسے طریق و لایت میں شمار کیا گیا ہے۔

امام ربانی کی رائے ہے کہ شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی (متوفی ۷۳۸ھ) سلوک کے سفر میں توحید وجودی سے مشرف ہوئے اور اسی مقام پر انھوں نے قیام فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے ذات واحد کا اقرار کیا اور ماسوا سے ذات کی لٹی کی اور نظریہ وحدت الوجود پیش کیا۔

وحدت الوجود اور وحدت الہو و تصوف کی وہ شہرہ آفاق اصطلاحیں ہیں۔ ان پر تفصیل سے گفتگو کرنے کا یہ موقع نہیں۔ ربط کلام کے لیے بس اتنا کہنا کافی ہوگا کہ دنیا بھر کے تصوف میں ان

دونوں نظریات کو مقبولیت حاصل ہے۔ صوفیہ کرام کا ایک طبقہ ابن عربی کی فکر سے متاثر ہے تو دوسرا امام ربانی کے نظریہ وحدت الہو سے متفق ہے۔ امام ربانی کن دنیاویوں پر وحدت الہو دیکھے قائل ہیں اور کیوں وہ وحدت الوجود کو درست نہیں جانتے، اسے سمجھنے کے لیے شیخ صوفی کے نام لکھا گیا حوالہ خط ہے حد اہم ہے، جس کا ہم گذشتہ صفحات میں مطالعہ کیا۔ مزید تحقیق کے لیے مکتوبات امام ربانی دفتر دوم، مکتوب اول (بیمام شیخ عبد العزیز جون پوری) سے رجوع کرتے ہیں:

”وجود ہر چیز کو کمال کا مبداء اور عدم ہر نقص و شرارت کا مثلاً ہے۔ وجود واجب جل شانہ کے لیے ثابت ہے اور عدم ممکن کے نصیب ہے۔ تاکہ جزو کمال حق تعالیٰ کی طرف عائد ہوں۔ اور تمام شر و نقص ممکن کی طرف راجع ہو ممکن کے لیے وجود ثابت کرنا اور تمام جزو کمال کو اس کی طرف راجع کرنا و تحقیق اللہ تعالیٰ کے قلم و ملک میں اس کو شریک بنانا ہے۔ اسی طرح ممکن کو واجب تعالیٰ کا عین کہنا اور ممکن کے صفات و افعال کو حق تعالیٰ کے صفات و افعال کا عین بنانا بڑی بے ادبی اور حق تعالیٰ کے ماسواہ و صفات میں الحاد و شرک ہے۔۔۔“

اکثر صوفیہ خاص کر ان میں سے اکثر متاخرین نے ممکن کو واجب تعالیٰ کا عین جانا ہے اور اس کے صفات و افعال کو حق تعالیٰ کے صفات و افعال کا عین خیال کیا ہے۔۔۔“

یہ بزرگوار اگرچہ وجود کے شریک کرنے سے پرہیز کرتے ہیں اور دونوں سے بھاگتے ہیں۔ لیکن غیر وجود کو وجود جانتے اور نقائص کو کمالات سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ذاتی نقص و شرارت کسی چیز میں نہیں ہے۔ اگر ہے تو نسبی اور اضافی ہے۔ مثلاً زیر قائل انسان کی نسبت شرارت رکھتا ہے کیوں کہ اس کی زندگی کو دور کرنا ہے، جس حیوان میں وہ زہر پایا جاتا ہے، آب حیات اور تریاق مایع ہے۔ اس امر میں ان کا مقتدا ان کا اپنا کشف و شہود ہے۔ جس قدر کہ ان کو معلوم ہوا ہے انھوں نے ظاہر کر دیا ہے۔“ (۷)

حضرت مجدد الف ثانی کے نزدیک شیخ اکبر محمد الدین ابن عربی کے مشاہدات کی بھی یہی نوعیت ہے۔ وہ اور ان کے ہم نوا صوفیہ کرام اپنے شہود کے اندازے کے مطابق کثرت میں وحدت کی بات کرتے ہیں، ماسوا سے ذات حق کی لٹی کرتے ہیں اور تمام اعیان ثابتہ/اشیاء مخلوقات کو ذات الہی کا ظل (سایہ) قرار دیتے ہیں:

”شیخ محمد الدین اور اس کے متبعین فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے اسماء و صفات حق تعالیٰ کی عین ذات ہیں۔ اور نیز ایک دوسرے کے عین ہیں۔ مثلاً علم و قدرت جس طرح حق تعالیٰ کی ذات کے عین ہیں، اسی طرح ایک دوسرے کے بھی عین ہیں۔ اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس مقام میں تعدد و تفرق کا کوئی نام و نشان نہیں اور نہ ہی کسی قسم کا تمايز و تباہی ہے۔ حاصل کلام یہ کہ ان اسماء و

صفات اور شیوں و اعتبارات نے حضرت علم میں اجمالی اور تفصیلی طور پر تمايز و تباين پيدا کیا ہے۔ اگر تمیز اجمالی ہے تو اس کو تعین اول سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر تفصیلی ہے تو اس کو تعین ثانی کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔

تعین اول کو وحدت کہتے ہیں اور اسی کو حقیقت محمدی جانتے ہیں۔ اور تعین ثانی کو واحدیت کہتے ہیں اور اسی کو تمام ممکنات کے حقائق سمجھتے ہیں۔ اور ان حقائق ممکنات کو اعیان ثابثہ جانتے ہیں۔ یہ دو تعین علمی جن کو وحدت اور واحدیت کہتے ہیں، مرتبہ و جوب میں ثابت کرتے اور کہتے ہیں کہ ان اعیان نے وجود خارجی کی بونہیں پائی۔ اور خارج میں احدیت مجرہ کے سوا کچھ موجود نہیں ہے۔ یہ کثرت دکھائی دیتی ہے، ان اعیان ثابثہ کا عکس ہے، جو ظاہر وجود کے آئینہ میں جس کے سوا خارج میں کچھ موجود نہیں، منعکس ہوا ہے۔ اور وجود بخلی پیدا کیا ہے جس طرح کہ آئینے میں کسی شخص کی صورت منعکس ہو کر آئینے میں وجود بخلی پیدا کر لے۔ اس عکس کا وجود خیال کے سوا کچھ ثابت نہیں اور نہ ہی آئینے میں کسی شے نے حلول کیا ہے اور نہ ہی اس آئینے پر کوئی چیز منعکس ہوئی ہے۔ اگر کچھ منعکس ہے تو تحلیل میں ہے، جو صرف آئینہ میں وہی طور پر ظاہر ہے۔ یہ تحلیل اور تہو ہم عکس چوں کہ صعبت خداوندی ہونے کے باعث بڑا استحکام اور اثبات رکھتا ہے، اس لیے وہ تحلیل کے گھٹنے سے اٹھ نہیں سکتا۔ اور ثواب و عذاب ابدی اس پر مترتب ہے۔ یہ کثرت جو خارج میں نمودار ہے، تین قسموں میں منقسم ہے۔

قسم اول تعین رومی ہے۔ اور قسم دوم تعین مثالی۔ اور قسم سوم تعین جسدی ہے جو عالم شہادت سے تعلق رکھتا ہے۔

ان تینوں تعینوں کو تعینات خارجہ کہتے ہیں۔ اور مرتبہ امکان میں ثابت کرتے ہیں۔ تفرقات خدہ بھی ان ہی تعینات، چوگا نہ سے مراوے۔ ان تفرقات خدہ کو حضرات قس بھی کہتے ہیں۔ چوں کہ حق تعالیٰ کی ذات اور اس کے اسماء و صفات کے موجودیت ذات ہیں ان کے نزدیک خارج کا علم ثابت نہیں ہوا۔ اور انھوں نے صورت علمیہ کو اس صورت کا عین سمجھا ہے نہ اس کا شبہ و مثال۔ اور ایسے ہی اعیان ثابثہ کی صورت معکسہ کو جو ظاہر وجود کے آئینہ میں نمودار ہوئی ہے، ان اعیان کا عین تصور کیا ہے نہ اس کی شبہ و مانند۔ اس لیے اتحاد کا حکم کیا ہے اور ہماوست کہا ہے۔“ (۸)

فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کے مصنف کے نظریہ وحدت الوجود پر روشنی ڈالتے ہوئے امام ربانی مجدد الف ثانی مزید لکھتے ہیں کہ:

”شیخ سے پہلے اس گروہ میں سے کسی نے ان علوم و اسرار کے ساتھ زبان نہیں کھولی، اور اس حدیث کو کسی نے اس طرح بیان نہیں کیا۔ اگرچہ تو حید و اتحاد کی باتیں شکر کے غلبوں میں

ان سے ظاہر ہوئی ہیں، اور انا الحق اور سبحانی کہا ہے، لیکن اتحاد کی وجہ اور تو حید کا موجب کسی نے معلوم نہیں کیا۔ پس شیخ ہی اس گروہ میں سے متقدمین کی بہان اور متاخرین کی جست ہے۔“ (۹)

شیخ محی الدین ابن عربی کے مشاہدات کا اجمالی ذکر کرنے کے بعد امام ربانی اپنا اظہار نظر ان لفظوں میں پیش فرماتے ہیں:

”میرے مخدوم واجب الوجود جل شانہ کے صفات ثنائیہ جو اہل حق شکر اللہ تعالیٰ سبحانہ کے نزدیک خارج میں موجود ہیں، حق تعالیٰ کی ذات سے خارج میں تمیز ہیں۔ اور وہ تمیز بھی ذات و صفات کی طرح بے چوں و بے چگون ہے۔ اسی طرح صفات بھی تمیز بخونی کے ساتھ ایک دوسرے سے تمیز ہیں بلکہ تمیز بخونی حضرت ذات تعالیٰ کے مرتبے میں بھی ثابت ہے۔ لَا تُسَمُّوُا الْمَوَاسِيعَ الْمَجْهُوْلَ الْكَفِيفَةَ (کیوں کہ وہ ایسی وسعت کے ساتھ واسع یعنی اشیا کو گھیرنے والا ہے جس کی کیفیت معلوم نہیں)، وہ تمیز جو ہمارے فہم و ادراک میں آسکے، اس جناب پاک سے مسلوب ہے کیوں کہ بعض اور تجزی (بعض بعض اور جز و جزو ہوا) اس چکھ متصور نہیں۔ اور تحلیل و ترکیب کا اس بارگاہ میں دخل نہیں۔ اور حال و محل ہونے کی وہاں گنجائش نہیں۔ غرض جو ممکن کے صفات و اعراض ہیں، سب اس جناب پاک سے مسلوب ہیں۔ لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ فَهُوَ الْمَدَّاتُ وَلَا فِي الصِّفَاتِ وَلَا فِي الْأَفْعَالِ (ذات و صفات و افعال میں کوئی اس کی مانند نہیں)۔ اس بخونی تمیز اور بے کفی وسعت کے باوجود حق تعالیٰ کے اسماء و صفات نے خاند علم میں بھی تفصیل و تمیز پیدا کی ہے۔ اور منعکس ہوئے ہیں۔ اور ہر صفت و اسم تمیزہ کے لیے مرتبہ علم میں ایک مقابل اور نقیض ہے۔ مثلاً مرتبہ علم میں صفت علم کا مقابل اور نقیض عدم علم ہے، جس کو جہل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور صفت قدرت کے مقابل بغیر ہے جس کو عدم قدرت کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔ ان عدالت متقابلہ نے بھی حق تعالیٰ کے علم میں تفصیل و تمیز پیدا کی ہے۔ اور اپنے متقابلہ اسماء و صفات کے آئینے اور ان کے عکس کے مظہر بن گئی ہیں۔

فقیر کے نزدیک وہ عدالت بمعہ اسماء و صفات کے، عکسوں کے حقائق ممکنات ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ عدالت ان مایات کے اصول و مواد کی طرح ہیں اور وہ عکس ان مواد میں حلول کی ہوئی صورتوں کی طرح۔ پس شیخ محی الدین کے نزدیک ممکنات کے حقائق وہ اسماء و صفات ہیں جو مرتبہ علم میں ایک دوسرے سے تمیز ہیں۔ اور فقیر کے نزدیک ممکنات کے حقائق وہ عدالت ہیں جو اسماء و صفات کی تقییدیں ہیں بمعہ اسماء و صفات کے عکسوں کے جو خاند علم میں ان عدالت کے آئینوں میں ظاہر ہوئی ہیں اور ایک دوسرے سے باہم مل گئی ہیں۔ قاور بخار و جل شانہ نے جب چاہا کہ ان مایات مجزبہ میں سے کسی مابیت کو وجود بخلی کے ساتھ جو حضرت وجود کا پرتو ہے، مٹھت

کر کے موجود خارجی بنائے تو اس ملیت متوجہ پر حضرت وجود کا پرتو ڈال کر اس کو آٹا روخا رچیہ کا مبدع بنایا۔ پس ممکن کا وجود علم و خارج میں اس کی باقی صفات کی طرح حضرت وجود اور اس کی کمالات تابع کا پرتو ہے۔ مثلاً ممکن کا علم واجب الوجود کے علم کا پرتو اور ظل ہے جو اپنے مقابل میں منعکس ہوا ہے اور ممکن کی قدرت بھی ایک ظل ہے، جو عجز میں جو اس کے مقابل ہے منعکس ہوئی ہے۔ اسی طرح ممکن کا وجود حضرت وجود کا ظل ہے جو عدم کے آئینے میں جو اس کے مقابل ہے منعکس ہوا ہے۔ لیکن فقیر کے نزدیک شے کا ظل شے کا عین نہیں بلکہ اس کا شیخ و مثال ہے۔ اور ایک کا دوسرے پر حمل کرنا متعین اور محال ہے۔ پس فقیر کے نزدیک ممکن واجب کا عین نہ ہوگا اور ممکن کا واجب پر حمل کرنا ثابت نہیں ہوگا کیوں کہ ممکن کی حقیقت عدم ہے۔ اور وہ عکس جو اسماء و صفات سے اس عدم میں منعکس ہوا ہے، وہ ان اسماء و صفات کا شیخ و مثال ہے، نہ کہ ان کا عین۔ پس ہمہ اوست کہنا درست نہیں ہوگا۔ بلکہ ہمہ از اوست کہنا درست ہوگا۔“ (۱۰)

اس خط میں ہمہ اوست اور ہمہ از اوست کے مابین فرق کی وضاحت کرتے ہوئے مسئلہ زیر بحث کو اس طرح سمیٹا گیا ہے:

”شیخ محی الدین کے نزدیک عالم سب کا سب ان اسماء و صفات سے مراد ہے جنہوں نے خانہ علم میں تمیز پیدا کر کے ظاہر وجود کے آئینے میں نمود و نمائش حاصل کی ہے اور فقیر کے نزدیک عالم ان عدا مات سے مراد ہے جن میں حق تعالیٰ کے اسماء و صفات خانہ علم میں منعکس ہوئی ہیں۔ اور وہ عدا مات بعد ان عکسوں کے حق تعالیٰ کے ایجاب سے وجود ظلی کے ساتھ خارج میں موجود ہوئی ہیں۔ پس عالم میں خبث ذاتی اور شرارت جبلی ظاہر اور پیدا ہے۔ اور سب جز و کمال حق تعالیٰ کی پاک بارگاہ کی طرف راجع ہے۔ آیت کریمہ اَصَابُکُمْ مِنْ حُسْنِیَةِ فِیْمَنْ لِّلّٰہِ وَمَا اَصَابُکُمْ مِنْ سَبَیْۃٍ فِیْمَنْ نَّفْسِکَ (جو تجھے بھلائی پہنچے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ اور جو تجھے بدائی پہنچے وہ تیرے اپنے نفس سے ہے) اس معرفت کی تائید کرتی ہے۔

پس اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ عالم وجود ظلی کے ساتھ خارج میں موجود ہے جس طرح کہ حق تعالیٰ وجود و اصلی کے ساتھ بلکہ بذات خود خارج میں موجود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عالم کا یہ خارج بھی وجود و صفات کی طرح حق تعالیٰ کے وجود کے خارج کا ظل ہے۔ پس عالم کو حق تعالیٰ کا عین نہیں کہہ سکتے۔

انگریز کہ شیخ محی الدین اور اس کے تابعین بھی عالم کو حق تعالیٰ کا ظل جانتے ہیں، پھر فرق کیا ہوا۔ تو میں کہتا ہوں کہ یہ لوگ اس ظلی وجود کو صرف وہم ہی میں خیال کرتے ہیں۔ اور وجود خارجی کی بونٹ بھی اس کے حق میں تجویز نہیں کرتے۔ غرض کثرت مہوہ کو وحدت وجود

کے ظل سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور خارج میں واحد تعالیٰ ہی کو موجود جانتے ہیں۔ پس ظل کے اصل پر حمل کرنے اور نہ کرنے کا باعث ظل کے لیے وجود خارجی کا ثابت کرنا اور نہ کرنا ہے۔ یہ لوگ چوں کہ ظل کے لیے وجود خارجی ثابت نہیں کرتے اس لیے اصل پر محمول کرتے ہیں۔ اور یہ فقیر چوں کہ ظل کو خارج میں موجود جانتا ہے۔ اس لیے اصل پر حمل کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ ظل سے وجود اصلی کے لٹی کرنے میں فقیر اور یہ لوگ شریک ہیں اور وجود ظلی کے ثابت کرنے میں بھی متفق ہیں۔ لیکن یہ فقیر وجود ظلی خارج میں ثابت کرتا ہے۔ اور یہ لوگ وجود ظلی کو وہم و خیال ہی سمجھتے ہیں اور خارج میں احدیت مجرہ کے سوا کچھ موجود نہیں جانتے اور صفات ثنائیہ جن کا وجود اہل سنت و جماعت رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی آرا کے موافق خارج میں ثابت ہوا ہے، ان کو بھی علم میں ثابت نہیں کرتے۔۔۔ حق تعالیٰ کو عالم کا عین کہنا اور اس کے ساتھ متحد جانا بلکہ نسبت دینا بھی اس فقیر پر بیست گراں اور دشوار ہے۔“ (۱۱)

اس خط میں بھی وحدت الوجود کے نظریے کو رد کیا گیا ہے لیکن اختلاف کو کشف و شہود کے اجمالی ذکر تک محدود نہیں رکھا گیا ہے بلکہ علمی انداز میں مسئلے کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالی گئی ہے، غور و خوض کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو حید وجودی کے قائل صوفیائے کرام کا نقطہ نظر کیا ہے اور خود مکتوب نگار کے موقف کی فکری بنیاد کیا ہے۔

وحدت الوجود اور وحدت الشہود کی بحث کو اب ہم چھوڑتے ہیں اور فنا و بقا کے مسئلے کو لیتے ہیں۔ یہ بھی تعریف کا ایک محبوب موضوع ہے۔ اسے سمجھنے کے لیے مکتوبات امام ربانی، دہر اول، مکتوب ۵۸ (پناہ سید محمود) سے ایک اقتباس مستعار لیتے ہیں:

”یہ راہ جس کے طے کرنے کے ہم درپے ہیں، انسان کے سات لطیفوں کے موافق سب سات قدم ہیں۔ دو قدم عالم خلق میں ہیں، جن کا تعلق قالب اور نفس کے ساتھ ہے۔ اور شیخ قدم عالم امر میں ہیں جو قلب و روح و سر و خفی و انھی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اور ان سات قدموں میں سے ہر ایک قدم میں دس ہزار پردے پھاڑنے پڑتے ہیں، خواہ وہ پردے نورانی ہوں یا ظلمانی۔۔۔ اور پہلے قدم میں جو عالم امر میں لگاتے ہیں، تجلّی افعال ظاہر ہوتی ہے۔ اور دوسرے قدم پر تجلّی صفات اور تیسرے قدم پر تجلّی ذاتیہ کا شروع آ جاتا ہے۔ علیٰ ہذا التیاس درجوں کے تفاوت کے لحاظ سے ترقی ہوتی جاتی ہے۔۔۔ اور ان ساتوں قدموں میں سے ہر ایک قدم پر اپنے آپ سے دور ہوتا جاتا ہے اور حق تعالیٰ کے نزدیک ہوتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ان قدموں کے تمام ہونے تک قرب بھی پورا ہوا جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد فنا اور بقا سے مشرف ہوتے ہیں اور للہیت خالصہ کے درجے تک پہنچ جاتے ہیں۔

طریقہ عالیہ نقشبندیہ کے مشائخ قدس سرہم نے برخلاف دوسرے سلسلوں کے مشائخ کے اس سیر کی ابتدا عالم امر سے اختیار کی ہے اور عالم خلق بھی اسی سیر کے ضمن میں ملے کر لیتے ہیں۔ (۱۲) مکتوبات امام ربانی دھڑ اول، مکتوب ۲۱ (پیام شیخ محمد کی ابن حاجی قاری موسیٰ لاہوری) سے ماخوذ ایک اور اقتباس ملاحظہ ہو:

”میرے بھائی! جان لو۔ جب تک وہ موت جو موت معروف کے پہلے ہے اور اہل اللہ اسے فنا سے تعبیر کرتے ہیں، ثابت نہ ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی جناب میں پہنچنا محال ہے۔“ (۱۳) مکتوبات امام ربانی، دفتر اول، مکتوب ۳۰ (پیام شیخ نظام تھانیسری) بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس خط میں شبو نفسی اور شبو صوری کے حوالے سے بعض وقتیں مسائل بھی زیر بحث آئے ہیں اور مکتوب نگار کا نقطہ نظر بھی:

”خواجہ نقشبند قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ اہل اللہ فنا و بقا کے بعد جو کچھ دیکھتے ہیں، اپنے آپ میں دیکھتے ہیں اور جو کچھ پہنچاتے ہیں، اپنے آپ میں پہنچاتے ہیں۔ اور ان کی حیرت اپنے وجود میں ہے۔۔۔ شبو نفسی سے کوئی شخص وہم میں نہ پڑ جائے۔ اور اس کو تجلی صوری کے شبو کی طرح جو تجلی لہ کے نفس میں ہے، خیال نہ کرے۔ ہرگز ایسا نہیں ہے۔ تجلی صوری جس قسم کی ہو، سیر آفاقی میں داخل ہے اور مرتبہ علم الیقین میں حاصل ہے اور شبو نفسی مرتبہ حق الیقین میں ہے جو مراتب کمال کا نہایت ہے۔ اور شبو کا لفظ اس مقام میں میدان عبارت کی تنگی کے باعث بولا گیا ہے ورنہ جیسے کہ ان کا مطلب بے چوں و بے جگہ ہے، اس مطلب کے ساتھ ان کی نسبت بھی بے شبہ و بے مانند ہے۔ چوں کہ بے چوں کی طرف راہ نہیں ہے۔۔۔

اور شبو نفسی اور شبو صوری مذکور کے باہم متحد ہونے کے وہم کا منشا دونوں مقاموں میں بقا سے شخص کا حاصل ہونا ہے۔ کیوں کہ تجلی صوری فنا کرنے والی نہیں ہے، اگرچہ قیود میں سے تھوڑی سی قید رفع کر دیتی ہے۔ لیکن فنا کی حد تک نہیں پہنچاتی۔ پس بقیہ وجود سا لک کا اس تجلی میں حاصل ہے۔ اور سیر نفسی خود پوری پوری فنا اور کامل بقا کے بعد ہے۔ پس اسی واسطے معرفت کی کمی کے باعث ان دونوں بقا کے درمیان فرق نہیں کر سکتے اور باچا راتھا کا حکم لگاتے ہیں۔ اگر معلوم کریں کہ بقا سے ثانی الہ کے نزدیک بقا یا اللہ سے تعبیر کی گئی ہے۔ اور اس وجود کو جو دوہو بوجھانی یعنی خدا کا بخشا ہوا وجود کہتے ہیں، تو شاید اس وہم سے خلاص ہو جائیں۔

اس مضمون سے کوئی یہ نہ کہے کہ بقا یا اللہ اپنے آپ کو حق تعالیٰ کا عین معلوم کرنے سے مراد ہے۔ ایسا نہیں ہے۔ اگر یہ مضمون اس قوم کی بعض عبارات میں مفہوم ہو بھی تو اس کا ہم جواب کہتے ہیں کہ یہ بقا جذبے کے مقام میں بعض کو اسی استغراق و نیستی کے بعد، جو فنا کے مشابہ ہے، حاصل

ہوتی ہے اور مشائخ نقشبندیہ قدس سرہم اسے وجود عدم سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور یہ فنا سے پہلے ہے اور اس کے لیے زوال متصور ہے بلکہ واقع ہے۔ کبھی اس سے اس کو ملے لیتے ہیں اور کبھی پھیر دے دیتے ہیں۔ اور وہ بقا جو فنا کے کامل کے بعد ہے، زوال و خلل سے محفوظ ہے۔ ان کی فنا دائمی فنا ہے۔ اور عین بقا میں فانی اور عین فنا میں باقی ہیں۔ اور وہ فنا و بقا جو زوال پذیر ہیں، احوال و تکوینات میں سے ہیں۔ اور جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، وہ ایسے نہیں۔

حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ نے فرمایا ہے کہ وجود عدم وجود بشریت میں غائب کرنا۔ پس بالضرورت ان کا وقت دائمی ہوگا اور ان کا حال دائمی۔ بلکہ ان کے لیے نہ کوئی وقت ہے نہ حال۔ ان کا کار قوتوں کے پیدا کرنے والے کے ساتھ ہے۔ اور ان کا معاملہ احوال کے پھیرنے والے کے ساتھ۔ پس زوال کا قبول کرنا وقت و حال سے مخصوص ہے اور وہ جو وقت و حال سے گزر جائے، وہ زوال سے محفوظ ہے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے اور اللہ تعالیٰ بڑے فضل والا ہے۔ کوئی شخص گمان نہ کرے کہ وقت کا دوام اس وقت کے اثر از مرتبہ عین وغیرہ کے باقی رہنے کے اعتبار سے بیان کیا ہے۔ نہیں بلکہ دوام عین وقت کے لیے ہے اور تنگی نفس حال کے لیے۔ اور ظن سے حق بات کوئی بات نہیں ہوتی۔“ (۱۴)

تعویف کے نکات سے بھرپور درج ذیل اقتباس بھی اسی خط کا حصہ ہے اور اس لحاظ سے قابل توجہ ہے کہ اس میں مقام عہدیت کے حصول میں عشق کے کردار و ولایت کے درجوں میں مقام عہدیت کی اہمیت، خدا اور بندے کے تعلق اور توحید قطعی کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے:

”عشق و محبت... مقام عبودیت کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ انسان خدا سے کاٹدہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ماسوائے اللہ کی گرفتاری اور بندگی سے پورے طور پر خلاصی پا جائے اور عشق و محبت صرف اس اھطاع کا وسیلہ ہے۔ اسی واسطے مراتب ولایت میں سے نہایت کا مرتبہ مقام عہدیت ہے اور ولایت کے درجوں میں مقام عہدیت سے اوپر کوئی مقام نہیں۔ اس مقام میں اپنے مولا کے ساتھ اپنے لیے کوئی نسبت نہیں پاتا مگر بندے کی طرف سے احتیاج اور مولا کی طرف سے از روئے ذات و صفات کے پوری پوری استغنا۔ یہ نہیں کہ اپنے آپ کو اس کی ذات کے ساتھ اور اپنی صفات کو اس کی صفات کے ساتھ اور اپنے افعال کو اس کے افعال کے ساتھ کسی وجہ سے مناسب جانے۔ غلطی کا اطلاق بھی من جملہ مناسبات سے ہے۔ اس سے بھی پاک و منزہ ہتاتے ہیں اور حق تعالیٰ کو خالق اور اپنے آپ کو مخلوق جانتے ہیں۔ اس سے زیادہ کہنے کی کچھ جرات نہیں کرتے۔

توحید قطعی جو بعض بزرگواروں کو ثناء راہ میں حاصل ہوتی ہے اور حق تعالیٰ کے سوا کسی کو فاعل نہیں پاتے۔۔۔ اس مضمون کو اس مثال سے واضح کرتے ہیں۔ مثلاً کوئی شعبہ باز پر دے کے

پیچھے پیچھے کر چند جمادی صورتوں کو حرکت میں لاتا ہے اور عجیب و غریب افعال ان میں ایجا کرتا ہے تو وہ لوگ جو تیز نظر والے ہیں، جانتے ہیں کہ ان جمادی صورتوں میں ان افعال کا بنانے والا وہ پردہ نشیں شخص ہے۔ لیکن افعال کو اختیار کرنے والی وہی صورتیں ہیں۔ اسی واسطے کہتے ہیں کہ صورت متحرک ہے اور یہ نہیں کہتے کہ شعیبہ باز متحرک ہے۔“ (۱۵)

اس طویل اقتباس کی تشریح یا تسہیل کے بجائے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سالک کے بعض احوال و مقامات کے بارے میں مکتوباتِ امام ربانی، دفتر اول، مکتوب ۵۷ (بنام حافظ محمود) سے استفادہ کیا جائے:

”جاننا چاہیے کہ سالکوں کو خواہ وہ ابتدا میں ہوں، خواہ انتہا میں، احوالِ تلوینات سے چارہ نہیں۔ حاصلِ کلام یہ کہ اگر وہ تلوینِ قلب پر ہے تو وہ سالک اربابِ قلوب میں سے ہے اور ابنِ الوقت کے نام سے موسوم ہے۔ اور اگر قلبِ تلوین سے نکل گیا اور احوال کی غلامی سے آزاد ہو کر مقامِ تمکین میں پہنچ گیا تو اس کے احوال تلو نہ نفس پر وارد ہوتے ہیں جو مقامِ قلب میں اس کی خلافت میں بیٹھا ہے۔ یہ تلوینِ تمکین کے حاصل ہونے کے بعد ہے اور اس تلوین والے کو اگر ابو الوقت کہیں تو بجا ہے۔ اور اگر اللہ تعالیٰ کے فضل سے نفس بھی تلوینات سے گزر گیا اور تمکین و اطمینان کے مقام تک جا پہنچا تو اس وقت تلوینات کا وارد ہونا قالب پر ہے جو امور مختلفہ سے مرکب ہے۔ یہ تلوین واکئی ہے۔“ (۱۶)

اس خط کے ساتھ اگر مکتوباتِ امام ربانی، دفتر اول کے مکتوب ۳۲ (بنام مرزا حسام الدین احمد) کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو سلوک کے مقامات اور احوال کو سمجھنے میں مزید آسانی ہوگی:

ہر مقام کے لیے علوم و معارف جدا ہیں اور احوال و مواجید جدا۔ کسی مقام میں ذکر و توجہ مناسب ہے اور کسی مقام میں تلاوت اور نماز مناسب۔ کوئی مقام جذبے سے مخصوص ہے اور کوئی مقام سلوک کے مناسب۔ اور کسی مقام میں یہ دونوں دولتیں ملی ہوئی ہیں۔ اور کوئی مقام ایسا ہے جو جذبہ اور سلوک کی دونوں جہتوں سے جدا ہے۔ نہ جذبے کو اس سے علاقتہ ہے اور نہ سلوک کو اس سے تعلق۔ یہ مقام نہایت عجیب ہے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب اس مقام کے ساتھ ممتاز اور اس بڑی دولت سے شرف ہیں۔ اس مقام والے کے لیے دوسرے مقامات والوں سے پورا پورا امتیاز ہے اور ایک دوسرے کے ساتھ بہت کم مشابہت رکھتے ہیں۔ برخلاف دوسرے مقامات والوں کے کہ ایک دوسرے کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، خواہ وہ مشابہت کسی وجہ سے ہو۔“ (۱۷)

الخصر، مقام ولایت اپنی جگہ لیکن وہ عمر و زندگی اور لذتِ بندگی جو سرور و کائنات رسول اکرم ﷺ کی زفاقت کے طفیل اصحاب کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کو حاصل ہے، فہم و ادراک

سے بالا اور دوسرے مقاموں کے ہر مقام سے افضل و اعلیٰ ہے۔

سیر و سلوک کا مقصد و نفسِ امارہ کا تزکیہ ہے، تصوف کی اس عام تعریف سے ہم سبھی واقف ہیں لیکن یہ منزلِ اول ہے۔ ”دولتِ فنا“ اور ”محببتِ ذاتی“ سے سرشار ہونے والے مقررینِ خدا سے واحد کے سوا کسی اور کے طلب گار نہیں ہوتے۔ ”اس مقام میں انعام و یلام برابر ہیں۔۔۔ اگر بہشت کو چاہتے ہیں تو اس لیے کہ اس کی رضا کا مقام ہے۔ اور اس کے طلب کرنے میں خدا کی مرضی ہے اور دوزخ سے پناہ اس واسطے مانگتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے غضب کا مقام ہے۔ نہ تو بہشت سے اُن کا مقصود و نفس کی لذت کا طلب کرنا ہوتا ہے اور نہ دوزخ سے پناہ مانگنا رنج و محنت کے باعث۔ کیوں کہ جو کچھ محبوب سے آئے، ان بزرگواروں کے نزدیک مرغوب اور عینِ مطلوب ہوتا ہے۔“ (۱۸)

میاں حاجی محمد لاہوری کو مخاطب کرتے ہوئے جو بات مندرجہ بالا طور پر میں کہی گئی ہے، اسی خیال کو مکتوباتِ امام ربانی، دفتر اول، مکتوب ۳۲، بنام محمد شیخ خاں میں اس طرح ادا کیا گیا ہے: ”جب تک بندہ اپنے نفس کی مراد سے بالکل پاک نہ ہو جائے، حق تعالیٰ اس کی مراد نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ہی حق تعالیٰ کی محبت اس کے دل میں آ سکتی ہے۔ اور یہ اعلیٰ دولت فنا سے مطلق کے بعد جو تجلی ذاتی سے وابستہ ہے، ثابت و حاصل ہوتی ہے۔ پس جب یہ محبت جس کو محبتِ ذاتی سے تعبیر کرتے ہیں، حاصل ہو جائے تو اُس وقت محبت کے نزدیک محبوب کا انعام اور ایلام یکساں معلوم ہوتا ہے۔ پس اس کو اس وقت اخلاصِ حقیقی حاصل ہو جاتا ہے اور خدا کی عبادت خاص اسی کے لیے کرتا ہے، نہ اپنے نفس کے لیے۔ یعنی انعام کی طلب اور رنج کے دفع کرنے کی غرض سے نہیں کرتا۔ کیوں کہ یہ دونوں اس کے نزدیک برابر ہیں۔ اور یہ مرتبہ مقررین کا ہے۔۔۔ ابراہیم اللہ تعالیٰ کی عبادت خوف و طمع کی نیت سے کرتے ہیں۔ پس ابراہیم کے حسنات ایک وجہ سے نیکیاں ہیں اور ایک وجہ سے برائیاں، اور مقررین کے حسنات خالص اور محض نیکیاں ہیں۔“ (۱۹)

اس خط میں یہ وضاحت بھی کی گئی ہے کہ: ”مقررین میں سے بھی بعض لوگ بقائے کامل سے موصوف ہوتے اور عالمِ اسباب کی طرف نزول کرنے کے بعد خوف و طمع کی نیت پر خدا کی عبادت کرتے ہیں لیکن ان کا خوف و طمع ان کے اپنے نفسوں کی طرف راہ جمع نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس کی رضا مندی کی طمع پر اور اس کے غضب سے ڈر کے مارے عبادت کرتے ہیں۔۔۔ بہشت کو وہ اس واسطے طلب کرتے ہیں کہ وہ اس کی رضا کا مقام ہے۔۔۔ مقررین کے مرتبوں میں سے یہ رتبہ نہایت اعلیٰ ہے۔۔۔ اللہ تعالیٰ ہم کو سید البشر صلی اللہ علیٰ آلہ واتباعہ وسلم کے طفیل ان بزرگواروں کی محبت عطا فرمائے۔ کیوں کہ آدمی اسی کے ساتھ ہے جس سے اس کو محبت ہے۔“ (۲۰)

ظاہر ہے رسولِ عربی ﷺ کی محبت اصلِ ایمان ہے۔ سالک اسی دولت کو سینے سے لگا کر

مرشد کی رہنمائی میں منتر لیں طے کرتا ہے۔ شریعت کی مشعل اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اعمال کی قوت اس کے سینے میں دل بن کر دھڑکتی ہے۔ اسی لیے یہ کہا گیا ہے کہ:

”جو کچھ ہم پرا اور آپ پر لازم ہے وہ یہ ہے کہ اول اپنے عقاید کو کتاب و سنت کے موافق درست کریں۔۔۔ اور دوسرے احکام شرعی از قسم حلال و حرام و فرض و واجب کا علم حاصل کرنا ہے۔ اور تیسرے اس علم کے موافق عمل کرنا۔ اور چوتھے تصفیہ و تزکیہ کا طریق جو صوفیائے کرام قدس سرہم سے مخصوص ہے۔ جب تک عقاید کو درست نہ کریں، احکام شرعیہ کا علم کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اور جب تک یہ دونوں تحقیق نہ ہوں، عمل نفع نہیں دیتا، اور جب تک یہ تینوں حاصل نہ ہوں، تصفیہ اور تزکیہ کا حاصل ہونا محال ہے۔“ (۲۱)

مکتبہ امام ربانی، دہلی، دہلی، اول سے ماخوذ جس خط (نمبر ۱۵) کا اقتباس ابھی ہم نے پڑھا، اس کے مخاطب حکیم عبدالوہاب ہیں۔ اس کے ساتھ ایک اور مکتوب بنام شیخ نظام تھامیری کے درج ذیل جملے بھی ذہن نشین کر لیے جائیں تو شریعت اور طریقت کے رشتے کو سمجھنے میں آسانی ہوگی:

”کسی شخص نے حضرت خواجہ نقشبند قدس سرہ سے سوال کیا کہ سلوک سے مقصود کیا ہے؟ آپ نے فرمایا یہ کہ اجمالی معرفت تفصیلی ہو جائے اور استدلالی کشفی سے بدل جائے۔“ (۲۲)

ایک اور مکتوب (نمبر ۴۱، بنام شیخ درویش) میں شریعت اور طریقت کی وضاحت اس طرح کی گئی ہے:

”زبان سے جھوٹ نہ بولنا شریعت ہے اور دل سے جھوٹ کا خطرہ دور کرنا طریقت اور حقیقت ہے۔“ (۲۳)

ایک اور جگہ ارشاد فرماتے ہیں: ”شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم و عمل اور اخلاص۔ جب تک یہ تینوں جزو تحقیق نہ ہوں، شریعت تحقیق نہیں ہوتی۔۔۔ طریقت اور حقیقت جن سے صوفیہ ممتاز ہیں، تیسرے جزو یعنی اخلاص کے کامل کرنے میں شریعت کے خادم ہیں۔“ (۲۴)

مکتبہ امام ربانی دہلی، اول کا مکتوب ۱۳ (بنام پیر و مرشد) بھی ملاحظہ ہو۔ اس میں شریعت اور طریقت پر اس طرح اظہار خیال کیا گیا ہے:

”باطن ظاہر کے کچھ مخالف نہیں ہے۔۔۔ علما و ربز رگوں کے درمیان اسی قدر فرق ہے کہ علما از روے دلیل و علم کے جان لیتے ہیں، اور یہ ربز رگوں از روے کشف اور ذوق کے پالیتے ہیں۔“ (۲۵)

اس لیے امام ربانی، مجدد الف ثانی، شیخ احمد سرہندی قدس سرہ و فقیر دہلی میں خواجہ شرف الدین حسین کو مخاطب کرتے ہوئے نصیحت فرماتے ہیں:

”اے فرزند! فرصت اور فراغت کو غنیمت جانتا چاہیے۔ اور تمام اوقات ذکر الہی میں

مشغول رہنا چاہیے۔ جو عمل شریعت غرا کے موافق کیا جائے، ذکر الہی میں داخل ہے، اگرچہ بڑبڑ و فروخت ہو۔ پس تمام حرکات و سکون میں احکام شرعیہ کی رعایت کرنی چاہیے تاکہ سب کچھ ذکر ہو جائے۔ کیوں کہ ذکر سے مراد یہ ہے کہ غفلت دور ہو جائے۔ جب تمام افعال میں اوامر و نواہی کو مد نظر رکھا جائے تو اس صورت میں بھی اوامر و نواہی کی غفلت دور ہو جاتی ہے اور دوام و ذکر الہی حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ دوام ذکر حضرت خواجگان کی یادداشت سے جدا ہے۔ وہ یادداشت صرف باطن تک ہی ہے اور اس دوام ذکر کا اثر ظاہر میں بھی ہے۔ اگرچہ دشوار ہے۔“ (۲۶)

راہ دشوار رہی، مگر آئیے، امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی کے الفاظ مستعار لیتے ہوئے: ”بارگاہ خداوندی میں ورج و عابد کریں، اپنے لیے اور ان سب کے لیے جو نجات کے آرزو مند ہیں۔ خداوند! ہم پر فضل فرما اور ہمیں توفیق دے کہ:

”بندگی کے وظیفوں کو بجالائیں۔ شرعی حدود کی محافظت اور سنیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی متابعت کریں۔ اور عیبوں کے حاصل کرنے میں غیبتوں کو درست رکھیں۔ اور اپنے باطنوں کو خالص اور اپنے ظاہروں کو سلامت رکھیں۔ اور اپنے عیبوں کو دیکھتے رہیں۔ اور گناہوں کے غلبے کا مشاہدہ کرتے رہیں۔ غلام الغیوب کے انتقام سے ڈرتے رہیں۔ اور اپنی نیکیوں کو چھوڑا سمجھیں اگرچہ بہت ہوں اور اپنی برائیوں کو بہت خیال کریں اگرچہ چھوڑی ہوں۔ اور خلقت کی قبولیت اور شہرت سے ڈرتے رہیں۔“ (۲۷)

حواشی

۱۔ جہاں گیر: توڑک جہاں گیری، جلد دوم، انگریزی ترجمہ الیگزینڈر راجرس، اردو ترجمہ: اقبال حسین، ص ۸۷-۸۸، نئی دہلی قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ۲۰۰۶ء

۲۔ ایضاً، ص ۱۵۱

۳۔ حضرت مجدد الف ثانی، مکتوب ۲۳۔ بنام شیخ فرید، مشمولہ مکتبہ امام ربانی، دہلی، اول (اردو ترجمہ: قاضی عالم الدین)، ص ۱۶۲، حیدرآباد، دارالعلوم، جنچل کوڑہ، انڈیا، ب۔ ت۔ مکتوب ۳۱۔ بنام شیخ صوفی، دہلی، اول، ص ۱۴۳-۱۴۳

۵۔ ایضاً، ص ۱۴۳-۱۴۴

۶۔ ایضاً، ص ۱۴۴-۱۴۵

۷۔ مکتوب ۱۔ بنام شیخ عبدالعزیز جون پوری، مشمولہ مکتبہ امام ربانی، دہلی، دوم، (اردو ترجمہ: قاضی عالم الدین)، ص ۱۹، حیدرآباد، ب۔ ت۔

۸۔ ایضاً، ص ۲۰-۲۱

۹- ایضاً ص ۲۱

۱۰- ایضاً، ص ۲۲-۲۳

۱۱- ایضاً، ص ۲۳-۲۴

۱۲- مکتوب ۵۸- بنام سید محمود، دفتر اول، ص ۱۸۱

۱۳- مکتوب ۲۱- بنام شیخ محمد کی این حاجی قاری موسیٰ لاہوری، دفتر اول، ص ۱۲۲

۱۴- مکتوب ۳۰- بنام شیخ نظام تھانیسری، دفتر اول، ص ۱۳۹-۱۴۰

۱۵- ایضاً، ص ۱۴۰

۱۶- مکتوب ۱۷- بنام حافظ محمود، دفتر اول، ص ۳۰۱

۱۷- مکتوب ۳۲- بنام مرزا احسان الدین احمد، دفتر اول، ص ۱۴۶

۱۸- مکتوب ۳۵- بنام مہیال حاجی محمد لاہوری، دفتر اول، ص ۱۵۲-۱۵۳

۱۹- مکتوب ۳۴- بنام محمد شیخ خاں، دفتر اول، ص ۱۳۱

۲۰- ایضاً، ص ۱۳۱-۱۳۲

۲۱- مکتوب ۱۷- بنام حکیم عیدالوہاب، دفتر اول، ص ۷۸

۲۲- مکتوب ۳۰- بنام شیخ نظام تھانیسری، دفتر اول، ص ۱۴۰

۲۳- مکتوب ۴۱- بنام شیخ ذرولیش، دفتر اول، ص ۱۵۹

۲۴- مکتوب ۲۱- بنام ملا حاجی محمد لاہوری، دفتر اول، ص ۱۵۳-۱۵۴

۲۵- مکتوب ۱۳- بنام پیر مرشد، دفتر اول، ص ۱۱۱-۱۱۲

۲۶- مکتوب ۲۱- بنام خواجہ شرف الدین حسین، دفتر دوم، ص ۷۰-۷۱

۲۷- مکتوب ۱۷- بنام ملا طاہر بدخشی، دفتر اول، ص ۲۹۶



مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ: افکار کا تقابلی مطالعہ

حضرت مجدد الف ثانی (احمد بن عبد الاحد فاروقی، ۱۲۰ھ شوال ۱۷۹۷ھ/۱۶ مئی ۱۵۶۲-۲۸ صفر ۱۲۴۰ھ/۳۰ نومبر ۱۶۲۳ء بمصر ۶۳ برس) اور حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (احمد بن عبدالرحیم فاروقی، ۱۲۰ھ شوال ۱۱۱۲ھ/۲۲ فروری ۱۷۰۳ء-۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ/۲۰ اگست ۱۷۶۲ء بمصر ۶۳ برس) برصغیر پاک و ہند کی دو عظیم ترین شخصیات تھیں اور جن کو صحیح معنوں میں عبقریات کہا جاسکتا ہے۔ ان دونوں میں بڑی مماثلتیں بھی تھیں۔ دونوں ہم نام تھے اور دونوں ہم نسب بھی کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ خلیفہ دوم کے خاندان سے تھے اور ان کے جلال و جمال کے وارث بھی۔ دونوں بزرگوں کا مادری نسب اور وطن مالوف علوی اور مدینہ منورہ تھا۔ حضرت شاہ رضی اللہ عنہ کے مادری نسب کی تصریح سب نے کی ہے جبکہ حضرت مجدد کے مادری نسب کے بارے میں بالعموم سکوت پایا جاتا ہے۔ بہر حال دونوں عبقریات اہل سنت کی محبت سے سرشار تھے۔ ان دونوں عبقری شخصیات کا خاندان اصل وطن سے ہجرت کر کے ہندوستان آکر ایک ہی خطہ پاک میں آباد ہوا۔ سرہند اور ریتک غیر منقسم پنجاب کے دو عظیم اسلامی مراکز تھے پھر دونوں نے دارالسلطنت دہلی کو اپنا وطن و مرکز بنالیا۔ ”حضرت مجدد“ اور ”حضرت شاہ“ کی تعلیم و تربیت اور نشو و نما میں بھی کافی مماثلت و مناسبت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان کے افکار و خیالات، مزاج و موقف اور فکر و نظر میں بھی قریبی اشتراک ملتا ہے۔ علوم اسلامی میں مہارت بھی ایک جیسی تھی اور ان کی خدمات و اصلاحات میں بھی اشتراک و مناسبت اور اتحاد و اتفاق کے متعدد عناصر بھی یکساں رہتے ہیں، بایں ہمہ ان دونوں عبقریات کی اپنی شخصی، علمی، فکری اور اصلاحی جہات و حیثیات تھیں جو ان کو منفرد و ممتاز بناتی ہیں۔

(حضرت مجدد کے بنیادی مآخذ ہیں: مکتوبات امام ربانی، ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت و عزیمت، چہارم۔ محمد عبدالشکور فاروقی: تذکرہ امام ربانی، شیخ محمد اکرام: رود کوثر، سید زوار حسین: حضرت مجدد الف ثانی، محمد منظور نعمانی: تذکرہ امام ربانی وغیرہ۔ حضرت شاہ کے مآخذ و مراجع

ہیں: مختلف کتب حضرت شاہ، خاص طور سے انفاس العارفین، مکاتیب حضرت شاہ، تہذیبات الہیہ، جلبانی، لائق آف شاہ ولی اللہ اور شاہ ولی اللہ کی تعلیم، مناظر احسن گیلانی، تذکرہ شاہ ولی اللہ، معبد اللہ سندی، شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، محمد رحیم بخش: حیات ولی، ابوالحسن علی ندوی: تاریخ دعوت و عزیمت، پیچم، سراج ایم ایس بایون: ریجن اینڈ تھاٹ آف شاہ ولی اللہ، محمد یونس مظہر صدیقی: حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی: شخصیت و حکمت کا ایک تعارف، شاہ ولی اللہ کی تصانیف کا تنقیدی مطالعہ وغیرہ متعدد دیگر کتب۔

حضرت مجدد کے کاموں پر تجزیہ

حضرت مجدد کی عظیم خدمات کو بالعموم دو خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، ایک قومی و ملکی سطح ہے جس پر حضرت موصوف نے اپنے عہد کے دو مغل شہنشاہوں جلال الدین محمد اکبر (۱۵۵۶ء-۱۶۰۵ء) اور نور الدین محمد جہانگیر (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) کی دینی سچ روی اور فکری و عملی بے راہ روی کے ملک و عوام پر اثرات پر کا ازالہ کیا۔ اور اسلام و شریعت کی گراں قدر خدمات انجام دیں۔ اپنے مکتوبات کے ذریعے بطور خاص بعض بڑے سامرائے سلطنت کو بے دینی اور الحاد دور کرنے پر ابھارا اور مغل دربار میں موجود موشرک کلابان دولت کے افکار و اعمال پر روک لگانے اور صحیح اسلامی تعلیمات کی ترویج کی کوشش کی۔ انھوں نے مغل دربار میں اور اس کے زیر اثر عوام و خواص میں شیعہ اثرات کی ترک تازی کو روکنے کے لیے دروافض، رسالہ فی اثبات النبوة وغیرہ کی تالیف بھی کی اور مکتوبات میں خالص اہل سنت کے افکار و عقائد کی پر زور و پر خلوص سچی کی، رسول اللہ ﷺ، نبوت محمدی، صحابہ کرام، خلفائے راشدین بالخصوص خلفائے ثلاثہ (حضرات ابو بکر و عمر و عثمان رضی اللہ عنہم) اور دوسرے موضوعات پر بڑی صراحت و وضاحت سے لکھا اور عوام و خواص کے ذہنوں سے شیعہ جالے دور کیے۔

حضرت مجدد کا دوسرا کارنامہ عالمی و آفاقی بتایا جاتا ہے اور اس کا تعلق اسلامی تصوف کی تطہیر اور شیرازہ بندی سے ہے، بیشتر مورخین و محققین نے مبالغہ آمیز حد تک اس امر پر کیا ہے کہ حضرت مجدد نے تصوف و طریقت کو غیر اسلامی حس و نشاط کے صاف کیا اور اسے اسلامی دین و شریعت کے مطابق بنایا شریعت و طریقت کا فرق واضح کیا اور مقبول خواص بنایا۔

(ابوالکلام آزاد، تذکرہ: ۳۳۸) شہنشاہ اکبر کے عہد کے اختتام اور عہد جہانگیری کے اوائل میں کیسے کیسے اکابر موجود تھے لیکن مفاہد و وقت کی اصلاح و تجدید کا معاملہ کسی سے بھی بن نہ آیا۔ صرف مجدد و الف ثانی کا وجود گرامی ہی تن تھا اس کا رویا رکافیل ہوا۔

(سید ابوالاعلیٰ مودودی، تجدید و احیاء دین، ۸۷) ہندوستان کے مختلف گوشوں میں اس

وقت بھی بہت سے حق پرست علما اور سچے صوفیہ موجود تھے مگر ان کے درمیان وہ ایک اکیلا شخص تھا جو وقت کے ان فتنوں کی اصلاح اور شریعت محمدی کی حمایت کے لیے اٹھا اور جس نے شاہی قوت کے مقابلے میں یکہ و تنہا احیاء دین کی جدوجہد کی۔

ڈاکٹر محمد عیدالحق انصاری، مولانا ابوالحسن علی ندوی، اور متعدد دوسرے علما و مورخین نے حضرت مجدد کے تجدیدی کام کے ان دونوں پہلوؤں پر اسی طرح کی مبالغہ آمیزی کی ہے۔ ڈاکٹر انصاری نے دوسرے پہلو پر غلو کی تمام حدود پار کر لیں: ”تصوف کے تمام پہلوؤں کے ایک ساتھ جائزے کا کام شیخ محمد دوسے پہلے کسی نے نہیں کیا اور شان کے بعد کسی نے انجام دیا۔ یہ صرف انہیں کا کارنامہ ہے اور یہ غیر معمولی کام جب ان جیسا عظیم اللہ رصوفی انجام دے تو اس کا ایک ہی مقصد ہوگا۔ تصوف کی قرآن و سنت کی روشنی میں اصلاح و تجدید۔“ (مقالہ ”شیخ احمد سرہندی اور تصوف کی اصلاح و تجدید“، مشمولہ فکرا اسلامی کے فروغ میں شیخ احمد سرہندی کی خدمات، علی گڑھ، ۲۰۰۵ء، ۲۳: نیز خدمات مجدد کے دوسرے مقالات، جیسے ضیاء الدین اصلاحی، شیخ احمد سرہندی کے بارے میں شیخ عیدالحق محدث دہلوی کی غلط فہمیوں کا مسئلہ، ۱۱۰-۱۲۵ء، محمد رضی الاسلام ندوی، تصوف سرہندی کا تنقیدی مطالعہ (مولانا سید احمد عروج قادری کی تحریروں کی روشنی میں) ۱۲۶-۱۴۷ء، اور پروفیسر احتشام احمد ندوی اور ڈاکٹر محمد سلیم قاسمی کے مقالات وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود پر ۱۴۸ء و بعد)

حضرت شاہ رحمہ اللہ کی بے مثال جامعیت

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی بنیادی طور سے حضرت مجدد کے نقش ہندی سلسلے سے وابستہ تھے اور مجددی بھی تھے، ان کا امتیاز الہیت یہ ہے کہ وہ تمام سلاسل طریقت و سلوک کے جامع تھے۔ قادری، سہروردی، چشتی کے علاوہ شاذلی اور دوسرے متعدد سلسلوں سے بھی کب فیض کرتے تھے۔ ان کے مورخ و تحسین شناس تھے اور ان کے پارکھ اور نقد بھی تھے، ان کی انفرادیت و شخصیت دونوں کی بنیادی صفت ان کی جامعیت تصوف و سلوک کے علاوہ علوم دین و شریعت میں بھی تھی۔ حضرت شاہ رحمہ اللہ کو تمام اکابر علما صوفیہ میں یہ مقام عالی نصیب ہے کہ انھوں نے کتاب اللہ کا ترجمہ چشمہ فارسی میں کیا جو ان کے عہد کی عوامی زبان بھی تھی اور خواص کی علمی و فکری زبان بھی۔ ان کی بنیادی دعوت قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے، اسے روح و قلب اور زبان و دہن میں بیوست کرنے کی تھی اور وہ تمام طبقات امت کو اس چشمہ ہدایت سے وابستہ کرنا چاہتے تھے، ان کی حر یک قرآنی نے ان کے زمانے میں بھی اور ان کے بعد ان کے فرزندوں اور شاگردوں کے ذریعے اسلام کی بنیاد کو مقبول بنایا۔ اسلام و شریعت اور طریقت کے دوسرے تو اس سرچشمہ حدیث و سنت میں ان کی عظیم الشان تصانیف کا درو بے مثال ہیں۔ فن حدیث و سنت پر ان کی نظر مجتہدانہ

اور فکر مجددانہ تھی۔ مسوی و مصطفیٰ، ازالتہ الخفاء، اور حجتہ اللہ البالغہ جیسی کتب لازوال ہیں۔ حضرت مجدد کی مانند وہ صحابہ کرام اور خلفائے راشدین اور دوسرے تاریخی و اسلامی موضوعات کے مولف تھے مگر سب سے بڑھ کر قاسمی تھے۔ تاریخ اسلام اور تہذیب اسلامی کی جتنی خدمت اور پرورش انہوں نے کی، وہ بہت عبرتی و صوفیہ سے نہیں بنی آئی ہے۔ حضرت مجدد بلاشبہ عظمت صحابہ اور عدالت خلفائے راشدین میں ان کے پیشرو تھے مگر ان کی نگارشات اس موضوع پر بہت کم ہیں۔ اسلامی تعارف و طریقت پر وہ حضرت مجدد کے پرتو ثانی سے بڑھ کر عظیم مولف، جلیل القدر پیر رکھ اور وسیع تر مجدد تھے۔ ولی الہی سرمایہ تصنیف اثنا و قیاس و وسیع اور ہمہ گیر ہے کہ جس کے سامنے امامان پیش کے کارنامے بقول شکی ماند پڑ جاتے ہیں۔ (قرآنی تالیفات شاہ میں فتح الرحمن پترجمۃ القرآن، الفوائد الکبیر، فتح الخیر وغیرہ کے علاوہ حجتہ اللہ البالغہ کے مباحث قرآنی شامل ہیں۔ حدیث و سنت میں مسوی و مصطفیٰ شروح موطا (عربی و فارسی) کے ساتھ شرح تراجم ابواب صحیح البخاری اور متعدد دیگر رسالے ہیں ازالتہ الخفاء اور اس کا نقش اول قرۃ العینین فی تفصیل الشیخین، تاریخ اسلامی، تاریخ خلافت و صحابہ کے علاوہ قاسمی حدیث ہیں۔ فقہ اسلامی میں غایۃ الانصاف فی بیان اسباب الاختلاف اور عقد الجہد کے ساتھ ساتھ حجتہ اللہ البالغہ کے قسم دوم کے مباحث بھی ہیں۔ سیرت نبوی پر ان کے مختلف فصول و ابواب کے علاوہ نور العیون کا فارسی ترجمہ نور المحررون ایک یادگار اضافہ ہے۔ خاص تعارف و طریقت پر ان کے متعدد درساں و کتب اور مباحث ہیں جیسے القول الجمیل، انفس العارضین، فیوض الحرمین، اللطاف القدس، بمعات، لمعات، سطعات، ہوامع، تہنمات الہیہ، الخیر الکبیر، البدور البازغہ وغیرہ۔ حضرت شاہ کا عظیم ترین کارنامہ حجتہ اللہ البالغہ ہے جو حدیث و قرآن و طریقت کا قاسموس ہے اور دین و شریعت کی تعبیر و تشریح کا خزینہ۔ تفصیل کے لیے سنا پچھ شخصیت و حکمت کا ایک تحارف)

حضرات مجدد و شاہ کی تجدید طریقت

احسان و طریقت اور تعارف و سلوک کی تجدید و اصلاح اور تزکیہ و تطہیر میں دونوں عبرتی شخصیات کا اپنا اپنا تہا و تخصیص ہے اور ان کی بیہ سے ان کی انفرادیت و عبرتیت بھی ہے۔ اسی بیہ سے ان میں اشتراک بھی ہے اور اختلاف بھی۔ یہ اختلاف تشا و تقاضا و تقاضا کے معنی نہیں رکھتا بلکہ وہ تنوع اور رنگارنگی اور بقلمونی کے وسیع ترین معانی و جہات رکھتا ہے۔ حضرت شاہ تاریخی اور زمانی لحاظ سے حضرت مجدد کے خلف صالح تھے اور خلف صالح نے اپنے عظیم سلف سے بہت کچھ لیا تھا۔ دوسرے پیشرو صوفیہ و مولفین کی مانند حضرت شاہ نے حضرت مجدد سے بھی خوش چینی کی تھی یا ان کی تاثیر جذب کی تھی۔ وہ ان کے متعدد افکار و عقائد میں خاص اللہ تعالیٰ سبحانہ کی تجلی ذاتی اور اس کی

معرفت حاصل کرتے پر دوسرے صوفیہ کے علاوہ حضرت مجدد کے مکتوبات سے ایک خاصا طویل اقتباس نقل کرتے ہیں اور حضرت مجدد کے فارسی بیان کی عربی تفسیر اپنی تفسیم میں بیان کرتے ہیں۔ (تہنمات الہیہ ۲۲/۲۳ تفسیم ۲۳/۲۳ میں مکتوبات الشیخ احمد السہروردی کا اقتباس شیخ اکبر کے حوالے اور اپنی کتب سے بھی دیتے ہیں) ایک دوسری تفسیم میں حضرت شاہ نے متعدد مسائل تعارف سے بحث کی ہے جن میں ایمان، شرح صدر، قرب نوافل، حکمت قرب فرائض، قرب ملکوت، دورۃ الکمال کی شرح و تفسیر کرتے ہوئے اپنے مقام عالی کا ذکر کیا ہے اور بیان حکمت و تاویل احادیث کے علم کی بنا پر اپنے آپ کو نائب حضرت یوسف علیہ السلام قرار دیا ہے۔ اسی بحث میں حضرت مجدد و حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کے مقام ارباص پر فائز اور ان پر نور نبوت کے مجمل نزول و شرف کا ذکر کیا ہے۔ (۸/۲۷ مضمون وجد الشیخ احمد السہروردی و کان ادرہا صابظہور عیسیٰ علیہ السلام فالتمع علیہ نور النبوة علی اجماله) یہ اصلاً متعدد و کامر صوفیہ کے مقامات عالیہ کا بیان ہے جو حکمت کے ضمن میں آیا ہے۔ تہنمات الہیہ کی جلد دوم کی تفسیم ۲۴/۳۳ آقندری اسمعیل بن عبد اللہ رومی کے استفسار کے جواب میں شیخ اکبر کے نظریہ وحدۃ الوجود و شرح مجدد کے نظریہ وحدۃ الشہود پر حضرت شاہ کی بحث پیش کرتی ہے اور ان دونوں کی تطبیق کی سعی شاہ بیان کرتی ہے (۲۸/۲۶-۲۹/۱ تا در مکتوبات حضرت شاہ، اردو ترجمہ ۲۳۹/۲ و مابعد میں مذکور ہوا لا مکتوب مدنی کا حوالہ دیا ہے اور مختصر بحث کی ہے)۔ تا در مکتوبات میں ہی ایک میں حضرت شاہ نے خلقت کے مقامات کے بارے میں حضرت مجدد پر بعض اعتراضات و شبہات کا جواب لکھا ہے اور مکتوب ربانی ۹۴۰ کی عبارت و شرح حضرت مجدد کو پیش کیا ہے اور خود بھی تمام اشکالات کا جواب لکھ کر حضرت مجدد کا دفاع کیا ہے۔ (۳۰/۳۲ و مابعد: مکتوب ۸۴۰) حضرت شاہ نے حضرت مجدد کے افکار و نظریات کی ترمیمی تشریح اور مدافعت دوسرے مقامات پر بھی کی ہے)

قرن شاہ میں مقام مجدد

حضرت شاہ نے حضرت مجدد کے مقام خلعت اور اس کے واسطے سے مقام خلعت محمدی کی حکیمانہ شرح کی ہے۔ اس میں حضرت مجدد کے بارے میں حضرت شاہ نے جو کچھ لکھا ہے وہ یہاں نقل کرنے کے لائق ہے کہ اس سے دونوں کے مقامات کا مطلب و معنی سمجھ میں آتا ہے اور اسی کے ساتھ حضرت مجدد کے تجدیدی کارنامے اور اصلاح طریقت کی حقیقت بھی معلوم ہوتی ہے۔

”پس خلاصہ کلام یہ ہے کہ ہزار سال کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوا ہے جو بعض اعتبارات سے گزشتہ فیوض کا اجمال ہے، مثلاً قلب، روح اور سر و غیرہ کے حالات (ا حوال) نے مجمل ہو کر جمیعت ظاہر کر لی اور یہ دورہ دیگر بعض اعتبارات سے گزشتہ فیوض کی تفصیل ہے۔ مثلاً حجر

بحث (بہت اصل میں ہے) اور انانیت کبریٰ کے مسائل اس دور میں گذشتہ زمانوں کے مقابلے میں زیادہ تفصیلی ہیں۔ المختصر حضرت شیخ مجدد اس دورہ کی بنیادی شخصیت ہیں اور اس دورہ کے بہت سے خصوصی معارف ہیں جو حضرت مجدد کی زبان سے رمزاویا کے طور پر نکلے ہیں۔ شیخ مجدد اس دورہ کے قطب ارشاد ہیں اور ان کے ہاتھ پر بہت سے نیچریت اور بدعت کے جنگلوں میں جھکنے والوں نے خلاصی پائی ہے۔ تعظیم حضرت مجدد حضرت مدو راوار (اللہ تعالیٰ) اور ملکان کائنات (اللہ تعالیٰ) کی تعظیم ہے اور نعمت شیخ کا شکر ادا کرنا ان کے مفیض (اللہ تعالیٰ) کی نعمت کا شکر ادا کرنا ہے۔ یہ فقیر (ولی اللہ) ان اکثر معارف کا تصدیق کنندہ ہے جن کو حضرت شیخ مجدد نے آغاز دورہ کے زمانے میں تحریر فرمایا ہے مثلاً تو حیدر شہودی کی طرف ان کا اشارہ کرنا، اگرچہ حضرت مجدد نے اس مضمون میں رمزاویا سے تجاویز نہیں کیا اور بات کو بالکل محول کر بیان نہیں کیا ہے مثلاً معارف اجمالیہ میں علماء اہل سنت جنہوں نے معارف اجمالیہ کو تقلید انبیاء سے اخذ کیا ہے، ان علماء اہل سنت کی حقانیت کا اعتراف کرنا اور یہ فرمانا کہ ان کے معارف تحقیقات صوفیہ کے مخالف نہیں ہیں..... یہ ہے وہ کلام جو فقیر کے نزدیک حضرت مجدد کے معارف کی شرح میں متعین ہوا ہے، حضرت مجدد کی غرض و دعائیت آنحضرت ﷺ کے لیے اول امر میں بغیر توسط کے اصل خلعت کا ثابت کرنا ہے اور نبی آدم پر فیضان خلعت میں اپنے توسط کا اثبات کرنا ہے، بایں معنی کہ آنحضرت ﷺ کے توسط سے ہزار سال کے بعد لوگوں نے اس خلعت سے حصہ پایا اور اس بات سے کوئی حذر اور مضائقہ لازم نہیں آتا اس لیے اضافی فضیلتیں مثلاً آنحضرت ﷺ کا مقتدا و متبوع ہونا مخلوق کے توسط سے متحقق ہوا ہے، عجم کے فتح ہونے کے بعد.....“ (۲ در مکتوبات ۲۷۷-۳۰۸)

مقامات مجدد و شاہ

بعض محققین اور قدیم صوفیہ کا خیال ہے کہ تصوف و طریقت براہ راست مقام فنا و بقا سے وابستہ ہے اور اس مقام کے حصول کے لیے تمام صوفیہ کوشش کرتے ہیں بلکہ ان ہی کے سلسلے میں اپنی دنیا ترک کرتے اور جان کھپا دیتے ہیں۔ حضرت مجدد نے ایک مقام پر اس کا اظہار یوں کیا ہے: تصوف عبارت از فنا و بقا است۔“ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری اسی تعریف پر بس ہی نہیں کرتے بلکہ تعظیم ترین صوفیہ شیخ جنید بغدادی (م ۲۹۷ھ/۹۰۹ء) ابو بکر شبلی (م ۳۳۲ھ/۹۴۶ء) اور ابو علی جوزجانی (م تیسری/نویں صدی) سے سند لاتے ہیں (مقالہ مذکور بالا ۱۶، بحوالہ مکتوب امام ربانی ۱۳۵ اور مکتوب ۹۷، تیسری، رسالہ تفسیر ۵۵۱ و بعد، جامی، بحیات الانس ۲، نیز مجدد دین امت اور تصوف میں مقالہ حضرت مجدد پر)

بلاشبہ مقامات میں ایک مقام فنا و بقا بھی ہے مگر اس کے علاوہ دوسرے مقامات بھی ہیں

جیسے مقامات جمع، جمع الجمع، الفرق بعد الجمع اور آخر کار کلی فرق جب صوفی کو ادراک ہو جاتا ہے کہ اس کی ذات و وجود اللہ کی ذات و وجود سے بالکل الگ ہے اور وہ یہ ہوش و حواس تسلیم کر لیتا ہے کہ وہ عید ہے، محض عید، (بندہ خالص) و اللہ تعالیٰ معبود ہے اور مالک و خالق کل، اسی بنا پر حضرت مجدد نے سلوک و طریقت اور تصوف کی منہاج و مقصد مقام عیدیت کا حصول بتایا ہے۔ حضرات صوفیہ کرام نے اسی بنا پر مقام عیدیت سے دوسرے مقامات سلوک کی طرف صعود کرنے اور ان کے روحانی تجربات سے گزرنے کے بعد واپس مقام عیدیت پر لوٹ آنے کو اصل غایت قرار دیا ہے۔ ان تجارب روحانی سے صوفیہ کو مقام عیدیت کا روحانی اور ذاتی تجربہ ہو جاتا ہے (ڈاکٹر محمد عبدالحق، تصوف اور شریعت، اول و دوم، اردو ترجمہ مفتی محمد مشتاق تجاوی، دہلی ۲۰۰۱ء، ۲۰۰۵ء، بالترتیب، اول میں مولف کی تحقیقات ہیں اور دوم میں مکتوبات امام ربانی، افکار مجدد و کے اردو تراجم۔ مؤثر الذکر کی پہلی بحث: تصوف کی حقیقت میں یہی اظہار ہے بحوالہ مکتوب: ۱۳۰ اول)

دونوں حضرات مجدد و شاہ نے اپنے روحانی تجربات اور مقامات کی سیر و سلوک کے دوران اپنے مقامات کو بیچا ہوا تھا اور ان میں سے بعض مقامات سے ان کا گزر ہوا تھا جیسے حضرت مجدد کو مقام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر قائل ہونے کا تجربہ ہوا تھا۔ حضرت مجدد نے اسی طرح کے اور بعض مقامات کا ذکر فرمایا ہے، جیسے مقام خلعت یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مانند ظلیل اللہ ہونے کا، ان میں سب سے اہم ان کا مقام مجدد الف ثانی کا ہے اور وہ تجربہ کے بعد شعوری بھی ہے اور اس کو وہ اصل مقام گردانتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری نے ایک مکتوب ربانی سے دئی کیا ہے کہ حضرت مجدد دعو کو ایک ولی سے بڑھ کر ایک مجدد دیکھتے تھے جو الف ثانی (سنہ ہجری کے ہزارہ دوم) میں کار تجدید کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ (تصوف اور شریعت ۹۳/۱ نیز دوسرے صفحات)

مجدد الف ثانی کا نظریہ

حضرت مجدد بلاشبہ مجدد الف ثانی کے مقام و لقب سے معروف ہیں اور تمام علماء و مفکرین نے ان کے اس مقام کو تسلیم کیا ہے۔ مولانا محمد عبدالحق روفی نے اس کی توجیہ بھی کی ہے۔ حضرت کا مجدد الف ثانی ہونا بھی ایک بڑی چیز ہے۔ آپ سے پہلے صدی کے مجدد ہوا کرتے تھے، الف کا مجدد کوئی نہیں ہوا۔ الف ثانی کا آغاز ہی نہ ہوا تھا اور الف اول میں خود ذات اقدس و اطہر سید البشر ﷺ کی موجودگی تھی۔ آپ سے پہلے جس قدر مجدد صدیوں کے گزرے ہیں کوئی مجدد دین کے تمام شعبوں کا مجدد نہیں ہوا بلکہ خاص خاص شعبوں کے مجدد ہوتے رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی وقت میں متعدد مجدد نظر آتے ہیں۔ کوئی علم حدیث کا، کوئی فقہ کا پھر اس میں بھی کوئی حنفی فقہ کا مجدد ہے

کوئی شافعی کا، کوئی علم کلام کا مجدد وہے اور کوئی سلوک و احسان کا لیکن یہ چیز اللہ تعالیٰ نے آپ ہی کے لیے مخصوص رکھی کہ آپ دین کے تمام شعبوں کے مجدد ہیں۔ مولانا فاروقی نے مقام مجددیت پر مزید بحث کی ہے (تذکرہ مجدد الف ثانی میں شامل مضمون فاروقی بعنوان امام ربانی ۲۸۶) مجدد الف ثانی کا خیال وہی حدیث مجدد کے برخلاف ہے اور مولانا فاروقی کا حاشیہ و بیان محض بدل مداحی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ حضرت مجدد نے صوبہ شاہ اکبر کے ہزارہ دوم الف ثانی میں اسلام کی جگہ نئے دین، دین الہی کے توڑ میں رکھا تھا حضرت شیخ سرہندی بلاشبہ مجدد تھے مگر تمام دین کے شعبوں کے نہ تھے اور نہ پورے ہزارہ دوم الف ثانی کے۔ اپنے دور صدی کے مجدد تھے۔

حضرت شاہ کی مجددیت

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے لیے مقام مجدد سے شرف ہونے کی صراحت خوب کی مگر دوسروں نے انہیں مجدد نہیں مانا۔ انہوں نے بہر حال تقسیم ۱۳۰ میں اللہ کے بندوں میں سے ایک بندے کو ملت مصطفویہ کے لیے مجدد بنانے کا ذکر کیا ہے اور خود کو مراد لیا ہے۔ (۱/۳۸، ۳۷) البتہ انہوں نے اپنے لیے متعدد مقامات کا ذکر کیا ہے، جن سے اللہ تعالیٰ نے ان کو ان کے علم و حکمت اور خدمات کی بنا پر نوازا تھا۔ ان میں مقام حکمت و شرح و تاویل احادیث کے لحاظ سے نائب حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر اور ایک تنزیہ کے حوالے سے آچکا۔ دورہ ایمان کے مناصب پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کا ایک منصب مجددیت ہے اور مشہور حدیث: یبعث اللہ فی امتی بعد کل مائۃ رجلاً یجدد لہا دینہا۔ بیان کر کے مجدد کے اوصاف و شروط اور علوم کا ذکر کیا ہے اور آخر میں دورہ حکمت کے تمام ہونے پر اپنے آپ کو خلعت مجددیت سے شرف ہونے کی صراحت کی ہے: ولما تمت بسی دورۃ الحکمۃ ألبسنی اللہ سبحانہ خلعة المجددۃ (۵۴/۱) متعدد دوسری قیامت میں اور بعض دوسری نگارشات میں بھی حضرت شاہ نے اپنے لیے متعدد مقامات و مناصب کا ذکر کیا ہے، جیسے مجدد دین و وصیا، وارثین انبیاء ہوتے ہیں۔ اور یہ فقیر وحی ہے۔ (۱۱۰/۱) مجددیت اور بعض دیگر مقامات حضرت شاہ (۱/۳۳۱) اور بعد دورہ آخرہ کے مطلق و حکیم، قائد و زعیم (۱۶۹/۱)، قائم دورہ آخر الزمان، نائب رسول اکرم ﷺ، امام طریقت و سلوک، فاتح و کاشف علوم ہمشرو مجتہد، مجتہد و شارح، مستجاب الدعوات، ولی اللہ، قطب الدین وغیرہ دوسرے مقامات ہیں۔ (قیامت ۱۳۲، ۲۲، ۲۵، مثل حضرت ابن عباسؓ بوجہ فتاوت دین، ۵۹، ۶۰، ۱۱۲، ۱۳۵، ۱۷۲) اور بعد حضرت شاہ بلاشبہ مجدد وقت تھے اور ان کا عظیم ترین مجددوں میں شمار ہوا چاہیے۔ اس موضوع پر ابھی تک تحقیقی مقالہ باقی ہے۔

مقامات کا قیضان

تمام صوفیہ کرام اور بالخصوص حضرت مجدد و حضرت شاہ کا پختہ ایمان ہے کہ مقام کا قیضان عطیہ الہی ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے محروم رکھتا ہے اور متعدد صوفیہ بعض مقامات تک پہنچ کر رہ گئے جیسے شیخ حلاج (حسین بن منصور حلاج م ۳۰۹ھ/۹۲۲ء) مقام فنا و بقا یا مقام جمع میں ٹھہر گئے اور اس سے نکل نہ سکے۔ حضرت مجدد کے خیال میں حضرت ابو یزید بسطامی اپنی عظمتوں کے باوجود مقام شہود سے آگے نہیں جاسکتا اور سبحانی کی مکتبائے سے باہر قدم نہیں نکال سکے۔ اسی بنا پر ان پر سکر کا غلبہ ہوا اور وہ انا الحق کہہ بیٹھے۔ عظمت صوفیہ دراصل اسی غلبہ سکر کی بنا پر ہوتے ہیں۔ حضرت مجدد کا بیان ہے کہ فنا اور بقا کا حاصل حیرت ہے، علم نہیں۔ (تصوف اور شریعت ۱۹۲، ۲۰، ۲۵ نیز ۸۸ وغیرہ) شیخ جنید بغدادی سے لے کر حضرت شاہ تک اور بعد کے دوسرے کابر صوفیہ و علما کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ سکر پر صوفی کو قنصلیت حاصل ہے اور صوفیہ اور سالکین کا کمال یہی ہے کہ وہ سکر کے حال سے نکل کر صوفیہ کے حال میں آجائے۔ حضرت ابو بکر شبلی حضرت ابو حزر صاحب شیخ جنید بغدادی وغیرہ شروع میں صاحب سکر تھے اور بعد میں صاحب صوفی بن گئے۔ (تذکرہ باب ۱۸۲، ۱۸۳) حضرت شاہ نے اور دوسرے متقدمین صوفیہ اور علما نے بھی اصحاب صوفیہ کے مقامات عالیہ کا ذکر کیا ہے۔

اسی سے متعلق دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ بہت سے سالکوں اور صوفیوں کو کوئی مقام ہی نہیں نصیب ہوا۔ ہندوئی کہ تصوف فنا و بقا سے عبارت ہے صحیح نہیں ہے اور زیادہ سے زیادہ اسے خاص صوفیہ کے بارے میں جزوی طور سے صحیح کہا جاسکتا ہے۔ ایک تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ کسی بھی صوفی کو اپنے مقام کا علم و ادراک، اس کے کشف یا الہام جیسے ذرائع سے ہوتا ہے۔ یہ ذریعہ علم یکا نہیں ہے۔ اس میں خطا و صحت دونوں کا امکان ہے اور یہ بھی ہے کہ وہ کشف صوفی کے لیے بھی واجب نہیں، دوسروں کے لیے کیوں کر ہو سکتا ہے، حضرت مجدد تو کشف صوفی میں خطا کے امکان کا اعلان و اقرار کرتے ہیں، البتہ حضرت شاہ نے الہام و کشف کو صحیح ہی سمجھا ہے لیکن وہ بھی اس کے صوفی کے لیے واجب ہونے کے قائل نہیں، البتہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر کسی صوفی کو اپنے کشف و الہام پر یقین تام ہو تو اسے اس پر ضرور یقین کرنا اور عمل کرنا چاہیے۔ (حضرات مجدد و شاہ کے روحانی تجربات اور مختلف مقامات پر ملاحظہ ہو لکھنؤ مکتبہ ام ربانی، تصوف اور شریعت ۳۲۱-۳۲۷) اور بعد

حضرت مجدد نے بالآخر مقام عہدیت پر اپنے فائز ہونے کو عنایت الہی کہا ہے اور اس سے قبل کے تمام مقامات خلعت، و جہود وغیرہ کو تغزل قرار دیا ہے حضرت مجدد کے مقامات سے متعلق بیانات ان کے ذاتی تجربات پر زیادہ مبنی ہیں جب کہ حضرت شاہ کے بیانات تحقیقی و علمی ہیں۔

(حضرت شاہ، حجة الله البالغة ۲/۸۸-۱۰۱ باب المقامات والاحوال، اعلم ان للاحسان ثمرات تحصل بعد حصوله وهي المقامات والاحوال، ان دونوں کا تعلق عقل سے ہے جسے یقین کہا جاتا ہے۔ اور یقین سے توحید، اخلاص، توکل، شکر، انس، صدقیت، محرمیت وغیرہ جنم لیتے ہیں۔ ان کی تفصیل و تشریح کے بعد قلب سے متعلق مقامات میں جمع اول ہے، پھر شہید و خواری ہیں جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہیں۔ دوسرے مقامات کا ذکر کرنے کے بعد صراحت کی ہے کہ وہ سب عنایت الہی سے ہی عطا ہوتے ہیں۔)

علم کے ذرائع شریعت و طریقت

تمام علما، محققین، صوفیہ اور سلاکین کا یہ پختہ عقیدہ اور معروف نظریہ ہے کہ علم کے دو ذرائع ہیں: ایک وحی کا ذریعہ جو انبیاء کرام کے ساتھ خاص ہے اور بالکل یقینی ہے، ذرا بھی مشکوک نہیں کہ قطعی الثبوت ہے۔ وہ انبیاء کرام اور وحی کے حاملین عالمی مقام کے لیے بھی اسی طرح واجب العمل ہے جس طرح ان کی امتوں کے لیے۔ حضرت مجدد اور حضرت شاہ دونوں نے اور دوسرے تمام کابر صوفیہ نے بھی صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ تمام غیبی حقائق جیسے ذات و صفات الہی، ملائکہ و ملائع اعلیٰ و اسفل، جنات و شیاطین، جنت و دوزخ اور دوسرے عالم ملکوت کے حقائق کا قطعی علم صرف وحی رسول اللہ ﷺ سے ملتا ہے جس میں خطا کا کوئی امکان نہیں جبکہ صوفیہ کے کشف والہام اور وجدان و تجربہ کے ذریعہ حاصل ہونے والا علم اتنا قطعی نہیں بلکہ غلطی ہے اور اس میں خطا کے امکانات بھی موجود ہیں، غلطی اور خطا کا امکان کشف و وجدان اور الہام میں بھی ہے اور اس کی تعمیر و تنہیم میں بھی۔

دوسرا پہلو یہ بھی اہم ہے کہ ایک حقیقت غیبی کے بارے میں دو سے زیادہ صوفیہ کے کشف والہام اور وجدان مختلف ہو سکتے ہیں بلکہ ہوتے ہیں اور وہ متضاد بھی ہو سکتے ہیں۔ حضرت مجدد نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ عقائد اور غیبی امور و حقائق کے بارے میں اہل سنت کے علما و فقہاء اور مشنکلمین وحی رسالت کی کسی تعبیر و تشریح پر متفق ہوں تو تمام صوفیہ کا کشف و وجدان نہ اس کی تردید کر سکتا ہے اور نہ ہی اس کا بدل بن سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ حضرت مجدد اور حضرت شاہ نے یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ کشف و وجدان صوفی کو وحی رسالت یا دوسرے الفاظ میں دین و شریعت کی میزان میں پرکھا جائے گا۔ ان کے مطابق ہوگا تو صحیح ہوگا، ورنہ صحت و صواب کے دائرے سے خارج، حضرت مجدد نے علوم شرعیہ سے ان کے سر مو تیاؤز کرنے کو سکر کہا ہے اور وہ غلبہ حال ہے اور معیار نہیں بلکہ وہ الحی و زندیقہ ہے۔ حضرت مجدد کے ہمنوا اور ہم خیال حضرت شاہ بھی ہیں اور کشف و وجدان صوفی کو یہی نہیں تمام ذرائع علم طریقت و تصوف کو صرف علوم شریعت و دین کے ماتحت قرار

دیتے ہیں، البتہ وہ بعض نئی تشریحات بھی کرتے ہیں (مکتوبات امام ربانی ۱۰۰۷: مکتوب ۳۱-۱/۱۰۰۷: مکتوب ۱۲۷: ۱۲ وغیرہ، تصوف اور شریعت ۹۱/۱ و بالبعد نیز جلد دوم حضرت شاہ حجة الله البالغہ اور ۵۸-۵۹: بحث المعاد، تصوف اور شریعت مذکورہ بالا میں حضرت شاہ کے افکار سے موازنہ)

حقائق غیبی اور عقائد ہی کے باب میں نہیں احکام و اعمال شریعت و دین کے باب میں دونوں عبرتی صوفیہ اور امامان عقیدہ رکھتے اور اس کا اعلان کرتے ہیں کہ احکام شرعیہ کے تعین و استنباط اور ان پر عمل و اطلاق کے باب میں صرف وحی رسالت ہی قطعی اور ناگزیر ذریعہ علم ہے اور وجدان اور الہام و کشف صوفیہ کا اس میں کوئی کردار نہیں۔ ارکان اسلام اور دوسرے منصوص اعمال شریعت کا تعین صرف رسول اکرم ﷺ اپنی وحی کے ذریعہ سے کرتے ہیں اور وہ صاحب وحی ﷺ سمیت سب کے لیے واجب و لازم ہیں، کسی چیز کے حلال و حرام، مسنون و منسوب، مکروہ و مباح ہونے کا فیصلہ وجدان والہام صوفیہ نہیں کر سکتے، اسی بنا پر حضرت مجدد اور حضرت شاہ دونوں نے وضاحت کی ہے کہ ارباب ولایت خاصہ یعنی صوفیہ کرام اور عام مومن و مسلمان نہ صرف وحی رسالت کے پابند ہیں بلکہ وہ مجتہدوں کی تقلید کے لیے بھی مجبور ہیں اور اس باب تقلید و تقل میں اصحاب ولایت اور عام اہل ایمان برائے ہر مقلد مقتدی اور تابع کا درجہ رکھتے ہیں۔ حضرت مجدد و حضرت شاہ نے عقائد و اعمال شریعت اور دوسرے واضح احکام وحی و اجتہاد کے دائرے سے باہر عرف ان امور و معاملات میں کشف و وجدان اور الہام کی عمل داری مانی ہے جن میں شریعت و دین کے واضح احکام نہیں ملتے۔ حضرت شاہ نے حجة الله البالغہ میں بالخصوص اور دوسری تصانیف میں بالعموم ان تمام ذرائع علم سے بحث کی ہے اور قطعی علوم کے ذرائع وحی رسالت و جماع مجتہدین و علما و غلطی علوم کے ذرائع کشف والہام اور وجدان سے بحث کی ہے۔ (مکتوبات امام ربانی ۱۰۲۶: مکتوب ۵۵: الہام مثبت حل و حرمت نبوی و کشف ارباب باطن اثبات فرض و سنت نہ نماید، ارباب ولایت خاصہ با عامہ مومنات و تقلید مجتہدان برائے ہر مقلد، بیعات، ۱۸۳-۱۸۹ و بالبعد، سلوک الی اللہ کی دو قسمیں ہیں: (۱) شرعی احکام و اوامر کی پابندی پر اس کا انحصار ہے، علما، انبیاء کرام کے وارث اور تبلیغ و دعوت الی اللہ کے پابند ہیں اور غفلت و کوتاہی کرنے پر قابل مواخذہ، سلوک الی اللہ کی یہی وہ قسم ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں اور رسول اللہ ﷺ کی سنت میں بڑی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسری قسم عالی مزاج اور عالی طبیعتیں اپنی افتاد و فطرت سے اسے حاصل کر لیتے ہیں اور ان کا اللہ تعالیٰ خود متکفل ہوتا ہے فیوض الحرمین اردو ۱۶۹ میں قرب الہی کے دو طریقوں طریقہ نبوت اور طریقہ طریقت پر بحث کی ہے جو ہر معاشی کی مانند ہے۔ التہذیبات الالہیہ: ۲/۲: لان الطرق الموصلة الى الله سبحانه على قسمين: قسم اثباته الوحی او

معارف الانبياء وقسم اثنته معارف الاولياء، كل ما اوحاه الله سبحانه من الطاعات فانها من جنس الغرض وكلها الهم الله سبحانه اوليائه من الطرق الموصله فانه نفل اى ليس من جنس الغرض وزیادة.

طریق نبوت اور طریق ولایت

محققین صوفیہ کی مانند حضرت مجدد اور حضرت شاہ نے سیر الی اللہ یا سلوک کے دو طریقے بتائے ہیں۔ متعدد صوفیہ نے سلوک و تصوف اور طریقت کے مقصود و مہمہا کے بارے میں مختلف تعبیرات اختیار کی ہیں، وہ اصلاً تو تقرب الی اللہ ہے لیکن اس کو بیان میں نئی نئی اشکال دی گئی ہیں۔ صوفیہ کی ساری تنگ و دو اور جدوجہد اور اس کا مقصود یہ ہے کہ وہ حقائق غیبیہ کی غایت جان کر معرفت حق حاصل کر لے اور اسی کے ذریعہ تقرب پالے۔ دوسری تعبیر یہ ہے کہ سلوک کی آخری انتہا یہ ہے کہ تو حیدر الہی کا حصول ہی نہیں، اس کی معرفت و حقیقت جان لے، ذات واجب الوجود اور ذات واحد میں فنا و استغراق بلکہ اپنی ذات میں فنا اور ذات واحد میں بقا اس کا مقصود ہے۔ حضرت مجدد اور حضرت شاہ دونوں نے ان مقامات کو تسلیم کیا ہے اور سلوک کے منہا و مقصود کو بھی، لیکن یہ بھی کہا ہے کہ یہ سب عارضی اور گزران کے مقامات ہیں۔ حضرت مجدد نے وضاحت کی ہے کہ طریق ولایت کی غایت صرف عبودیت کا حصول و ایقان اور اس کی تکمیل و تجربہ ہے۔ یہی مقصود طریق نبوت کا بھی ہے کہ بندے اپنے آپ کو عبد اور اپنے مالک و خالق اور ذات واحد کو معبود والہ مان لیں اور اسی پر ایقان و ایمان رکھیں۔ ایمان و اعمال کی منزلوں سے یہ بچتے ہو جاتا ہے۔

بلاشبہ طریق ولایت کے سالکوں کو فنا و بقا اور جمع و اتحاد اور فرقی بعد الجمع وغیرہ کی منزلوں سے گزر کر تجربیات کر کے مقام عبودیت کا مقصود پا سہ لگتا ہے جب کہ طریق نبوت پر عمل کرنے والوں کو یہ روحانی تجربات نہیں ہوتے اور ان منزلوں سے نہیں گزرتا پڑا۔ طریق ولایت کے سالکین جب اپنی آخری منزل عبودیت پر پہنچتے ہیں تو ان کو اپنے اس علم پر تجربات سے یقین آ جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ وراہ اورا ہے اور اس کی ذات و صفات کسی میں بھی مخلوق یا صوفی شریک نہیں۔ انھیں اپنی بندگی، عبودیت کی اصالت و حقیقت کا اور اک ہو جاتا ہے اور وہ تمام اتحاد و وحدت کے بخود سے تائب ہو جاتے ہیں (مذکورہ بالا مباحث حجۃ اللہ الباقیہ، تعلیمات و معارف و فیوض، الحرمین اور کتابت امام ربانی، تصوف اور شریعت کے مختلف ابواب مذکورہ بالا)۔

حضرت شاہ نے طریق ولایت اور طریق نبوت پر اور ان کے فرق و صواب پر مختلف کتابوں میں بحث کی ہے۔ حضرت شاہ نے اس کے لیے سعادتین (دوسو باتوں) کے حصول کے دو طریقوں کا ذکر بھی کیا ہے حجۃ اللہ الباقیہ میں اس حصول سعادت پر پورا ایک باب ہے۔ بحث

السعادة جس میں متعدد مباحث ہیں اور بڑے قیمتی ہیں۔ حقیقی سعادت یہ ہے کہ انسان کی بکھی طاقت اس کے نفس مطلق کی پیروی ہو جائے اور خواہش عقل کے تابع ہو۔ یعنی ہمیشہ پر سکوتیہ کا غلبہ ہو جائے، سعادت حقیقی کے حصول میں افراد و طبقات بنی نوع انسانی مختلف درجات کے ہوتے ہیں، تکمیل سعادت صرف عبادات کے ذریعہ حاصل ہوتی ہے۔ ان کے حصول کے دو ذریعہ ہیں ایک اصلاح ارتقا قات سے ہوتی ہے جو امور دنیا سے متعلق ہے اور آخرت کی سعادت کے لیے اصلاح نفس ضروری ہے۔

دوسرا طریقہ ”ائمہ مشہور“ کا ہے جو ریاست دین و دنیا کے امام ہیں اور اصحاب الہدیین ہیں۔ اس ساری تفصیل و بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ طریق نبوت سے ہی یہ سعادت ملتی ہے اور وہ یقینی ہے اور دوسرا طریقہ صوفیہ اور ولایت کا طریقہ ہے جس میں حصول سعادت ممکن ہے لیکن وہ خطرات سے بھی پر ہے فیوض الحرمین میں طریق نبوت و طریق ولایت پر بحث کر کے بتاتے ہیں کہ رسول اکرم ﷺ کی ذات و الامتات طریق نبوت کا عنوان تھی اور اللہ تعالیٰ نے دوسرے انبیاء کرام سے زیادہ آپ ﷺ کو اپنی خاص عنایات کا مرکز بنایا تا کہ آپ ﷺ کے ذریعہ تقرب الہی کا فیض عام اور یقینی ہو جب کہ حضرت شاہ کو اپنے کشف و علم دونوں سے معلوم ہوا کہ دوسرا طریق ولایت اگر چہ صحیح ہے تاہم وہ رسول اکرم ﷺ کے نزدیک نہ عالی مرتبہ ہے اور نہ پسندیدہ۔ ظاہر ہے کہ نفی طریق کے مقابل قطعی طریق ہی بہتر ہوگا۔ بمعارف میں حضرت شاہ نے سلوک الی اللہ کی دو قسمیں کی ہیں اول شرعی احکام و اوامر کی پابندی کرنے پر اس کا انحصار ہے علما انبیاء کرام کے وارثین ہیں اور قرآن مجید و حدیث و سنت اور تشریحات علما میں اس طریق کی وضاحت کی گئی ہے دوم عالی مزاج و طبیعت افراد اپنی افتاد و فطرت سے حاصل کر لیتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کا خود متکفل اور والی و کاسر از بن جاتا ہے۔ (حجۃ اللہ الباقیہ ارہ ۵۵-۵۶) و بالبعد فیوض الحرمین مذکورہ بالا۔ بمعارف اردو ترجمہ ۱۸۳-۱۹۳ اس بحث میں صدیقین سابقین اولین شہداء را تلمیذین مطہرین و صالحین وغیرہ کی تقسیمات اصحاب یمین کے بنیادی طبقہ کی ہیں جو قرآنی اصطلاح ہے اور طریق نبوت وحی سے ثابت ہے۔ دوسری تقسیم طبقہ اولیاء اللہ کا ہے اور ان کے طبقات ہیں۔ یہ کامل طبقات ہیں ان کے علاوہ دوسرے دو طبقات ناقص نفوس والوں کے ہیں۔)

حضرت شاہ کا نظریہ الوان تصوف

اکابر محققین صوفیہ میں حضرت شاہ واحد و منفرد تھا حسب نظر ہیں جنہوں نے تصوف کے چار رنگ کا نظریہ پیش کیا ہے انہوں نے دوسرے متعدد تذکرہ نگار اور مورخ صاحبان طریقت کی طرح تصوف و طریقت کی اجمالی تاریخ اور ان کے سلاسل کی تہذیب بھی لکھی، مشہور و مقبول

سلسلوں اور ان کے اکابر کے اعمال و اشغال طریقت کا فرق بتایا اور ان کے مشترک نکات و اقتدار اجاگر کیے چہا رنگہائے تصوف کا نظریہ شاہ ان سب پر مستزاد ہے جو پوری تاریخ و تہذیب طریقت کے امتیازات بتاتا ہے۔ اسے حضرت شاہ نے مختلف ناموں سے پکارا ہے۔ وہ دورات طریقت بھی ہیں اور ادوار تصوف بھی اور الوان طریقت بھی، وہ رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کے عہد میں اور عہد شریعت سے شروع ہو کر شیخ اکبر کے نظریہ و رنگ تصوف پر تمام ہوتے ہیں۔ ان میں اولین رنگ دورہ اور لون طریقت عہد نبوی و دور صحابہ اور ان کے عظیم جانشینوں اور پیروؤں کے درمیان رنگ جھانکا رہا۔ حضرت شاہ نے اسے لون و رنگ تصوف ضرور کہا ہے مگر اصلاً وہ دورہ شریعت اور رنگ دین اور لون اسلام ہے۔ سماعت میں اس کا اور دوسرا لون طریقت کا مفصل ذکر کیا ہے۔ اولین رنگ کا بیان حضرت شاہ یہ ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے صحابہ کرام کے زمانے میں اور بعد کی چند نسلوں تک اہل کمال کی بیشتر توجہ شریعت کے ظاہری اعمال کی طرف رہی۔ ان لوگوں کو باطنی زندگی اور روحانی ارتقاء کے جملہ مراتب شرعی احکام کی پابندی کے ذیل میں ہی مل جاتے تھے چنانچہ ان بزرگوں کا احسان یہ تھا۔ (یعنی حاصل تصوف یہ تھا) کہ وہ نمازیں پڑھتے تھے۔ ذکر و تلاوت کرتے تھے روزے رکھتے تھے حج کرتے تھے صدقہ اور زکوٰۃ دیتے تھے اور چہا ذکر کرتے تھے ان میں سے کوئی شخص ایسا نہ تھا جو سر نیچے کیے، غرغری میں غرق نظر آتا، یہ بزرگ اللہ تعالیٰ سے قرب و حضوری کی نسبت اعمال شریعت اور ذکر و کار کے سوا اور کسی ذریعہ سے حاصل کرنے کی سعی نہ کرتے تھے۔ بے شک ان اہل کمال بزرگوں میں سے جو محقق ہوتے ہیں ان کو ذکر و کار اور نماز میں لذت ملتی قرآن مجید کی تلاوت سے متاثر ہوتے، اسی طرح شریعت کے دوسرے احکام بجالاتے، ان شرعی احکام کی بجا آوری سے ان کے باطنی تقاضوں کی تسکین بھی ہوتی تھی۔ ان میں سے کوئی شخص نہ بیہوش ہوتا نہ اسے وجد آتا، نہ وہ جوش میں آکر کپڑے پھاڑتا، نہ شطح یعنی خلاف شرع کوئی لفظ زبان سے نکالتا، یہ بزرگ تجلیات استتار اور تصوف کے دوسرے مسائل پر مطلق گفتگو نہ کرتے تھے، کشف و کرامات ان سے بہت غم ظاہر ہوئے اور سرمستی اور بے خودی کی کیفیت بھی شاذ و نادر ہی ان پر طاری ہوتی، اور اگر کبھی کبھی یہ باتیں ان سے صادر بھی ہوتیں تو قصداً نہیں بلکہ محض اتفاق سے ایسا ہوتا۔ بات یہ ہے کہ وہ نفسی کیفیات جن کا نتیجہ کرامات، خوارق اور سرمستی و بے خودی کی قبیل کی چیزیں ہوتی ہیں ان بزرگوں کے اندر اتنی راسخ نہ ہوتی تھیں کہ وہ ملکہ بن جاتیں۔ یہ چیزیں ایسی نہ ہوتیں کہ عوام کی رسائی ان تک نہ ہو سکتی۔ قصہ مختصر اس دور میں جسے تصوف و احسان کا پہلا دور کہنا چاہیے اہل کمال کا غالب طور پر یہی حال رہا۔

(سماعت اردو ترجمہ محمد سرور، سندھ ساگر اکیڈمی لاہور ۱۹۹۹ء، مکتبہ رحمانیہ یونیورسٹی، ۱۹۶۹ء)

۷۰۔ ۷۱۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری، مذکورہ بالا، ۵۹-۶۰ کا ترجمہ مختلف ہے۔ مقالہ خاکسار تصوف و طریقت کے چہا رنگ کا نظریہ شاہ ولی اللہ عیش کردہ تصوف پر سیمینار، شعبہ ہندی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، مارچ ۲۰۱۰ء)

حضرت شاہ نے اس بیان میں بعد کی صوفیانہ اصطلاحات خوب استعمال کی ہیں اور اسے تصوف بھی کہا ہے لیکن یہ واضح ہے کہ وہ قرآنی وحدانی احسان تھا اور بعد کے رنگ ہائے تصوف و طریقت سے اس کا ذرا بھی تعلق نہیں تھا، ارتباط و تعلق تھا بھی تو وہ عرف دین و شریعت کی بالادستی برتری اور ہمہ گیری اور وجوب و مرغیت کا کہ جس کے بغیر نہ ظاہری ایمان و اسلام ہے اور نہ باطنی رنگ و طریقت شریعت دین ہی اس دور میں سب کچھ تھے اور اسی سے باطنی و روحانی ارتقاء ملتا تھا۔ حضرت شاہ نے اسی وجہ سے اسے ایک مقام پر پیشین دورہ شریعت قرار دیا ہے جو عوام و خواص دونوں کے لیے تھا۔

دوسرے ادوار بالترتیب ۲۔ حضرت جنید بغدادی یا ان کے حصارا پیشتر زمانے سے، ۳۔ حضرت ابو الحسن خرقانی و ابو سعید ابوالخیر کے عہد سے اور ۴۔ حضرت شاہ نے تمام اکابر صوفیہ اور سارے سلسلے تصوف کو طریقت جنید یا کا پابند قبیح اور پیرو کا قرار دیا ہے دوسرا دور دورہ و رنگ تصوف یا ضات شاذ کا ہے تیسرا جذب توجہ و فکر و مراقبہ اور جو تھا حق غیبیہ کی تلاش یا وحدۃ الوجود کا۔

حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان ادوار، دورات اور رنگ ہائے تصوف کی تقسیم و تعریف سے خاص امتیاز حاصل کیا جو دوسرے اکابر اور بالخصوص حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں بھی نہیں ہے۔ سو مقرر الذکر کا سارا تصوف و طریقت خواص و اہل کمال کا ہے۔ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے اولین دورہ شریعت کے ذریعہ عوام و خواص دونوں کو طریقت اور باطنی طہارت کے حصول کا طریقہ بتایا ہے۔ ان کا یہ بیان ہر دور دورہ کے آغاز میں آتا ہے کہ عام مسلمان اور عام اہل کمال تو صرف اولین رنگ شریعت پر ٹھہر رہے اور دوسرے علی یا اہل کمال نے دوسرا تیسرا چوتھا رنگ اختیار کیا جو ان کی رنگ طبیعت سے میل کھلیا اور ان کے دل کو بھانپا گیا۔ ان دورات تصوف کا تینا دی نکتہ یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے دور کے بعد دوسرے ادوار و دورات میں بھی جاری رہے اور اس طرح دورہ شریعت یا اولین رنگ طریقت ہمیشہ برقرار رہا اور وہی تمام اہل ایمان کا وظیفہ حیات اور طریقہ روحانیت بھی رہا۔

بہر حال حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے تصوف و طریقت کے نہ صرف امتیازات کو واضح کیا بلکہ عملی و فکری تصوف کے بنیادی اقدام پیش کیا۔ ان کا یہ امتیاز بے مثال بھی ہے اور صحیح اسلامی طریقت کا بیان بھی اور اس باب میں وہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے بھی ایک مقام آگے ہیں۔

(مترجم معات محمد سرور اور ڈاکٹر محمد عبدالحق وغیرہ متعدد اہل قلم کو حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے بیان دورہ اولین سے یہ غلطی لگی کہ حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ صحابہ کرام کے دور میں بھی تصوف کا اثبات کر رہے ہیں۔ یہ ایک عام غلط فہمی بھی ہے، حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے متعدد دیباچات میں صراحت کی ہے کہ تصوف بعد کا ارتقاء ہے)

اصلاً تصوف و طریقت کے دو دنیاوی خانے ہیں اور ان دونوں کو بالعموم خلط ملط کر دیا جاتا ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے۔

ایک خاص عملی تصوف ہے جس کی بنیادی تعلیمات یا اعمال و اشغال کتاب وسنت سے ماخوذ ہیں اور بعض تجرباتی صوفیہ پر مبنی ہیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے علاوہ دوسرے تمام اکابر صوفیہ کا فیصلہ ہے کہ جو تجرباتی صوفیہ اور اعمالی طریقت کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہیں ان کو قبول کرنے اور ان پر عمل کرنے اور ان کی ترویج و اشاعت کرنے میں کوئی قباحت ہے اور نہ وقت۔ اور جو اعمال تصوف اور تجرباتی صوفیہ خلاف شریعت و دین ہیں وہ قطعی مردود ہیں اور ان کو خیالی و عملی دونوں سے خارج کر دینا چاہیے۔ دوسرا خانہ تصوف خالص فلسفیانہ ہے جو حقائق غیبیہ کا پتہ لگانا چاہتا ہے۔ وہ فلسفیانہ افکار کی بنا پر تصوف میں درآیا ہے، حضرات مجدد علیہ الرحمہ و شاہ علیہ الرحمہ ہی نہیں بہت سے محققین صوفیہ اور اکابر علماء اس رنگ تصوف کے نہ صرف عاشق ہیں بلکہ اسی میں رنگ گئے ہیں۔ مکتوبات امام ربانی علیہ الرحمہ اور حضرت شاہ علیہ الرحمہ کی کتب و رسائل تصوف ان فلسفیانہ افکار و مباحث سے بھرے پڑے ہیں۔ اور ان میں مقامات کی بحث، ذات الہی اور اس کی صفات پر فکر اور وحدۃ الوجود اور وحدۃ الشہود کے نظریات اہم ترین ہیں۔ (سید عروج احمد قادری، تصوف سرہندی کا مطالعہ، مرتبہ محمد رضی الاسلام ندوی، مشمول فکر اسلام کے فروغ میں.... ۱۲۶-۱۲۷)

وحدۃ الوجود و وحدۃ الشہود

بالعموم شیخ اکبر ابن عربی کو اس نظریہ وحدۃ الوجود کا بانی مہائی کہا جاتا ہے حالانکہ پہلے سے موجود تھا۔ شیخ اکبر علیہ الرحمہ کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے وحدۃ الوجود کے نظریہ و فلسفہ کو اپنی کتابوں مفتوحات مکیہ و روضہ الحکم میں زیادہ روشنی کی اور اس کی تفصیل و تشریح کر کے اس کے تمام اجزا و مبادی کو اس طرح مرتب کر دیا کہ وہ ایک مستقل فلسفہ بن گیا۔ حضرت شاہ علیہ رحمۃ اللہ نے اس بنا پر جو تھے رنگ تصوف کے آغاز و ارتقاء کا سہرا ان کے سر باندھا ہے اور حضرت مجدد بھی اسی کے قائل ہیں۔ معات اور بعض دوسری نگارشات میں حضرت شاہ علیہ رحمۃ اللہ نے وحدۃ الوجود کی مختصر اور سمجھ میں آنے والی تشریح کی ہے جو یہ ہے: اللہ کی ذات واجب الوجود ہے۔ یہ محسوس کائنات جو ظہور پذیر

ہوئی اس کو سمجھانے کے لیے اہل طریقت نے پانچ تزیلات مانے ہیں: ۱۔ ایک ذات احد کا درجہ ہے۔ ۲۔ اس سے دوسرا تزل و حدانیت میں ہوا۔ ۳۔ تیسرا تزل ارواح کا ہے۔ ۴۔ چوتھا عالم مثال اور ۵۔ پانچواں تزل عالم اجسام کا..... مسئلہ وحدۃ الوجود میں اس عقدے کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وجود کے یہ مختلف مراتب حقیقتاً ایک وحدت ہیں یا محض دیکھنے میں ایک نظر آتے ہیں۔ ظاہر ہے تزیلات خمسہ اور وحدۃ الوجود کے یہ معاملات بے حد نزک اور دقیق ہیں اس لیے سالک کو ابتدائے سلوک میں ان سے بچنا لازمی ہے۔ حضرت شاہ علیہ رحمۃ اللہ نے اس سے وابستہ دوسرے مسائل تصوف جیسے توحید و جود، توحید شہودی، توحید انفعالی اور توحید صفاتی، بقول ڈاکٹر انصاری تصوف کی کتابوں میں لفظ توحید چار معنوں میں استعمال ہوا ہے: اول اللہ کی وحدانیت، دوم خارجی و داخلی تعمیر، ذات الہی کے ساتھ جمع و اتحاد اور مکار شفات و تجربات کی حقیقت کی فلسفیانہ تشکیل وغیرہ پر بحث کی ہے اور فلاسفہ کے نظریہ وحدت و جود سے اختلاف کر کے اہل طریقت کے فلسفہ وحدۃ الوجود کے مبادی بتائے ہیں۔ حضرت شاہ علیہ رحمۃ اللہ اور ان کے والد ماجد شیخ عبدالرحیم علیہ الرحمہ اور متعدد پیش رو صوفیہ و محقق نظریہ وحدۃ الوجود کے قائل ہیں اور اسے برحق مانتے ہیں۔ جس طرح بعد کے متعدد علماء اسلام اور محققین صوفیہ نے اس کو اسلامی یا صوفی نظریہ سمجھا ہے اور اس کی تخریجات کی ہیں مولانا عبدالسلام خاں کا مختصر بیان یہ ہے کہ ابن عربی کے نزدیک واقع میں عرف ذات باری کا وجود اصلی اور ذاتی ہے۔ اس کے علاوہ کسی چیز کی ہستی اصلی اور ذاتی نہیں، باقی تمام چیزیں اس معنی میں موجود ہیں کہ وہ ذات باری کے آثار اور پرتو ہیں، ذات باری سے علیحدہ ان کی اپنی کوئی ہستی نہیں۔ (معات، ۵۲، ۵۶، ۷۸، ۸۹، ۱۱۸، ۱۲۰، ۱۳۱ وغیرہ۔)

مولانا عبدالسلام خاں، ابن عربی کا نظریہ وحدۃ الوجود و نقوش قرآن نمبر ۴- لاہور ۲۷-۲۸-۲۹-۳۰ اس کے علاوہ متعدد دوسرے مقالات بھی ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری، تصوف اور شریعت ۱۳۳۱-۱۳۳۲ و ما بعد یاب چہارم وحدۃ الشہود پر ہے: ابن سبعین (م ۶۷۹/۱۲۸۰) عبدالکریم جلی (م ۶۷۹/۱۲۸۰) وغیرہ نے وحدۃ الوجود پر اپنے نظریات پیش کیے۔ پھر ابن عربی کا نظریہ وحدۃ الوجود پیش کیا ہے۔ اور اس کے بعد اس پر حضرت مجدد علیہ رحمۃ اللہ نقد لکھا ہے۔ حضرت مجدد علیہ رحمۃ اللہ کا نظریہ مکتوبات میں مختلف مقامات پر ہے: ۱۰۹/۶۵، ۲۹۹/۳۳۲، ۳۸۷ وغیرہ ۳/۸۲۵، ۸۵۳ وغیرہ۔

شیخ مجدد علیہ رحمۃ اللہ کو وحدۃ الوجود کے بعض اقدار و جہات سے اختلاف تھا لہذا انھوں نے اپنا نظریہ وحدۃ الشہود پیش کیا۔ جس طرح حضرت شیخ اکبر علیہ رحمۃ اللہ نے وحدۃ الوجود پر امام ابن تیمیہ اور اشعری عالم امام سعد الدین قنطرازی (م ۹۳۱/۱۳۹۱) اور عظیم صوفی شیخ علاء الدولہ سمنانی

(۱۳۶۶/۷۷۶) نے اس پر نقد شدید کر کے اس کو مسترد کر دیا تھا۔ تاہم بہت سے صوفیاء اور علما نے وحدۃ الوجود پر ان تنقیدات کے باوجود اسے قبول کیا اور اس کی شروح و تفسیرات لکھیں۔ شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ کا نظریہ وحدۃ الشہود بھی خالص نیا نظریہ نہیں ہے۔ اس کے مباحث پہلے بھی رہے ہیں، حضرت مجدد علیہ رحمۃ نے اس کو مرتب کر دیا ہے۔ حضرت مجدد علیہ رحمۃ کی تنقیدوں اور کتبہ چینلوں کو نقل کرنے کا یہاں موقع نہیں، صرف بنیادی فرق بیان کرنا کافی ہوگا کہ وہ کچھ میں آسکے۔ پانچ تنقیدات ہیں: ۱- اسلامی تصور توحید کے منافی ہے۔ ۲- اسلام کے متعدد اصولوں سے متصادم ہے کہ یہ نظریہ کائنات کو اللہ کا عین قرار دیتا ہے۔ ۳- وہ موضوعی (Subjective) ہے۔ ۴- تاریخ تصوف میں نئی چیز ہے۔ ۵- ختمائے حصول کے لیے وحدۃ الوجود کی قطعاً ضرورت نہیں ان کے خیال میں اللہ کا وجود ہے اور وہ ایک ہی وجود ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ صحیح اور حقیقی معنوں میں اصلگی ایک ہے اور وہ اللہ ہے اور یہ کائنات جو اللہ سے الگ وجود رکھتی ہے اس کا کوئی اصلگی وجود نہیں، یہ شخص ظنی وجود ہے۔ یعنی کائنات اللہ سے الگ ہے جبکہ وحدۃ الوجود میں اسے اللہ کا عین بھی بعض اعتبارات سے سمجھا جاتا ہے حضرت مجدد نے ظنی وجود پر مفصل بحث کی ہے۔ اس کے متعدد شارحین میں ہمارے معاصر اہل قلم ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری ہیں جن کے مضامین اور کتابوں میں اس کی تفصیل ملتی ہے ان کا اور ان کے دوسرے ممواؤں کا خیال ہے کہ حضرت مجدد کا نظریہ وحدۃ الشہود زیادہ صحیح بھی اور اسلامی بھی اور عقلی بھی ہے۔ حضرت شاہ نے اپنے مکتوب مدنی میں اس پر بحث کر کے دونوں نظریات میں تطبیق دی ہے وہ بحث بھی کافی فلسفیانہ اور دقیق ہے اس کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ نظریہ وحدۃ الوجود اور نظریہ وحدۃ الشہود میں صرف لفظی فرق و نزاع ہے ورنہ دونوں ایک ہے۔ معاصرین حضرت شاہ میں سے حضرت مرزا مظہر جان جاناں (م ۱۱۹۵ھ/۱۸۰۶ء) اور ان کے مرید شاہ غلام یحییٰ (م ۱۱۹۰ھ/۱۷۷۶ء) نے حضرت شاہ پر نقد کیا ہے، دوسرے مآثرین حضرت شاہ بالخصوص ڈاکٹر موصوف نے حضرت شاہ پر غیر اسلامی افکار کو ترویج دینے کا مجرم قرار دیا ہے کہ ان کے سبب حضرت مجدد کے صحیح ترین اسلامی نظریہ میں پھر غیر اسلامی خس و خاشاک شامل ہو گیا اور اذہان کو خراب کر گیا، حقیقت یہ ہے کہ نظریہ وحدۃ الوجود ہو یا وحدۃ الشہود دونوں اسی وقت تک اسلامی اور صحیح ہیں جب تک وہ اللہ کی ذات کو براہ الہواء سمجھتے ہیں اور اس کے وجود کو اصلی و ذاتی اور کائنات کو موموجود مانتے ہیں جو ذات الہی سے الگ ہے اور اس پر منحصر ہے کہ وہ قیوم ہے (ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری، مقالہ شیخ احمد سرہندی کا نظریہ وحدۃ الشہود، قرآن نمبر نقوش ۲۵: ۱-۲۹۹ء نیز کتاب مذکورہ بالا مکتوب مدنی / تہذیبات الہیہ: تقسیم: ۳۳، مذکورہ بالا مکتوب مدنی اربو ترجمہ سید عروج احمد قادری و مذکورہ بالا میں مکتوبات امام ربانی اور نظریہ وحدۃ الشہود دونوں پر نقد ہے کہ وہ خالص فلسفیانہ مباحث ہیں)

حرف تنقید

اسلامی شریعت و طریقت کے دو عظیم ترین شاعرین کرام کی تحریروں پر تنقید کرنا چھوٹا منہ بڑی بات کے مصداق ہے لیکن یہ بڑی بات بہت سے بڑے مہوں نے بھی نکالی ہے اور اسلام کا عقلم صداقت کہ وہ مسلم و مومن کو سچ بات کہنے کا حق ہی نہیں فرض قرار دیتا ہے کیونکہ ہمارے اکابر اسی وقت تک اور ان ہی معاملات میں اکابر ہیں جب تک وہ کتاب و سنت کے پابند ہیں، دین و شریعت کے واضح جاہد و مصراط مستقیم سے ذرا سا بھی انحراف ان کی بزرگی تسلیم کرنے کے باوجود نقد و دعوت دیتا ہے، حضرت مجدد اور حضرت شاہ اور ان کی کتابیں ہمارے لیے سرمایہ سعادت ہیں مگر ان کے غیر اسلامی افکار سے اختلاف ہے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ (حضرت مجدد کے متعدد افکار پر ان کے معاصر عالم اور صوفی شیخ محمد عبدالحق محدث دہلوی نے متعدد تنقیدیں کی تھیں۔ ان پر متعدد دہلی علم نے بحث کی ہے، جیسے مولانا آزاد، عبدالحکیم رکنی، شیخ محمد اکرام، مولانا ابوالحسن علی ندوی، پروفیسر خلیق احمد نظامی وغیرہ۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا مضمون اسی پر ہے۔ طرف داران حضرت مجدد کا دعویٰ ہے کہ شیخ عبدالحق نے حضرت مجدد کے جوابات کے بعد رجوع کر لیا تھا مگر شیخ اکرام کا خیال ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے رجوع نہیں کیا تھا۔)

مکتوبات امام ربانی کے بارے میں یہ تجزیہ صحیح ہے کہ ان کے تین بڑے حصے ہیں: ایک میں کتاب و سنت کی پیروی کی ترغیب و ترویج پر مشتمل ہے اور اس میں یہ بات پادار و ہدایت گئی ہے کہ طریقت شریعت کے تابع ہے اور حقیقت یا تصوف شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے۔ دوسرے حصہ/خانہ میں حضرت مجدد کے وہ خطوط و مراسلات اور خطابات ہیں جو معاصر امراء حکومت کو بھیجے گئے تھے اور جن میں دین و شریعت کی ترویج و ترویج پر ان کو ابھارا گیا تھا اور بدعات کے سدباب کے لیے کہا گیا تھا۔ (ملاحظہ ہو مضمون ظفر الاسلام شیخ احمد سرہندی اور اہل حکومت میں شریعت کی ترویج مشمولہ فکر اسلامی کے فروغ میں ۹۳-۶۳ء)

تیسرا حصہ فلسفیانہ تصوف کے لیے مخصوص ہے اور مکتوبات کا بڑا حصہ اسی فلسفیانہ تصوف کے مضامین پر ہی مشتمل ہے (سید عروج احمد قادری مذکورہ بالا) حضرت شاہ کے رسائل و نگارشات تصوف میں بھی یہی تقسیم جزوی ترمیم کے ساتھ کی جاسکتی ہے، ایک خالص اسلامی اور علمی تصوف ہے جو کتاب و سنت سے ماخوذ ہے یا تجربات صوفیہ پر، جو خالص شریعت پر نہیں مبنی ہے، اور انھیں سے مستفاد ہے ان میں سے بیشتر مباحث خالص فلسفیانہ تصوف سے متعلق ہیں اور ان کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ سب اسلامی ہیں۔ دونوں بزرگان شریعت و طریقت تصوف پر شریعت و دین کی بالادستی تسلیم کرتے ہیں اور طریقت سے شریعت کو الگ نہیں کرتے لیکن ان دونوں کے

ہاں شریعت اور طریقت میں دین اسلام کی تقسیم بہر حال ملتی ہے خواہ وہ ظاہر و باطن کی اصطلاح رکھتی ہو یا کچھ اور علمائے ظواہر اور فقہائے اسلام پر یہ انزام ہے کہ وہ صرف دین کا چھلکا لیتے ہیں اور مغز چھوڑ دیتے ہیں جو صاحبان طریقت پیش کرتے ہیں۔ ظاہر (ظہر) دین اور باطن (طن) دین کے تصور نے قرآن مجید کی آیات کریمہ بھی ظہر و باطن کا خیال پیدا کیا، لغوی اور لسانی اعتبار سے قرآنی متن کے معانی کو ظہر قرآن کا نام دیا جاتا ہے، اور اس کے اندرون میں مستور معانی کو باطن کے ذریعہ نکالا جاتا ہے اسی سے اشاری تفسیر صوفیہ کا چلن ہوا جس نے کتاب اللہ کو ہدایت و شریعت کے صحیفہ کی جگہ صحیفہ طریقت بنا دیا کہ مفسر صوفیہ کرام میں شیخ عبد اللہ سمری، امام قشیری، شیخ علاء الدین علی مہانچی اور متعدد دوسرے صوفیہ نے اسی طرح اشاری تفسیر لکھی ہیں حضرت شاہ کے ترجمہ و حواشی قرآن مجید میں صوفیانہ باطنی تفسیر کی آلائش نہیں ملتی ہے اور وہ خالص علمائے قرآن کی تفسیر ہے، حضرت مجدد کے ہاں کامل تفسیر و ترجمہ نہیں ہے تاہم ان کی تشریحات میں سے متعدد میں باطنی و اشاری تفسیر کے نمونے موجود ہیں، آیات محکمات کی تاویل اور آیات متشابہات کی تفسیر کے باب میں بھی حضرت مجدد نے صوفی طریق بالخصوص موخر الذکر کے باب میں اختیار کیا ہے، محکمات اگرچہ امہات کتاب ہیں لیکن متشابہات، جو ان امہات کتاب کے نتائج و ثمرات ہیں، اصل مقاصد کتاب ہیں۔ امہات کے ان نتائج کے حصول کے لیے وسائل زیادہ نہیں ہیں، پس کتاب اللہ کا مغز متشابہات ہیں، اور محکمات کتاب اس مغز کا چھلکا ہیں۔ یہ متشابہات ہی ہیں جو رمز و اشارے میں اصل کو بیان کرتی ہیں اور اس مرتبہ کی حقیقت معاملہ کی نشاندہی کرتی ہیں۔ بخلاف محکمات، متشابہات حقائق ہیں، اور محکمات ان حقائق کے لیے معقول صورت و شکل ہیں۔ عالم راسخ وہ ہوتا ہے جو مغز کے چھلکے کے ساتھ جمع کر سکتا ہے اور حقیقت کو صورت میں اتار سکتا ہے، علمائے فخر (چھلکے کے علمائے) چھلکے پر خوش ہیں اور انہوں نے محکمات پر اکتفا کر لیا ہے۔ یہ صرف ایک نمونہ تاویل ہے۔ ایسے نمونے ان کی تفسیر میں بہت ہیں جن کو ایک نو جوان محقق نے جمع کر کے تحقیق کی ہے اگرچہ وہ زیادہ تر تنقیدی نہیں۔ حسینی اور مداحی ہے، پھر بھی انہوں نے بعض مقامات پر حضرت مجدد کی تفسیر کو جمہور علمائے خلاف بتایا ہے جیسے بقرہ ۱۰۰ وغیرہ کی بعض تفسیرات مجددی، مگر صاحبان فکر و نظر نے ان پر سخت گرفت کی ہے اور حضرت مجدد کے ان صوفیانہ اشارات و لطائف پر صحیح طور سے نقد کیا ہے حضرت شاہ نے محکمات و متشابہات کے باب میں اپنا دامن تصوف بھی اشاری چھینٹوں سے پاک و صاف رکھا ہے (مکتوبات امام ربانی، مکتوب ۲۷، ۲۸، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۲، ۴۳، ۴۴، ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۴۹، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۴، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۰، ۶۱، ۶۲، ۶۳، ۶۴، ۶۵، ۶۶، ۶۷، ۶۸، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۰، ۸۱، ۸۲، ۸۳، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۸۹، ۹۰، ۹۱، ۹۲، ۹۳، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۸، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۷، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۱، ۱۲۲، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۴۴، ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷، ۱۴۸، ۱۴۹، ۱۵۰، ۱۵۱، ۱۵۲، ۱۵۳، ۱۵۴، ۱۵۵، ۱۵۶، ۱۵۷، ۱۵۸، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۱، ۱۶۲، ۱۶۳، ۱۶۴، ۱۶۵، ۱۶۶، ۱۶۷، ۱۶۸، ۱۶۹، ۱۷۰، ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳، ۱۷۴، ۱۷۵، ۱۷۶، ۱۷۷، ۱۷۸، ۱۷۹، ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳، ۱۸۴، ۱۸۵، ۱۸۶، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۸۹، ۱۹۰، ۱۹۱، ۱۹۲، ۱۹۳، ۱۹۴، ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷، ۱۹۸، ۱۹۹، ۲۰۰، ۲۰۱، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶، ۲۰۷، ۲۰۸، ۲۰۹، ۲۱۰، ۲۱۱، ۲۱۲، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۸، ۲۱۹، ۲۲۰، ۲۲۱، ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱

کل خطیئة، خلقت من نور اللہ (دفتر سوم مکتوب: ۱۰۰ موضوع روایت ہے) لہی مع اللہ وقت لا یسعی فیہ ملک مقرب ولا نبی مرسل (دفتر اول: مکتوب: ۹۹-۵۷ وغیرہ، کنت کنزاً مخفیاً الخ وغیرہ۔

۲- دونوں بزرگوں نے احادیث شریفہ میں سے بعض کے ضمن میں اکابر صوفیہ کے اقوال سے بھی استناد کیا ہے جیسے حدیث قلب میں حضرت شاہ کا حوالہ حضرت جنید بغدادی، حسی المسلم علی المسلم خمس میں حضرت مجدد کا استدلال حضرت خواجہ نقشبند سے وغیرہ۔
حضرات مجدد و شاہ نے متعدد احادیث کی شرح میں بھی نہایت دقیقہ دہی اور نکتہ سنجی کی ہے اور عظیم معانی کی تزییل کی ہے جیسے حدیث قرطاس کی شرح حضرت مجدد و اور حدیث اسبال ازار کی شرح حضرت شاہ کلستان خفیفستان علی اللسان وغیرہ

حضرت شاہ نے بالخصوص ایک سے زیادہ احادیث کو جمع کر کے مجموعہ سے بلند و جمیل معانی اور احکام کا استنباط کیا ہے، جیسے من قال لا الہ الا اللہ دخل الجنة کی شرح مجدد (دفتر دوم، مکتوب: ۳۷) حدیث قلب کی شرح شاہ (لغات القدس، ۴۹، ۵۷)

(ہمایوں عباس، حضرت مجدد الف ثانی اور معارف حدیث، لاہور ۲۰۰۸ء)
(محمد حسین مظہر صدیقی، شاہ ولی اللہ کی صوفیانہ شرح حدیث مہجرت، ۲۰۰۸ء)

مقام نبوت

اکابر صوفیہ بالخصوص محققین کا ایک محبوب موضوع رسول اکرم ﷺ کی ذات گرامی اور اسی سے وابستہ مقام نبوت ہے، وحدۃ الوجودی صوفیہ کی فکر میں مقام نبوت کو بڑا مرتبہ حاصل ہے اور دوسرے قدیم و متاخر صوفیہ بھی اس پر کلام کو ضروری سمجھتے ہیں، علمائے اسلام اور قرآنیات و حدیثیات کے ماہرین کتاب و سنت کی تشریحات کر کے اپنے مباحث کو قابل فہم بنا دیتے ہیں جبکہ صوفیائے کرام فلسفیانہ افکار و اصطلاحات کے ذریعہ ان کو پیچیدہ، ناقابل فہم اور فلسفیانہ فکر میں ڈھال دیتے ہیں، حضرات مجدد و شاہ دونوں نے بیشتر مقامات پر فلسفیانہ بحث کی ہے اور مقام نبوت کو کتاب و سنت سے زیادہ فلسفہ کے قریب کیا ہے، دونوں بزرگوں کے مباحث میں بہر حال مفسرین و محدثین اور متکلمین اسلام کے طریق بحث و استدلال بھی کافی حد تک ملتا ہے، حضرت مجدد نے نبی کی تعریف متکلمین کے اسلوب پر کی ہے اور انتخاب نبی کی تشریح قرآنی آیات و احادیث کے ذریعہ کی ہے جبکہ نبوت کی حقیقت کی بحث میں فلسفہ کی آمیزش ہے، نبوت سے مراد وہ قرب الہی ہے جس میں خلقت کی آمیزش نہیں اس کا عروج حق تعالیٰ کی طرف ہوتا ہے اور نزول خلقت کی طرف۔ اثبات نبوت، معجزات نبوت اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے مقامات پر عام

بحث کے علاوہ خاص رسول اکرم ﷺ کے مقام نبوت پر بحث حضرت مجدد و بیشتر مقامات فلسفیانہ ہے اور قابل نقد بھی ہے، جیسے عنصری و مادی پیدائش کے علاوہ حق تعالیٰ کے نور سے پیدائش کا خیال، بشریت محمدی کا تصور ہجرت ظاہری و باطنی اور وصال محمدی وغیرہ (عبدالحق انصاری - تصوف اور شریعت ۱۱۴۱-۱۱۹۰ و بعد: نبی اور نبوت، حضرت مجدد نے نبی کو بھی ولی بنا دیا ہے اور حکیم ترمذی، امام غزالی، ابن عربی وغیرہ کا بھی یہی خیال ہے۔

حضرت شاہ نے حجۃ اللہ البالغہ کے باب حقیقۃ النبوة و خواصہ کے علاوہ تاویل الاحادیث، تہذیبات وغیرہ میں فلسفیانہ بحث زیادہ کی ہے۔ الہی انتخاب رسول، ماس کی حکمت، بعثت رسول کی حکمت الہیہ، سابق انبیاء پر فضیلت، ختم نبوت اور دوسرے مباحث میں ملا اعلیٰ، مضمون، مضمیت محمد ﷺ، نفس ناطقہ وغیرہ کی پسندیدہ اصطلاحات شاہ کا کمال و دل قرآن و حدیث سے زیادہ ہے اصل نبوت کی حقیقت یہ ہے کہ نبوت دو جانب سے معرض وجود میں آتی ہے (نبی) قبول کرنے والے کے نفس ناطقہ کی طرف سے جب اس کا نفس ناطقہ مقام مضمیت حاصل کر لیتا ہے اور دوسری اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔ بعثت ختم نبوت کے بعد بھی اجزائے نبوت کا سلسلہ جاری ہے، اور اس سے مراد مضمیت ہے۔ کیونکہ مضمین پر سب نبوت کے ہی انوار، اشباح اور تمثیلیں طاری ہوتی ہیں، دونوں بزرگوں کے مباحث مقام نبوت میں بہت سی مشتمل کہ اقدار و صفات ہیں اور ان پر نقد و امتدراک بھی کیا جاسکتا ہے اور کیا بھی گیا ہے (حضرت مجدد و اثبات النبوة مختلف صفحات، مکتوبات کے دو فائز، مفصل بحث کے لیے ہمایوں عباس، مقام نبوت، مجدد کے افکار، لاہور ۲۰۰۹ء، شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ ۸۵، ۸۶، تاویل الاحادیث، ۷۷ وغیرہ، معارف ۱۸۰-۱۹۵ و بعد، تہذیبات: ۲۸، ۱۰۱، ۱۳۵ وغیرہ)

اذکار و وظائف

اعمال و اشغال طریقت میں سب سے زیادہ زور اذکار و وظائف پر دیا جاتا ہے اور وہ تمام صوفی سلسلوں میں اہم ترین ہے، امام غزالی اور ان کے شیخ کے ہاں یہ افراط تک ملتی ہے کہ وہ ذکر کی جگہ تلاوت قرآن کو بھی منع کرتے تھے جبکہ حضرت شاہ تلاوت کو افضل و ذکر قرار دیتے ہیں، اس کی بنیاد یہ ہے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ واجب الوجود و موجود حقیقی سے بندہ اور سالک کا راستہ تعلق ہو جاتا ہے، یا دالہی، قلب و نظر میں اس کا دوام روح و بدن میں اس کی سراپت ہی غیر اللہ سے بیگانہ و دنیا سے میرا کرتی ہے، نقشبندی سلسلہ میں ذکر الہی کے دوام کو یادداشت سے یاد کیا جاتا ہے، حضرت شاہ نے عربی زبان میں بھی اسی فارسی اصطلاح کو استعمال کیا ہے کہ ان کے فکر و نظر میں اس کا عربی بدل نہیں ہے، خواجہ نقشبندی سے اس کی تعریف و اہمیت منقول ہے۔

دوسرے سلاسل سے نقشبندیہ کا اختلاف ذکر جہری اور ذکر خفی پر ہے، خواجہ نقشبند کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ذکر جہری کو مکروہ سمجھتے تھے اس لیے نقشبندی حضرات صوفیہ اور سالکین ذکر خفی کو ترجیح دیتے ہیں اور ذکر جلی سے اجتناب کرتے ہیں۔ حضرت شاہ نے اس غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور حنفی فقہاء ذکر جہری کو غیر مسنون سمجھتے تھے اسی لیے خواجہ نقشبند نے اس کی ممانعت کی، بسا اوقات اس باب میں افراط و تفریط کا رویہ بھی اختیار کیا جاتا ہے اور اس کی راست زوہدیت و حدیث پر پڑی ہے، حضرت مجدد ذکر قلبی کے قائل تھے اور بعض دوسرے صوفیہ بھی جس میں زبان کو حرکت دینا ممنوع ہے کہ ذکر قلب کا کام ہے، ذکر لسانی سے ذکر قلبی تک پہنچنا بلاشبہ ایک اہم شغل و ریاضت ہے کہ ذکر الہی دلوں کے نہاں خانہ میں بیوست ہو جائے مگر ذکر لسانی کے بغیر ذکر قلبی محال نہیں تو مشکل ہے اور وہ ریاضت و مشقت کے خاصے لیے مرحلے کے بعد نصیب ہوتا ہے، حضرت شاہ نے نقشبندی خیال کی اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے کہ ذکر جلی ممنوع ہے اور نہ مکروہ، وہ خالص مسنون چیز ہے مگر ذکر میں وہ زبان و آواز کی بندی آہنگ کر دے کہ اللہ تعالیٰ سمیع و بصیر ہے لہذا زور و شور سے ذکر کرنا خلاف سنت ہے، اسی طرح مختلف سلسلوں کے اکابر اور ان کے عظیم شیوخ نے مختلف اذکار و وظائف کو اپنے تجربات کی بنا پر اختیار کیا ہے بلاشبہ تمام مصوفیہ کرام مسنون اذکار اور قرآنی وظائف کی تاثیر و اہمیت کا اعتراف کرتے اور ان ہی کو تجویز کرتے ہیں۔ حضرت مجدد کے تجویز کردہ اور اذکار و وظائف کو ڈاکٹر ہمایوں عباس نے اپنی کتاب ”معارف حدیث“ کے اواخر میں جمع کر دیا ہے کہ وہ بھی خدمت حدیث ہے، لیکن بعض ایسے اذکار و وظائف بھی ہیں جو غیر مسنون ہیں اور مخالف کتاب و سنت نہیں، ان کی ادائیگی میں کوئی قیاحت نہیں، اسی طرح حضرت مجدد اور حضرت شاہ اور دوسرے اکابر نے بھی خاص مقاصد حاصل کرنے کے لیے بعض اور اذکار و وظائف کو اپنے تجربہ سے تجویز کیا ہے۔ (مکتوبات امام ربانی، مکتوب ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸، ۱۵۱۹، ۱۵۲۰، ۱۵۲۱، ۱۵۲۲، ۱۵۲۳، ۱۵۲۴، ۱۵۲۵، ۱۵۲۶، ۱۵۲۷، ۱۵۲۸، ۱۵۲۹، ۱۵۳۰، ۱۵۳۱، ۱۵۳۲، ۱۵۳۳، ۱۵۳۴، ۱۵۳۵، ۱۵۳۶، ۱۵۳۷، ۱۵۳۸، ۱۵۳۹، ۱۵۴۰، ۱۵۴۱، ۱۵۴۲، ۱۵۴۳، ۱۵۴۴، ۱۵۴۵، ۱۵۴۶، ۱۵۴۷، ۱۵۴۸، ۱۵۴۹، ۱۵۵۰، ۱۵۵۱، ۱۵۵۲، ۱۵۵۳،

کی ہی خدمت و محبت میں سلوک و معرفت کی منازل طے کرنا شروع کیا اور جلد ہی باطنی کمالات و برقیات سے مالا مال ہو گئے۔ آپ کی روحانی استعداد و ترقی کو دیکھ کر والد مخدوم نے مختلف سلاسل مبارک کی اجازت و خلافت سے نوازا کر خرقہ بھی عنایت فرمایا اور ساتھ ہی اپنا قائم مقام اور جانشین مقرر فرما کر چند دنوں کے بعد ہی آخرت کے لیے کوچ کر گئے۔

اس کے بعد مزید علوم طریقت و حقیقت کو حاصل کرنے کے لیے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ (متوفی ۱۰۱۲ھ) کی صحبت و تربیت کو اختیار فرمایا۔ ان کی خدمت میں رہ کر بڑی تیزی سے منازل سلوک و تصوف طے کر کے بلند درجات و مراتب پر فائز ہوئے اور ساتھ ہی اجازت و خلافت کی عظیم نعمت سے بھی بہرہ مند ہوئے۔ اس کے بعد مرشد کامل کے حکم و ارشاد کے مطابق آپ وطن مالوٹ سرہند تشریف لے آئے اور سالکوں اور طالبوں کی تربیت ظاہری و باطنی اور دینی امور کی تجدید و توسیع میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔

آپ نے ہزاروں شائقین معرفت و سلوک کو اپنے چشمہ فیض و معرفت سے شاد کام فرمایا اور ساتھ ہی ملک و سماج میں درائیں برائیوں اور خرابیوں کا اپنی علمی و روحانی حکمت و بصیرت اور انتہائی دوراندیشی و بے باکی سے قلع قمع کر کے سب کا خاتمہ کیا اور ایک دینی و علمی اور خوش گو اور ماحول قائم کیا۔ آپ نے اپنی وسیع روحانی و تجدیدی مصروفیات اور مجہوم افکار کے باوجود کچھ نادر و نایاب اور قیمتی نقوش قلم بھی چھوڑے ہیں جو آپ کے مکتوبات عالیہ اور رسائل نافہ ہیں آپ کی جملہ تخلیقات و تصنیفات میں مکتوبات کو ایک خاص اور امتیازی مقام حاصل ہے جو بلاشبہ شریعت و طریقت اور حقیقت و معرفت کی معلومات کے لیے ایک بیش بہا اور ارہ تما ذخیرہ ہے اور طالبان شریعت و طریقت کی روحانی سیرابی کے لیے ایک منبع و مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔

آپ کی ذات بابرکت سے سلسلہ نقشبندیہ کو کافی عروج و فروغ حاصل ہوا ہے جس کا واضح ثبوت ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہزاروں اور لاکھوں کی تعداد میں مریدین و خلفاء اور ان کی دینی و علمی خدمات کے اثرات ہیں۔

آپ نے ان کے ذہن و فکر کو وار و عمل اور ظاہر و باطن کی ایسی عمدہ تطہیر و تربیت اور بے مثال تزکیہ کا فریضہ انجام دیا کہ سلوک میں اعلیٰ درجات تک پہنچ گئے اور آپ کے نقوش قدم پہ چلتے ہوئے انہوں نے بھی دینی و باطنی اور علمی و روحانی سطحوں پہ قابل رشک کارنامے انجام دیے ہیں اور آپ کی تجدیدی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلفائے گرامی کا سلسلہ خواہ وہ بلا واسطہ ہوں یا بالواسطہ، کافی وسیع ہے۔ تقریباً دنیا کے تمام گوشوں میں ان کی جلوہ بازیوں ہیں، جس کا اندازہ آپ

مجدد الف ثانی اور ان کے چند ممتاز خلفا

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی قدس سرہ (ولادت: ۱۰۹۷ھ وفات: ۱۱۰۳ھ) گیارہویں صدی ہجری کی ایک عظیم علمی و روحانی اور بہتری و انقلابی شخصیت ہیں، انہوں نے اپنی خدا داد صلاحیتوں اور ہمہ گیر کوششوں سے دینی و مذہبی، فنی و فکری، اور علمی و روحانی تمام میدانوں میں ایک زبردست انقلاب برپا کیا، عہد اکبری میں پچھلی ہوئی غیر شرعی بدعات و خرافات اور ان کی ترویج و تشہیر کا حکمت و بصیرت سے سد باب کر کے ایوان بادشاہت میں ایک بل چل مچا دیا، تعلیمات اسلام اور احکام شرع کا مثبت طور پر احیاء و اشاعت اور ان کی ترقی و توسیع کر کے ایک تاریخی اور ناقابل فراموش کارنامہ انجام دیا۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ شرعی پنجاب میں ضلع انبالہ کے ایک گاؤں سرہند میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد حضرت شیخ عبدالاحد سرہندی قدس سرہ (متوفی ۱۰۷۷ھ) تھے، جو ایک جید عالم دین، بڑے عابد و عارف اور حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ کے فرزند ارجمند و خلیفہ حضرت شیخ رکن الدین علیہ الرحمہ کے اجلہ خلفاء میں تھے (مشائخ نقشبندیہ، ص: ۲۸۳/۴، نزہۃ النوح اطرس: ۲۱۱، ج ۵)

آپ نے اپنی تعلیم و تربیت کی تحصیل و تکمیل والد گرامی اور دیگر علمائے روزگار و مشائخ کبار کی صحبت میں رہ کر فرمائی اور سترہ سال کی مدت میں تمام علوم معقولہ و منقولہ سے فارغ ہو کر درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ آپ کا تدریسی زمانہ آگرہ میں گزرا جہاں آپ نے ہزاروں تشنگان و طالبان علوم کو عرصے تک اپنے چشمہ علمی سے سیراب فرمایا۔ اس کے بعد آپ شیخ سلطان جو اکبر بادشاہ کے خاص مصاحبوں میں سے تھے، کی دختر نیک اختر سے نکاح کر کے رشتہ ازواج سے منسلک ہو گئے۔ اس کے بعد آپ کو ایک روحانی رشتہ (معرفت الہی) سے بھی وابستہ ہونے کی ایک شدید ضرورت اور تڑپ پیدا ہوئی۔ چنانچہ حضرت مجدد قدس سرہ اپنے والد گرامی قدس سرہ

کے ایک مشہور مرید و خلیفہ حضرت شیخ محمد ہاشم کشمی قدس سرہ کے اس قول سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ بعض حضرات نے محض اتفاقاً ملاقاتوں میں انکشاف کیا کہ ان کو حضرت مجدد سے خلافت و اجازت حاصل ہے، (مشائخ نقشبندیہ ص: ۵۴۳)

لیکن میں اپنے علم و مطالعے کی روشنی میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلفائے عظام میں سے جن میں آپ کی اولاد امجاد اور ملک و بیرون ملک کے علماء و مشائخ شامل ہیں صرف چند اسمائے مبارک کے تعارفی حالات کو ذیل میں مختصراً ذکر کرنے پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔

۱- حضرت خواجہ محمد صادق سرہندی قدس سرہ

آپ حضرت مجدد قدس سرہ کے فرزند نکلاں ہیں ۱۰۰۰ھ میں آپ کی ولادت ہوئی، تعلیم و تربیت اپنے جد امجد حضرت شیخ عبدالاحد قدس سرہ سے حاصل فرمائی، صغریٰ ہی میں فارغ ہو کر جامع علوم و فنون ہوئے اور درس و تدریس میں مشغول ہوئے۔

آپ انتہائی ذہین و فطین اور زہد و تقویٰ کے پیکر تھے۔ آپ کے والد مکرم حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ میرے والد ماجد (حضرت شیخ عبدالاحد قدس سرہ) فرمایا کرتے تھے کہ: ”تمہارا پڑ کا مجھ سے حقائق و معارف کی ایسی ایسی عجیب باتیں دیا کرتا ہے کہ ان کا جواب مشکل سے بن پڑتا ہے“ (از جہان امام ربانی، اقلیم چہارم ص: ۱۷۳)۔

آپ کی علمی بصیرت و جولانیت کے بارے میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ ایک مکتوب میں آپ کے وصال فرمانے کے بعد ذکر کرتے ہیں کہ:

”علوم عقلیہ و نقلیہ کے درس و تدریس کو بے حد کمال پر پہنچا دیا تھا حتیٰ کہ اس کے شاگرد بیضاوی و شرح موافق اور اسی قسم کی مثنوی کتابیں پڑھاتے ہیں“ (ایضاً ص: ۱۷۳)۔

آپ اپنے والد گرامی کے ہمراہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت اقدس میں پہنچے اور ان سے مراقبہ و گراور جذب و نسبت کی برکات و عنایات سے شرف ہوئے اور وہ کمالات و مقامات حاصل ہوئے کہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ آپ کو دیرینہ سالکوں کے مقابلے میں پیش فرماتے تھے (تخصیص از تربیۃ الخواطر ج: ۵، ص: ۳۶۴)۔

اس کے بعد حضرت خواجہ محمد صادق قدس سرہ اپنے والد گرامی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے فیض تربیت سے بھی مرہون فضل و کمال کو پہنچے اور ”لولہ سرلابیہ“ کے پورے مصداق ثابت ہوئے۔ آپ نے بہت کم عمر پائی لیکن جتنی بھی میسر ہوئی اس کا بھرپور استعمال فرمایا۔

حضرت مجدد قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

”فرزند مرحوم (خواجہ محمد صادق) اللہ تعالیٰ کی ایک نشانی اور رحمت تھے۔ چوبیس سال کی

عمر میں وہ کچھ پایا کہ بہت کم لوگوں نے پایا“ (ایضاً)۔

آپ ۲۴ سال کی ہی عمر میں سرہند شریف میں بعارضۃ طاعون ۱۰۲۵ھ کو وصال فرما کر عالم فانی سے عالم باقی کی طرف رحلت فرمائے، مزار مبارک سرہند شریف ہی میں مرجع خاص و عام ہے۔

۲- حضرت خواجہ محمد سعید سرہندی قدس سرہ

آپ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے دوسرے فرزند ارجمند ہیں۔ آپ صلاح و تقویٰ اور علم و بزرگی میں اپنے برادر کبیر حضرت خواجہ محمد صادق قدس سرہ کے عکس جمیل تھے۔ ولایت و عرفان اور فضیلت و بزرگی کے آثار پیدائشی ہی سے نمایاں تھے۔

آپ کی پیدائش ۱۰۰۵ھ میں ہوئی۔ اپنے والد گرامی، برادر نکلاں اور حضرت شیخ طاہر لاہوری (متوفی ۱۰۴۰ھ) سے علوم ظاہری کی تحصیل فرمائی اور سترہ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فارغ ہوئے۔ بعدہ درس و تدریس میں مصروف ہوئے۔ آپ نے کچھ قیمتی قلمی یادگاریں بھی چھوڑیں ہیں۔ مشکوٰۃ اور حاشیہ خیالی پر آپ نے بہت ہی جامع اور ذریعہ حاشیہ رقم فرمایا ہے اور رفع سبایہ پر ایک عمدہ رسالہ بھی ہے علاوہ ازیں آپ کے کچھ گرامر و کتبائے ہیں جو حقائق و معارف کا ایک بحر ذخار ہے (نہجۃ الخواطر ج: ۵، ص: ۳۶۵ و جہان امام ربانی اقلیم چہارم ص: ۱۷۳)۔

اس کے بعد علوم باطنی حضرت مجدد قدس سرہ سے حاصل کیا اور انہیں کی تربیت و صحبت میں درجہ کمال کو پہنچے اور خلافت و اجازت کے مجاز قرار پائے، حسب ارشاد والد و مرشد مندر ارشاد پر بیٹھ کر طالبین و مترشدین کی تربیت ظاہری و باطنی میں ہمہ تن متوجہ ہوئے اور ان کو اپنے فیوض و برکات سے اعلیٰ مقامات و ترقیات پہ فائز فرمایا۔ آپ کی وفات ۱۰۷۰ھ میں ہوئی، مزار مبارک سرہند شریف میں واقع ہے۔

۳- حضرت خواجہ محمد معصوم سرہندی قدس سرہ

آپ حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے تیسرے فرزند دل بند ہیں۔ آپ بڑے جامع کمالات و برکات اور گونا گوں خصوصیات کے حامل تھے۔ ملک و بیرون ملک میں آپ کے علم و فضل اور ولایت و بزرگی کا خوب شہرہ ہے۔ آپ کی ولادت باسعادت ۱۱ شوال ۱۰۲۷ھ رجبی ۱۵۹۹ء میں بستی ملک حیدر میں ہوئی۔ یہ بستی سرہند سے دو میل (خام) کے فاصلہ پر واقع ہے۔

(مشائخ نقشبندیہ ص: ۵۵۹)۔

آپ فطری طور پر فہم و استعداد کی خوبیوں سے آراستہ اور ولی کامل تھے ”آپ نے تین سال کی عمر میں کلمہ توحید سے متعلق بات شروع کر دی تھی اور درود و دوا اور گل و گنزار میں سے ہر چیز

پر جب اس کی نظر پڑتی تھی تو وہ کہتا تھا کہ ”یہ میں ہوں اور وہ میں ہوں“ (ایضاً ص: ۵۶۱)۔

آپ نے جملہ مرتبہ علوم و فنون کو سولہ سال کی قلیل مدت میں مکمل فرمایا، آپ کے اساتذہ کرام میں والد محترم، برادر مکرم اور حضرت علامہ شیخ طاہر لاہوری رضی اللہ عنہم ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر علماء و مشائخ سے بھی استفادہ فرمایا ہے، اور تین ماہ کی مختصر مدت میں حفظ قرآن کی دولت سے بھی آپ مالا مال ہوئے۔ تحصیل علم سے فراغت کے بعد درس و تدریس کے مشغلے سے بھی وابستہ ہوئے۔ آپ نے تفسیر بیضاوی، ہدایہ، عقیدی وغیرہ جیسی قیمتی اور اہم کتابوں کا درس دیا۔

اب اس کے بعد آپ علوم معرفت و طریقت کی تحصیل و تکمیل میں مصروف ہوئے اور انہیں کی صحبت و تربیت میں رہ کر چند دنوں ہی میں تمام منازل سلوک طے کیا، اس کے بعد حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو خلافت و اجازت عطا کر کے اپنا امین و جانشین مقرر فرمایا اور اس وارفانی سے کوچ فرما کر عالم جاودانی کے مسافر ہو گئے۔

حضرت خواجہ معصوم مند ارشاد پر متمکن ہو کر رشد و ہدایت اور اصلاح و تزکیہ کا قابل قدر اور بیش بہا کارنامہ انجام دیا اور سلسلہ نقشبندیہ کی ترقی و توسیع میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

آپ کا سلسلہ بیعت کا فی ہمد گیر تھا۔ لاکھوں کی تعداد میں آپ کے مریدین و متوسلین اور کثیر تعداد میں خلفائے گرامی ہیں۔ شیخ محمد باقر لاہوری، حافظ محسن مینا لکھنوی، شاہ حسین عشاق اورنگ آبادی، خواجہ محمد حنیف کابلی وغیرہ جیسے مادر روزگار افراد آپ ہی کے اصحاب اجازت و خلافت ہیں۔

آپ کی تحریری خدمات میں مکتوبات کی تین ضخیم جلدیں اور کئی اہم رسائل شامل ہیں۔ ۶/ رجب الاول ۱۳۹۹ھ میں آپ نے وصال فرمایا، مزار اقدس سرہند شریف میں واقع ہے۔

حضرت مجدد و الف ثانی قدس سرہ جس طرح عالم علوم عقلیات و نقلیات اور جامع کمالات ظاہری و باطنی تھے اسی طرح آپ کی اولاد و مجاہد بھی علوم و معانی اور حقائق و معارف کے بہت بڑے شکار اور راز آشائے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ اپنے ایک مخلص مرید کو صاحبزادگان و لالہا کے مقامات رفیعہ سے روشناس کراتے ہوئے فرمایا:

”میرزا زندان ایشان کہ اطفال اسرار الہی اندا استعداد ابائے عجب دارند بالجملہ شجرہ طیبہ اند، امجا اللہ بناتنا حنا“۔

ترجمہ: حضرت مجدد و الف ثانی کے تمام عزیز زاد اللہ تعالیٰ کے اسرار ہیں اور عجیب استعداد رکھتے ہیں۔ مختصر یہ کہ شجرہ طیبہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ پر وان چڑھائے۔ (جہان امام ربانی، القیم چہارم، ص: ۴۷۴)

۳۔ حضرت خواجہ میر محمد نعمانی رحمہ اللہ کی قدس سرہ

آپ بڑے علمی جاہ و جلال اور بلند روحانی مرتبہ و کمال والے تھے۔ آپ کی ولادت و پیدائش ۱۷۹۹ھ میں بدخشاں میں ہوئی، آپ کی ولادت سے پہلے آپ کے والد ماجد حضرت سید غلام الدین سبکی علیہ الرحمہ جو بدخشاں اور ماوراء النہر کے مشائخ و مشاہیر میں شمار کیے جاتے تھے، نے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ایک مرتبہ عالم خواب میں دیکھا کہ ارشاد فرما رہے ہیں:

”تمہارے ہاں ایک فرزند سعادت مند پیدا ہوگا، اس کا نام ہمارے نام پر ”نعمان“ رکھنا۔ چنانچہ آپ کا یہی نام رکھا گیا (نزہۃ الخواطر ج: ۵، ص: ۴۲۵)۔

اپنی تعلیم و تربیت اپنے ہی ملک کے علمائے سامنے زانوئے ادب تہہ کر کے حاصل کی۔ پھر عنفوان شباب میں آپ حضرت عارف حق آگاہ شیخ امیر عبداللہ عشق علی قدس سرہ کے پاس بلخ پہنچے اور بیعت و ارادت کے شرف سے مشرف ہوئے۔ اس کے بعد آپ ہندوستان تشریف لائے اور بعض درویشوں و بزرگوں سے اذکار کی تعلیم حاصل کر کے حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور ان کے الطاف و انعامات سے پایاں کو دیکھ کر طرقت نقشبندیہ میں منسلک ہوئے۔ اس کے بعد حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ نے جب حضرت مجدد قدس سرہ کو بیعت و ارشاد کی اجازت مرحمت فرمائی تو اپنے تمام اصحاب ارادت کی تربیت انہیں کے ذمہ سپرد فرمائی اور آپ سے بھی ارشاد فرمایا کہ ”تم ان کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھنا“۔

چنانچہ آپ حضرت مجدد و الف ثانی قدس سرہ کے حلقہ تربیت و تزکیہ میں شامل ہوئے اور ایک عرصہ تک آستانہ عالیہ میں رہ کر انعامات و نوازشات سے سرفراز ہوئے اور حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو اجازت و تعلیم طریقت مرحمت فرما کر طالبین معرفت کی رہنمائی کے لیے برہانپور روانہ کیا۔

حضرت مجدد قدس سرہ کو آپ سے حدود کی محبت و شفقت تھی یہاں تک کہ ایک مرتبہ ان کو ضعف عارض ہونے کی وجہ سے حضرات خواجگان نقشبندیہ کی امانت و نعمت کو کسی اہل و مخلص کے سپرد کرنے کا ارادہ کیا تھا تو اس وقت اس بار کا تحمل سوائے اپنے بڑے فرزند ارجمند حضرت خواجہ محمد صادق قدس سرہ اور آپ کی ذات ہرکات کے کسی کو نہیں پایا تھا۔ آپ کی وفات ۱۰۵۸ھ میں ہوئی۔

۴۔ حضرت شیخ حمید بنگالی قدس سرہ

آپ علم و فضل، زہد و ورع اور فکر و بصیرت کے جامع تھے اور اس کے ساتھ سنت رسول کے بھی سخت پابند تھے۔ آپ کی پیدائش و پراخت صوبہ بنگال کے ضلع بروان میں ایک منگل کوٹ نامی شہر میں ہوئی۔ حصول تعلیم و تربیت کے لیے آپ لاہور تشریف لے گئے اور تکمیل کے

بعد وہ ایسی میں آگرہ قیام کیا، وہیں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ سے بیعت بھی ہوئے اور تقریباً دو سال ان کی خدمت عالی چاہ میں رہے اور احوال عجیبہ، مقامات غریبہ اور درجات رفیعہ سے مالا مال ہوئے، ساتھ ہی تعلیم طریقت و معرفت کی اجازت و خلافت بھی حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو عنایت فرمائی اور شہر بنگال کی طرف رشد و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کے لیے روانہ فرمایا۔ وہاں آپ نے مجددی فیوض و برکات کا گوہر خوب لٹایا۔ آپ کا وصال مبارک ۱۰۵۰ھ میں ہوا۔ مزار پر انوار شہر منگل ضلع بردوان میں ہوا۔ (نزہۃ الخواطر، ج: ۵، ص: ۱۵۱)

۶۔ حضرت شیخ طاہر حنفی لاہوری قدس سرہ

آپ بڑے عالم و فاضل اور یکتائے روزگار اور صاحب کشف و کرامت بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت ۱۰۲۰ھ و شمالاہور میں ہوئی اور تعلیم و تربیت اور حفظ قرآن کی تحصیل و تکمیل بھی یہیں سے ہوئی۔ اس کے بعد تعلیم سلوک کے حصول کے لیے حضرت شیخ اسکندر عمامہ نقشبندی قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے دست حق پرست پر بیعت کی، بعد حضرت شیخ عبدالاحد بن زین العابدین سرہندی قدس سرہ سے بھی استفادہ کر کے فیض یاب ہوئے اور پھر بعد میں نادر روزگار حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی کی خدمت و صحبت کو اپنے اوپر لازم کر لیا اور ایک عرصہ تک وہاں رہے اور ان کی نظر کیما اثر سے درجہ کمال کو پہنچ کر اجازت و خلافت سے شرف ہوئے۔ پھر مجسم شیخ و مرشد لوگوں کی ہدایت و تربیت کے لیے لاہور روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر طالبان حق کی حقیقت و معرفت کی طرف عمدہ راہ نمائی فرمائی اور اپنے فیوض و کمالات سے مخلوق خدا کو حظ وافر پہنچایا، وصال مبارک ۱۰۴۰ھ میں ہوا۔ روضۃ انوار لاہور میں مرجع خلافت ہے۔

(نزہۃ الخواطر، ج: ۵، ص: ۴۱۲)

۷۔ حضرت شیخ آدم بخاری قدس سرہ المعزیز

آپ علوم ظاہری اور علوم باطنی دونوں میں کمال رکھتے تھے اور بڑی بزرگ و شخصیت کے حامل تھے۔ آپ کی ولادت مبارک سرہند کے مضافات میں ایک نورانی گاؤں میں ہوئی۔ آپ کے والد گرامی حضرت اسماعیل بن بھوہ قدس سرہ کو آپ کی نیک بختی و سعادت مندی کے بارے میں حضرت نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے رینا رت فرمائی تھی۔ (نزہۃ الخواطر، ج: ۵، ص: ۳)

آپ امی بزرگ تھے، علوم باطنی سے اپنے قلب و باطن کو جلا بخشنے کے لیے حضرت حاجی خضر خاں اصفانی قدس سرہ کی بارگاہ میں پہنچے جو حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے مرید و خلیفہ تھے یہاں دو سال ان کی خدمت میں رہے لیکن انہوں نے جب آپ کے طلب معرفت کو ملاحظہ فرمایا کہ آپ کی یہ روحانی نشانی روز بروز بڑھتی ہی جا رہی ہے تو انہوں نے راہ سلوک کی تکمیل کے لیے

اپنے شیخ و مرشد کی طرف ایسا اشارہ کیا چنانچہ آپ حضرت شیخ احمد فاروقی قدس سرہ کی خدمت عالی چاہ میں باریاب ہوئے اور ان کی توجہ خاص سے تمام باطنی مقامات و درجات کے حصول میں کامیاب ہو کر مشا و کام ہوئے۔ اس کے بعد حضرت شیخ و مرشد قدس سرہ نے آپ کو اجازت و خلافت سے بھی بہرہ ور فرمایا۔

اجازت کے بعد آپ خدمت انسانیت اور دعوت و ارشاد میں مصروف ہوئے۔ آپ کی شان و شوکت ولایت اور مقام و مرتبہ سے متاثر ہو کر خلق خدا ایک بڑی تعداد میں وامن رشد و ہدایت سے وابستہ ہوئی یہاں تک کہا جاتا ہے کہ چار لاکھ مریدین اور ایک ہزار خلفا آپ کی تربیت و صحبت یافتہ تھے۔ (نزہۃ الخواطر، ج: ۵، ص: ۳، خلاصہ)

اس کے بعد آپ مع اہل و عیال اور اصحاب حج و زیارت کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے اور وہیں مدینہ منورہ میں سکونت پذیر ہو گئے۔ آپ کا وصال پر مال ۱۰۵۳ھ میں ہوا۔ مزار قدس جنت البقیع میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے قبر انور کے قریب واقع ہے۔

۸۔ حضرت شیخ عیدالحکیم سیالکوٹی قدس سرہ

آپ اپنے وقت کے ایک جلیل القدر عالم و فقیہ، محدث و مفسر، محقق و مدقق اور کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ آپ کی ولادت بقول بختا ورخاں ۹۸۹ھ میں پنجاب کے ضلع سیالکوٹ میں ہوئی۔ علوم معقولہ و منقولہ کی تحصیل سیالکوٹ ہی میں حضرت شیخ کمال الدین کشمیری قدس سرہ سے فرما کر اپنے معاصرین میں ممتاز و رفائق ہوئے۔

جب آپ کے فغل و کمال کا شہرہ بادشاہ وقت شاہجہاں نے سنا تو انہوں نے آپ کو دو مرتبہ چاندی سے وزن کر کے انعام و اکرام سے نوازا جس میں ہر مرتبہ چھ ہزار روپے آئے اور یہ آپ کو حاصل ہوئے اور ساتھ ہی انہوں نے (شاہجہاں سیالکوٹ میں سوا لاکھ روپے کی جائگہ بھی آپ کو عطا کی)۔ (ازحدائق الحنفیہ، ص: ۴۳۵ و نزہۃ الخواطر، ج: ۵، ص: ۲۲۹)۔

آپ نے پوری حیات طیبہ کو درس و تدریس اور تصنیف و تحقیق کے لیے وقف کر دیا تھا مختلف موضوعات و فنون پر طبع آزمائی کر کے آپ نے قابل قدر اور قیمتی تخلیقات و کتبیرات پیش فرمائیں جن میں آپ کی علمی و تحقیقی جولانیت کی جلوہ سامانیاں نظر آ رہی ہیں۔ نمونہ کے طور پر چند کتابیں درج ذیل ہیں۔

حاشیہ تفسیر بیضاوی، حاشیہ شرح عقائد دوانی، حاشیہ شرح موافق، حاشیہ مطالع، حاشیہ مراجع الارواح وغیرہ۔

آپ نے علوم و کمالات باطنی اپنے عہد کے مختلف مشائخ کرام سے حاصل کیے اور پھر

بعد میں حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی خدمت میں بھی حاضر ہوئے اور ان کی صحبت و تربیت میں رہ کر بلند مقامات و درجات پر فائز ہوئے اور خلافت و اجازت کی دولتوں سے نوازے گئے۔
حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو ”آفتاب پنجاب“ کے مبارک لقب سے ملقب فرما کر آپ کی علمیت و فضیلت کو اجاگر کیا اور آپ ہی نے حضرت مجدد قدس سرہ کو ”مجدد الف ثانی“ کے خطاب پایاب سے یاد کیا تھا۔ (حدائق الکفایہ ص: ۴۳۵ ملخصاً)

۱۸ ربیع الاول ۱۰۶۷ھ میں آپ کا وصال ہوا، مزار انور سیالکوٹ میں زیارت گاہ نام ہے۔

۹- حضرت خواجہ محمد ہاشم ششمی قدس سرہ

آپ بدخشاں کے ایک گاؤں کشم میں پیدا ہوئے۔ تعلیم و تربیت کا کام وہیں انجام پایا پھر باطنی کشش آپ کو ہندوستان کے شہر بہان پور بھیج لائی۔ یہاں حضرت خواجہ میر محمد نعمان ششمی قدس سرہ کی صحبت اختیار کر کے ان سے اخذ طریقت کیا پھر یہاں سے ۱۰۳۱ھ میں سرزمین سرہند تشریف لائے اور حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی خدمت مبارکہ میں پہنچے اور وہاں کافی عرصے تک رہ کر الطاف و عنایات سے نوازے گئے۔ اس کے بعد آپ کو خلافت و اجازت بھی عطا ہوئی۔ (تخلص از جہان امام ربانی اقلیم چہارم ۸۱-۸۸ و نیزہ الخواطر ج: ۵، ص: ۳۶۶)۔

آپ ایک صاحب تصنیف بزرگ بھی تھے۔ مشائخ نقش بند یہ قدس سرہ امراہم کے احوال و آثار اور خدمات اور کارناموں پر آپ نے بڑی قریب و دست اور قیمتی قلمی یا دگاریں چھوڑی ہیں۔ زبدۃ المقامات وغیرہ آپ ہی کی لکھی ہوئی ہے۔ آپ کا وصال شہر بہان پور میں ہوا۔

(نیزہ الخواطر ج: ۵، ص: ۳۶۶)

۱۰- حضرت شیخ بدردین سرہندی قدس سرہ

آپ ایک بلند پایہ عالم و فاضل اور بڑے زہد و تقویٰ والے تھے۔ آپ کی پیدائش سرہند میں ہوئی۔ علوم و فنون کی تحصیل حضرت شیخ احمد بن عید الاحمد سرہندی اور حضرت خواجہ محمد صادق بن شیخ احمد قدس سرہما العزیز سے فرمائی۔ بیعت و ارادت بھی حضرت شیخ احمد بن عید الاحمد سرہندی قدس سرہ ہی سے حاصل ہے اور اس کے ساتھ خلافت و اجازت کی نعمتوں سے بھی مشرف ہیں۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں آپ کا گراں قدر کام ہے۔ چند قابل ذکر کتابیں یہ ہیں:

حضرات القدس، کرامات اولیا، مجمع الاولیاء، سنوات الاتقیاء فی وفیات المشائخ وغیرہ (ماخوذ من نفس نیزہ الخواطر ج: ۵، ص: ۱۰۱)

۱۱- حضرت شیخ کریم الدین بابا حسن ابدالی قدس سرہ

آپ صاحب تصرف و خوارق اور بلند احوال و جذبات والے تھے۔ ایک عمدہ شاعر تھے

کریمی تخلص اختیار فرماتے تھے۔

آپ کی ولادت باسعادت ”حسن ابدالی“ نامی ایک مقام میں ہوئی جو کابل اور لاہور کے درمیان ایک شہر ہے۔ (نیزہ الخواطر ج: ۵، ص: ۳۶۱)۔

آپ عالم جوانی میں لاہور تشریف لائے اور علوم ظاہری کی تحصیل میں مصروف ہو گئے۔ تکمیل تعلیم کے بعد آپ سرہند آئے اور حضرت مجدد قدس سرہ کی خدمت عالیہ میں بامیاب ہوئے۔ انہوں نے آپ کو کمال محبت اور غایت شفقت کے ساتھ ذکر و مراقبہ کی تعلیم سے روشناس کرایا۔ آپ وہاں مدتوں تک زیر تربیت رہے یہاں تک کہ حضرت مجدد قدس سرہ کی صحبت بامرکت اور نظر کیمیا اثر سے آپ سے بلندیاں اور ترقیاں ظاہر ہونے لگیں تو انہوں نے آپ کو مطلق خلافت بھی عطا فرمائی اور اس کے بعد آپ خدمت انسانیت اور تعلیم طریقت و معرفت میں منہمک ہو گئے۔ کثیر تعداد میں لوگ آپ کے حق پرست ہاتھ پر تاجب ہو کر داخل سلسلہ نقش بند یہ ہوئے اور گوہر مقصود کے حصول میں کامیاب ہوئے۔

(تخلص از جہان امام ربانی اقلیم چہارم ص: ۵۰۵ و نیزہ الخواطر ج: ۵، ص: ۳۶۱)

۱۲- حضرت شیخ احمد جی قدس سرہ

آپ طریقت و معرفت کے جامع اور علم و عمل کے ایک عظیم پیکر تھے۔ آپ کی ولادت بیٹن (یوہند) مہارن پور میں ہوئی۔ تعلیم و تربیت حضرت شیخ احمد فاروقی و دیگر علمائے کرام سے حاصل کی۔ پھر وہاں سے آپ بہان پور آ کر حضرت شیخ محمد بن فضل اللہ قدس سرہ سے بیعت ہوئے اور ان کی خدمت میں ایک طویل عمر گزار کر خلافت سے سعادت مند ہوئے اور اپنے شہر لوٹ آئے۔

اس کے بعد جب آپ آگرہ پہنچے تو اس وقت وہیں حضرت مجدد قدس سرہ بھی جلوہ فرما تھے۔ ان کی روحانی کشش نے آپ کو اپنی طرف مائل کیا اور آپ چند دن انہیں کی صحبت اقدس میں رہ کر طریقہ عالیہ نقش بند یہ اختیار کیا۔ پھر اس کے بعد آپ حضرت شیخ نعمان بن شمس الدین بہان پوری کی صحبت و تربیت میں رہ کر سرہند آئے تو حضرت مجدد قدس سرہ نے آپ کو خلافت عنایت کر کے آگرہ میں قیام کی اجازت دی۔ یہاں آپ سے کثیر لوگ فیض پایاب ہوئے۔ پھر یہاں سے آپ بنگال گئے جہاں آپ کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ (نیزہ الخواطر ج: ۵، ص: ۵۰۹ و جہان امام ربانی اقلیم چہارم ص: ۵۰۳)

۱۳- حضرت شیخ عبدالہادی بدایونی قدس سرہ

آپ بدایوں کے تھے۔ سلوک و تصوف کی تعلیم حضرت شیخ باقی باللہ قدس سرہ کی خدمت مبارکہ میں رہ کر حاصل کی۔ اس کے بعد مزید تربیت باطنی کے حصول کے لیے حضرت مجدد قدس

سرہ کی بارگاہ مقدسہ میں آئے اور ان کی صحبت و خدمت میں رہ کر خلافت سے سرفراز کیے گئے اور پھر بحکم مرشد کامل آپ اپنے وطن کی طرف رخصت ہوئے۔

تاریخ وصال ۹ شعبان المعظم ۱۰۲۱ھ ہے اور مزار مبارک خرم شاہ کے نکیہ میں ہے۔

(جہان امام ربانی، القلم چہارم، ص: ۵۰۸)

۱۴۔ حضرت شیخ احمد کی قدس سرہ

آپ مدد کے رہنے والے تھے اور وہاں کے عظیم علما میں سے شمار ہوتے تھے۔ جب آپ نے حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے فضل و کمال کا شہرہ سنا تو ادب و اخلاص کے ساتھ ان کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ ایک عرصے تک وہاں رہ کر توجہات و عنایات سے سرفراز ہوئے اور پروانہ اجازت و خلافت حاصل کر کے اپنے وطن تشریف لائے اور شیخ کے ارشاد کے مطابق کار اصلاح و تزکیہ میں مشغول ہوئے۔ ۱۰۲۶ھ میں آپ کا وصال ہوا۔

(مخلص نزیہ الخواطر: ۵/۱۰۲، جہان امام ربانی، القلم چہارم، ص: ۲۹۳، ۲۹۴)

۱۵۔ حضرت شیخ بدیع الدین سہارن پوری قدس سرہ

آپ کی ولادت سہارن پور میں ہوئی۔ والد ماجد کا نام حضرت شیخ رفیع الدین بن عبد المتار انصاری تھا۔ علوم و فنون اپنے اور دوسرے شہر کے علما و فضلا سے حاصل کیے اور پھر بعد میں حضرت مجدد قدس سرہ کے پاس بھی کتب درسیہ مثلاً توطیع و تلویح و غیرہ کی تعلیم لی اور انہیں کے دست حق پرست پر بیعت سے شرف یاب ہوئے اور شیخ و مرشد کی توجہ خاص سے اپنے باطن کو روشن و نور کیا اور جب ان کے پاس ایک لمبی مدت تک صحبت و تربیت میں رہ کر بہت سے کمالات و کمالات سے مالا مال ہوئے تو حضرت شیخ مجدد قدس سرہ نے آپ کو تعلیم طریقت و ارشاد کی اجازت عنایت فرمائی۔ اس کے بعد آپ اپنے وطن مالوف سہارن پور تشریف لائے اور یہیں طالبین معرفت و حقیقت کی اصلاح و تربیت میں مصروف ہو گئے۔ آپ کا وصال ۱۰۳۲ھ میں ہوا۔

(مخلص نزیہ الخواطر: ۵/۱۰۲، جہان امام ربانی، القلم چہارم)

۱۶۔ حضرت شیخ نور محمد قدس سرہ

آپ بڑے معروف عالم و فقیہ اور صاحب فضل و کمال تھے۔ آپ نے علوم دینی و ظاہری اپنے عہد کے علما و فضلا سے مکمل کرنے کے بعد سلوک و تصوف اور علوم باطنی کی طرف متوجہ ہوئے اور ہندوستان کے بہت سے درویشوں کے پاس حاضری دی لیکن آپ کو کہیں بھی تسکین روح حاصل نہ ہوئی۔ آخر کار امام معرفت و حقیقت حضرت شیخ مجدد قدس سرہ کے پاس آئے۔ صحبت و تربیت میں رہے اور بیعت و ارشاد سے شرف یاب ہوئے۔ اس کے بعد ایک مدت تک اپنے شیخ کامل کی تربیت

میں رہے۔ مرشد گرامی نے مراتب و کمالات کی بلندی دیکھ کر اجازت و خلافت عنایت فرمائی اور دین و مذہب کی تبلیغ و وسیع کے لیے آپ کو شہر پٹنہ روانہ فرمایا۔ آپ نے وہاں پہنچ کر مستقل سکونت اختیار کی اور رہائے گنگا کے کنارے ایک جھونپڑی قائم کر کے ایک مسجد کی تعمیر فرمائی، جس کو آپ نے دعوت و ارشاد کا ایک اہم مرکز بنایا اور یہیں سے سالکین و طالبین کی ہدایت و تربیت فرماتے رہے۔

(مخلص نزیہ الخواطر: ۵/۵، جہان امام ربانی، القلم چہارم، ص: ۸۸، ۸۹)

۱۷۔ حضرت شیخ عبدالحی حساری قدس سرہ

آپ ایک عالم کبیر اور صاحب مقام صوفی تھے۔ زہد و تقویٰ اور شریعت پر استقامت کے معاملے میں اپنے زمانے میں فائق تھے۔ آپ حصار شادمان، جو صہبان کے مضائقہ میں سے ہے، کے باشندے تھے۔ وہاں سے ہندوستان تشریف لائے اور حضرت مجدد قدس سرہ کے خدمت عالیہ میں حاضر ہو کر ان کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ ایک طویل مدت تک خدمت میں رہ کر درہائے فیوض سے اپنا دامن مراد بھر لیا اور وہاں سے مرشد گرامی کی توجہ سے اہم مقامات و ترقیات سے ہم کنار ہوئے۔

اس کے بعد حضرت شیخ قدس سرہ نے آپ کو پروانہ خلافت اور تعلیم طریقت کی اجازت دے کر شہر پٹنہ روانہ فرمایا جہاں پہلے ہی سے آپ کے ایک برادر طریقت اور حضرت شیخ نور محمد قدس سرہ رشتہ و ہدایت اور دعوت و تبلیغ کی خدمت انجام دے رہے تھے۔ آپ کے وجود و مسعود سے شہر پٹنہ قمران السعدین کی مانند ہو گیا۔ چنانچہ حضرت مجدد قدس سرہ ایک مخلص کو تحریر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:

”مولانا عبدالحی اور شیخ نور محمد کے شہر پٹنہ میں رہنے کی وجہ سے یہ شہر قمران السعدین کی مانند ہے۔“ (ص: ۸۹، القلم چہارم) آپ کا وصال ۱۰۷۰ھ میں ہوا۔

مذکورہ بالا تحریر حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے چند معروف و ممتاز خلفا کا اجمالی تعارف ہے۔ ان کے علاوہ بھی دیگر بہت سے اصحاب اجازت و خلافت ہیں لیکن یہاں ان کے تفصیلی حالات و واقعات سے قفلت اور خوف طوالت کی وجہ سے گریز کیا گیا ہے تاہم جن خلفا کے اسمائے مبارکہ دوران مطالعہ دریافت ہوتے ہیں وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) خواجہ عبید اللہ عرف خواجہ کلاں (۲) خواجہ عبید اللہ عرف خواجہ خورد (۳) خواجہ محمد صادق کالی (۴) شیخ منزل (۵) شیخ یوسف سرقدی (۶) شیخ سلیم بخوری (۷) مولانا امان اللہ فقیہ (۸) شیخ عبد الرحیم مدنی (۹) سید باقر سارنگ پوری (۱۰) خواجہ محمد صدیق شمی (۱۱) شیخ عبد الکریم (۱۲) حافظ محمود لاہوری (۱۳) مولانا عبد الغفور سرقدی (۱۴) خواجہ محمد اشرف کالی (۱۵) حافظ محمود

کجراتی (۱۶) سید محبت اللہ مایک پوری (۱۷) شیخ عثمان یحییٰ (۱۸) شیخ محمد بہاری (۱۹) شیخ یار محمد قدیم طالقانی (۲۰) شیخ عبدالحی شادمانی (۲۱) مولانا عبد الواحد لاہوری (۲۲) شیخ سلیم کجراتی (۲۳) شیخ داؤد ساکنی (۲۴) شیخ محمد حرمی (۲۵) مولانا حاجی محمد حرمی (۲۶) مولانا فرخ حسین بروی (۲۷) شیخ یوسف بروی (۲۸) حاجی حضرت خاں افغانی (۲۹) شیخ حسن بروی (۳۰) شیخ عبد العزیز شوی حنبلی (۳۱) شیخ علی مالکی (۳۲) مولانا حمید احمدی (۳۳) مولانا عبد المؤمن لاہوری (۳۴) مولانا غازی نو کجراتی (۳۵) صوفی قربان قدیم (۳۶) صوفی قربان جید (۳۷) شیخ زین العابدین تھریزی شامی الشافعی (۳۸) مولانا ہاشم خادم (۳۹) حاجی حسین (۴۰) شیخ یوسف بروی (۴۱) مولانا محمد صالح کولانی (۴۲) شیخ طاہر بخش (۴۳) شیخ حامد بہاری (۴۴) مولانا قاسم علی (۴۵) سلیم خان لشکری (۴۶) سید علی بن عبد القادر طبری (۴۷) شیخ احمد خٹکی استنبولی (۴۸) مولانا امان اللہ لاہوری (۴۹) مولانا یار محمد جید بخش طالقانی (۵۰) شیخ عبد العزیز نجوی مغربی مالکی (۵۱) شیخ احمد بروی وغیرہم رضوان اللہ تعالیٰ علیہم۔

بہر حال حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلفائے اپنی کوششوں سے اسلام کے زریں پیغام اور احکامات کی اشاعت قوتِ ستیج میں حصہ لے کر قائلِ قدر اور لائقِ فخر کرنا مہم انجام دیا ہے اور پورے عالم اسلام کو طاعتِ الہی، محبتِ رسول، آدابِ شیخ، حسنِ خلق، خدمتِ انسانیت اور طلبِ معرفت کا لائقِ تقلید درس دیا ہے۔ ان کی انہیں عمدہ تعلیمات اور بے لوث خدمات کی وجہ سے آج ان کی علمیت و شخصیت، ولایت و عظمت، فکر و تدبیر اور صلاحیت و بصیرت کا خوب شہرہ و تذکرہ ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کے خلفائے نیک نام کی زندگی کے نقوش خدمات سے یہ حقیقت واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کے فکر و شعور میں بلندی، افعال و کردار کی اصلاح، خدمتِ دین کا جذبہ غرض کہ علمی و عملی اور روحانی زندگیوں میں انقلاب کا سبب ان کے مرشد حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ کی ہی جامع کمالات ذات ہے جن کی تعلیم و تربیت سے شرفِ یاب ہو کر یہ حضرات دنیا کی عمدہ نعمتوں اور آخرت کی سرمدی سعادوں سے بہرہ مند ہوئے۔ آج حالات کا شدید تقاضا ہے کہ ہم مادیت و نفسانیت اور دنیوی لذات و خواہشات سے باہر آئیں ورنہ نفس پرستی کے جنون میں مبتلا ہو کر سعادت داریں سے ہمیشہ کے لیے محروم ہونا پڑ سکتا ہے۔

○○○

سرزمینِ دہلی سے مذہبی صحافت میں ایک نئی پیش رفت

ماہنامہ خضر راہ

✽ سفر و حضر کا بہترین ساتھی
✽ گھر کے ہر فرد کی فکری و روحانی تسکین کا سامان
✽ آسان زبان میں اسلامی افکار و تعلیمات کا انمول خزانہ
✽ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کی ترغیب دیں!

سرپرست و نگران

داعی اسلام شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دامت برکاتہم العالیہ

مدیران

جہانگیر حسن - شوکت علی سعیدی

ناشر

شاہ صفی اکیڈمی

خانقاہ عارفیہ، سپر سرائیں، کوٹلہ، الہ آباد، اتر پردیش

مراسلت کا پتہ

MAHNAMA KHIZRE RAH

F-464, Jaitpur II, Near Khajuri Masjid, Badarpur, New Delhi-44

Mob: 9312922953, E-Mail: khizrerah@gmail.com

شاہ ولی اللہ کی صوفیانہ شریعت

تالیف: پروفیسر محمد سلیمان مظہر صدیقی

ناشر: حضرت شاہ ولی اللہ اکیڈمی، بھٹکت (مظفرنگر، یو پی)

صفحات: ۲۲۹، قیمت: ۱۰۰ روپے، سال اشاعت: ۲۰۰۸ء

زیر نظر کتاب معروف اسکالر پروفیسر محمد سلیمان مظہر صدیقی کی تالیف ہے، جن کی علمی دنیا میں اپنی شناخت ہے، اسلامیات اور بالخصوص ولی اللہی افکار و مسائل ان کے مطالعہ و تحقیق کے موضوع ہیں، یہ کتاب اس پہلو سے اہم ہے کہ اس میں شاہ صاحب کے صوفیانہ افکار بھی ہیں اور محدثانہ عظمت بھی اور اس طرح یہ کتاب اہل تصوف اور اہل حدیث دونوں کی نہ صرف دل چسپی کی چیز ہے بلکہ دونوں گروہ کو شاہ صاحب کی شخصیت پر جمع بھی کرتی ہے، یہ کتاب افکار شاہ کی اشاعت بھی ہے اور خدمت حدیث و تصوف بھی۔

پروفیسر محمد سلیمان مظہر صدیقی اہل تصوف و اہل حدیث اور میان شاہ ولی اللہ سب کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب ایسے صوفی تھے جن کا تصوف حدیث سے ثابت ہے اور ایسے محدث تھے جن کی حدیث دانی، رموز تصوف کی تہیں کھولتی تھی، صدیقی صاحب نے بڑی محنت و جان فشانی سے حضرت شاہ کی کتابوں اور مکتوبات میں بکھری احادیث کی صوفیانہ تشریحات کو جمع کیا ہے۔ اس کے ساتھ انہوں نے اس بات کا بھی اعتراف کیا ہے کہ انہوں نے اپنے طور پر احادیث کی صوفیانہ تشریحات کو جمع کی ہیں، اگر مزید کوشش کی جائے تو اس جہت سے ابھی مزید کام ہو سکتا ہے۔

جن احادیث کی صوفیانہ تشریحات جمع کی گئی ہیں ان میں حدیث: "مَنْ سَمِعَ كَلِمَةً مِنْ عِنْدِ اللَّهِ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللَّهِ حَسَنٌ" شامل ہیں۔ یہ تمام شروحات محدث ولی اللہ کو تسلیم کرنے اور صوفی ولی اللہ کا انکار کرنے والوں کے لیے دعوت فکر ہیں۔ اس کتاب سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت شاہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے حضرت حسن بصری کی سماعت کا محدثانہ اصول کے مطابق انکار کرتے ہیں جب کہ صوفیانہ اجماع کے مطابق سماعت کے قائل ہیں اور اس اجماع کو وہ با وزن تسلیم کرتے ہیں، عصر حاضر بلاشبہ اس طرز فکر کا داعی ہے۔ پروفیسر محمد سلیمان مظہر صدیقی اپنی اس علمی کاوش کے لیے بے پناہ قابل مبارکباد ہیں۔

پیام

امیر خسرو (میوزیکل اوپیرا)

تصنیف: فصیح اکمل

ناشر: ۱۲۱- پبلی کیشنز، کوچہ چیلان، دریا سٹریٹ، نئی دہلی

صفحات: ۹۴۰ قیمت: ۱۰۰ روپے، سال اشاعت: ۲۰۱۱ء

سید فصیح اکمل قادری اردو نعت و غزل کے ایک معتبر شاعر ہیں، آپ شاہ جہانپور کے حضرت مولانا سید انوار حسین قادری کے صاحب زاوے ہیں جو اہل سنت کے ایک بڑے عالم اور خطیب تھے۔ بیک وقت علما و مشائخ، ادبا و شعرا سے آپ کے روالپا رہے ہیں، بزرگوں سے عقیدت آپ کے رگ و پے میں ہے، شعر و شاعری اور ادب و زبان و ادبی لہجے آپ کی وراثت ہے۔ پیش نظر کتاب ”امیر خسرو (میوزیکل اوپیرا) آپ کی خوش عقیدگی، قادر الکلامی، زبان و ادبی اور فصاحت و بلاغت کی ایک مثال ہے۔ ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ فصیح اکمل صاحب نے جن تاریخی حوالوں سے امیر خسرو کے اوراقِ حیات جمع کیے ہیں، ان پر انہیں خود اعتماد نہیں ہے۔ انہیں اعتراف ہے کہ:

”اس وقت تک پروفیسر ممتاز حسین کی کتاب ”امیر خسرو دہلوی: حیات اور شاعری“ شائع نہیں ہوئی تھی، اس کتاب نے بڑے بڑے چغادری محققوں کا پول کھول دیا ہے، افسوس ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا وقت کم و بیش وہی ہے جو میرے اوپیرا کا، اس لیے جہاں پوری دنیا نے اب تک بہت سے حقائق سے چشم پوشی کی ہے، اس اوپیرا میں اور کہی۔“

اوپیرا ادب کی ایک صنف ہے، اس کا تعلق بیک وقت ادب، شعر اور اسٹیج سے ہے، امیر خسرو پر یہ پہلا میوزیکل اوپیرا ہے جسے شاعر نے بڑے خلوص، محبت اور دل جمعی سے لکھا ہے، لیکن افسوس کہ یہ اب تک اسٹیج نہیں ہو سکا۔ پوری کتاب کو میں ایک یا دو نشست میں پڑھ گیا اور محبت، عقیدت، شعریت اور تصوف کا حظ اٹھایا۔

کاش یہ اوپیرا اسٹیج ہو جائے تو پھر اس کے نظارے کا لطف ہی کچھ اور ہوگا۔ شعر و ادب اور تاریخ و فن سے وابستہ افراد کو اس سمت توجہ کرنی چاہیے۔ اوپیرا کی زبان و بیان، اسلوب و آہنگ اور ترتیب و تالیف بے حد خوش گوار اور دل چسپ ہے۔ بعض اشعار مجھے بے حد پسند آئے، جن میں شعریت بھی ہے اور فلسفہ حیات بھی۔ فصیح اکمل صاحب کا ہمیں شکر گزار ہونا چاہئے کہ انہوں نے میوزیکل اوپیرا کے فارم میں حیات خسرو کے چند خوب صورت گوشوں سے ہمیں متعارف کرایا۔

انوار مخدوم (سہ ماہی مجلہ)

ایڈیٹر: ڈاکٹر کفیل احمد

ناشر: مکتبہ شرف، خانقاہ معظم حضرت مخدوم جہاں شیخ شرف الدین احمد منیری، بہار شریف

شمارہ خصوصی، صفحات: ۳۰۴، قیمت: ۱۰۰ روپے

حضرت شیخ شرف الدین منیری قدس سرہ (۶۶۱/۱۲۶۳-۸۴۳/۱۳۸۱) کی ذات گرامی کا شمار ہندوستان کے ان مشائخ صوفیہ میں ہوتا ہے جو باطنی احوال و مقامات میں شرف و منزلت رکھنے کے ساتھ ساتھ علم ظاہری میں بھی تبحر رکھتے تھے۔ ان کے معاصرین سے لے کر آج تک تمام صوفیہ نے ان کی عظمتوں کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے بہت استفادہ کیا ہے۔ خصوصاً ان کے مکتوبات کو تصوف کی دنیا میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ نویں صدی ہجری کی جامع شریعت و طریقت شخصیت حضرت مخدوم شیخ سعد خیر آبادی (۹۲۲ء) قدس سرہ نے بھی رسالہ مکہ کی شرح مجمع السلوک میں آپ کے اور آپ کے رسائل کے بہت حوالے دیے ہیں۔ ان ساری عظمتوں کے باوجود حضرت مخدوم جہاں کی شخصیت پر علمی انداز میں ابھی تک کوئی خاص کام نہیں ہو سکا ہے۔ اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے آپ کی شخصیت پر تین روزہ سیمینار ۲۲ تا ۲۴ نومبر ۲۰۱۱ء منعقد ہوا اور اسی موقع پر انوار مخدوم سہ ماہی کے خصوصی شمارے کی اشاعت ہوئی۔

یہ خصوصی شمارہ چار لسانی ہے۔ رسالے کا بڑا حصہ اردو مقالوں پر مشتمل ہے جن کی تعداد ۲۱ ہے جب کہ عربی اور فارسی میں ایک ایک اور انگلش میں تین مقالے ہیں۔ اس کے علاوہ سات مقالے ہیں اور آغاز میں ایک ادارہ ہے۔ مقالے کبھی گراں قدر ہیں، خصوصیت کے ساتھ اردو زبان میں جو مقالات ہیں وہ حضرت مخدوم جہاں کی ہمہ جہت شخصیت کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ حضرت مخدوم کو علم حدیث، علوم فقہ میں بالخصوص کیسی گہرائی حاصل تھی اور اس سے ان لوگوں کی ترویج ہوتی ہے جو صوفیہ پر یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ وہ تحصیل علم کی طرف توجہ نہیں کرتے اور اسے حجابِ راہِ قرار دیتے ہیں۔ البتہ حضرت مخدوم اور عشق الہی کے عنوان سے تحریر کردہ مقالے میں صفحہ ۴۲ سے ۴۴ تک اور صفحہ ۳۳ سے ۴۵ تک مکرر اور غلط ملط شائع ہو گیا ہے۔ اس کی وجہ سے مقالہ عمدہ ہونے کے باوجود بے وقعت ہو کر رہ گیا ہے۔ فارسی مقالے میں پروف کی متعدد غلطیاں ہیں، مجموعی طور پر یہ شمارہ اچھا ہے لیکن انارٹی بورڈ نے اگر اپنی ذمہ داری اچھی طرح نبھائی ہوتی تو مخدوم جہاں کی شخصیت پر مشتمل یہ شمارہ اور کچھ کر سکتے آتے۔

جانشین خواجہ غریب نواز

مصنف: پروفیسر غلام یحییٰ انجم

ناشر: مکتب خانہ امیدیہ، ملیا محل، جامع مسجد، نئی دہلی-۶

صفحات: ۶۰۷، قیمت: ۵۰ روپے، سال اشاعت: ۲۰۱۰ء

حضرت خواجہ معین الدین چشتی سجوی رحمۃ اللہ علیہ کے قدموں کی برکت سے آج ہندوستان قرون اسلامی بنا ہوا ہے۔ آپ کے بعد آپ کے خلفائے اس ملک پر اپنی نوازشات کا سلسلہ جاری رکھا اور خصوصیت کے ساتھ سلطان المشاغ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ تک تو اس ملک کو چشتیت کے ایمنیساں نے اس قدر فیض یاب کیا کہ کشور ہند لہلہا اٹھا۔ انہیں عظیم شخصیات میں ایک نام جانشین خواجہ غریب نواز حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمۃ اللہ علیہ (۵۶۸-۶۳۴) کا بھی ہے۔ آپ کے احوال و کوائف پر محققانہ انداز میں تقریباً کے برابر کام ہوا ہے، جب کہ ایسی شخصیات کی سیرت و سوانح کو عمدہ انداز میں پیش کرنا جہاں ایک بڑا علمی کام ہے وہیں نسل نو کے لیے رہنمائی کا بھی ذریعہ ہے۔

باعث مسرت ہے کہ خواجہ موصوف کی سوانح پر پروفیسر غلام یحییٰ انجم صاحب نے مختلف قدیم کتابوں کو سامنے رکھتے ہوئے عمدہ اور مادیہ انداز میں اپنے بھرپور علمی ماحول کو کچھ کر دیا ہے۔ حضرت خواجہ غریب نواز کے اس عظیم جانشین سے متعلق مختلف معلومات کا یہ اچھا ذخیرہ ہے جو قاری کو صرف ایک کتاب کے مطالعے سے حاصل ہو جاتا ہے۔ زبان آسان اور علمی ہے۔ اہل علم اور عام قارئین دونوں کے لیے یکساں طور پر کارآمد ہے۔ یوں تو پوری کتاب ہی لائق مطالعہ ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ ریاضات و مجاہدات کے ضمن میں توکل، توبہ و استغفار اور درود و پاک کی کثرت سے متعلق جو آپ کے معمولات کو ذکر کیا گیا ہے وہ سائلین و طالبین کے لیے جہاں توشیح ہدایت ہے وہیں ان لوگوں کے چہروں پر زما لے دار طمانچہ بھی جو اس طرح کے مشائخ کی طرف اپنی نسبت تو کرتے ہیں لیکن ان کے معمولات کو اپنی زندگی میں اتارنے کی کوشش نہیں کرتے۔ یوں ہی ارشادات و تعلیمات والا حصہ بھی مسافران راہ طریقت کے لیے رہنما اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔

کتاب کی پیش کش بالکل اچھی ہے، البتہ ہمارے خیال میں سوانحی کتابوں کی ترتیب و تنظیم اس طرز پر ہو کہ معلومات تو وہی پرانی ہوں لیکن پیش کش میں جدت ہو، معلومات میں اصالت ہو لیکن پیش کش میں عصریت ہو۔ اس طرح اسلوب موثر ہوگا اور لوگ تعارف کی طرف مائل ہوں گے۔

تذکرہ صابریہ

مصنف و ناشر: شاہ محمد انور علی سہیل فریدی

مطبع: اسلامک وڈرز بیورو

صفحات: ۱۵۲، قیمت: ۵۰ روپے، سال اشاعت: ۲۰۱۱ء

تذکرہ نویسی کی روایت بہت قدیم ہے۔ اس سے جہاں لوگوں کے احوال صفحات کے سینے میں محفوظ ہو جاتے ہیں وہیں خصوصاً صالحین کے تذکروں سے آنے والی تسلیں روشنی حاصل کرتی ہیں۔ حضرت سید صابری علی معروف بہ میاں صابر بخش دہلوی تیرہویں صدی ہجری کے چشتی صابری بزرگ ہیں۔ آپ کا مزار دریا گنج دہلی میں ہے۔ آپ زنجیان کے سادات سے ہیں اور آپ کا سلسلہ نسب حضرت امام علی رضا کے واسطے سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے احوال و کوائف، نسبی شجرہ اور سلسلہ طریقت کو اس کتاب میں تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور سلسلہ طریقت کے مشائخ کے بھی مختصر احوال درج کیے گئے ہیں۔ آپ کے ہم عصر مشائخ دہلی کے اسناد ذکر کر کے ان کے احوال بھی اختصاراً بیان کر کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں۔ خلفاء کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور آپ کے بعد ہونے والے سجادہ نشینان درگاہ کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔ آغا ز کتاب میں مظہر علی فریدی اور ڈاکٹر فضل الرحمن مصباحی کے کہے ہوئے سال طباعت سے متعلق قطعاً تاریخ ہیں، اور خواجہ حسن ثانی نظامی نے تعارفی کلمات لکھے ہیں۔ پروف کی کچھ فاش غلطیاں ہیں۔ کتاب کی ترتیب پر از سر نو محنت کر کے اس کو اور بہتر اور مفید بنایا جاسکتا ہے۔

○○○

بالکل سوانحی حیثیت سے کتاب اہم ہے اور خصوصیت کے ساتھ سلسلہ چشتیہ صابریہ کے احوال سے شغف رکھنے والوں کے لیے اس کتاب میں دل چسپی کا سامان ہے۔

مفتی عبید الرحمن رشیدی (صاحبِ مجاہدہ: خانقاہ رشیدیہ، جون پور، یو پی)

خدا کرے آپ بخیر ہوں! میں ادھر کافی دنوں سے علیل چل رہا ہوں۔ آپ کے سوالات کو موصول ہوئے بہت دن ہوئے، مگر جواب کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں آیا۔ اب جب کہ ۱۰ اکتوبر کی تاریخ قریب آپ کی تو فکر لاحق ہوئی مگر کچھ نہ کچھ عواقب و موانع درپیش رہے۔ عزیزی مولوی امیر سلیم سے میں نے کہا تھا کہ ہوسکے تو آپ ہی میری طرف سے جواب مرتب کرو بیچے مگر انھوں نے اپنے طور پر صرف چند سوالات ہی کے جوابات مرتب کیے، باقی میرے حوالے کر دیے۔ بالآخر مجھے ہی مجبور رہونا پڑا۔ آپ کے سوالات کافی معیاری ہیں اور اس معیار پر میرے جوابات نہیں ہیں مگر مجھ سے جو ہو سکا وہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ میں خانقاہ رشیدیہ کا ادنیٰ خادم ضرور ہوں، مگر میں اپنے کو تعارف کے قابل نہیں سمجھتا۔ عزیزی مولوی امیر سلیم کے اصرار پر آپ کی خواہش پر یہ چند حروفِ حوالہ قلم کر دیے۔

شمس الرحمن فاروقی (الہ آباد، یو پی)

کتابی سلسلہ ”الاحسان“ شمارہ ۲۷۰ شکر یہ! میں نے شمارہ جگہ جگہ سے دیکھا اور اسے بہت دل چسپ پایا۔ تصوف اور طریقت کے موضوع پر یہ رسالہ خوب ہے۔ شروع میں کچھ شعری تخلیقات شامل کر کے آپ نے ایک ادبی فضا قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر کوثر مظہری کی فارسی غزل موضوع کے لحاظ سے ٹھیک ہے اگرچہ زبان ناچست ہے اور موضوع کے ساتھ انصاف نہیں کر پاری ہے۔ خواجہ ابوسعید ابوالخیر کا خط ابن سینا کے نام بہت دل چسپ اور سبق آموز ہے۔ مولانا عبدالکبیر نعمانی کا مضمون یقیناً اصلاحی ہے۔ بے شک حسد اور کینہ ہمارے معاشرے کی تباہی کا سامان ہیں۔ نعمانی صاحب نے اس سلسلے میں کثرت سے احادیث یکجا کر دی ہیں لیکن سمجھنے والے اور خود کو راستی پر لگانے والے کے لیے ایک ہی کافی ہے۔ شہباز احمد (سجاش چند) کی داستانِ حیات بہت متاثر کن ہے اور مسرت بخش بھی۔ سچ ہے، اللہ جسے چاہے اپنی طرف بلا لے! اور یہ بھی سچ ہے کہ حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ مدظلہ جیسے صاحبانِ تعارف اب بھی موجود ہیں۔ تحقیق و تنقید اور حاصلِ مطالعہ کے ذیل میں اکثر مضامین بہت معیاری ہیں۔ خسرو کی شخصیت اور صوفیانہ شاعری پر اچھی معلومات اس رسالے میں فراہم کی گئی ہے، لیکن ولی پر مضمون تھوڑے تو ضیع معلوم ہوتا ہے۔

تصوف کے موضوع پر یوں تو خانقاہوں سے مضامین اکثر منظرِ عام پر آتے رہے ہیں لیکن اس موضوع پر یہ رسالہ بہت ہی جامع ہے۔ اس بہترین رسالے کے لیے آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ میں دعا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ آپ کے ہمت و حوصلے کو تقویت دے۔

مکتوبات

میں نے حضرت شیخ کی مثنوی دیکھی۔ جگہ جگہ ان فارسی شعرا کی یاد آئی جو مغلوب الحال اور مغلوب المعرخت رہا کرتے تھے۔ ان کے اشعار میں صلاوت و پاکیزگی بلا کی ہے۔ زبان بھی مجموعی حیثیت سے بہت پاکیزہ اور بامزہ ہے، لیکن آخر میں بطور تشریح جو مضامین بیان کیے گئے ہیں وہ نہ ہوتے تو بہتر تھا؛ کیوں کہ بولوگ قائل ہیں وہ قائل رہیں گے اور جو قائل نہیں ہیں وہ فضول مذہبی بحث میں مبتلا ہو جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ پروفیسر مسعود علوی اور ذیشان صاحب کی انتہائی عالمانہ تحریروں کو الگ سے شائع کیا جائے اور مثنوی اپنی جگہ پر برقرار رہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ دونوں کتابیں بہت کامیاب ہوں گی۔

آخر میں یہ کہنا ہے کہ میرے ذہن میں کچھ اڑتی اڑتی سی خبر حضرت شیخ کے بارے میں تھی، لیکن میں ان کے عارفانہ کمالات سے بالکل بے خبر تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ اب میں ان سے کچھ واقف ہو گیا۔ ان شاء اللہ کبھی زیارت کا شرف بھی حاصل کروں گا۔ ان کی خدمت میں سلام شوق عرض کیجیے۔

پروفیسر یسین مظہر صدیقی (سابق صدر دارالعلوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ) بیکراں اور ہمہ گیر رحمت الہی سے امید واثق ہے کہ آپ سب ہمہ وجہ بخیر ہوں گے اور ساتھ ہی دعا ہے کہ ہمیشہ بخیر رہیں۔ حسب الحکم حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کے افکار کے تقابلی مطالعہ پر مقالہ حاضر خدمت ہے، باقی ”توقانی حساب کم و بیش را“۔

تصوف پر خاص تحقیقی اور علمی مجلہ ”الاحسان“ جاری کر کے آپ سب نے ایک بڑا کام کیا، کہ وہ ایک خاص موضوع ہے۔ اس سے بڑا کام آپ نے یہ کیا ہے کہ مختلف مکاتب فکر کے اہل قلم کو دعوت دی نہیں دی۔ ان کی نگارشات کو شائع بھی کیا۔ تصوف و طریقت کے باب میں افراط و تفریط کا رویہ نیا نہیں ہے اور نہ اچھوتا۔ دوسرے اسلامی علوم فنون کے معاملے میں بھی کج روی ملتی ہے۔ طریقت اسی وقت مسئلہ مفتی ہے جب اسے شریعت کا بدل قرار دے دیا جاتا ہے یا اسے شریعت کا یا دین کا مغز بتایا جاتا ہے۔ شریعت و طریقت کا اصل ارتباط یہ ہے کہ شریعت کل ہے اور طریقت اس کا اک جز اور وہ بھی شرعی قواعد اور دینی قوانین سے مشروط۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں شریعت کے باب میں دنیا میں بھی مواخذہ ہو گا اور آخرت میں بھی۔ تمام اکابر صوفیہ کرام کا اس پر اتفاق ہے۔

الاحسان کا دوسرا شمارہ نقش اول سے بھی بہتر ہے، اگرچہ اس میں کتابت و پروف ریڈنگ کی غلطیاں زیادہ ہیں۔ مقالات اور انتخابات اور ان کے عناوین اور سرخیاں بھی بہت معیاری، جاذب اور دلکش ہیں کہ باوجود وساغر کے بغیر بات نہیں مفتی۔ حضرت ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کے

اپنے کلام عالی مقام کے علاوہ ان پر بعض نگارشات عمدہ ہیں لیکن ابھی ان پر زیادہ وقیع کام کی ضرورت ہے۔ فقیر، مستحکم اور صوفی کے درجات میں حضرت شیخ مثنوی نے بڑے پتے کی بات کہی ہے کہ معصوم تو صرف انبیاء علیہم السلام ہیں اور باقی سب قائل نقد۔ حسد و کینہ کی تباہ کاریاں ہی تو اصلاً اس امت مرحومہ کی مہرادی کی قومہ وار ہیں اور حضرات صوفیہ نے اسلامی مفکرین کی طرح ان کا علاج کیا ہے۔ مولانا عبدالکیمین نعمانی نے دونوں نقاط نظر کا خوب احاطہ کیا ہے۔ جناب شہباز احمد (سجاش چند سابق) کا معمول چشتی مسلمانوں کے لیے ایک تازیانہ ہے اور اہل طریقت کے لیے بھی ایک سبق، مگر اصل اسلام سے وابستگی ہے، جسے انھوں نے خدا کی طرف واپسی سے تعبیر کیا ہے۔

مختصر اور تنقیدی مضامین میں مولانا لئیمین اختر مصباحی، پروفیسر اختر الواسع اور مولانا مبارک حسین مصباحی وغیرہ کے مضامین ناثراتی زیادہ ہیں۔ تحقیقی مضامین میں شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف، مسائل تصوف احادیث کی روشنی میں اور کشف الجوب کا مطالعہ خاص و دلچسپ ہیں۔ ابن تیمیہ پر ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری کا مضمون بہت قابل قدر ہے، اسے بھی شائع کرنا چاہیے تاکہ دونوں اطراف تحسین و تنقید سامنے آجائیں۔ حاصل مطالعہ کے تحت مضامین اچھے ہیں، لیکن بعض میں افراط و تفریط خاصا ہے۔ پروفیسر مسعود انور علوی سے ذاتی واقفیت ہے اور ان سے محبت بھی، لیکن ان کے صوفی افکار میں غلو اور بے اوقات کرامات و خوارق وغیرہ پر حد سے زیادہ زور تحقیقی کا نتیجہ لگتا ہے۔ شریعت سے وابستگی اور اخلاص کے وعدے تو سب کو ہیں لیکن اس پر عمل اصل کسوٹی ہے۔ خانقاہ کا نظریہ تقلید پر مضمون تحقیقی ہے۔ مضمون نگار اور مضمون دونوں کا حوالہ دے بغیر عرض ہے کہ رسول اکرم ﷺ کے بارے میں عالم الغیب ہونے کا نظریہ فاسد اور گمراہ کن نہیں بلکہ غیر اسلامی ہے۔ بلاشبہ آپ کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے قیمتی امور سے آگاہی بخشی تھی اور نبوت محمدی اس کی ہی ایک عمدہ مثال ہے، تاہم قرآن کریم کے اعلان کے مطابق آپ عالم الغیب نہ تھے۔ عالم الغیب والہا دۃ صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اس لیے صاحب موصوف کا یہ کہنا کہ آپ ﷺ ”ساکنان و صابکون“ کے عالم الغیب تھے، سراسر غلط ہے۔ ایسی ہی غلو آمیز باتوں نے تصوف و طریقت کے بارے میں اہل ظاہر کو سخت باتیں کہنے کا موقع دیا ہے۔

کتابوں پر تبصرے بھی عمدہ ہیں۔ ڈاکٹر محمد عبدالحق انصاری کی کتاب ”مجدد دین امت اور تصوف“ پر آپ کا تبصرہ تو ازن ہے۔ خاک سار نے بھی اس پر تبصرہ لکھا تھا جو اردو بک ریویو میں چھپا تھا۔ جی چاہتا ہے کہ ”حضرت شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی صوفیانہ تشریح حدیث“ پر آپ ایک تبصرے چھاپیں اور خاک سار کو احسان مند بنائیں۔

مکتوبات میں بھی بعض عمدہ تبصرے آئے ہیں اور بعض صرف محسنی ہیں۔ مولانا عبدالکیمین

نعمانی کا مکتوب دل چہرہ پہ بھی ہے اور اہم بھی - شروع احمد عظمیٰ معباجی کا مکتوب بھی خاص اہم ہے اور متوازن بھی - شیم طارق صاحب ادیب و صحافی کے ساتھ عمدہ شخص ہیں اور صاحب نظر بھی - ان کی بعض آرا بہت چشم کشا ہیں - جناب صادق رضا معباجی سے شکوہ نہیں کہ وہ مجھے تصوف کے مخالفین میں سمجھتے ہیں - میرا مسئلہ یہ ہے کہ اہل ظاہر اور سخت قسم کے اصلاحی مجھے تصوف زدہ بتاتے ہیں اور اہل تصوف مخالف تصوف و طریقت - دراصل بقول مشتاق یوسفی ”تج مڑک پر چلنے پر راری دونوں طرف کی زد میں آجاتا ہے“ میں اس اعتراف و اعلان میں پاک نہیں سمجھتا کہ شریعت پر خالص عمل ہی طریقت تک لے جاتا ہے، لہذا حضرات صوفیہ نے اسی کی ترکیب سکھائی ہے - البتہ جس نے اور جب شریعت و دین کے جاوہ سے ذرا بھی انحراف کیا اس نے اسی قدر طریقت کا بیڑا غرق کیا - اسلامی تصوف کی اصطلاح پر سمجھ لوگ ہنستے ہیں اور روایتی تصوف اس سے مراد لیتے ہیں - میں اسلامی تصوف کا قائل نہیں اس پر عامل بھی ہوں - البتہ کتاب و سنت سے فکری، نظری اور عملی اختلاف سے اتفاق نہیں کرنا خواہ کسی نے کیا ہو - اسلامی تصوف وہی ہے جو قرآن و حدیث میں ہے اور جن سے صوفیہ نے بھی اخذ کیا ہے - آپ کے حکم کی بنا پر تبصرہ طویل ہو گیا - معذرت کروں طوالت کی یا اظہار مسرت کروں قبول ارشاد کی؟ ایک اور مشکل آگئی ہے سامنے -

ڈاکٹر سید علیم اشرف جانیسی (شعبہ عربی، مولانا آزاد انسٹیٹیوٹ، حیدرآباد)
خانقاہ عالیہ عارفیہ سید سراہاں کے علمی و دعوتی سلسلہ کتاب مجلہ الاحسان کا دوسرا شمارہ پیش نظر ہے - قلب و نظر کی حالت و گہر ہے - جیسے صحرا میں بھٹکنے والے کو کوئی شجر سایہ دار مل جائے، جیسے تنگی سے جاں بلب کو جام لب لباب میسر ہو جائے، جیسے امید کی گندھیرے میں غلطیاں و پیچاں کو امید کی کوئی کرن نظر آجائے اور جیسے کسی ڈوبتے ہوئے کو کوئی سہارا مل جائے - مجلہ صوری اور معنوی ہر دو اعتبار سے ایک علمی و تحقیقی مجلے کے نمایاں شان ہے -

ناسپاسی ہوگی اگر ہم اپنی گفتگو کا آغاز خانقاہ عارفیہ کے مسند نشین کے تین اپنے اظہار تشکر و امتنان سے نہ کریں، جنہوں نے ہوا کے رخ پر عزیمت کا یہ چراغ جلانے کی کوشش کی ہے جب کہ ہر چہار سو رخصت کے اندھیرے چھائے ہوئے ہیں - ہمارا یہ یقین ہے کہ آنے والا وقت تصوف کا ہے - شدت پسندی کی ڈوبتی ہوئی قبض سست سے سست تر ہوتی جا رہی ہے - وہشت گردی و شدت پسندی سے بیزار مسلمانوں کی نئی نسل ایک متبادل کی تلاش میں ہے اور وہ متبادل تصوف کے سوا کچھ نہیں ہے، جس پر بد قسمتی سے تحریفات و توہمات کا غبار چھایا ہوا ہے، جس نے روحانیت کی اس دولت کو عامۃ الناس کی نظروں سے محجوب کر رکھا ہے - آج کشف محجوب کی ضرورت ہے تاکہ حقیقی تصوف کی طرف لوگوں کی واپسی ہو سکے - آج تصوف کے تزکیے کی

ضرورت ہے تاکہ مادہ پرستی کی آلودگیوں میں گرفتار قلوب کا تزکیہ کیا جاسکے اور تصوف کے تزکیے کے اس عمل سے جتنی جلدی عہدہ بردار ہوا جاسکے اتنا ہی اسلام اور انسانیت کے حق میں بہتر ہے - آج ہماری دنیا کے دو سب سے قریب وہ مہلک امراض مادہ پرستی اور شدت پسندی ہیں اور تصوف ان دونوں امراض کا ماہر ہے، بلکہ تیسرے بڑے گروہ یعنی نفس پرستوں اور بے عملوں کے لیے بھی یہ ایک مفید دوا ہے - مشرق و مغرب میں تصوف کے واپسی کی آہٹ محسوس کی جا رہی ہے - شاید کاہن تقدیر نے ہندوستان و جنت نائن میں تصوف کے عہدوں کے لیے تمہید اور راہ ہمواری کا اعزاز خانقاہ عارفیہ کے لیے مختص کر دیا ہے - ”ذلک فضل اللہ یوقیہ من یشاء“ اس ہیقت و مہارت کے لیے مجلہ الاحسان کے مدیر، مرتبین، معاونین اور ان کے مربی و ہادی صاحب سجادہ داعی اسلام شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی دامت فیوضہ کی خدمت میں ہدیہ تحریک پیش کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ حضرت والا کی توجہات و جہات کا یہ سلسلہ دراز رہے گا -

الاحسان کے مرتبین و معاونین سے مجھے کسی قدر شناسائی حاصل ہے - یہ تمام افراد نوجوانوں کے جوش و خروش اور یوزوں کے حکمت و تدبیر سے آراستہ ہیں - ان کی بنیادی خوبی یہ ہے کہ یہ اصالت اور عصریت دونوں کے جامع ہیں اور دعا و مصلحین کا یہی بہترین رشتہ سفر ہے - فکر میں اصالت اور پیش کش میں عصریت کا میاں کی ضمانت ہے - فکر کا غیر اہمیل ہونا جس قدر نقصان دہ ہے، پیش کش کا غیر محسوس ہونا بھی اتنا ہی ضرر رساں ہے - بلاشبہ مجلہ الاحسان موضوع اور ہدف کی اصالت اور تقدیم و پیش کش کی عصریت کا ایک حسین امتزاج ہے - ان شاء اللہ تعالیٰ ”إلیٰ التصوف من جدید“ کی مہم میں یہ مجلہ ایک سنگ میل ثابت ہوگا -

جس روحانی قیادت اور عملی ادارت کے سائے میں یہ مجلہ نکل رہا ہے، مجھے پورا یقین ہے کہ یہ نہ صرف لوگوں کے لئے حقیقی اور عملی تصوف کی بازیافت میں مددگار ہوگا بلکہ بہتوں کے شکوک و شبہات کو دور کرنے میں بھی معاون ہوگا - یہ مجلہ علوم اور فلسفہ تصوف کے بجائے تصوف کے اعمال و اخلاق پر مرکوز رہے گا - لوگوں کو ہر آنے کے بجائے انہیں جیتنے کی سمت پیش قدمی کرے گا اور علوم تزکیہ کے بجائے احوال تزکیہ کو تیار دہا بہت دے گا؛ کیوں کہ تصوف کا مقصد و علم تزکیہ حاصل کرنا نہیں بلکہ حالت تزکیہ حاصل کرنا ہے اور دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، جیسے کہ علم صحت اور حالت صحت میں ہوتا ہے - علم صحت امراض سے محفوظ رہنے کی ضمانت نہیں ہے بلکہ حالت صحت مطلوب ہوتی ہے - اسی لیے قرآن مجید میں یعلمہم التزکیہ (تزکیہ سکھاتے ہیں) یا یعظمہم التزکیہ (عظم تزکیہ عطا کرتے ہیں) کے بجائے یزکیہم فرمایا گیا یعنی ان کا تزکیہ فرماتے ہیں - صوفی وہ ہے جو حالت تزکیہ رکھے یا اس کے لیے کوشاں ہو - علم تزکیہ رکھنے والا یا حاصل

کرنے والا صوفی نہیں متصوف ہوتا ہے۔ ایک تیسرا بھی ہوتا ہے جس کے پاس نہ علم نہ کیرہ ہوتا ہے اور نہ حالت نہ کیرہ ہوتی ہے، جنہیں متصوف یا متصوف کہا جاسکتا ہے۔ آج درگاہ نظام میں یہی تیسرا عنصر غالب ہے۔ ان تینوں طبقات کو صوفیہ یوں بیان کرتے ہیں کہ: صوفی صاحب ”وصول“ ہوتا ہے، متصوف صاحب ”اصول“ ہوتا ہے جب کہ متصوف محض فضول ہوتا ہے۔

مچلے کا سر ورق بے حد جاذب نظر اور صوفیانہ ہے جو روایتی اثرات سے پوری طرح پاک و صاف ہے۔ علمی و تحقیقی محلات کا سر ورق ایسا ہی ہونا چاہیے۔ پیشانی پر مرقوم مترجم آیت قرآنی بے حد معنی خیز اور مچلے کے اہداف و مقاصد سے بے حد ہم آہنگ ہے۔ تصوف کی ایک عہد ساز شخصیت حضرت خواجہ ابو سعید ابوالخیر رحمہ اللہ کے نام اس عدد کا انتخاب بھی بے حساب معنویت کا حامل ہے۔ یہ مچلے کے ہم گیر اور آفاقی اہداف کی بھی نشان دہی کرتا ہے اور عہد سازی کے عزم پر بھی دلالت کرتا ہے۔

مچلے کے مشتملات کا ہمہ جہتی تنوع خواہ مضامین کے اعتبار سے ہو، خواہ مضمون نگاروں کے لحاظ سے ہو یا پھر ذیلی عناوین کی حیثیت سے ہو، بے حد خوب ہے۔ ذیلی عناوین کا تعین مجلس ادارت کے حسن ذوق اور تحقیق نظر کی دلیل ہے۔ اتنے سارے عناوین کے تحت مقالے لکھوانا اور ان کے لیے مناسب افراد تلاش کرنا اور مضمون لکھنے کے لیے انہیں آمادہ کرنا، یہ سب جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہے۔

باوہ و ساغر کا ہر جام طویل مقالوں سے بہتر ہے۔ احوال میں ابتدا سیئہ اور اداوت دونوں ہی حسب حال ہیں۔ ابتدا سیئہ میں مدیر محترم نے شمارے کی پیش کش بے حد سادہ اور پروقار انداز میں کی ہے۔ یہی علمی محلات کا حقیقی رنگ و آہنگ ہوتا ہے۔ وادرات میں موجودہ دور کی فکری کشاکش کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے اور معاصر تصوف کو درپیش مسائل کی بڑی درست نشان دہی کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنی اس حقیقت بیانی کو ”تخیلاتی“ قرار دے کر غالباً صرف اپنی تواضع کا اظہار کیا ہے۔ صاحب وادرات عزیز القدر رؤیشان احمد صاحبی کے فکر و قلم سے مستقبل میں کافی امیدیں کی جاسکتی ہیں۔

امریکا اور یورپ سے حد روتخولیف (ڈارٹا) دراصل شدت پسندوں کی اعلامی پالیسی کا حصہ ہے۔ دوسروں سے خوف اور نفرت ولا کر ہی یہ اپنے ہم نواؤں میں اضافہ کرتے ہیں۔ امریکی خطرات کا مبالغہ آمیز ذکر اور قوم کی ہلاکت و ہربادی اور پستی و مجبوری کے لیے ہمیشہ مغرب کو مورد الزام قرار دینا نہ صرف خلاف واقعہ ہے بلکہ اپنی مائیتوں اور کٹاہیوں کے اعتراف و تدارک سے غرار بھی ہے۔ شدت پسندوں اور بعض قوم پرستوں کے پرو پگنڈے کے زیر اثر ہمارا یہ مزاج بنتا جا رہا ہے کہ ہم اپنے تمام مسائل کے لیے امریکا کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں اور ”ہا اصابکم من

مصيبة فيما كسبت ايديكم“ کے قرآنی اصل کو فراموش کر دیتے ہیں۔ شدت پسند حضرات امریکا اور مغرب کے لیے ایسے ایسے تصرفات کا اثبات کرتے ہیں جو وہ انتہائے کرام اور اولیاء کے لیے بھی نہیں مانتے۔ اس منطقی سوچ کا خاتمہ ہونا چاہیے۔ یہاں کسی کی صفائی مقصود نہیں ہے، بلکہ قرار واقعی صورت حال کو پیش کرنا مطلوب ہے۔ ہماری توجہ اس پر ہونی چاہیے کہ ہمارا لائحہ عمل کیا ہو۔ ہم خود اپنی مقلوبیت کے ذمہ دار ہیں اور ہماری شکست خوردگی کی قابلیت ہماری پستی و مجبوری کا اولین سبب ہے اور اسی شکست خوردگی کی قابلیت کا علاج ہماری پہلی ضرورت ہے۔ جیسا کہ مالک بن نبی نے کہا ہے کہ پہلے استعماریت کی قابلیت کسی قوم میں پیدا ہوتی ہے پھر کوئی مستعمر اور نوآباد کار پیدا ہوتا ہے۔ لہذا استعمار کے لیے استعماریت کی قابلیت پہلے اور مستعمر بعد میں ذمہ دار ہوتا ہے۔

اہل تصوف کو کسی قوم یا جغرافیائی خطے کے تئیں معاندانہ نقطہ نظر نہیں رکھنا چاہیے، بلکہ سب کی اصلاح و ہدایت ہمارا مقصد ہونا چاہیے۔ خیال رہے کہ بحیثیت مجموعی امریکا ایک ایسی قوم ہے جس کی دنیا اچھی اور آخرت خراب ہے۔ شدت پسند یہ چاہتے ہیں کہ آخرت کی طرح ان کی دنیا بھی خراب ہو جائے اور ہمارا صحیح فکر و عمل یہ ہونا چاہیے کہ ان کی دنیا کی طرح ان کی آخرت بھی اچھی ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ امریکا کی آخرت کا اچھا ہونا اس کی دنیا خراب ہونے سے اچھا ہے۔ اسلام کے لیے بھی اور انسانیت کے لیے بھی۔ تصوف انسانیت سے نفرت کے بجائے اس کے لیے نفع بخش بننے کی تعلیم دیتا ہے اور اللہ کی زمین پر یہی استقرار و استمرار کا ذریعہ ہے۔ **سوا اھما ینفع الناس فیہمکھ فی الارض۔**

بادہ کہنہ کے دونوں جام سرور آگئیں ہیں۔ بادہ کی تو خوبی ہی یہی ہوتی ہے کہ جس قدر کہنہ ہوا تباہی سرور بخش ہوتا ہے۔ ”صوفیہ کے اعتقادی و اصولی مسائل“ میں ترجمہ کسی قدر لفظی ہونے کے باوجود خوب ہے۔ شیخ الرکبیں اور شیخ الصوفیہ کے درمیان مکاتبت بھی صوفی ادب کا حصہ ہے۔ اگرچہ اس کا وجود اور اس کے مشتملات دونوں مختلف فیہ ہیں۔

باب تذکیر مچلے کی روح اور عملی تصوف کا آئینہ دار ہے۔ شیخ مدظلہ العالی کے افادات جنہیں محب الرحمن غنی نے ”فقہ، متکلم اور صوفی کے درجات“ کے عنوان سے بڑے سلیقے کے ساتھ مرتب کیا ہے، بے حد روح پرور اور ایمان افروز ہے۔ ان افادات کا حاصل وہی ہے جسے خود ایک بڑے صوفی نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے: ”الصوفی اکثر من فقیہ، فالفقیہ من وقف عند الاقوال والصوفی اکثر من عابد إذ العابد من وقف عند الأعمال وأما الصوفی فہو من جمع بینہما فائتمر الأحوال“ چوں کہ صاحب احوال یعنی صوفی اقوال و اعمال دونوں کا جامع ہوتا ہے لہذا اس کا درجہ دونوں سے سوا ہوتا ہے۔ اسے یوں بھی سمجھا جاسکتا

ہے کہ معرفت الہی کا درجہ احکام الہی کی معرفت سے بڑا ہوتا ہے۔ تصوف کی تو ایک تعریف ہی کی گئی ہے کہ: ”علم یعرف بہ فقہ المعرفة“ یعنی تصوف ایسا علم ہے جس سے معرفت الہی کی فقہ کو جانا جاتا ہے یا حاصل کیا جاتا ہے۔ اس کی وضاحت امام اہل سنت احمد ابن حنبل کے اس قول سے بھی ہوتی ہے جو آپ نے بشر حافی کے بارے میں فرمایا تھا کہ: ”اللہ کی شریعت کی معرفت مجھے بشر سے زیادہ ہے لیکن اللہ کی معرفت بشر کو مجھ سے زیادہ ہے۔ صوفی اور غیر صوفی میں وہی فرق ہوتا ہے جو عارف بالغایہ اور عارف بالوسیلہ میں ہوتا ہے۔ واضح رہے کہ یہاں مجر و عالم کی بات کی جارہی ہے، ورنہ بے شمار عالم اعلیٰ و رجب کے صوفی بھی ہوئے ہیں۔ یہ ایک دلہرا تہ تحریر ہے۔ علمی صاحب نے اس صوفی فکر کو صوفی اسلوب میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

اس باب میں مولانا عبدالمبین نعمانی کا مقالہ بھی نہایت دل پذیر ہے اور یقیناً افروز ہے۔ اس قسم کی اصلاحی و تذکیری تحریروں کا ہر شمارے میں ہونا ضروری ہے بلکہ کیا ہی خوب ہوا اگر مقالہ نگار جیسے عالم باعمل اور علم و تصوف کے جامع ہی اس بات کی ذمہ داری قبول فرمائیں تاکہ تذکیر و تائید دونوں جمع رہیں۔

تحقیق و تنقید کا پہلا مقالہ محض تاثراتی ہے اگرچہ مقالہ نگار ایک بلند پایہ محقق اور قلم کار ہیں۔ اس مقالے کا عنوان ہے: ”تصوف - ایک انقلاب کی ضرورت“، اول جہلہ میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مراد تصوف میں انقلاب کی ضرورت ہے یا تصوف کے ذریعے انقلاب کی ضرورت ہے، مگر اس مختصر اور جامع مقالے کو پڑھنے کے بعد پتا چلتا ہے کہ مقالہ نگار کا مقصد دونوں ہیں۔ وہ تصوف میں بھی انقلاب لانا چاہتے ہیں اور پھر تصوف کے ذریعے بے سمتی کا شکار اور تلاش حق میں سرگرواں دنیا میں بھی انقلاب لانا چاہتے ہیں۔

اس باب میں اگلا مقالہ مشہور اسلامی اسکالر، صاحب تصانیف کثیرہ، نقوش ایوارڈ سمیت متعدد علمی اور تحقیقی ایوارڈ یافتہ، بین الاقوامی شہرت کے حامل مصنف پروفیسر یحییٰ مظهر صدیقی صاحب کا ہے۔ راقم السطور ان کا باضابطہ شاگرد تو نہیں ہے لیکن ان سے بہت کچھ اخذ و استفادہ کیا اور خود کو ان کے زمرہ شاگردوں میں سمجھتا ہے۔ ان کے مقالے کا عنوان ہے: ”تصوف کی اجمالی تاریخ“، راقم السطور کو اس مقالے کے بیشتر نکات کو براہ راست موصوف سے سننے کا اتفاق ہوا ہے۔ حضرت حسن بصری اور سیدنا علی کرم اللہ وجہہ کی ملاقات، تناقل اذن و خرقہ پوشی کی روایت، صوفیہ کے اعمال و اشغال اور طریقت وغیرہ تصوف کے ہامشی اور ثانوی مسائل ہیں، جنہیں مستشرقین و متصوفین و مترجمین بالتصوف وغیرہ نے ہوا دی ہے، ہم تصوف سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں اور نثران کے اثبات و ثنی سے تصوف پر کوئی اثر پڑتا ہے۔

فاضل مقالہ نگار نے تصوف و طریقت کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت و تعلق کو روایتی خیال اور بے اصل قرار دیا ہے اور اس مفہوم کو نصف درجن سے زائد بار مختلف اسلوب اور بیرونی میں بیان کیا ہے، علی سہیل المثال فرماتے ہیں کہ:

”روایتی نقطہ نظر کے حاملین کرام تصوف کے استناد و اعتبار کے لیے اس کا رشتہ قرآن و سنت سے جوڑتے ہیں“ (ص: ۷۰)۔

”مشتہور و عام روایتی خیال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس طریقت کی بنیاد ڈالی“ (ص: ۷۰)۔

”ذات نبوی سے مسلسل اور غیر منقطع سلسلہ کی خاطر یہ خیال بھی پروان چڑھایا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام کو خاص علم طریقت عطا کیا“ (ص: ۷۰)۔

”تصوف و طریقت کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے وابستگی اور ان کی ذات و خدات کو سرچشمہ بنانے کی کوشش دراصل اس کو اسلامی رنگ دینے اور معتبر و مستند بنانے کی عام طبعاتی کوششوں کا ایک حصہ ہے“ (ص: ۷۵)۔

یہ اور ان جیسی متعدد دعوایوں کے ذریعے اس بات کو راسخ کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام سے تصوف و طریقت کی نسبت روایتی، فرضی اور غیر تحقیقی ہے جب کہ مقالہ نگار کے نزدیک علماء و محققین کے خیال میں ایسا نہیں ہے، چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

”محققین علماء و محدثین اور صوفیہ بھی تاریخی حقائق و شواہد کے ناظر میں طریقت کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیتے ہیں تو دوسری صورت نظر آتی ہے“ (ص: ۷۰)۔

مزید فرماتے ہیں کہ:

”بیشتر محققین صوفیہ و علماء کے مطابق تصوف و طریقت کا عہد نبوی اور عہد صحابہ و تابعین و تبع تابعین میں وجود نہ تھا، وہ دوسری صدی ہجری کے اواخر یا تیسری صدی ہجری کے اوائل کا ایک علمی، فکری اور تحریری ارتقاء ہے“ (ص: ۷۶)۔

”محققین کا ایک روایتی خیال سے پورا اتفاق نہیں ہے“ (ص: ۷۱)۔

یہ تمام اقوال نہ صرف اسی مقالے میں مندرج حقائق سے نا آہنگ ہیں بلکہ تصوف اور علم تصوف میں فرق نہ کرنے کی دلیل بھی ہیں۔ اس کے بعد مقالہ نگار نے پھر ایک تقسیم فرمائی ہے (ص: ۷۱) لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ یہ تقسیم سابق کی طرح محققین و غیر محققین کے مابین ہے یا پھر محققین کی دو قسمیں ہیں، اور اگر محققین کی تقسیم ہے تو یہ روایتی خیال سے مکمل اختلاف رکھنے والے محققین کی ہے یا پورا اتفاق نہ رکھنے والوں کی ہے۔ بہر کیف! اس تقسیم کے بعد رسالہ فقیرانہ سے

ایک طویل اقتباس دیا گیا ہے اور غالباً اس بات کی دلیل کے طور پر کہ تصوف و طریقت کا آغاز تبع تابعین کے بعد ہوا، اگرچہ نہ اقتباس سے قبل مقالہ نگار نے اس کی کوئی وضاحت کی ہے اور نہ اقتباس شدہ عبارت میں اس کا ذکر ہے، برخلاف اس کے رسالہ تفسیریہ میں تصوف کا آغاز یا اس کی تاریخ موضوع ہی نہیں ہے بلکہ اس میں صوفی کے تسمیہ کے آغاز کا بیان کیا جا رہا ہے، جس کا مفاد یہ ہے کہ صحابہ اور تابعین کے عہد میں تصوف تھا اور وہ حضرات اسے برتتے بھی تھے لیکن نسبت صحابیت اور تابعیت کی عظمت و جلالت کے سبب انہیں صوفی نہیں کہا گیا۔

امام تفسیری فرماتے ہیں:

”اعلموا، رحمکم اللہ تعالیٰ، أن المسلمين بعد رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يسموا افاضلهم في عصرهم بتسمية علم سوى صحبة رسول الله صلى الله عليه وسلم إذ لافضيلة فوقها، فقبل لهم صحابة.

ولما أدرکہم اهل العصر الثاني سمي من صحب الصحابة: التابعين ورأوا في ذلك أشرف سمة ثم قبل لمن بعدهم اتباع التابعين ثم اختلف الناس وتباينت المراتب فقبل لخواص الناس ممن لهم شدة العناية بأمر الدين: الزهاد والعباد ثم ظهرت البدع وحصل التلذذ بين كل الفرق فكل فريق ادعوا ان فيهم زهاداً“۔

رسالہ تفسیریہ کی یہ وہ عبارت ہے جس کا ترجمہ مقالہ نگار نے درج کیا ہے۔ اصل عبارت کو پڑھنے سے یہ بات پوری طرح واضح ہے کہ اس میں تصوف کے آغاز و ارتقا کی بات ہی نہیں ہو رہی، بلکہ اس میں وہی بات کی جارہی ہے جو ابھی ذکر کی گئی۔ علاوہ ازیں ترجمے میں کافی حذف و اضافہ بھی ہے اور سب سے اہم یہ ہے کہ اگر رسالہ تفسیریہ کی عبارت سے دو اگلی سطروں کا ترجمہ بھی کر دیا جاتا تو بات پوری طرح سے واضح ہو جاتی۔ چنانچہ امام تفسیری فرماتے ہیں کہ جب ہر ایک فرقہ یہ دعویٰ کرنے لگا کہ ان کے اندر زہاد ہیں تو:

”فانفرد خواص اهل السنة المراعون انفسهم مع الله تعالى، المحافظون قلوبهم عن طوارق الغفلة باسم ”التصوف، واشتهر هذا الاسم لهؤلاء الاكابر قبل المائتين من الهجرة.“

(یعنی وہ خواص اہل سنت جو اللہ کے ساتھ اپنے انفس کا پاس رکھنے والے تھے اور جو اسباب غفلت سے اپنے دلوں کی حفاظت کرنے والے تھے، تصوف کے نام سے علاحدہ ہو گئے۔ دوسری صدی ہجری سے قبل ہی ان بزرگوں کے لیے یہ نام مشہور ہو گیا تھا۔)

اس آخری فقرے سے صاف طور پر ظاہر ہے کہ یہاں تصوف و طریقت کے آغاز کی بات نہیں ہو رہی ہے بلکہ امام تفسیری ان تسمیات و مصطلحات کے استعمال کے آغاز و ابتدا کے بارے میں گفتگو فرما رہے ہیں۔

تصوف کی بنیاد کتاب و سنت پر ہے اس پر کم از کم بھی صوفیہ کا، محققین ہوں یا غیر محققین، کھلی اتفاق ہے۔ ان سب کی نمائندگی کرتے ہوئے محدث مغرب شیخ محمد صدیق غامری رحمہ اللہ ایک استفتاء کے جواب میں فرماتے ہیں کہ:

أما أول من أسس الطريقة فلتعلم أن الطريقة أسسها الوحي السماوي في جملة ما أسس من الدين المحمدي، إذ هي بلاشك مقام الإحسان الذي هو أحد أركان الدين الثلاثة التي جعلها النبي صلى الله عليه وسلم، بعد أن بينها واحدا واحدا، ديناً۔

(رہا یہ سوال کہ تصوف کی بنیاد کس نے ڈالی تو جان لو کہ اس کی بنیاد وحی آسمانی سے ہے جیسا کہ دین محمدی میں جو کچھ ہے سب کی بنیاد وحی الہی نے ڈالی ہے۔ بلاشبہ تصوف وہی ہے جسے حدیث شریف میں احسان کہا گیا ہے اور یہ دین کے تین ارکان میں سے ایک رکن ہے (حدیث جبریل میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کو ایک ایک کر کے ذکر کرنے کے بعد دین قرار دیا ہے۔)

اس ضمن میں مقالہ نگار نے شیخ جویری کی ایک عبارت نقل کی ہے جسے یوں ترجمہ کیا ہے:

”صحابہ کرام اور سلف صالحین کے زمانے میں یہ نام موجود نہ تھا لیکن اس کی حقیقت ہر شخص میں جلوہ گر تھی“، یعنی یہ عبارت بھی رسالہ تفسیریہ کی عبارت کی مانند مقصود کے خلاف ہے۔

اس کے بعد محترم پروفیسر صاحب نے ”ہر شخص“ کے عموم کو مبالغہ آمیز محسوس کیا لیکن ساتھ ساتھ یہ بھی لکھا ہے کہ: ”یہ حقیقت ہے کہ عہد نبوی اور عہد صحابہ کرام کے کارہ خواص میں تو بلاشبہ یہ حقیقت موجود تھی اور عوام کی اکثریت بھی اس سے خالی نہیں تھی۔“ (ص: ۷۲)

اگر مؤرخ لڈکرا تبتباس خود مقالہ نگار کا ہے تو یہ بذات خود ایک طرفی ہے اور صاحبان دعووں سے متصادم ہے جن میں خیر القرون میں تصوف کے وجود کو روایتی اور غیر تحقیقی قرار دیا گیا ہے۔

تیسرا حوالہ عوارف المعارف کا ہے جس کی کوئی عبارت تو نہیں دی گئی ہے البتہ ان کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ وہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ تصوف اور طریقت کا سلسلہ دراصل دوسری صدی ہجری یا نویں صدی عیسوی کے بعد ہی ہوا تھا“ (ص: ۷۲)۔

جب کہ عوارف المعارف میں ایسا کچھ بھی نہیں ہے، جہاں سے یہ مفہوم لیا گیا ہے وہ کتاب

کاباب اول ہے اور اس کا نام ہی ہے: ”الباب الاول فی ذکر منشأ علوم الصوفیة“ یعنی اس میں تصوف و طریقت کی نہیں بلکہ ان کے علوم و مصطلحات کی بات کی جا رہی ہے۔

مقالہ نگار فرماتے ہیں کہ: ”اور ابو یاسم صوفی کو شیخ شہاب الدین سہروردی نے اولین صوفی قرار دیا ہے“ (ص: ۷۱)۔ جب کہ صاحب العوارف نے یہ کہا ہے کہ انہیں سب سے پہلے صوفی کہا گیا ہے، یعنی صوفی کی اصطلاح سب سے پہلے ان کے لیے استعمال کی گئی اور اس بات کو بہت سے صوفیہ اور اصحاب سیر نے بیان کیا ہے۔

دراصل تصوف کے آغاز کو لے کر یہ سارا ابہام اور ساری غلط فہمی تصوف اور علم تصوف میں امتیاز نہ کرنے کے سبب ہے۔ تصوف الگ چیز ہے اور علم تصوف الگ چیز ہے۔ علما و صوفیہ دوسری صدی یا اس کے تھوڑا پہلے یا بعد سے جس چیز کے آغاز کا ذکر کرتے ہیں وہ علم تصوف ہے، تصوف نہیں ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور وحی آسمانی سے جسے نسبت دیتے ہیں وہ تصوف ہے علم تصوف نہیں ہے۔ صحابہ کرامؓ اور تابعین عظام کو علم تصوف کی ضرورت نہیں تھی جیسے انہیں علم حدیث، علم کلام، علم تفسیر اور علم اصول فقہ کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی مثال تو اس خالص عربی جیسی تھی جو بغیر نحو و صرف و بلاغت کے ادب کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہو اور شعر و خطابت کی قدرت رکھتا ہو، لیکن جب قرون اولیٰ کے بعد لوگوں میں بگاڑ پیدا ہونے لگا تو دوسرے علوم کی طرح علم تصوف کی تالیف و تدوین کا کام کیا گیا۔ اسی بات کو ابن خلدون اپنے مقدمے میں یوں لکھتے ہیں کہ:

”وهذا العلم - یعنی التصوف - من العلوم الشرعية الحادثة في الملة وأصله ان طريقة هؤلاء القوم لم تنزل عند سلف الأمة وكبارها من الصحابة والتابعين ومن بعدهم طريقة الحق والهداية“

(یہ علم تصوف امت میں پیدا ہونے والے شرعی علوم میں سے ہے اور اس کی اصل یہ ہے کہ صوفیہ کرام کا طریقہ صحابہ و تابعین وغیرہ اسلاف اکابرین امت کا طریقہ ہے اور جو ان کے بعد آئے ان کا طریقہ ہے اور یہ طریقہ حق و ہدایت کا طریقہ ہے۔)

مختصر یہ کہ اس مقالے میں متعدد مقامات پر اس دعوے کا ذکر کیا گیا ہے کہ تصوف و طریقت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں نہیں تھے لیکن ایک بھی قطعی الدلالت ثبوت نہیں ہے۔

ایک مقام پر مقالہ نگار لکھتے ہیں کہ:

”صوفیہ کرام نے قرآن مجید کی آیات کریمہ کی من چاہی تاویلات و تشریحات کر کے ان کو طریقت پر چسپاں کیا حالانکہ وہ شریعت و دین کی جان و روح ہیں اور ان کا تصوف و طریقت سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔“ (ص: ۷۵)

ایسا کام کرنے والے نہ صوفیہ ہو سکتے ہیں اور نہ کرام، چونکہ اس بھاری بھر کم الزام کے لئے کوئی دلیل نہیں دی گئی ہے بالخصوص کوئی معین دلیل نہیں دی گئی ہے لہذا اسی قدر پر اکتفا کرنا ہوں کہ: ”سبحان اللہ! ہذا بہتان عظیم۔“ ”زبد القوی اور خشیت و امانت وغیرہ نفس کے جن احوال کا مقالہ نگار نے ذکر کیا ہے صوفیہ نے ان میں کبھی اور کون سی من چاہی تاویل کی ہے اور تصوف نے انہیں دین سے کب الگ کیا ہے۔ دراصل یہ شبہ اس بنیاد پر قائم ہے کہ تصوف دین سے الگ اور ایک خارجی عنصر ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تصوف فقہ و کلام کی طرح دین کا ایک حصہ ہے جس طرح علم فقہ اسلام کی اور علم کلام ایمان کی شرح و تفسیر کرتا ہے ویسے ہی علم تصوف احسان کے شرح و بیان کا کام کرتا ہے اور شیعوں کا مسئلہ اور مستند کتاب وسنت ہے۔ یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے کہ آیات احکام دین کا نوٹ حصہ ہیں اور فقہائے کرام نے من چاہی تاویلات کر کے اس سے فقہ اور اصول فقہ پر چسپاں کر دیا تھا۔

تصوف بطور احسان، دین کے تین ارکان میں سے ایک رکن ہے، لہذا اسے اسی طور پر دیکھنا چاہیے جب کہ کچھ لوگ اسے دین اسلام کے متوازی ایک فکری نظام کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اور رہے بنام تصوف پیش کیے جانے والے کچھ فلسفیانہ افکار و نظریات یا جاہلانہ اعمال و اشغال جن میں سے بعض کی طرف خود محترم مقالہ نگار نے اشارہ کیا ہے تو تصوف ان در آمد افکار و اعمال سے اتنا ہی بری ہے جتنا فقہاء حیل سے علم فقہ اور وضائیں حدیث سے علم حدیث شریف۔

مقالے میں پیش کیا گیا یہ دعویٰ بھی محل نظر ہے کہ:

”اس باب میں محدثین اور علمائے دین کا یہ متفقہ فیصلہ اور اجماع کلی یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی صحابی کو دین و شریعت اور طریقت و امانت کا کوئی مخصوص علم نہ تو سکھایا اور نہ ہی ان کو اعمال بتائے۔“ (ص: ۷۶)۔

جب کہ اس سلسلے میں کوئی مختلف فیہ فیصلہ اور جزئی اجماع بھی نہیں اور صحیح بخاری میں موجود حضرت ابو ہریرہؓ کی اس حدیث کی موجودگی میں کوئی ایسا فیصلہ اور اجماع کیسے ہو سکتا ہے جس میں آپؐ نے فرمایا ہے کہ:

”حفظت عن رسول الله صلى الله عليه وسلم وعائنين من العلم فأما أحدهما فبنته وأما الآخر فلو بنته قطع هذا البلعوم۔“

حضرت حسن بصریؒ اور امام علی رضی اللہ عنہ کی ملاقات کو مقالے میں اس طور پر پیش کیا گیا ہے جیسے یہ شخص بے بنیاد اور بے اصل بات ہوا اور دونوں کی ملاقات نہ ہونا کوئی ثابت شدہ علمی حقیقت ہو، حتیٰ کہ اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کو ”صوفی نہ طرقتی“ کا شکار قرار دیا

گیا ہے۔ غالباً فاضل مقالہ نگار نے تائید لقا کے دلائل وبراہین کو ملاحظہ نہیں فرمایا ورنہ کم از کم انہیں عدم لقا کا یقین باقی نہ رہتا۔ چوں کہ شاہ صاحب دونوں کے دلائل سے باخبر تھے لہذا انہوں نے محدثین کے اختلاف کے بجائے صوفیہ کے اجماع کو اختیار کیا۔ علاوہ ازیں اثبات ہمیشہ نفی پر مقدم ہوتا ہے اور پھر محدثین کے نزدیک لقا ثابت نہیں ہے، اس کا یہ مرکز مطلب نہیں ہے کہ عدم لقا ثابت ہو گیا؛ کیوں کہ عدم دلیل کبھی بھی دلیل عدم نہیں ہوتا۔ اس کے لیے مستقل دلیل کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور عدم لقا محدثین کے نزدیک ایک مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ متعدد محدثین نے صراحت کے ساتھ اس لقا کو ثابت کیا ہے اور متعدد نے خرقدہ بن کر اور پہنا کر اس کا عملی اقرار کیا ہے۔ جلال الدین سیوطی کے رسالے تصحاف الخرقہ میں اس بحث کو تفصیل کے ساتھ ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اپنی کسی حدیثی تحقیق کو بلا لائے خالق نہیں رکھا ہے، انہوں نے محدثین کی رائے کو پیش کیا لیکن اسے قبول نہیں کیا، جیسا کہ امام سیوطی اور امام سخاوی وغیرہ نے کیا ہے ورنہ ان پر عملی منافقت کا الزام عائد ہوگا، جو کسی طرح بھی حضرت شاہ صاحب کے شایان شان نہیں ہے۔

مقالہ نگار نے دوسری صدی کے صوفیہ کا سب سے بڑا وصف زہد کو بتایا ہے اور پھر اس کا بیان کچھ اس طرح کیا ہے:

”جو ترک کسب پر اکتا ہے اور وہ زہد، صحابہ کرام اور تابعین کے زہد سے قطعی مختلف تھا۔“ (ص: ۸۰)

جب کہ ابن جوزی نے اس عہد کے صوفیہ کے مجاہدانہ کارناموں کے ذکر کے لیے اپنی کتاب صفۃ الصوفیہ میں ایک مستقل باب قائم کیا ہے جس میں اس دور کے صوفیہ کے جہاد کا تفصیلی ذکر ہے۔ طبقات الصوفیہ اور رسالہ قشیریہ کے مطالعے سے اس دور کے اکثر صوفیہ کے کسب وحرقت کے بارے میں معلوم کیا جاسکتا ہے، لہذا اس قسم کا اطلاق خلاف واقعہ ہے۔

صوفیہ کی خانقاہوں، زویوں اور رابطوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فاضل مقالہ نگار ربط کے بارے میں لکھتے ہیں کہ: ”وہ اصلاً جہاد کی سرگرمیوں کا مرکز تھا بعد میں صوفیہ کرام نے خاص طور پر عرب ممالک و مضافات میں اپنی خانقاہوں کے لئے اس اصطلاح کو اپنایا۔“ (ص: ۸۰)

اس بیان میں پہلی بات تو یہ قائم و مضاحت ہے کہ ربط سرحدی چوکیوں کو کہتے ہیں جہاں نظامی یا رضا کار مجاہد گمرانی کا کام انجام دیا کرتے تھے۔ یہ چوکیاں عموماً عارضی نوعیت کی ہوا کرتی تھیں لہذا اس میں سب سے نمایاں چیز گھوڑے باندھنے کی جگہ ہوا کرتی تھی اور اسے مناسبت سے انہیں ربط کا نام دیا گیا۔ بعد میں ان چوکیوں کے مقاصد میں تنوع پیدا ہوتا گیا۔ یہ بات بھی

تاریخی حقائق سے میل نہیں کھاتی ہے کہ صوفیہ نے ربط کا لفظ اپنی خانقاہوں کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ خانقاہیں رابطیں ہی تھیں، جہاں صوفیہ نے جہاد کے عظیم ثواب کے حصول کے لیے رہنا شروع کیا تھا۔ یہاں انہیں جہاد بانفس کے مواقع بھی ملتے تھے اور عبادت و ربانیت کے لیے خلوت بھی میسر ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم اوہم کا وصال ایک ایسی ہی ربط میں ہوا تھا۔ امام شاذلی کے سوانح نگاروں نے منفرد طور پر لکھا ہے کہ آپ ایک زمانے تک صبح سے شام تک رضا کارانہ طور پر اسکندریہ میں واقع ایک ربط میں گزارا کرتے تھے جو صلیبی حملہ آوروں کی غمرانی کے لیے بنائی گئی تھی۔ مغرب عربی کے مراہطین صوفیہ کے جہادی کارنامے اسلامی تاریخ کا ایک روشن باب ہے۔

بعد میں اسلامی سرحدیں بدل گئیں اور بہت سی رابطیں مستقل طور پر خانقاہیں بن گئیں، مگر ربط کا نام باقی رہا جس سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی۔ دراصل اس لفظ کو باقی رکھنے میں ایک لفظی مناسبت بھی کا فرما تھی اور وہ یہ کہ ربط عربی زبان میں زاہد کو کہتے ہیں، انجم الوسیط میں اس کے تحت ایک حدیث نقل کی گئی ہے کہ: ”ان ریبط بنی اسرائیل قال: زین الحکیم المصمت۔“

ان تمام علمی بحثوں کے بعد فاضل مقالہ نگار نے پوری کشادہ دلی اور علمی وسعت نظری کے ساتھ لکھا ہے کہ تصوف بنیادی طور پر کتاب و سنت سے ماخوذ ہے، چنانچہ خود صراحت فرماتے ہیں کہ: ”اس کے تمام بنیادی افکار اصلاً اسلامی تعلیمات ہیں اور ان کی تشریح و تفصیل اور تعبیر قرآن مجید، سنت نبوی اور تعامل ملفت میں ملتی ہے۔“ (ص: ۸۲) تصوف کے بارے میں مقالہ نگار کا مندرجہ بالا حکم ”وخصامہ مسک“ جیسا ہے اور یہی تصوف کے بارے میں بنیادی حقیقت ہے۔ باقی رہے فروعی مسائل تو اس میں اختلاف کی گنجائش ہمیشہ موجود رہے گی اور فروعات میں ”سب کچھ صحیح ہے“ اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا جاسکتا۔ اور اس سے کوئی علم مستثنیٰ نہیں ہے، حدیث و تفسیر یا فتنہ و کلام۔

وکی پیڈیا سے ماخوذ مضمون بظاہر معلومات کا ایک خزانہ ہے لیکن یہ افکار پریشاں نہ تصوف کی تنظیم کے لیے کارآمد ہیں اور نہ قریب کے لیے، بلکہ اس قسم کے مضامین عام قاری کو براہ گندہ خیالی اور تصوف پیرامی کی سوغات ہی دیتے ہیں۔ اس طرح کے مضامین مجلے میں شامل کیے جاسکتے ہیں، لیکن انہیں مناسب تعلیقات و حواشی کے ساتھ شائع کیا جائے۔ تمام خانقاہات کی صحیح یا ان کا تشیہ ضروری نہیں ہے البتہ ان میں جو ”جنایات“ کے قیمل سے ہیں ان پر حاشیہ ضرور ہونا چاہیے۔ میں اس کی صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ مقالے کی ایک عبارت ہے:

”تصوف میں بلند درجہ پر تسلیم کیے جانے والے ایک صوفی جلال الدین رومی نے خود اس

بات کا تذکرہ کیا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں ہے۔“ (ص: ۸۹)

یہ ایک بے حد گمراہ کن اور غلط فہمی پیدا کرنے والا بیان ہے۔ حوالے میں صرف انگریزی میں ”جلال الدین رومی“ لکھا ہے۔ یہ بیان ہمیشہ و تنصیلاً غلط ہے۔ صاحب الدر المختار امام حنفی مشہور صوفی ابوعلی دقاق سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

”أنا أخذت هذه الطريقة من أبي القاسم النصرا باذی، وقال أبو القاسم: أنا أخذتها من الشبلي، وهو من السري السقطی، وهو من معروف الکرخی وهو من داود الطائسی وهو أخذ العلم والطريقة من أبي حنیفة رضى الله عنه.“

ایسے جلیل القدر صوفیہ نے امام اعظم سے طریقت کا حصول کیا ہے جن میں سے ہر ایک کا درجہ رومی سے بڑا ہے۔ یقین ہے کہ جلال الدین رومی کی طرف اس قول کی نسبت تدلیس اور دسیہ کاری کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بھلا ان سے یہ واضح حقیقت کیسے پوشیدہ رہ سکتی تھی۔ خود تصوف اور مسائل تصوف کے بارے میں امام اعظم کے اقوال فقہ و تصوف کی کتابوں میں وافر مقدار میں موجود ہیں۔ امام حنفی کے مذکور بالا قول پر حاشیہ لگاتے ہوئے امام شافعی اپنے حاشیہ درختار میں لکھتے ہیں کہ: ”امام ابو حنیفہ میدان تصوف کے شہسوار ہیں۔ علم تصوف کی بنیاد علم و عمل اور ترکیب پر ہے اور سلف صالحین نے عام طور پر انہیں ان اوصاف سے متصف کیا ہے۔ احمد ابن حنبل فرماتے ہیں: وہ علم، ورع، زہد اور ایثار آخرت کی اس منزل پر تھے جسے کوئی نہیں پاسکتا۔ انہیں کوڑوں سے مارا گیا کہ وہ تقصا کو قبول کر لیں لیکن انہوں نے منصب قاضی کو قبول نہیں کیا۔ عبد اللہ ابن مبارک فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ سے زیادہ کوئی اس بات کا حق دار نہیں ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے، اس لیے کہ وہ ایک متقی و پرہیزگار امام اور بے مثل عالم و فقیہ تھے۔ انہوں نے نظر و فکر اور ذہانت و تقویٰ سے علم کو اس طرح کھولا ہے کہ دوسرا کوئی نہیں کھول سکتا۔ ایک شخص نے امام ثوری سے کہا کہ وہ ابو حنیفہ کے پاس سے آ رہا ہے تو امام ثوری نے فرمایا کہ: تو اہل زمین میں سے سب سے زیادہ عبادت گزار کے پاس سے آ رہا ہے۔“

امام شافعی کے بارے میں بھی ایسی بہت سی علمی شہادتیں مشہور و معروف ہیں۔ آپ کا یہ قول بے حد متداول ہے کہ ”مجھے دنیا کی تین چیزیں پسند ہیں: ترک تکلف، بھلوک کے ساتھ لطف و نرمی اور اہل تصوف کے طریقے کا اتباع۔“ اور ان دونوں اماموں کی پوری زندگی بھی ہمیں تصوف کے رنگ میں رنگی نظر آتی ہے۔

عزیز القدر مولانا ضیاء الرحمن علیہی السلام کا مضمون: ”شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف۔ ایک مطالعہ“ ان کے عمیق مطالعے اور گہری تحقیق کا نتیجہ ہے جس میں علمی تحقیق کے تقاضوں کی پوری رعایت ملتی

ہے۔ اس میں ایک انتہائی مختلف فیر شخصیت کا ایک خاص موضوع کے حوالے سے مکمل فیر جانب دارانہ اور معروضی مطالعہ کیا گیا ہے۔ انہوں نے اس تحقیقی مقالے کے ذریعے جماعتی سطح پر ایک خوش روی کی بنیاد ڈالی ہے۔ اپنے متعدد تحفظات کے باوجود میری نظر میں یہ مقالہ مجلہ الاحسان کے اس شمارے کے لیے قدامت عقد (Pendent) کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لیے نہیں کہ اس مقالے کے مشتملات میں کوئی نیا انکشاف ہے بلکہ اس لیے کہ اس میں ایک ایسی شخصیت کے ایجابی پہلو کو پیش کیا گیا ہے جو مقالہ نگار کا مرجع عقیدت نہیں ہے۔ یہ مقالہ مدلل مداحی، مدلل تنقیص اور مصداقہ مطلوب کے رواقی اسالیب سے ہٹ کر ایک نئے راستے کی بنیاد ڈالنے کی کوشش ہے، جس میں اپنی کم زوریوں کا اظہار ہوا اور دوسروں کی خوبیوں کا اقرار ہوا اور تحقیق فیر جانب دار ہو۔ ان کا یہ علمی مقالہ بحث و تحقیق پر ان کی قدرت، وسعت اطلاع، عمق تفکر اور تواضع و امانت علمی وغیرہ جیسی مطلوب علمی صفات کا غماز ہے۔

صفحہ ۱۱ پر صفات باری تعالیٰ کے سلسلے میں ابن تیمیہ کے عقیدے کی وضاحت نہیں ہو سکی ہے اور نہ اشاعرہ کا موقف واضح کیا گیا ہے، بلکہ پورے بیان میں ایک قسم کا ابہام ہے۔ عقیدہ تجسیم سے ان کی مراءت کے لیے ان کے شاگرد شیدائین کثیر کے اقوال پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔ ابن تیمیہ تجسیم کی طرف مائل نہیں بلکہ اس کے قائل ہیں اور آج پوری دنیا میں یہ عقیدہ رکھنے والے انہیں اپنا پیش رو اور امام مانتے ہیں۔ اس سلسلے میں شیخ عبد اللہ ہریری رحمہ اللہ کی کتاب الدرر السریہ کو دیکھا جاسکتا ہے جس میں ابن تیمیہ کے تجسمی عقیدے کو شرح و بسط کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس مضمون کی تیاری کے دوران ہی ڈاکٹر عبد المعز صدر شعبہ عربی، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدرآباد نے ایک دل چسپ قصہ سنایا کہ عربی ادب کی ایک کلاس میں نصوص پر بحث کے وقت انہوں نے آیت ”وهو الذی فی السماء إله و فی الأرض إله وهو الحکیم العلیم“ کی تشریح بیان کی۔ کلاس کے بعد ایک طالبہ ان کے جیمیر میں آئی اور بولی کہ آپ نے جو بتایا ہے وہ غلط ہے، اللہ تعالیٰ تو صرف عرش پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے کہا کہ میں نے وہ بتایا ہے جو قرآن میں ہے تو اس نے کہا کہ قرآن کا ترجمہ و تشریح ایسی ہونی چاہیے جو اس عقیدے سے ہم آہنگ ہو کہ اللہ تعالیٰ صرف عرش پر ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس سے پوچھا کہ عرش کہاں ہے تو اس نے کہا کہ ان اور اشارے دونوں سے بتایا کہ اوپر ہے۔

لطف یہ ہے کہ وہ طالبہ کلاس کے کم زور طلبہ میں سے ایک ہے۔ یہ سب ابن تیمیہ کے تجسمی عقائد کے آثار و نتائج ہیں۔

مقالے کا ایک عنوان ہے: ”شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف یا مخالف تصوف“ اگرچہ نقد و

مخالفت مانع الجمع تھا کئی نہیں ہے لیکن مقالہ نگار نے اس عنوان کے تحت جو کچھ بیان کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ ابن تیمیہ کو تصوف کا مخالف سمجھنا خلاف واقعہ ہے اور ”مخدوش فکر“ ہے اور اس طرح بیک جنبش قلم مختلفین اہل سنت کی کثرت کا اثر اور صوفیہ کی غالبیت عظمیٰ کی فکر کو مخدوش قرار دے دیا گیا، جن میں مشائخ ازہر بھی ہیں، محدثین مغرب عربی بھی ہیں، محققین شام و عراق و یمن بھی ہیں، جن کے نزدیک شیخ ابن تیمیہ مخالف تصوف تھے۔ ان کے تصوف مخالف ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ دنیا اور دنیا داروں کی سب سے بڑی تصوف مخالف تحریک یعنی سلفی تحریک کے بانی مہمانی ہیں یا کم از کم یہ تحریک انہیں اپنا سب سے بڑا پیش رو مانتی ہے۔

شیخ ابن تیمیہ کو سلفی فکر کے ساطین جیسے شیخ محمد بن عبد الوہاب نجدی، شیخ رشید رضا، شیخ ابن باز، سفر حوالی قبل الوداعی، شیخ محمد سرور وغیرہ اور سلفی جہاد کے حامیوں جیسے جہان، بن لادن، ہلواہری اور ڈاکٹر امام عبد العزیز وغیرہ ہم سے بہتر جانتے ہیں بلکہ یہ سب انہیں کے بالواسطہ شاگرد اور ان کے افکار و عقائد کے علم بردار ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر ابن تیمیہ کے یہاں تصوف اتنا واضح ہے تو ان کے متبعین میں اس کی اتنی شدید مخالفت کیوں ہے؟ دراصل ان کے مخالفین و موافقین دونوں ان کی فکر میں تدریج کے قائل ہیں، چنانچہ ہم ان کے بہت سے ایسے معاصرین کو جانتے ہیں جنہوں نے ابتدا میں ان کی بہت تعریف و توصیف کی لیکن ان کے اجتہادات و تفروعات پر مطلع ہونے کے بعد ان سے برادرت کا اظہار کر دیا اور ان کے بارے میں اپنی سابقہ آراء سے رجوع کر لیا۔ ان کے متبعین بھی اپنی فکر کی بنیاد شیخ کی آخری عمر کی فکر پر ڈالتے ہیں جس کی ان کے معاصر علما نے زبردست مخالفت کی تھی۔ شیخ کے وہ تمام اقوال جو تصوف کے اقوال و احوال و رجال کی حمایت میں لگتے ہیں ان میں سے بیشتر کا تعلق ان کی ابتدائی عمر سے ہے۔ اس تاویل کو ان کے متبعین بھی پیش کرتے ہیں اور مخالفین بھی۔

رہا ان کی تحریروں میں تصوف کے بعض عناصر کا پایا جانا تو محض اس کی بنیاد پر انہیں مخالفین تصوف کی صف سے باہر نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ یہ بات مقررات علمیہ اور ثوابت منطقیہ کا حصہ ہے کہ ہر نظریہ اور فکر میں کچھ ایسے عناصر ہوتے ہیں جو اس کے لیے مابہ لایا ضرورتے ہیں اور یہی عناصر اس فکر یا نظریے کا قوام ہوتے ہیں جن سے اس کا جہر اتر او یہ تشکیل پاتا ہے، اور کچھ دوسرے ایسے عناصر ہوتے ہیں جو اس میں اور دوسرے افکار و نظریات میں مشترک ہوتے ہیں۔ اب کوئی اس فکر کا حامی ہے یا مخالف اس کا تعین مشترک عناصر کی حمایت یا مخالفت کی بنیاد پر نہیں ہوتا بلکہ ان میں مابہ لایا عناصر کی حمایت یا مخالفت کی بنیاد پر ہوتا ہے جو اس فکر کا خاصہ ہوتے ہیں۔ شیخ نے تصوف کے جن عناصر کا اپنے ابتدائی دور میں ذکر فرمایا ہے وہ سب تصوف کے مشترک عناصر ہیں،

اور رہے تصوف کے مابہ لایا عناصر تو شیخ نے ہر دور میں ان کی مخالفت کی ہے۔ یہ صرف حامیان تصوف کا موقف نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کی سلفی جماعتیں اپنے تمام آپسی تناقض و تعارض و اختلاف و انفعال (یا ہی نقل و عارت گری) کے باوجود اس بات پر متفق ہیں کہ ابن تیمیہ تصوف مخالف تھے، بلکہ تصوف مخالفت کو وہ شیخ ابن تیمیہ کی کلاہ افتخار کا ایک اہم نگینہ تصور کرتی ہیں۔

عالم عرب میں اور خاص کر برصغیر ہند و پاک میں ایسی متعدد شخصیات ملتی ہیں جنہوں نے فکری اور اس سے زیادہ اجتماعی ضروریوں اور مصلحتوں کے پیش نظر تصوف اور شیخ ابن تیمیہ میں مصالحت کرانے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سے کچھ ایسی ہیں جو صوفی القلب اور عجمی العقل ہیں اور کچھ قلب و نظر دونوں اعتبار سے عجمی ہیں۔

مقالے کا یہ جملہ کہ شیخ ابن تیمیہ نے ”فلسفہ، منطق اور علم کلام کی اینٹ سے اینٹ بجادی“ ایک مبالغہ آمیز تعبیر ہے جو شیخ کے مدافین و معتقدین میں بے حد قبول و متداول ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ فلسفہ و منطق کے خلاف شیخ ابن تیمیہ کی کوششیں قابل ذکر ہیں اور انہیں اس ضمن میں کافی کامیابی بھی حاصل ہوئی، لیکن نہ فلسفہ ختم ہوا اور نہ منطق کی بساط الٹ سکی، اور رہا علم کلام تو اسے فلسفہ و منطق کی صف میں رکھنا اور اس فن شریف کے ساتھ ان کے جیسا معاملہ کرنا ایک تعزیری گناہ جیسا ہے شہر موافق، شرح عقائد عضدی، خیالی، صدر، شمس باز، افتخار امینی، تسویہ، حواشی ملا عبد العظیم اور رسائل میرزا زہد کی موجودگی میں کون عقل مند مذکورہ بالا جملے کی صداقت پر یقین کرے گا۔ یہ سب سنگریزے نہیں قدیم علوم عقلیہ کے قلعے ہیں۔

مقالہ نگار نے شیخ ابن تیمیہ کی تنقید تصوف کا بے حد عالمانہ و محققانہ جائزہ لیا ہے اور ان کی تنقید کے تمام پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کی آراء سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مقالے کا یہ حصہ علمی محاکمے کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ البتہ جہاں انہوں نے تصوف کے پانچ فلسفیانہ نکات پر شیخ ابن تیمیہ کی تنقید کا ذکر کیا ہے وہاں انہوں نے پہلا نکتہ تو حیدر الوہیت اور تو حیدر بو بیت کو قرار دیا ہے جس سے واضح طور پر لگتا ہے کہ یہ تقسیم اہل تصوف نے کی ہے جب کہ دنیا جانتی ہے کہ تو حیدر کی تقسیم شیخ ابن تیمیہ کے ان تفروعات میں سے ہے جس پر ان کی اور ان کے متبعین و متاثرین کی فکر کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ وہی اس تقسیم کے موجد وہابی ہیں اور بقول امام زاہد کوثری ان سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک امت میں کسی نے بھی تو حیدر کی یہ تقسیم نہیں کی ہے جو محض ایک بدعت سیرہ ہے اور اس کے لیے ان کے مدافعین کی جانب سے پیش کیے جانے والے سارے غدر و تدبیر و گناہ کی مثال ہیں۔ بہر کیف، تو حیدر کی تقسیم کو لے کر مقالے میں خاص غلط بحث ہے اور اس تقسیم کے حوالے سے شیخ ابن تیمیہ کے مخاطب صرف صوفیہ نہیں ہیں بلکہ پوری امت ہے اور اس کے

سارے حقائق ہیں۔

مقالے میں شیخ ابن تیمیہ کے ذاتی کمالات اور ان کی علمی رفعت و بلندی کا جس کشادہ دلی کے ساتھ اعتراف و ذکر کیا گیا ہے، وہ علمی مقالہ نگاری کی روایت کو مستحکم کرنے والی چیز ہے۔ روایت سے انحراف پر مبنی اس تحریر پر مقالہ نگار لائق مبارکباد ہیں۔

مقالہ میں صادر کی ایک احکام منطقی تحلیل پر مبنی ہیں جن میں تحدید و وقت کی کمی ہے اور اس کے سبب ان سے ایک مبہم اور غیر واضح صورت حال سامنے آتی ہے۔ پھر اس پر استثناءات کی کثرت مستزاد ہے جو ابہام کی اس چادر کو اور بھی دیر بنا دیتی ہے۔

یہ بات بھی محل نظر ہے کہ تصوف ”عمومی ظاہر ہونے کے سبب کوئی اس پر تنقید کی جرأت نہیں کر پا رہا تھا جب کہ ابن تیمیہ سے پہلے بہت سارے علمائے یہ کام ان سے زیادہ بڑے پیمانے پر انجام دیا ہے۔ بھلا اس ضمن میں امام غزالی اور شیخ عبدالقادر جیلانی کی خدمات کو کیوں کر نظر انداز کیا جاسکتا ہے؟ شیخ ابن جوزی جیسے ”ناقد“ تصوف بھی شیخ ابن تیمیہ سے پہلے ہی تھے۔

مقالہ نگار کے مندرجہ ذیل فقرے اور اس کی ترتیب و اسلوب اور تیور سب نظر ثانی کے مستحق ہیں۔

”تصوف کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعہ بدعات، شرکوں کے مشابہ رسوم و رواج، قبور سے حدود تعلق، خدا سے بے خوفی اور صاحب مزار سے خوف و خشیت، اللہ اور شعائر اللہ سے استہزاء، بزرگوں کے ساتھ الوہیت والے معاملات، مشاہد و مزارات کی زیارتوں میں حج بیت اللہ جیسا معاملہ، مساجد کی ویرانی اور مزارات پر رنق و اہتمام کے مظاہر کو فروغ دینا، لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ سب غیر اسلامی تصوف اور گمراہ صوفیہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔“ (ص: ۱۴۲)۔

اس میں پہلے مخالفین تصوف کے نکالی الزامات کو تصوف کے لیے تفصیل کے ساتھ انہیں کے اسلوب و مصطلحات و ترکیبات کے ساتھ ثابت کیا گیا اور پھر غور کرنے کے بعد یہ انکشاف ہوا کہ یہ سب تصوف کی کرشمہ سازی نہیں ہے۔ اگر کسی سنی عالم و قلم کار کو اس انکشاف کے لیے غور و فکر کی ضرورت پیش آئے تو یہ بڑے فکر کی بات ہے اور لطف کی بات یہ ہے اس غور و فکر کے بعد بھی جو انکشاف ہوا وہ پوری طرح سے درست نہیں ہوا، کیوں کہ یہ کرشمہ سازیاں غیر اسلامی تصوف اور گمراہ صوفیہ کی نہیں بلکہ غیر تصوف اور غیر صوفیہ کی ہیں، اور دونوں میں بڑا فرق ہے۔ غیر اسلامی تصوف اور گمراہ صوفیہ جیسی اصطلاحیں معاندین تصوف کی اختراع ہیں بالخصوص وہ گمراہ جو نہ تصوف کو دل سے قبول کر سکتا اور نہ کھل کر اس کی مخالفت کر پاتا ہے۔ جس طرح غیر اسلامی حدیث، غیر اسلامی تفسیر اور غیر اسلامی فقہ کا وجود نہیں ہے، ویسے ہی غیر اسلامی تصوف بھی کوئی چیز نہیں ہے۔

اور جس طرح محدثین، مفسرین و فقہاء و مفتیان کے لیے گمراہ کی صفت استعمال نہیں کی جاتی اسی طرح صوفیہ کے لیے بھی اس کا استعمال غیر معقول و مقبول ہے۔ تصوف صرف اسلامی ہوتا ہے اور صوفی صرف وہی ہوتا ہے جو ہدایت کے اعلیٰ درجے پر فائز ہو۔

خاتمہ میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ ابن تیمیہ کا تعلق ناقدین تصوف کے اولین گروہ سے ہے۔ واضح رہے کہ ناقد کا اطلاق بسا اوقات مصلح اور محاسب پر بھی کیا جاتا ہے اور کبھی معارض و مخالف پر بھی ہوتا ہے۔ گروہ اول میں سیدی جنید بغدادی، امام غزالی، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ احمد زروق اور شیخ سرہندی وغیرہ شامل ہیں، شیخ ابن تیمیہ کو ان لوگوں کی صف میں شمار کرنا تصوف اور ان نفوس قدسیہ دونوں کی حق تلفی ہے، اور ناقدین کے دوسرے گروہ میں شیخ ابن جوزی، شیخ محمد ابن عبدالوہاب نجدی، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور سید قطب وغیرہ کا شمار ہوتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو شیخ ابن تیمیہ ناقدین کی دوسری قسم سے زیادہ قریب ہیں اور یہ حضرات بھی شیخ کی فکر سے بے حد قریب ہیں، نہ صرف باب تصوف میں بلکہ عقائد و افکار کے تمام ابواب میں، خواہ ان کا تعلق ذات و صفات الہیہ سے ہو، عظمت و مقام نبوت سے ہو، اہل بیت کی شان و عظمت سے ہو، اشعریت سے بغاوت سے ہو یا تقلید کی عداوت سے ہو۔

واضح رہے کہ اس تعلیق کے ذریعے صرف شیخ ابن تیمیہ کے تصوف کی نفی مقصود ہے، باقی رہے ان کے دوسرے حامد و مناقب و خصال و اطوار تو وہ فی الوقت ہمارا موضوع نہیں ہیں اور وہ بلا شک و شبہ بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کا تقویٰ مشہور و معروف ہے۔ ان کی کثرت علم و فضل پر اعیان علم کی شہادت موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حق دیکھنا اور اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

باب تحقیق و تنقید کے باقی مضامین بھی معلومات افزا اور مفید ہیں۔ حاحمل مطالعہ کے تحت جن کتابوں کا جائزہ لیا گیا ہے وہ ہیں شیخ محمد غزالی کی کتاب ”الجاناب العاطفی من الاسلام“ امام عبدالخلیم محمودی تصنیف ”الفکیر الفلسفی فی الاسلام“ شیخ یوسف رفاعی کی کتاب ”الصوفیة والنصوف فی ضوء الکتاب والسنة“ مولانا محمد احمد مصباحی صاحب کی تصنیف ”امام احمد رضا اور تصوف“ اور پروفیسر طاہر القادری صاحب کی کتاب ”حقیقت تصوف“ شیخ فتح اللہ کون کے افکار پر مشتمل ایک مقالہ بھی اس باب میں شامل ہے۔ کتابوں میں اول الذکر کتاب کو چھوڑ کر باقی سب کتابوں کے مصنفین فکر و عمل صوفی شخصیات ہیں۔ ان میں امام اکبر شیخ عبدالخلیم محمودی ذات اسلامیان ہند میں کم معروف ہے لیکن یہ ذات ایسی مجمع البحرین ذات تھی جو شریعت و طریقت دونوں میں منصب امامت پر فائز تھی۔ مؤخر الذکر چاروں کتابوں پر عمل و اعتماد کیا جاسکتا ہے البتہ شیخ محمد غزالی جو جماعت اخوان المسلمون سے متعلق ایک معروف داعی و مصنف تھے

ان کی یہ کتاب اس قسم کی ہے جیسے جماعت اسلامی ہند کی شائع کردہ جناب عروج قادری صاحب کی کتاب ”اسلامی تصوف“ ہے۔ اس کتاب کو ”مختصر صاف و سادہ“ کے طور پر لینا چاہیے۔ اخوانی فکر و عوامی افکار کا مغرب ہوتی ہے، علاوہ ازیں اس کتاب کو ”مکثہ تصوف کا بادہ کہنہ در جام نو“ تسلیم کرنے میں شدید تاثر ملے گا۔ کتاب کے پہلے ایڈیشن کو بہت پہلے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، اس میں شیخ ابن تیمیہ کے ”تصوف“ ہی کی بازگشت سنائی پڑتی ہے۔ البتہ اس کتاب کا اسلوب بیان اور طرز نگارش شیخ عزالی کی دوسری تمام کتابوں کی طرح بے حد دلکش اور مؤثر ہے۔ مولانا ذیشان احمد مصباحی نے بڑے عالمانہ انداز میں اس کتاب کا حاصل پیش کیا ہے، البتہ ایک مقام پر شیخ ابن عطاء اللہ اسکندری جیسے بلند پایہ صوفی اور عارف کو ابن تیمیہ کا ”معاشر اور حریف صوفی“ لکھا گیا ہے، اتنی جلیل القدر شخصیت کے ذکر کا یہ طریقہ مناسب نہیں ہے۔

شنا سائی کے تحت پروفیسر علوی صاحب کا اثر و یو بے حد معلومات افزا اور مغر ہے۔ محبت گرامی حبیب الرحمن عظیمی کا مقالہ ”خانقاہ کا نظریہ تلندریہ کا کوری تا ریخ اور کارنامے“ ایک طرح سے علوی صاحب کے اثر و یو کا نکتہ ہے، جس میں برصغیر کی ایک معروف و معتبر خانقاہ کا بے حد علمی اور دل نشیں پیرائے میں تعارف کرایا گیا ہے۔

صوفی ادب میں شامل تینوں مقالے خوب ہیں اور ان کی سب سے نمایاں خوبی یہ ہے کہ یہ تینوں مقالے ادب کی تعلیم و تدریس سے وابستہ موقر حضرات کے قلم سے نکلے ہیں۔

بحث و نظر میں پروفیسر اختر الواسع صاحب نے اپنے مختصر سے پیغام میں غیر اسلامی روحانیت کے سب سے نمایاں وصف کی طرف اشارہ کیا کہ وہ سب بھول بھلیوں میں گم ہے۔ یہ پیغام مختصر ہونے کے باوجود بے حد جامع ہے، جب کہ اس باب کے دوسرے مضمون میں، جسے مولانا مبارک حسین صاحب نے تحریر کیا ہے، اسلامی روحانیت یا تصوف کے سب سے بڑے اور نمایاں وصف کا ذکر کیا گیا ہے اور وہ ہے اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم۔

زاویہ مجدد و تصوف حضرت خواجہ ابو سعید ابوالخیر کے نام ہے۔ اس میں شامل تمام مضامین عمدہ اور معلوماتی ہیں۔ ہندوستانی تناظر میں یہ بہت اہم ہیں کیوں کہ یہاں تصوف کی اس عظیم المرتبت اور جلیل القدر شخصیت کے بارے میں کم ہی جانا جاتا ہے۔ اس باب میں شامل مقالے آنحضرت کی شخصیت، فضائل اور کارناموں کا مختصر مگر جامع احاطہ کرتے ہیں۔

پہانے کا سلسلہ بہت عمدہ ہے لیکن اس میں صرف وحشی اور توسیعی مطالعہ نہیں ہونا چاہیے ”پیش نیز گلو“ کے لیے بھی جگہ ہونی چاہیے اور کتاب کی پیش کش پر بھی تبصرہ ہونا چاہیے۔

”مکتوبات“ کے آسمان پر جیسے جیسے ماہ و نجوم نظر آ رہے ہیں وہ اس علمی مجلے کی کامیابی کی

دلچسپ اور مجلس اوارت کے شعبہ رابطہ عامہ کے حرکت و عمل کے نماز ہیں۔

آخر میں ایک بار پھر دل کی گہرائیوں کے ساتھ اس عظیم عمل سے وابستہ تمامی حضرات کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میں نے یہ تبصرہ بے حد مسروریت اور انجوم کار کے درمیان لکھا ہے۔ تمام مضامین کو بلا استیعا ب پڑھ بھی نہیں سکا ہوں۔ جلد بازی میں کچھ تجاویز احکام بھی صادر ہو سکتے ہیں اور کسی کی حق تلفی بھی ہو سکتی ہے، جس کے لیے میں جیگی محذرت خواہ ہوں۔ علاوہ ازیں یہ مضمون بغیر کسی علمی حوالے کے لکھا گیا ہے اور محض ایک تاثراتی مضمون ہے، جس میں اخلاص کے سوا ہر چیز میں کمی اور نقص کا احتمال ہے۔

(شمارہ اول پرڈاکٹر سید عظیم اشرف جاکسی صاحب کا وہ مکتوب جو تاخیر سے موصول ہونے کے سبب دوسرے شمارے میں شامل نہیں کیا جاسکا تھا، اسے پیش نظر تیسرے شمارے میں ذیل میں شامل کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ) ”الاحسان“ پانچواں شمارہ) احسن اللہ الیک۔ عہد حاضر کے خانہ انوری یعنی تصوف پر علمی و تحقیقی کتابی سلسلے کا آغاز پٹارت خیر کی مانند ہے۔ اس سبقت و مبادرت پر دل کی گہرائیوں سے مبارکباد قبول فرمائیے۔ مجلہ صوری اور معنوی خوبیوں کا حسین مرقع ہے۔ اس کی خفامت نیز گنبد و مینار سے خالی اس کے سرورق کو دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور فرحت بھی۔ اپنی معنوی خوبیوں سے قطع نظر اس کا ظاہر بھی علمی کتب و مجلات کے نمایاں شان ہے۔ ”وانہ یقری العیون جمالا“ عالم گیریت اور اعرا فیت کے اس عہد میں پیش کش کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے۔ آج ہر چیز کی قدر و قیمت اس کے ظاہر سے ہی متعین ہوتی ہے۔ تصوف کو اگرچہ عرف باطن سے سروکار ہے، لیکن پیش کش میں عصرانیت اس کے منافی نہیں ہے۔ خلق خدا کی خیر خواہی کا تقاضا بھی ہے کہ ہم اپنی پیش کش کو جتنی الامکان ایسا بنائیں جو لوگوں کے لیے مانوس اور زیادہ سے زیادہ قابل قبول ہو۔

مجلے کے ثما مضامین علمی نوعیت کے ہیں۔ ان مضامین کے بعض مشتملات سے اختلاف کیا جاسکتا ہے لیکن پیش کش سبھی کی عمدہ ہے۔ اس سلسلے کو جاری رہنا چاہیے اور اسی رنگ و آہنگ میں جاری رہنا چاہیے۔ ہمارا یقین مصمم اور عقیدہ مستحکم ہے کہ اسلام و سنت کا احیا و عروج تصوف کے احیا و عروج سے وابستہ ہے اور یہ کام اہل خانقاہ ہی حسب دل خواہ انجام دے سکتے ہیں۔ اس کام کا پہلا مرحلہ ذہنی و فکری تیاری کا مرحلہ ہے جس کی جانب آپ نے اس مجلے کے ساتھ پیش قدمی کر دی ہے۔ ذہن سازی کا یہ مرحلہ بے حد ہمت و فکری اور جاں نسیں ہے۔ یہ مرحلہ فکری تعمیر کی خشت اول ہے جسے تحت و فوق ہر دو دنیاؤ کو برداشت کرتے ہوئے اعتدال و استواء پر قائم رہنا ہے۔ اس کام میں اعدا اور اوجیا دونوں سے نچھڑا زماں کرنا پڑے گا۔ آپ کو اغیار کی تنگ باری سے کعبہ تصوف کی حفاظت بھی کرنا ہے اور قوم کے ذوق آزرگی سے بھی تبر و آزا ہونا ہے۔ نہ جنوں

کے رہنے سے کعبے کی طہارت کم ہوتی ہے اور نہ کعبے میں رہنے سے بتوں کی نجاست کم ہوتی ہے۔ دونوں محاذوں پر یکساں توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ لیکن ”الہی التصوف من جدیدہ“ کی اس مہم میں ہمارا اسلوب و تیج بھی صوفیانہ ہونا چاہیے، مناظرانہ اور معاندانہ نہیں ہونا چاہیے، ماصحانہ ہونا چاہیے، چارحانہ نہیں ہونا چاہیے، جس میں تخفیر کے بجائے تبشیر اور تعمیر کے بجائے تیسیر ہو اور جو ”کل کبد وطبہ“ سے محبت اور شفقت پر قائم ہو۔

و ففککم اللہ و سدد خطاکم و شد عضدکم و جزاکم عن التصوف و اہلہ خیرا۔

ڈاکٹر سید شاہ حسین احمد (صدر شعبہ اردو فارسی، وزیر کونرنگھ یونیورسٹی، آراء بہار) عزیز ی محترم رومی سلمہ (مقیم کونرنگھ پور) کے معرفت ”الاحسان“ کتابی سلسلہ ۳- ملا۔ اسے دیکھا، پڑھا، پڑھ کر خوشی ہوئی، جس کا اظہار الفاظ میں ممکن نہیں اس میں تصوف کو کشف و کرامات سے باہر نکال کر اس کے رموز و اسرار اور اصول و مسائل سے بحث کی گئی ہے، جو وقت کی ضرورت بھی ہے اور منکرین تصوف کی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی۔ ۸۰ صفحات پر مشتمل ”الاحسان“ کے تقریباً تمام مضامین اچھے ہیں، خصوصاً خلیفہ الرحمن کا مضمون ”شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف“ ایک مطالعہ۔ کم پڑھے لکھے لوگ تو اسے پڑھ کر چونک جائیں گے، لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ بات یہی صحیح ہے۔ یاں! خواجہ ابوسعید ابوالخیر کی ریاضیال معتقین کی نظر میں شروع ہی سے مشکوک رہی ہیں، جس طرح خواجہ خواجگان معین الملک والدین حضرت خواجہ معین الدین سبکی چشتی کا فارسی دیوان۔ صاحب سجادہ خانقاہ عارفیہ کی خدمت میں خاک سار کا سلام پیش کرو بیجیے گا۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

ڈاکٹر ہمایوں فریدی (شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ یوپی) میں علی گڑھ سے مسلسل باہر رہا اور ابھی بھی پاپ رکاب ہوں۔ چوں کہ آپ کی طرح آپ کی خواہش بھی ہمیں عزیز ہے، اس لیے ”الاحسان“ کے لیے مضمون ارسال کر رہا ہوں۔ ”الاحسان“ کا پیش نظر شمار ہر لحاظ سے معیاری ہے، امید ہے کہ تا زہ شمارہ بھی حسب سابق ہوگا۔ علی حلقوں میں اس رسالے نے بہت تیزی سے اپنی جگہ بنائی ہے۔ اس کے لیے آپ سب لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر شاہد پرویز (ریجنل ڈائریکٹر (دلی) مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) الاحسان کا دوسرا شمارہ موصول ہوا، شکریہ! میں نے اس کو جت جت مطالعہ کیا۔ اس میں مضامین کا تنوع اور رنگارنگی دیکھ کر اب بارہ کی دہائی و مسعت کا اندازہ ہوا۔ صوفیہ اور تصوف کے

حوالے سے یہ اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہے جس میں تحقیقی و علمی اور عصری انداز میں مسائل کی تنظیم کی گئی ہے۔ پیش کش عمدہ ہے۔ منظومات کے کالم میں ڈاکٹر کوثر مظہری کی شاعری پسند آئی۔ آج کے زمانے میں فارسی زبان میں اس طرح کی شاعری بہر حال غنیمت ہے۔ رسالے میں صوفی ادب کے کالم کے مضامین پسند آئے، لیکن تحقیقی کا احساس باقی رہا۔ اس کو مزید بہتر بنایا جاسکتا ہے۔ رسالے میں کھٹی کمپوزنگ کی وجہ سے مجھے قراءت کرنے میں پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ دوسطروں کے درمیان مزید فاصلے کی ضرورت ہے تاکہ پڑھنے میں آسانی ہو۔ علمی مقالات کے مطالعے سے تصوف کے نئے گوشوں سے واقفیت حاصل ہوئی۔ رسالہ مجموعی اعتبار سے مجھے بہت پسند آیا۔

ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی (لنن می ہجرہ کالونی، دیرہ محافی، علی گڑھ یوپی) حسب ارشاد ”حضرت مجدد الف ثانی کی تجدیدی خدمات“ پر مشتمل مقالہ پیش خدمت ہے۔ خدا کرے کہ آپ کی توقع کے مطابق ہو۔ عہد اکبری و جہاںگیری میں شش بہتی بگاڑا اور آپ کی شش بہتی جد و جہد اور مساعی جیلہ کا مختصر تجزیہ، یقیناً دونوں پر روشنی ڈالتا ہے اور حضرت والا کی تجدیدی خدمات کو ظاہر کرتا ہے۔ اب یہ آپ حضرات پر منحصر ہے کہ مقالہ آپ کے بلند معیار کے مطابق ہے یا نہیں؟ بہر حال وصول یابی اور گراں قدر رائے سے سرفراز فرمائیں تو ممنون ہوں گا۔ خانقاہ شریف میں سب کو سلام مسنون پیش فرمادیں۔

محمد بدر الدین فریدی (خدا بخش لاہوری، پٹنہ بہار) جناب والا کے توسط سے ”الاحسان“ کے دونوں شمارے ایک ساتھ ہم دست ہوئے۔ اس کے لیے بہت شکریہ! اس کے ذریعے اچھی اچھی چیزیں پڑھنے کو ملیں۔ اللہ تعالیٰ اس رسالہ کی عمر دراز فرمائے۔ آمین! ان دونوں شماروں پر بیشتر کہ طور پر چند باتیں پیش خدمت ہیں۔ اگر مناسب معلوم ہو تو شامل اشاعت فرمائیے، ورنہ کوئی بات نہیں۔

قرآنی آیات کی نقل میں رسم الخط قرآنی اور عبارات و حوالہ جات کی تصحیح کا خصوصی دھیان رکھیے۔ باقی اردو عبارتیں تو لوگ سیاق و سباق سے ملا کر درست کر لیں گے اور صحیح طور پر پڑھ لیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ پروف پر توجہ دینے کی سخت ضرورت ہے۔ سر دست قرآنی آیات کے تعلق سے مندرجہ ذیل تصحیح نامہ شامل اشاعت کر لیجئے۔

الاحسان - جلد ۱ - صفحہ ۳۹ - صحیحاً بجائے بحیاً آگیا ہے اس میں قرآنی رسم الخط کی پابندی کی جائے۔

جلد ۱ صفحہ ۳۶ پر النور ۲۴/۱۵ کی جگہ پر النور ۱۳۴/۱۵ ہو گیا ہے۔ اس حوالے کو درست کر دیا جائے۔

۳۸/۱ کانوا بجائے کانو۔

۸۸/۱ یتلوا بجائے یتلو

۱۲۹/۱ ذائقۃ الموت درست ہے۔

۱۷۷/۱ یتعلمنی درست ہے۔

۲۸۲/۱ سورہ انعام میں آیت کا حوالہ ۱۲۵ کی جگہ ۲۶ ہونا چاہیے۔

الاحسان جلد ۲/صفحہ ۱۲ آمنوا وعملوا بجائے آمنوا وعملوا

۱۶۳/۲ یعلمہم بجائے یعلیہم

۳۲۸/۲ وٹوں آیتوں کے حوالے درست کیے جائیں۔

۲۳۰/۲ عبادنا آتیناہ بجائے عبادنا و آتیناہ ساتھ ہی حوالہ میں آیت

نمبر ۹۵ درج ہے جسے ۶۵ کیا جائے۔

۲۳۹/۲ اطیعوا بجائے اطیعو

۳۵۳/۲ یتلوا بجائے یتلو

۳۰۸/۲ برحمۃ بجائے برحمہ

۳۶۱/۲ تامرون بالمعروف بجائے تامرون الناس بالمعروف

یہ چند تصحیحات بطور مثال عرض ہیں۔

جلد ۱ میں زاویہ کے تحت امام غزالی کی تاریخی خدمات پر خصوصی گوشہ بہت خوب ہے۔ تحقیق و تنقید کے ذیل میں آٹھوں مضامین بہت عمدہ اور نئے فکروں پر مبنی ہیں۔ مولانا امام الدین صاحب نے اپنا مضمون ”مشائخ کے شطیحات و ہنوات: ایک علمی جائزہ“ بڑی کاوش سے لکھا ہے۔ مضمون میں مذکور حضرت منسو رحلاج کے تعلق سے منسور القرامطی، ابو محمد مہدی و الخلاج اور حضرت حسین بن منسور الخلاج کے حالات و کوائف مثبوت کر دیے جائیں تو کسی قسم کا اختلاف نہیں رہ جائے گا۔ آزاد شاہروں میں کبھی حضرت منسور رحلاج کو بھی اپنے زاویہ میں جگہ دیجیے۔

بحث و نظر کے تحت پروفیسر اختر الوماس نے بڑی مہربانی بات کہی ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ تصوف کی ہر دور میں ضرورت رہی ہے اور آج بھی ہے۔ مولانا یحییٰ بن خضر صاحب نے بڑا ردنا دیا ہے، لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ موجودہ مروج طریقہ سجادگی میں عمر کی دورنگی لانے کے طریقے پر غور و فکر کیا جائے۔ مولانا مصباحی صاحب چاہتے ہیں کہ مریدین و متوسلین میں سے کوئی سجادگی پر بٹھادیا جائے، ایسا ہی زمانہ ناممکنات میں سے ہے۔ میری سمجھ یہ ہے کہ ”الوسلہ سرلابیہ“ کو پیش نظر رکھا جائے تو وراثت سجادگی میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ پھر یہ کہ ”سلاہیم

افضلیم اہل بیتیم“ سے انصاف کے طور پر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہر عمل کر لیا گیا تو اس میں بھی خیر ہی کا پہلو نکلے گا۔ ان شاء اللہ۔ اس ضمن میں اصل بات یہ ہے کہ وارثین میں سجادگی حاصل کرنے کے جو حربے اور طریقے اختیار کیے جاتے ہیں وہ غلط ہیں۔ جیسا کہ آپ کو خود بھی معلوم ہے کہ زینب سجادہ تہ اپنی اولاد میں اپنے بعد سجادگی کے لیے کسی اور کی تربیت و تعلیم کی اور ان کے وصال کے بعد وارثین میں سے کسی اور نے اپنا حق بتایا یہاں تک کہ کورٹ اور پھر کمری تک کا سہارا لے کر سجادگی پر قبضہ جما لیا۔ یہ طریقے مذموم ہیں۔ یہ سب خرابیاں اس وجہ سے درآئی ہیں کہ ہم نے اوراد و وظائف اور مشاغل کو چھوڑ کر صرف مراسم کو اپنا لیا اور اسی کو تصوف سمجھ لیا۔

مولانا فیضان المصطفیٰ صاحب نے اپنے مضمون ”تصوف کا نام رہ گیا ہے اور روح نکل چکی ہے“ میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے، تجربات و مشاہدات کے عین مطابق ہیں، لیکن چند نام نہاد صوفیوں کے کثوت سے حکم کلی لگانا اور یہ کہہ دینا کہ تصوف کی روح نکل گئی گویا وہ ناپید ہے، درست نہیں۔ اس میں اصلاح کے لیے ترکیبیں سوچیے، یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ ”اس کا جواب ہمارے پاس نہیں ہے۔“ دیکھیے جسم جو عناصر کا مجموعہ ہے، اس میں جب عوارض لاحق ہوتے ہیں تو اس کے دفعیہ کے لیے طرح طرح کے طریقے استعمال کیے جاتے ہیں۔ صحیح تشخیص کی جاتی ہے اور حسب حال معالجے کے ذریعے عوارض دور کر دیے جاتے ہیں۔ کیا ایسا ممکن نہیں کہ ذہنی اور فکری عوارض کے لیے بھی علاج کے طریقے پر غور و فکر کیا جائے۔ الحمد للہ! خانقاہ عارفیہ سید سراواں، الہ آباد کے زینب سجادہ مہتری قبلہ شاہ ابو سعید احسان اللہ صفوی مدظلہ العالی نے ”ام احسان“ کی شکل میں فکری عوارض کے لیے نسخہ لکھنا شروع کر دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اس کے مندرجات کے مطالعے سے صحیح اسلامی فکر اور ہمارے اسلاف میں رائج تصوف کو رواج ملے گا۔

جلد ۲ میں براہِ مومنانہ فیہ الرحمۃ علیہ کا مضمون ”شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف“ نیز اوقع ہے۔ اس میں ان کی بڑی کاوش کو دخل ہے۔ میں صرف سروسٹ ایک بات کی طرف اشارہ کرنا چاہتا ہوں، وہ یہ کہ انھوں نے ابن تیمیہ کے تعلق سے صفحہ ۱۱۱ پر طبعیت میں حدت و شدت، فراط ذکاوت اور سیمائیت کا ذکر کیا ہے۔ مگر ”اول من خالف سواد الامۃ ہو ابن تیمیہ“ کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اسی طرح دینی علوم و معارف کے حاملین اور مقلدین و تبعین مسالک کی آرا سے بہت کرجن پر جانب داری کا الزام نہیں لگایا جاسکتا، خالص معروضی شخص ابن بطوطہ جن پر مسلکی جانب داری کا الزام بڑا دشوار ہے، نے اپنے سفرنامے میں دمشق کا حال بیان کرتے ہوئے ابن تیمیہ کے تعلق سے لکھا ہے کہ ”ولکن فی عقلہ شبہاً“ (لیکن ان کا دماغ ہی پھرا ہوا تھا۔) اب ایسے شخص کو خواہ مخواہ تھوٹ کر لے آئیں۔ علمی صاحب نے نتائج بھی بڑے حیرت انگیز اخذ کیے

ہیں اور اس بات کی قطعی پرواہ نہیں کی کہ نقد سے اگر شخصیت مجروح ہو تو کیا کیا جائے جب کہ حال یہ ہے کہ ابن تیمیہ سے سوا دامت ہی مجروح ہے۔ تصوف شرعی اور تصوف غیر شرعی کی اصطلاح ہمارے اہل علم بھی استعمال کرنے لگے ہیں جس کے لیے مستشرقین کو مثال رہے ہیں۔ ارے بھائی شرعی نہیں ہے تو وہ تصوف ہی نہیں ہے، وہ از قبیل رہبانیت وغیرہ سے ہے۔ اس عنوان پر لکھنے کے لیے ہر اور مضاف الرحمن صاحب خصوصاً مبارک باد کے مستحق ہیں۔

زاویہ کے تحت غولہ ابو سعید ابوالخیر پر مضامین اچھے ہیں۔ اس شمارے کا پتہ ابھی بھر پور ہے۔ اس طرح کے علمی مجلے کی فی زمانہ سخت ضرورت تھی۔ اس ضرورت کی تکمیل کے لیے حضرت قبلہ شاہ ابوسعید احسان اللہ صفوی مدظلہ العالی اور آپ تمام حضرات مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ڈاکٹر کوثر مظہری (شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی)

”لاحسان“ کا کتابی سلسلہ ۲۰ نظر نواز ہوا۔ پہلے شمارے کو دیکھ کر ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ ہوگا۔ اس شمارے کے مضمولات (شعری و نثری) پر الگ الگ گفتگو نہیں کر سکتا۔ بس یہ عرض کرنا ہے کہ اس پر تصوف کے نام نہاد (معذرت کے ساتھ) سجادگی کا عکس نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کے اس میلے کا مزاج و سیلان تحقیقی و علمی ہے، بلکہ ایک طرح سے یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ مواد و معیار کی پیش کش کچھ ایسی ہے کہ کوئی شخص آسانی سے اس پر حرف نہیں رکھ سکتا۔ اس رسالے میں بیشتر لکھنے والے وہ ہیں جن کی نگاہیں دینی و دنیوی دونوں علوم پر ہیں، کچھ نام لینے میں حرج نہیں؛ جیسے پروفیسر یحییٰ مظہر صدیقی، پروفیسر اختر الومس، پروفیسر عقیل باغی، پروفیسر مسعود انور علوی، ڈاکٹر شمیم نعمی، جناب ڈیشان احمد مصباحی، ڈاکٹر شہزاد انجم وغیرہ۔ ان کے علاوہ بھی دوسرے اسلامی اسکالرز کی ایک ایسی فہم آپ کے پاس ہے جو عصری علوم اور ثقافت سے بہرہ مند ہیں۔

زیر نظر شمارے میں شیخ ابوسعید ابوالخیر پر آپ نے بہت ہی سیر حاصل اور علمی گوشہ شائع کیا ہے۔ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے یہ صفحات نعت غیر مترقبہ کے برابر ہیں۔ مولانا جلال الدین رومی پر پروفیسر عبدالمنان طرزی نے منظوم مقالہ تحریر فرمایا ہے اور یہ کام یعنی منظوم مقالہ میری دانست میں صرف طرزی صاحب نے ہی انجام دیا ہے۔ انھوں نے اردو کے بھی کئی مایہ ناز ادیب و شاعر پر منظوم مقالے تحریر کیے ہیں۔ ان کی قادر الکلامی کی تو سب نے داد دی ہے۔ اسی جیسے میں امیر خسرو پر پروفیسر مسعود انور علوی کا خوب صورت اور تجزیاتی مقالہ ہے۔ پروفیسر عقیل باغی نے ولی کے تصوف پر روشنی ڈالی ہے۔ یہ موضوع تو تقریباً ہر ایک یونیورسٹی کے شعبہ اردو کا حصہ ہے۔ میں نے بھی اس موضوع کی طرف ایم اے کے طالب علموں کی توجہ دلائی ہے۔

آپ نے ”باد و ساغر“ میں میری فارسی غزل شائع کی اس کے لیے شکر گزار ہوں۔ مجھے اس زبان میں درک نہیں لیکن یہ نہیں کس گھڑی میں یہ غزل ہو گئی۔ تقریباً ۱۸ سال پہلے کی غزل ہے۔ حوصلہ افزائی ہوتی ہے تو اچھا لگتا ہے۔ خدا کرے الاحسان صفیہ دل پر علمی احسانات کی بارش نہ کر رہے۔

مفتی الطاف حسین رضوی (خانقاہ سبحانیہ فین پورہ، کمپنا، لکھنؤ پورہ، بونہ)

علم تصوف پر جامع مجلہ ”لاحسان“ کا دوسرا شمارہ نظر نواز ہوا۔ اپنے تمام مضمولات کے لحاظ سے خوب ہے اور تمام ابواب اسم با مسمیٰ ہیں۔ محبت گرامی مولانا مجیب الرحمن عظیمی کی تحقیقی اور معلوماتی تحریر ”خانقاہ کاظمیہ قلندر یہ کا کوری: تاریخ اور کارنامے“ بطور خاص پسند آئی۔ بلاشبہ ”لاحسان“، تسکین قلب و نظر کا سامان اور شیخ طریقت حضرت شاہ ابوسعید محمدی صفوی دام ظلہ کے حال و قال کا منظر ہے۔

فقیر غفرلہ یا رگاہ رب العزت میں دعا گو ہے کہ مولائے کریم حضرت کا سایہ عاطفت تادیر قائم رکھے اور دین و سعادت کی بیش از بیش خدمات لے اور ”لاحسان“ کو مقبول عام بنائے۔ (آمین)

مولانا محمد شہروز مصباحی (رضاسمجہ، شریفہ روڈ، ممبئی، تھانہ، مہاراشٹر)

خانقاہ عالیہ عارفیہ، سید سراواں کوٹا میں الہ آباد کا کتابی سلسلہ ”لاحسان“ کا دوسرا شمارہ جس کا میں مشتاق تھا، پہلے شمارے کی طرح مولانا ضیاء الرحمن عظیمی کے توسط سے باعہ نواز ہوا منظر مست پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد یکے بعد دیگرے کئی مضامین پڑھ ڈالے۔ تصوف کے اسرار و رموز کو جس حسن و خوبی سے علمی انداز میں پیش کیا گیا ہے، اس کے لیے مرتبین اور معاونین سب دل کی اتھاہ گہرائیوں سے قائل مبارکباد ہیں۔

ہندوستانی خانقاہوں سے نکلنے والے رسالے عموماً صاحب خانقاہ، سجادگان، خلفاء مریدین اور متوسلین کی منقبت خوانی اور چند ادھر ادھر کے عجیبے مضامین پر مشتمل ہوا کرتے ہیں۔ مگر اللہ کے فضل اور سرپرست مجلہ شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی مدظلہ العالی کی علم و ہمت کی وجہ سے ”لاحسان“ اپنی مثال آپ ہے۔ جملہ مضمولات گراں قدر ہیں۔ خصوصاً مولانا عہد المسین نعمانی کا ”حسد و کینہ کی تباہ کاریاں“، مولانا ڈیشان احمد مصباحی کی ”واردات“، مولانا رفعت رضا نوری و طیب فرقانی کا ”حاصل مطالعہ“، مولانا مجیب الرحمن عظیمی کے قلم سے خانقاہ کاظمیہ قلندر یہ کا کوری کا تاریخی تعارف اور مولانا ضیاء الرحمن عظیمی کا مضمون ”شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف“ ایک مطالعہ ”میرے لیے دل چسپ رہے۔

ان میں مولانا ضیاء الرحمن عظیمی کا مضمون تو میں نے بقول لیکن فرامیسی خوب چبا چا کر

پڑھا اور بہت حد تک ختم کرنے کی بھی کوشش کی؛ کیوں کہ شیخ ابن تیمیہ جیسے مائدہ تصوف کو حامی تصوف ثابت کرنا عام ذہن میں ایک نیر بھی کھیر ہے، مگر مولانا عینی کی ذکاوت و فنی کہیے یا وسعت علمی، بہر حال انہوں نے اس نیر بھی کھیر کو پیش کیا ہے۔ اگر میں کہہ دوں کہ پورے مجلہ میں مولانا کی تحریر کو جسم میں قلب کی حیثیت حاصل ہے تو بہت سارے لوگ میری تائید میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور زور قلم عطا فرمائے۔

مولانا ساجد رضا مصباحی (استاذ جامعہ صمدیہ، پھچوند شریف، اودھیا، یوپی)

”الاحسان“ کے دوسرے شمارے کے مطالعے کے بعد ہمیں اس اعتراض میں کوئی تاثر نہیں کہ اس کا نقش ثانی نقش اول سے بہتر ہے۔ تصوف کے موضوع پر تسلسل کے ساتھ اس قدر معیاری علمی و تحقیقی مجلے کی اشاعت آپ ہی لوگوں کا حصہ ہے۔ درحقیقت یہ ساری بہاریں حضرت شیخ ابوسعید شاہ احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ کے قدم سے ہیں، جنہوں نے سید سراواں کو عملی اور نظریاتی تصوف کا حسین سنگم بنا دیا ہے۔ مادہ پرستی کے اس دور میں تصوف و روحانیت کا جو پاکیزہ ماحول سید سراواں میں قائم ہے، کم از کم وہ میرے لیے باعث حیرت ہے۔

اس بار محترم ضیاء الرحمن عینی کا مقالہ شیخ ابن تیمیہ کا نقد تصوف: ایک مطالعہ احباب کی محفلوں میں موضوع بحث رہا۔ موصوف نے اپنے اس طویل تحقیقی مقالے میں ابن تیمیہ کی علمی حیثیت اور معتقدات و معمولات وغیرہ کو پیش کرنے کے بعد تصوف کے تعلق سے ان کے نقد و نظر کا جائزہ مالہ و معالیہ کے ساتھ خالص علمی و تحقیقی اسلوب میں پیش کیا ہے، جو بہر حال قابل تحسین ہے۔ کیا مولانا کا مضمون عرف اس لیے مسترد کر دیا جائے گا کہ اس میں ابن تیمیہ کا نام آگیا؟

”حاصل مطالعہ“ کا اضافہ ایک اچھا قدم ہے۔ ”شناسائی“ کے تحت پروفیسر مسعود انور علوی کا انٹرویو اور مولانا حبیب الرحمن عینی کی تحریر پسند آئی۔ ”مصفوفی ادب“ کے تحت پروفیسر مسعود انور علوی کی تحریر نے مجھے خاص طور سے متاثر کیا۔ ”مکتوبات“ کے کالم میں اہل علم و دانش کے حوصلہ افزا تاثرات ”الاحسان“ کی مقبولیت کی دلیل ہیں۔ دعا ہے کہ الاحسان تسلسل کے ساتھ قارئین کو سیراب کرتا رہے اور حضور ابومیاں کا سایہ ہمارے سروں پر بنا دیر قائم رکھے۔ (امین)

مولانا طفیل احمد مصباحی (سب ایڈیٹر: ناہا ماسٹر فیہ مبارک پور، اعظم گڑھ)

تصوف، مباحث تصوف اور متعلقات تصوف پر علمی، تحقیقی اور دعوتی مجلہ ”الاحسان“ کے دو شمارے غریبوں نگاہ ہیں۔ جملہ مضامین قابل قدر اور معلومات افزا ہیں۔ عصر حاضر میں تصوف کی پہلے سے کتنی زیادہ ضرورت ہے۔ آج جب کہ مادیت کے تیز و تند سیلاب میں اخلاقی قدریں خس و خاشاک کی طرح بہتی جا رہی ہیں، حق کی متلاشی رو میں ہضمہ صافی کی جانب متغلبی باندھ کر دیکھ

رہی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اغیار کے لگائے گئے الزامات سے ”گدلے تصوف“ کو پاک کر کے ایک نئے رنگ و آہنگ کے ساتھ اس ”ہضمہ صافی“ کو دنیا والوں کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ تشنگان باطن اس سے دوبارہ سیراب ہو سکیں۔

ہماری جماعت میں دینی رسالوں کی کمی نہیں مگر خاص تصوف پر اس قسم کا علمی و تحقیقی رسالہ دیکھنے کو نہیں ملتا۔ حالات کی بغض پر ہاتھ رکھتے ہوئے خالص تصوف کے موضوع پر آپ حضرات نے یہ سال نامہ جاری کر کے پوری جماعت کی طرف سے فرض کفایہ کا حق ادا کیا ہے۔ اس جرأت رندانہ کو ہم سلام کرتے ہیں۔ سرزمین ہند میں صوفیہ کرام نے تصوف کا چراغ روشن کر کے تاریک دلوں کو ضیاء بخشی مگر افسوس! غیروں کی عیاری اور اینوں کی غفلت شعاری سے تصوف کی لومہم پڑ گئی۔ شرح تصوف کی اس فخریہ پیش کش پر میں آپ کی پوری تحمید کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

مولانا مظہر حسین علیمی (محاول مدیر: ماہنامہ سنی دعوت اسلامی، ممبئی)

تصوف پر علمی، تحقیقی و دعوتی مجلہ ”الاحسان“ نے اپنے نقش اول ہی سے اہل علم و دانش کو اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اپنے تو اپنے اغیار بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہو گئے اور نقش ثانی کے بہ شدت منتظر دکھائی پڑے۔ اللہ الحمد للہ علی ذلک!

دراصل الاحسان کی کامیاب اشاعت میں شیخ طریقت حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی زیدت محاسن کا سوز و گداز و خلوص پنہاں ہے۔ حضرت موصوف سے مجھے دوبار ملنے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ کے اندر وہ تمام باتیں پائیں جو ایک پیر کامل کی خصوصیات ہیں۔ حضرت کی نصیحتیں براہ راست دل پر اثر انداز ہوتی ہیں اور آپ کے ہند و مواعظ سن کر نہ جانے کتنے پتھر دل انسان تائب ہو چکے ہیں بلکہ اب تک سیکڑوں افراد نے کفر و شرک کا قلاوڑ تار پھینکا ہے۔ الاحسان کے مرتبین پر بھی حضرت موصوف کا خصوصی کرم ہے جس کی بدولت یہ حضرات اس طرح کے کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔

حسب سابق الاحسان کا دوسرا شمارہ بھی دستاویزی حیثیت کا حامل رہا۔ اس بار بھی ”باہر و ساعر“ میں اچھا انتخاب پیش کیا گیا ہے جس میں دو رباعی، ایک مناجات اور چار غزلیں شامل ہیں۔ حضرت خواجہ ابوسعید ابوالخیر کی دونوں رباعیوں کا ترجمہ کیا گیا ہے، اگر ڈاکٹر کوثر مظہری صاحب کی غزل کا بھی ترجمہ کر دیا گیا ہوتا تو استفادہ عام ہو جاتا۔ باہر کہہ میں ”خواجہ ابوسعید ابوالخیر کا خط ابن سینا کے نام“ سے پہلی بار واقفیت ہوئی۔ تذکیر کے کالم میں افادات حضرت شیخ ابوسعید احسان اللہ محمدی صفوی دام ظلہ اور حضرت مولانا عبدالحمید نعمانی صاحب قبلہ کا مضمون پسند آیا۔ نعمانی صاحب قبلہ کا مضمون اس لائق ہے کہ باضابطہ اسے کتابی شکل میں شائع کر کے عوام الناس تک پہنچایا جائے۔

تحقیق و تنقید کے کالم میں اس بار آٹھ مختصر و مفید تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ سارے مضامین عمدہ ہیں مگر مولانا ضیاء الرحمن عظیمی کی تحریر بڑی ذوق و محققانہ و فاضلانہ اور جرأت مندانہ تحریر ہے۔

حاصل مطالعہ کے تحت لکھنے والوں نے بڑی عرق ریزی سے مختلف شخصیات کے نظریات تصوف کا خلاصہ پیش کیا ہے اور اپنی کوشش میں کامیاب رہے ہیں۔ مولانا منظر الاسلام اترہری نے ”امام عبدالعلیم محمود اور تصوف“ کے عنوان پر خوب صورت مضمون قلم بند کیا ہے مگر موصوف کے اس مختصر مضمون میں مکرر اغلاط سے صرف نظر کرتے ہی چار درجن املا کی غلطیاں موجود ہیں جو بہر حال ذوقِ سلیم پر گراں گزرتی ہیں۔ غالباً مولانا موصوف کا مضمون آخری مرحلے میں دستیاب ہوا ہوگا اور مرتبین نے قلمت و قلمت کے سبب من و عن شائع کر دیا ہوگا۔

’بحث و نظر‘ کے مضامین مختصر مگر جامع اور مفید ہیں۔ اسی طرح شناسائی میں مولانا مجیب الرحمن عظیمی کا مضمون ”خانقاہ کاظمیہ کا کوری: تاریخ اور کارنامے“ اس لائق ہے کہ اسے کتابی صورت میں شائع کر کے عام کیا جائے، اس لیے کہ اس خانقاہ کی خدمات بھی پرہیزگاری میں ہیں۔ زاویہ کے تحت لکھے گئے مضامین بھی اچھے ہیں۔ بینا نہ کے تحت اس بار ایسی نو کتابوں کا تعارف کرایا گیا ہے جو تصوف یا صوفیہ سے ہی متعلق ہیں، امید ہے کہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ اللہ رب العزت الاحسان کی ادارتی ٹیم کو شاد و آبدار رکھے اور ہم سب کو دینِ ستین کی بیش بہا خدمات انجام دینے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ۱۔ میرسنی دعوتِ اسلامی حضرت حافظ وقاری مولانا محمد شاکر نور دہلوی رضوی دامت برکاتہم الاحسان کے مرتبین اور معاونین کو سلام و دعا پیش کرتے ہیں۔

محمد اسلم رضا قادری (ایمنی، ناگور، راجستھان)

ہندوستان کی زرخیز زمین الہ آباد کے اُفق سے اٹھنے والا یہ علمی اور تحقیقی مجلہ بے شک ایک نیک اور قابلِ تقلید کاوش ہے، جسے وقت کی اہم ضرورت بھی کہا جاسکتا ہے اور رنگِ اولو قلوب کے واسطے سامانِ تسکین بھی۔ یہ تزکیہ نفس اور تطہیر قلب کا ذریعہ کیوں نہ ہو جب کہ تصوف تو حقیقت و معرفت کے جام سے مشامِ جاں کو معطر کرتا ہے اور تصوف نام ہی ظاہر و باطن کی صفائی و ستھرائی کا ہے۔ حضرت قاضی زکریا انصاری (المتوفی: ۹۲۹ھ) لکھتے ہیں: ”التصوف علم تعرف بہ احوال تزکیة النفوس وتصفیة الاخلاق وتعمیر الظاہر والباطن لنیل السعادة الابدیة۔“ (شرح الرسالۃ الشریفہ ص: ۷)

تصوف پر اگندہ ماحول کو لطیف و نفیس بنانا ہے۔ کدورتوں اور نفرتوں کی جڑوں کو کاٹنا ہے۔ اوصاف و کمالات اور اتباعِ شریعت و وقت کا پیکر محسوس بنانا ہے۔ طریقہ زندگی اور سلیقہ زندگی بنانا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر کوئی اس پاکیزہ اسلامی تصوف کو دین سے ایک جدا راہ تصور

کرے تو وہ ضرور مجرم اور ناجائز ہے۔ اس لیے ایسے نازک حالات میں آپ حضرات کا اسلامی تصوف کو دعوتی اور تحقیقی انداز میں جدید اسلوب کے ساتھ پیش کرنا قابلِ مبارک باد اور لائقِ تحسین کارنامہ ہے، جسے تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ خداوندِ قدوس ہم سب کو شریعتِ مطہرہ اور سنتِ مصطفیٰ ﷺ پر عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا محمد آفتاب مصباحی (رکن: تنظیم ہمدان فاؤنڈیشن ویشالی، بہار)

میرے پیش نظر ”الاحسان کا دوسرا شمارہ“ ہے، جو محترم مولانا ضیاء الرحمن عظیمی کی عنایت اور محترم مولانا مجیب الرحمن عظیمی کے توسط سے مجھے حاصل ہوا۔ ”نقاش نقش ثانی بہتر کھد از اول“ کے مصداق یہ شمارہ سرورق، کاغذ، طباعت نیز علمی، تحقیقی اور صوفی ادبی نگارشات ہر جہت سے پہلے شمارے سے زیادہ معیاری ہے۔

پہلے شمارے نے ہی اتنا گرویدہ کر لیا تھا کہ دوسرا شمارہ جیسے ہی ملا موقع پاتے ہی دو تین بار بڑی دل چسپی سے پڑھا مگر شوقِ پیہم کی غلش اب تک نہیں گئی تھی کہ چار بار پانچ بار بلکہ گیارہ بار مطالعہ کیا اور گلشنِ تصوف کے ان مختلف پھولوں، ان کی رنگتوں اور خوشبوؤں سے ایک بارگی متعارف ہوا جن سے شاید ہر سوسوں کی خاکِ روئی اور سیکڑوں دروازوں کی جا ربوب کشی کے بعد بھی بمشکل متعارف ہو پاتا۔ مگر پڑھتے پڑھتے ایک دو جگہ نظر ٹھہر گئی جسے میں اپنی فہم ناقص کی یا عدم توجہ کا باعث شمار کرتا ہوں، مثلاً مولانا ضیاء الرحمن عظیمی صاحب کا مضمون ”اگرچہ نہایت تحقیقی اور معیارِ تحقیق پر پوری طرح منطبق ہے مگر اسے پڑھ کر بہت سے اہل علم اس شک میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں مولانا موصوف شیخ ابن تیمیہ کے مداح تو نہیں ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ مولانا موصوف سے شیخ ابن تیمیہ کی مدحت کا تصور برگرز نہیں کیا جاسکتا بلکہ انھوں نے اپنے مضمون کے ذریعے شیخ کو ”منکر تصوف“ کی بجائے ”ناقد تصوف“ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہاں! اگر مولانا موصوف اپنے مضمون کے شروع میں اس طرح کی عبارت بڑھا دیتے یا نوٹ لگا دیتے کہ ”شیخ ابن تیمیہ کے غیر اسلامی نظریات سے نہ مجھے اتفاق ہے نہ میں اس کا حاقی ہوں بلکہ صرف موضوعِ تصوف پر ان کے نظریات کو پیش کرنا مقصود ہے“ تو شاید اہل علم تشویش میں مبتلا نہ ہوتے۔ ہاں! ایسے وقت میں جب کہ دنیا مادی پریشانیوں سے دوچار ہو کر گمراہیوں کے تعرندلت میں گرا چاہتی ہے، آپ نے تصوف کا شعلہ جلا کر ہدایت و نجات کی راہ دکھائی ہے، اس پر ہم رندانِ تصوف آپ کے بے حد شکر گزار ہیں۔

○○○

اس شمارے کے خاص قلم کار

”الادساو“ حاصل کرنے کے پتے

- ☆ مکتبہ امام عظیم ۲/۴۲۵ نیٹائل، جامع مسجد، دہلی-۶ رابطہ نمبر: 9560054375
- ☆ رضوی کتاب گھر، ۴۲۲، نیٹائل، جامع مسجد، دہلی 011-23264524
- ☆ وکن ٹریڈرس، ۲۲۳-۲-۸۷، مغل پورہ، حیدرآباد (آندھرا پردیش) 040-24521777
- ☆ نیو سلور بک اینجی، ۱۲، محمد علی بلڈنگ، محمد علی روڈ، ممبئی 022-23478970
- ☆ رضا کیڈی، نزد رضا جامع مسجد، ۱/۶۵، واسو با بنگان، کمرہٹی، کولکاتا 9433210940
- ☆ اداویہ بک ڈپو، جامع مسجد گیٹ، ہزاری باغ، چھارکھنڈ 9835523993
- ☆ نوری کتاب گھر، مید سادات مسجد، ہما پور، بھلی، کرناٹک 9343109363
- ☆ ہرمکائی بک ڈپو، عمران گیٹ باؤس کینیکس، خواجہ بازار کے چبچے، چھٹا روضہ، گلبرگہ 9739752587
- ☆ تاج بک ڈپو، مومن پورہ، مانگ پور، مہاراشٹر

- ☆ مفتی عبید الرحمن رشیدی، ہنا تھاہ رشیدیہ، جون پور، یو پی 9472894394
- ☆ مولانا عبدالحکیم نعمانی، انجیل الاسلامی، مبارک پور، اعظم گڑھ 9838189592
- ☆ مفتی محمد نظام الدین رضوی، جامعہ اشرفیہ، مبارک پور، اعظم گڑھ 9450119650
- ☆ پروفیسر اختر الواصل، شعبہ اسلامیات، جامعہ اسلامیہ، نئی دہلی 9810541045
- ☆ پروفیسر نسیم مظہر صدیقی، شعبہ اسلامیات، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 05713295609
- ☆ پروفیسر بدیع الدین صابری، شعبہ عربی، جامعہ عثمانیہ، حیدرآباد 9949351984
- ☆ پروفیسر عبدالحمید اکبر، شعبہ عربی، گلبرگہ، یونیورسٹی، گلبرگہ 9844231934
- ☆ ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 9808364501
- ☆ ڈاکٹر شجاع الدین فاروقی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 9634368012
- ☆ ڈاکٹر نوٹا وعالم چشتی، فتح پور، یو پی 9412562751
- ☆ مولانا کوثر امام قادری، دارالعلوم مہدوسہ، پرسونی بازار، مہراج محل، یو پی 9838086342
- ☆ مولانا وارث مظہری، شاہین باغ، جامعہ گلبرگہ، اوکھلا، نئی دہلی 9990529353
- ☆ ڈاکٹر محمد مشتاق تجاروی، شعبہ اسلامیات، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 9910702673
- ☆ مولانا ارشد عالم نعمانی، دارالعلوم، قادری مسجد، ڈاکٹر گلبرگہ، اوکھلا، نئی دہلی 9555584637
- ☆ مولانا ساجد رضا مصباحی، جامعہ صدیقیہ، بھیمپور، اوریا، یو پی 9258273739
- ☆ مولانا طفیل احمد مصباحی، ماہنامہ اشرفیہ مبارک پور، اعظم گڑھ، یو پی 8896768649